مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہمِ قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول نبی عربی صلعم۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحیِ الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع جدید ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم خلافتِ راشدہ۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ تاریخِ ملت حصہ سوم خلافتِ بنی امیہ

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سینکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں)۔ لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم خلافتِ ہسپانیہ۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم خلافتِ عباسیہ اول

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات۔ حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم خلافتِ عباسیہ دوم۔ بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم خلافتِ عثمانیہ۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول جس کو
از سرِ نو مرتب اور سینکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد ۱۰۱ جمادی الاول ۱۴۰۸ھ مطابق جنوری ۱۹۸۸ء شمارہ ۱

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

ایک ایسے ہجوم کا تصور کیجئے جس میں شامل ہر فرد کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہو اور ان میں سے ایک بھی دوسرے کی سننے پر تیار نہ ہو تو آپ کو مسلم قوم کی مضحکہ خیز حیثیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، اس کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ قوم ہندوستان میں تاریخ کی سب سے بڑی آزمائش کا شکار ہے، بلکہ اگر اور گہرائی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ اس پر پڑ رہا ہے اس نے معمولات زندگی سمجھ کر اس کو قبول کر لیا ہے اور اس کے رہنماؤں کو بھی بالآخر یہ خیال ہو گیا ہے کہ موجودہ صورت حال سے باہر نکلنے کی تو کوئی امید نہیں اس لئے فضول محنت اور جد و جہد میں کون جان ہلکان کرے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ سید شہاب الدین دہلی کے مسلمانوں کو مظاہرہ کا حکم جاری کرتے ہیں لیکن خود اس مظاہرہ میں شریک نہیں ہوتے، اور جب اس مظاہرہ کی قیمت ادا کرنے والے مسلمان، ان کی عدم شرکت کی شکایت کرتے ہیں تو ان کا کھرا جواب ہوتا ہے کہ میں نے مظاہرہ کی اپیل ضرور کی تھی، شرکت کا وعدہ ہرگز نہیں کیا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی فساد ہوتا ہے، تو مسلم جماعتیں اور مسلم اخبارات ایک زبان ہو کر جوڈیشل انکوائری کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن جب یہ مطالبہ پر کمیشن مقرر ہو جاتا ہے تو اس سارے قصے کو ہی ذہن سے نکال کر بے فکر بیٹھ جاتے ہیں، نہ کوئی پیروی کا خرخشہ نہ ثبوت کی فکر، نہ گواہوں کی فراہمی، نہ دستاویزوں کی تلاش، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فساد زدہ مسلمان جہاں اور معاملات میں پریشانیوں اور تباہ کاریوں سے دو چار ہوتے ہیں، وہاں ناکافی پیروکاری اور رہنماؤں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے وہ فسادات کے مجرم بھی کمیشن کے تحت بن جاتے ہیں، مسلم جماعتوں کو ان فیصلوں کی زہر آگینی اور نقصان کی طرف دھیان تک دینے کی فرصت اس لئے نہیں مل پاتی کہ وہ اس عرصے میں کسی دوسرے فساد کی جوڈیشل انکوائری کے مطالبہ اور مسلمانوں کی دردمندی میں طرح طرح کے بیان دینے میں مشغول ہو جاتے ہیں، ابھی آپ نے دیکھا کہ مرادآباد میں جہاں عین عید کے دن، عیدگاہ کے اندر سیکڑوں مسلمان مظلومی اور بے بسی کی حالت میں شہید ہو گئے تھے، انکوائری کمیشن نے ان ہی کو فسادات شروع کرنے کا مجرم قرار دیا تو کسی مسلم جماعت نے اس پر احتجاج کرنے، اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی، اور اس کے فوراً بعد علی گڈھ فساد کے تمام مجرم عدالت سے بری کر دیئے گئے تو صاف طور کہا گیا کہ ناکافی پیروی، اور مسلمانوں کی عدم دلچسپی، اس مقدمہ کے خراب کرنے کا سبب بنی، لیکن کسی مسلم جماعت نے نہ تو اس پر شرم محسوس کی، نہ ہی اس کمی کو دور کرنے کے لیے کوئی تجویز منظور کی، نہ ہی کسی مسلم جماعت نے کسی ایسے شعبہ کو کھولنے کا اعلان کیا جو آئندہ اس طرح کے معاملات کو سنبھالنے اور ان کی باقاعدہ نگرانی کا فرض سنبھالے۔

---

۲۹ دسمبر کو ماہنامہ برہان کے مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نمبر کی رسم اجرار گہری سنجیدگی، صدمہ اور وقار سے بھرپور فضا کے درمیان منائی گئی۔

پہلے ایوان غالب اور پھر دفتر برہان میں اس سلسلے میں دو فنکشن منعقد ہوئے جن میں حضرت مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ملک کے مشاہیر نے شرکت فرمائی۔ جناب حکیم عبدالحمید سے لے کر خواجہ حسن ثانی نظامی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے لے کر جناب حکیم محمد زماں حسینی، سابق مرکزی وزیر جناب محمد یونس سلیم صاحب، مولانا عبدالکریم پاریکھ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر جناب شفیع اگوانی، مشہور کمیونسٹ لیڈر جناب مقیم الدین فاروقی، میر دہلی جناب میر مشتاق احمد صاحب، جناب عبدالوہاب خلجی تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم، صحافت، تصوف، سیاست، دین، مذہب کی چمکیلی کہکشاں مفتی صاحبؒ کی یادوں کے آسمان پر کھل گئی۔ برہان کے سرپرست جناب حکیم محمد زماں حسینی صاحب کا مفتی صاحبؒ پر تاثرات کا حامل مقالہ اس یادگاری اجتماع کی جان تھا۔ راقم السطور اس پر رونق محفل اور باوقار اجتماع میں اگرچہ جسمانی طور پر شرکت نہ کرسکا لیکن اس کا دل اسی اجتماع میں پڑا ہوا تھا۔ اس اجتماع میں پانچ سو اسّی (۵۸۰) صفحات کے ضخیم مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نمبر کا افتتاح جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے مبارک ہاتھوں انجام پایا اور عالی جناب مسٹر محمد یونس سلیم صاحب نے اجتماع کی کارروائی کو خوش اسلوبی سے چلا کر اجتماع کو کامیاب بنانے میں جتنی محنت کی، حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات کا جیسا ثبوت دیا ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس ہنگامے کی بدولت اور ہماری مسلسل علالت کی وجہ سے برہان کی اشاعت میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی ہے ہم کوشش کریں گے جلد سے جلد اس پر قابو پالیا جائے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور ان کی زندگی کے چند گوشے

از مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب

یہ مضمون جشن "مفکر ملت نمبر" کے افتتاح کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ اب اس ماہ کے شمارے میں مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کلکتہ کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ — ادارہ

قبل از مسیح کی قدیم آبادی قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور، قدیم الایام سرچشمۂ روحانیت، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے خلیفہ مولانا احمد دیبنی کا مولد و مسکن ——— حضرت مجدد کا گذر، حضرت سید احمد شہیدؒ کی دعاؤں کا مظہر خیر و برکت۔ حضرت مفتی صاحب کی جائے پیدائش و سکونت تھی۔

خاندان و نسب کا رشتہ، خلیفۂ ثالث، حضرت عثمان ذوالنورین کے صلب پاک سے جا ملتا ہے، دادا، بانیانِ دار العلوم کے ارکان اربعہ کے ایک خاص رکن، حضرت مولانا فضل الرحمٰن

عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ——— باپ، حضرت قطب عالم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مفتی اعظم ہند ——— چچا، علامۂ روزگار، اردو، عربی، فارسی کے ادیب نامدار، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، جن کی جلالت علمی پر ان کی عظیم کتاب اشاعت اسلام (اردو) اور قصیدہ لامیہ (عربی) شواہد کا درجہ رکھتی ہیں ——— اور، دوسرے چچا، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ محدث و مصنف "فتح الملہم" شارح مسلم شریف اور مفسر قرآن و مصنف فوائد تفسیریہ عثمانی، ——— تیسرے چچا، حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی، مرشد طریقت و سلوک، صوفی صافی، جن کی صفت امتیازی تھی کہ ان کے دست گرفتہ مریدین کو "حُبِّ رسول" میں ایسی سرمستی حاصل ہو جاتی تھی کہ رؤیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مناحی میسر ہونے لگتی تھی، ——— اور، چچا زاد فضل، اور بابو سعید یہ دونوں دیندار و متشرع گریجویٹ تھے، اور مناصب عالیہ پر فائز ——— چھوٹے بھائی الحاج الحافظ القری، المجود، جلیل الرحمٰن، استاذ القراء دارالعلوم دیوبند زاہد شب بیدار و زندہ دار بزرگ ہیں۔

چچا زاد بھائیوں اور بھتیجوں کا بھی وسیع حلقہ علوم قدیم اور جدیدہ سے آراستہ ہند و پاک میں پھیلا ہوا ہے ؎

این خانہ ہمہ آفتاب است

از ہر ہند، دارالعلوم دیوبند آپ کی مادر علمی ہے۔ جملہ علوم شرعیہ، قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، علم کتابت و خطابت، حفظ قرآن اور تجوید و قرأت کے لئے، یہی معدن و مخزن ہے اسی سے سند فراغ حاصل کی۔

سبحان اللہ! اساتذہ کرام میں سرفہرست، حجۃ اللہ فی الارض حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کا جلوہ دکھائی پڑتا ہے، پھر امام المتکلمین حضرت علامہ محمد ابراہیمؒ بلیاوی، شیخ الادب والفقہ حضرت علامہ اعزاز علی امروہوی، امام الصوفیاء، محدث عصر حضرت علامہ

سیدا صغر حسین دیوبندی اور دیگر اکابر دارالعلوم کی سرپرستیاں نظر آتی ہیں۔ رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً
بلحاظ درس اور خواجہ تاشوں اور ہم عصروں میں، فخر الاماثل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند ـــــ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحرم النبوی محدث عصر حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، صاحب "ترجمان السنۃ"۔ اور ـــــ مفتی اعظم پاکستان، سابق مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت علامہ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ شارح ترمذی حضرت علامہ محدث دوراں مولانا محمد یوسف بنوری، مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی و مولانا قاضی سجاد حسین وغیرہم باہم شیر و شکر نظر آرہے ہیں۔

تلامذہ کی فہرست طویل ہے، ـــــ میں نے ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلے میں دریافت کیا تو مسکرائے اور ہنس کر فرمایا کہ حکیم صاحب! ... اس بارے میں کیا سناؤں، میرا طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ جس نے اپنا رشتۂ تلمذ جوڑ کر... خوشی و مسرت کا اظہار کیا تو میں نے بھی سن لیا، ورنہ اس دور ناشناس میں کہاں کی استادی اور شاگردی؟ ـــــ مگر میں اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر ان احسان شناس شاگردوں کا تذکرہ کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں، جنہوں نے نہایت سعادت مندی اور شکر گزاری کے ساتھ اپنے رشتۂ تلمذ کا بار بار ذکر کیا اور علماء کے بھرے مجمع میں کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ـــــ تقسیم ہند کے بعد جب مدرسہ عالیہ کلکتہ کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم اس کے پہلے پرنسپل قرار پائے اور اساتذۂ کرام اور دیگر اسٹاف مدرسہ کی تقرریوں کے بعد تعلیمی سلسلہ شروع ہو گیا تو اسی زمانہ میں حضرت مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی مرحوم کا سفر کلکتہ پیش آیا جو ہر سال ندوۃ المصنفین کے سلسلہ میں پیش آتا ہی تھا، اسی موقع پر حضرت مولانا اکبرآبادی مرحوم نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا انتظام مدرسہ عالیہ

میں گیا، جس میں مدرسہ کے علماء کرام اور اساتذہ اور دیگر کارکنان مدرسہ موجود تھے راقم الحروف بھی گورننگ باڈی کے ایک ممبر کی حیثیت سے اس میں شریک تھا۔ اس مبارک موقع پر مولانا اکبرآبادی مرحوم نے حضرت مفتی صاحب کی عظمت وجلال شان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا انکشاف کیا کہ میں نے "بیضاوی شریف" جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے سبقاً سبقاً بقدر درس پڑھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری پوری طالب علمی انہی کے زیرتربیت ونگرانی دارالعلوم دیوبند میں گذری ہے۔ اس موقع پر مُدرس حدیث، حضرت مولانا سید حمیدالدین صاحب مرحوم نے بھی فرمایا کہ میں نے "کنز الدقائق" حضرت مفتی صاحب سے پڑھی اور میں ان کا ادنیٰ تلمیذ ہوں ــــــ ایک تیسرے طالب علم، مُدرس مدرسہ عالیہ مولانا عبدالشکور صاحب نے جو بنگال کے باشندہ ہیں یہ اعلان کیا کہ میں نے ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے "بیضاوی" پڑھی ہے۔

میرا خیال ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ تدریس میں جن طلبہ نے حضرت مفتی صاحب سے درس لیا ہے اور اسی طرح جامعہ ڈابھیل میں جن حضرات نے حضرت مرحوم سے سبق لیا ہے بلاشبہ ان میں بڑے بڑے علماء نامدار ہوئے ہوں گے جو ساؤتھ افریقہ اور ہندوپاک اور ملک کے دوسرے خطوں میں پھیلے ہوں گے، ان بزرگوں کی تعداد بھی خاصی ہوگی۔

مزاجی کیفیت کے اعتبار سے نہایت حلیم وبردبار تھے، مُدبّر و عاقبت اندیش تھے خواہ مخواہ گلہ شکوہ کا مزاج نہیں تھا، طبیعت میں استقامت بہت تھی، جب کسی معاملے میں فیصلہ فرمالیتے تھے اسے عملی شکل دینے اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی تدبیریں نہایت ہی خوبی سے کرگذرتے تھے۔

لحاظ ومروت اور اس کی نگہداشت میں بے مثال آدمی تھے، حضرت مرحوم جب جب دیوبند تشریف لے جاتے تھے، خواہ کسی خانگی ضرورت یا خاندانی تقریب کا موقع ہو یا

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا وقت ہو، اپنے کل عزیزوں کے گھروں پر ضرور جانا دریافت حال کرنا، چھوٹوں کو روپے دے کر سروں پر دست شفقت و محبت پھیر کر ... محبت ارشاد فرمانا، بیواؤں، یتیموں کی خبرگیری اور بے معاش عزیزوں اور ... عزیزوں کی فکرمندی کے ساتھ مدد کرنا حضرت مفتی صاحب کی خاص صفت امتیازی تھی۔ ... بھی وارد ین، صادرین کی حسب حیثیت و ضرورت خیال رکھنا اور خوبی کے ساتھ ... مشکل کو سر کرنا انھیں کے ناخن تدبیر کا کمال تھا۔

اپنے اساتذہ کا بڑا خیال فرماتے اور نہایت اکرام سے ان کا ذکر فرماتے اور ان کی ... ورثوں کا خیال رکھتے تھے۔ استاذ زادوں تک کی خبرگیری میں دلچسپی لیتے تھے، اس سلسلہ ... ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادے دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے ان میں سے دو چھوٹوں کی بعض ملازمانہ ضرورتیں مجلس شوریٰ کی توجہ کی محتاج تھیں، بڑی دلسوزی سے مجھ سے فرمانے لگے کہ "حکیم صاحب! غریب و کمزور لوگ ہیں اور استاد زادے ہیں، ان کا خیال کرنا چاہئے"۔ حقیقت میں حضرت مرحوم بہت غم خوار اور غم گسار آدمی تھے۔ گھریلو خدمت گذار بھنگن تک سے دریافت کرتے کہ "خیریت ہے؟ اچھی ہو؟" پھر وہ خوش ہو کر نیازمندی سے جواب دیتی!۔ ایک صاحب جو اس گھریلو معاملہ کے برابر کے شاہد ہیں، ایک مرتبہ ہنس کر مجھے یہ روداد سنانے لگے۔ مگر اس واقعہ سے میں بہت متاثر ہوا ——— اس وقت حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ایک بات میرے کانوں میں گونجنے لگی، "حکیم صاحب! اباجی مرحوم کی طرف سے مجھ پر نقشبندیت کا سایہ پڑا ہوا ہے"۔

حافظہ غضب کا تھا، احادیث و تفسیر کے علمی مباحث پر اچھی گہری نظر تھی۔ علم فقہ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی، ایک مرتبہ میرے ہاں طلاق غضبان کے سلسلہ کا ایک پیچیدہ استفتاء آگیا، اس موقع پر فقہاء نے مدہش وغیرہ کی جو بحث کی ہے اس کی بنا پر

میں کیا، جس میں مدرسہ کے علمار کرام اور اساتذہ اور دیگر کارکنان مدرسہ موجود تھے، راقم الحروف بھی گورننگ باڈی کے ایک ممبر کی حیثیت سے اس میں شریک تھا۔ اس مبارک موقع پر مولانا اکبرآبادی مرحوم نے حضرت مفتی صاحب کی عظمت وجلالِ شان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا انکشاف کیا کہ میں نے "بیضاوی شریف" جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے سبقاً سبقاً بقدر درس پڑھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری پوری طالب علمی انہی کے زیر تربیت ونگرانی دارالعلوم دیوبند میں گذری ہے۔ اس موقع پر مُدرس حدیث، حضرت مولانا سید حمیدالدین صاحب مرحوم نے بھی فرمایا کہ میں نے "کنزالدقائق" حضرت مفتی صاحب سے پڑھی اور میں ان کا ادنیٰ تلمیذ ہوں ـــــ ایک تیسرے طالب علم، مُدرس مدرسہ عالیہ مولانا عبدالشکور صاحب نے جو بنگال کے باشندہ ہیں یہ اعلان کیا کہ میں نے ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے "بیضاوی" پڑھی ہے۔

میرا خیال ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ تدریس میں جن طلبہ نے حضرت مفتی صاحب سے درس لیا ہے اور اسی طرح جامعہ ڈابھیل میں جن حضرات نے حضرت مرحوم سے سبق لیا ہے بلاشبہ ان میں بڑے بڑے علمار نامدار ہوئے ہوں گے جو ساؤتھ افریقہ اور ہندوپاک اور ملک کے دوسرے خطوں میں پھیلے ہوں گے، ان بزرگوں کی تعداد بھی خاصی ہوگی۔

مزاجی کیفیت کے اعتبار سے نہایت حلیم وبُردبار تھے، مُدبّر وعاقبت اندیش تھے خواہ مخواہ گلہ شکوہ کا مزاج نہیں تھا، طبیعت میں استقامت بہت تھی، جب کسی معاملے میں فیصلہ فرمالیتے تھے اِسے عملی شکل دینے اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی تدبیریں نہایت ہی خوبی سے کرگذرتے تھے۔

لحاظ ومروّت اور اس کی نگہداشت میں بے مثال آدمی تھے، حضرت مرحوم جب جب دیوبند تشریف لے جاتے تھے، خواہ کسی خانگی ضرورت یا خاندانی تقریب کا موقع ہو یا

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا وقت ہو، اپنے کُل عزیزوں کے گھروں پر ضرور جانا، خیریت حال معلوم کرنا، چھوٹوں کو روپے دے کر سروں پر دست شفقت و محبت پھیر کر ان کو محبت استوار فرمانا، بیواؤں، یتیموں کی خبرگیری اور بے معاش عزیزوں اور ضرورت مندوں کی فکر مندی کے ساتھ مدد کرنا حضرت مفتی صاحب کی خاص صفتِ امتیاز تھی۔ شہر میں بھی وارد ہیں، صادرین کی حسب حیثیت و ضرورت خیال رکھنا اور خوبی کے ساتھ اس مشکل کو سر کرنا انھیں کے ناخن تدبیر کا کمال تھا۔

اپنے اساتذہ کا بڑا خیال فرماتے اور نہایت اکرام سے ان کا ذکر فرماتے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ استاد زادوں تک کی خبرگیری میں دلچسپی لیتے تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادے دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے ان میں سے دو چھوٹوں کی بعض ملازمانہ ضرورتیں مجلس شوریٰ کی توجہ کی محتاج تھیں، بڑی دلسوزی سے مجھ سے فرمانے لگے کہ "حکیم صاحب! غریب و کمزور لوگ ہیں اور استاد زادے ہیں، ان کا خیال کرنا چاہیئے"۔ حقیقت میں حضرت مرحوم بہت غم خوار اور غم گسار آدمی تھے۔ گھریلو خدمت گزار بھنگن تک سے دریافت کرتے کہ "خیریت ہے؟ اچھی ہو؟" پھر وہ خوش ہو کر نیاز مندی سے جواب دیتی!۔ ایک صاحب جو اس گھریلو معاملہ کے برابر کے شاہد ہیں، ایک مرتبہ ہنس کر مجھے یہ روداد سنانے لگے۔ مگر اس واقعہ سے میں بہت متاثر ہوا ——— اس وقت حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ایک بات میرے کانوں میں گونجنے لگی، "حکیم صاحب! اباجی مرحوم کی طرف سے مجھ پر نقشبندیت کا سایہ پڑا ہوا ہے"۔

حافظہ غضب کا تھا، احادیث و تفسیر کے علمی مباحث پر اچھی گہری نظر تھی۔ علم فقہ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی، ایک مرتبہ میرے ہاں طلاق غضبان کے سلسلہ کا ایک پیچیدہ استفتار آگیا، اس موقع پر فقہار نے مدہش وغیرہ کی جو بحث کی ہے اس کی بنا پر

میں گیا، جس میں مدرسہ کے علماء کرام اور اساتذہ اور دیگر کارکنان مدرسہ موجود تھے، راقم الحروف بھی گورننگ باڈی کے ایک ممبر کی حیثیت سے اس میں شریک تھا۔ اس مبارک موقع پر مولانا اکبرآبادی مرحوم نے حضرت مفتی صاحب کی عظمت وجلالِ شان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا انکشاف کیا کہ میں نے "بیضاوی شریف" جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے سبقاً سبقاً بقدر درس پڑھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری پوری طالب علمی انہی کے زیرِ تربیت ونگرانی دارالعلوم دیوبند میں گذری ہے۔ اس موقع پر مُدرس حدیث، حضرت مولانا سید حمیدالدین صاحب مرحوم نے بھی فرمایا کہ میں نے "کنزالدقائق" حضرت مفتی صاحب سے پڑھی اور میں ان کا ادنیٰ تلمیذ ہوں ــــ ایک تیسرے طالب علم، مُدرس مدرسہ عالیہ مولانا عبدالشکور صاحب نے جو بنگال کے باشندہ ہیں یہ اعلان کیا کہ میں نے ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے "بیضاوی" پڑھی ہے۔

میرا خیال ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ تدریس میں جن طلبہ نے حضرت مفتی صاحب سے درس لیا ہے اور اسی طرح جامعہ ڈابھیل میں جن حضرات نے حضرت مرحوم سے سبق لیا ہے بلاشبہ ان میں بڑے بڑے علماء نامدار ہوئے ہوں گے جو ساؤتھ افریقہ اور ہندوپاک اور ملک کے دوسرے خطوں میں پھیلے ہوں گے، ان بزرگوں کی تعداد بھی خاصی ہوگی۔

مزاجی کیفیت کے اعتبار سے نہایت حلیم وبُردبار تھے، مُدبّر وعاقبت اندیش تھے، خواہ مخواہ گلہ شکوہ کا مزاج نہیں تھا، طبیعت میں استقامت بہت تھی، جب کسی معاملے میں فیصلہ فرما لیتے تھے اِسے عملی شکل دینے اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی تدبیریں نہایت ہی خوبی سے کرگذرتے تھے۔

لحاظ ومروّت اور اس کی نگہداشت میں بے مثال آدمی تھے، حضرت مرحوم جب جب دیوبند تشریف لے جاتے تھے، خواہ کسی خانگی ضرورت یا خاندانی تقریب کا موقع ہو یا

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا وقت ہو، اپنے کل عزیزوں کے گھروں پر ضرور جانا، مزاج پرسی کرنا، چھوٹوں کو روپے دے کر سروں پر دست شفقت و محبت پھیر کر کوئی کلمۂ محبت ارشاد فرمانا، بیواؤں، یتیموں کی خبرگیری اور بے معاش عزیزوں اور غیر عزیزوں کی فکرمندی کے ساتھ مدد کرنا حضرت مفتی صاحب کی خاص صفت امتیاز تھی۔ شہر بھر میں بھی واردین، صادرین کی حسب حیثیت و ضرورت خیال رکھنا اور خوبی کے ساتھ اس مشکل کو سر کرنا انھیں کے ناخن تدبیر کا کمال تھا۔

اپنے اساتذہ کا بڑا خیال فرماتے اور نہایت اکرام سے ان کا ذکر فرماتے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ استادزادوں تک کی خبرگیری میں دلچسپی لیتے تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادے دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے ان میں سے دو چھوٹوں کی بعض ملازمانہ ضرورتیں مجلس شوریٰ کی توجہ کی محتاج تھیں، بڑی دلسوزی سے مجھ سے فرمانے لگے کہ "حکیم صاحب! غریب و کمزور لوگ ہیں اور استادزادے ہیں، ان کا خیال کرنا چاہئے"۔ حقیقت میں حضرت مرحوم بہت غم خوار اور غم گسار آدمی تھے۔ گھریلو خدمت گذار بھنگن تک سے دریافت کرتے کہ "خیریت ہے؟ اچھی ہو؟" پھر وہ خوش ہوکر نیازمندی سے جواب دیتی!۔ ایک صاحب جو اس گھریلو معاملہ کے برابر کے شاہد ہیں، ایک مرتبہ ہنس کر مجھے یہ روداد سنانے لگے۔ مگر اس واقعہ سے میں بہت متاثر ہوا ——— اس وقت حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ایک بات میرے کانوں میں گونجنے لگی، "حکیم صاحب! اباجی مرحوم کی طرف سے مجھ پر نقشبندیت کا سایہ پڑا ہوا ہے"۔

حافظہ غضب کا تھا، احادیث و تفسیر کے علمی مباحث پر اچھی گہری نظر تھی۔ علم فقہ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی، ایک مرتبہ میرے ہاں طلاق غضبان کے سلسلہ کا ایک پیچیدہ استفتاء آگیا، اس موقع پر فقہاء نے مدہش وغیرہ کی جو بحث کی ہے اس کی بنا پر

جواب استفتاء مرتب کرنے میں مجھے پریشانی لاحق ہوگئی، اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحب کلکتہ میں موجود تھے، میں نے ان کی طرف رجوع کیا تو حضرت مرحوم نے نہایت مختصر روشن کی رہنمائی کی بلکہ میرے اصرار پر جواب بھی چند سطروں میں تحریر فرما دیا۔ اردو، فارسی، عربی کے نہایت منتخب اور چیدہ اشعار ازبر تھے۔ حضرت مرحوم موقع بموقع نہایت دلچسپ انداز میں جب پڑھتے اور چسپاں کرتے تو لطف آجاتا تھا اور مخاطب پھڑک جاتا تھا۔

اپنی فتویٰ نویسی کی دلچسپ داستان حضرت مرحوم نے ایک مرتبہ سنائی تو وہ بے معنی نہ ہوگا اس لئے عرض کر رہا ہوں ——— فرمایا " دارالافتاء دیوبند سے جب میں وابستہ کیا گیا تو عہد شباب تھا، شوق میں کتب فقہ کا بڑا ذخیرہ اپنے ذاتی کتب خانہ میں جمع کر لیا اور بڑی محنت کرکے کسی ایک مسئلہ پر ساری کتابیں پڑھتا پھر تھک جاتا۔ اس میں بڑا وقت لگ جاتا والد صاحب یہ سب کچھ نہایت خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ بہت دنوں کے بعد ایک روز کہنے لگے کہ عتیق! تمہاری ساری محنت کا ثمرہ "شامی" میں موجود ہے، علامہ شامی نے سب سمیٹ لیا ہے اور ساری کتابوں کا عطر نکال لیا ہے۔

دیوبند کے فتویٰ نویسی کے زمانے کی یہ کہانی کہ جب کبھی بعض استفتاء کا جواب نہیں لکھ سکتا تو نہایت خاموشی سے والد صاحب کو مطلع کئے بغیر ان کے قالین کے نیچے دبا دیا کرتا اور والد صاحب حسب عادت قالین کے نیچے سے جب اپنے فتوے نکالتے تو ہمارے فتوؤں کا بھی جواب لکھ کر ارسال فرما دیتے اور مجھے کچھ بھی نہ فرماتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ حکیم صاحب! کیسے ان کے بزرگانہ طریقے تھے اور کس ڈھنگ سے تربیت دیا کرتے تھے؟۔

اسی سلسلے میں یہ واقعہ بھی سنانے لگے کہ شروع، شروع بچپنے میں تراویح، نفل میں قرآن سنانے لگا تو بھولتا بہت تھا مگر والد صاحب کی عادت تھی کہ میرے ساتھ ساتھ قرآن کا ایک، ایک صفحہ پورا، کا پورا پڑھتے جاتے اور میں ان کی تابعداری کرتا جاتا مگر

کسی دیتا نہیں ہوا کہ آزردہ ہو کر کہیں بگڑ کا ہو۔
مفتی صاحب لوگوں کو جوڑنے کی برابر سعی کیا کرتے تھے اور دہلی کے اولیاء میں سے کسی کا کلام پڑھا کرتے تھے کہ ان کا یہ کلام ہے کہ بھائی مجھے سوئی ڈورا چاہیئے تاکہ چاک رفو کروں میرا کام جوڑنے کا ہے، مجھے قینچی نہیں چاہیئے" میں نے کلکتہ میں کئی واقعات مشاہدہ کئے ہیں، خود میرا ذاتی معاملہ یہ ہوا کہ ملا جان مرحوم خلافت والوں سے سیاسی اختلافات کی بنا پر طرفین میں ناخوشی سی بنی رہتی تھی مگر نہایت خوبصورتی سے اسے رفع کرالیا ——— آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا وجود حضرت مفتی صاحب مرحوم کی اسی قسم کی جدوجہد کی زندہ مثال ہے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے حضرت مفتی صاحب مرحوم کو بڑا قلبی لگاؤ تھا، ان کا تذکرہ نہایت ہی شیریں انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" کا ذکر فرمانے لگے کہ، حکیم صاحب! آیات قرآنی کے معانی کی تعبیر جن لفظوں میں مولانا آزاد نے کی ہے، بس کمال کردیا ہے! مخالفین میں اگر کسی میں یہ صلاحیت ہے تو یہ کام کر دکھا دے حکیم صاحب خردہ گیری بہت آسان، اور گھٹیا کام ہے، تعمیری کام کوئی کر کے تو دکھائے۔

ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ہندستانی مدارس اور علماء میں شروح بخاری دیر میں پھیلی ہیں۔ "فتح الباری" اور "عینی" وغیرہ کے رواج کے پہلے فتح القدیر شرح ہدایہ آگئی تھی، درسی کتب حدیث کے اشکالات علمی ایک زمانے تک اسی کی مدد سے حل کرنے کا رواج تھا، علامہ کے مقابلے میں فتح الباری کو ترجیح دیتے تھے۔

زبان پر گالی کے کلمات میں نے کبھی نہیں سنے۔ سب وشتم اور نامناسب کلمات کے استعمال سے ان کی زبان پاک تھی۔ نہایت ناگواری میں بھی سخت مخالف و دشمن کے لئے حضرت مرحوم اس عمل بد کے روادار نہیں تھے۔

حضرت مفتی صاحب کے قلم کے فتاویٰ دارالعلوم کے رجسٹر فتاویٰ میں محفوظ ہیں۔ فرمایا کرتے تھے "ان پر نشان لگے ہوئے ہیں وہ سب کے سب میرے قلم کے ہیں"، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بھی ان کے فتاویٰ کی نقلیں رجسٹر میں موجود ہیں۔ معرکۃ الآراء بعض فتوے میں نے کفایت المفتی میں بھی دیکھے ہیں، اس سے فتویٰ نویسی میں ان کی ادا کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خطوط نویسی میں حضرت مفتی صاحب یگانہ اور منفرد تھے، جملوں کی بندش، طرزِ ادا کی ندرت، انداز بیان میں حلاوت ولینت اور اس طرح کی دوسری دل آویز خصوصیات حضرت مرحوم کے خطوط میں ہوتی تھیں۔

حضرت مرحوم حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ اور دیگر اولیاء برحق کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرے کیا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، تدریسی ہو یا تصنیفی، اخلاقی ہو یا معاشی اور معاشرتی ہر ایک میں ان کے دردِ دل کا پرتو دکھائی پڑتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے "ندوۃ المصنفین" جیسے عظیم ادارے کی بنیاد اسی بنا پر رکھی اور ساری زندگی اس کے لئے جس طریقے سے وقف کر دی، یہ اسی درونِ قلب کی تڑپ کا نتیجہ ہے ــــ سچ ہے

وَمَا فَقْدُہٗ وَاللّٰہِ فَقْدٌ لِوَاحِدٍ

وَرَبِّی جَنَاحُ الْعِلْمِ مِنْہُ تَکَسَّرَا

مجھے خوشی ہے کہ حضرت مرحوم کی دارین میں کامیاب زندگی کی شہادت کے لئے رسول اکرم کا یہ فرمان شاہد عدل ہے " اذا مات الانسان انقطع عنہ عملہ الا من ثلثۃ الا من صدقۃ جاریۃ او ولد صالح یدعولہ او علم ینتفع بہ " ـــ بالخصوص اس حدیث کا آخری جملہ پوری طرح ندوۃ المصنفین کی کارگذاریوں اور اس کے افادات کو حاوی ہے ـــــ اللّٰھم ارحمہ رحمۃ واسعۃ۔

●●

مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

جمیل مہدی

مفتی عتیق الرحمن عثمانی ان مغتنم روزگار شخصیتوں میں سے تھے جن کے بارے میں
خیال ہے کہ انھیں نہ دیکھتے تو دنیا کی دوسری مشہور اور تاریخی شخصیتوں کا وجود
یل افسانوی محسوس ہوا کرتا، وہ دیوبند کے ایسے علمی خاندان اور خانوادے کے
تھے جو مسلمانوں کی دینی اور علمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے دادا
لانا فضل الرحمن ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے حاجی عابد حسینؒ کی رہنمائی میں
بند کے عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے
وستان کا سب سے بڑا علمی اور دینی مرکز بن گیا اور جس نے آگے چل کر شیخ الہند
نا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبید اللہ سندھی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ
م بلیاوی اور مولانا منصور انصاری جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا کیں۔
مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے والد ماجد مفتی عزیز الرحمن عثمانی مشہور صاحب نسبت
ہونے کے علاوہ فتاویٰ اور مذہبی احکام پر اتنا عبور رکھتے تھے کہ ان کے
ئے ہزاروں فتووں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب فتاویٰ عزیزیہ کے نام سے کئی
ں میں شائع ہو چکی ہے اور ابھی تک بھی بڑی تعداد غیر مطبوعہ فتووں کی موجود

حضرت مفتی صاحب کے قلم کے فتاویٰ دارالعلوم کے رجسٹر فتاویٰ میں محفوظ ہیں۔ فرمایا کرتے تھے "ان پر نشان لگے ہوئے ہیں وہ سب کے سب میرے قلم کے ہیں"، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بھی ان کے فتاویٰ کی نقلیں رجسٹر میں موجود ہیں۔ معرکہ آرا بعض فتوے میں نے کفایت المفتی میں بھی دیکھے ہیں، اس سے فتویٰ نویسی میں ان کی ادا کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خطوط نویسی میں حضرت مفتی صاحب یگانہ اور منفرد تھے، جملوں کی بندش، طرز ادا کی ندرت، انداز بیان میں حلاوت و لینت اور اس طرح کی دوسری دل آویز خصوصیات حضرت مرحوم کے خطوط میں ہوتی تھیں۔

حضرت مرحوم حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ اور دیگر اولیاء برحق کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرے کیا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، تدریسی ہو یا تصنیفی، اخلاقی ہو یا معاشی اور معاشرتی ہر ایک میں ان کے دردِ دل کا پرتو دکھائی پڑتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے "ندوۃ المصنفین" جیسے عظیم ادارے کی بنیاد اسی بنا پر رکھی اور ساری زندگی اس کے لئے جس طریقے سے وقف کر دی، یہ اسی درونِ قلب کی تڑپ کا نتیجہ ہے ـــــ سچ ہے

وَمَا فَقْدُهٗ وَاللہِ فَقْدٌ لِوَاحِدٍ
وَبَاتَ جَنَاحُ الْعِلْمِ مِنْہُ تَکَسَّرَا

مجھے خوشی ہے کہ حضرت مرحوم کی دارین میں کامیاب زندگی کی شہادت کے لئے رسول رحمت کا یہ فرمان شاہد عدل ہے "اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلثة الا من صدقة جارية او ولد صالح يدعوله او علم ينتفع به" ـــــ بالخصوص اس حدیث کا آخری جملہ پوری طرح ندوۃ المصنفین کی کارگذاریوں اور اس کے افادات کو حاوی ہے ـــــ اللھم ارحمہ رحمۃ واسعۃ۔

●●

مفکّرِ ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

جمیل مہدی

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ان مغتنم روزگار شخصیتوں میں سے تھے جن کے بارے میں یراخیال ہے کہ انھیں نہ دیکھتے تو دنیا کی دوسری مشہور اور تاریخی شخصیتوں کا وجود تخیل افسانوی محسوس ہوا کرتا، وہ دیوبند کے ایسے علمی خاندان اور خانوادے کے رد تھے جو مسلمانوں کی دینی اور علمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے دادا ولانا فضل الرحمٰن ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے حاجی عابد حسینؒ کی رہنمائی میں یوبند کے عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے ندوستان کا سب سے بڑا علمی اور دینی مرکز بن گیا اور جس نے آگے چل کر شیخ الہند ولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبیداللہ سندھی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ براہیم بلیاوی اور مولانا منصور انصاری جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا کیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے والد ماجد مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مشہور صاحب نسبت رگ ہونے کے علاوہ فتاویٰ اور مذہبی احکام پر اتنا عبور رکھتے تھے کہ ان کے ے ہوئے ہزاروں فتووں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب فتاویٰ عزیزیہ کے نام سے کئی دوں میں شائع ہو چکی ہے اور ابھی تک بھی بڑی تعداد غیر مطبوعہ فتووں کی موجود

حضرت مفتی صاحب کے قلم کے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے رجسٹر فتاویٰ میں محفوظ ہیں۔ فرمایا کرتے تھے "ان پر نشان لگے ہوئے ہیں وہ سب کے سب میرے قلم کے ہیں"، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بھی ان کے فتاویٰ کی نقلیں رجسٹر میں موجود ہیں۔ معرکہ آرا بعض فتوے میں نے کفایت المفتی میں بھی دیکھے ہیں، اس سے فتویٰ نویسی میں ان کی ادا کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خطوط نویسی میں حضرت مفتی صاحب یگانہ اور منفرد تھے، جملوں کی بندش، طرزادا کی ندرت، انداز بیان میں حلاوت ولینت اور اس طرح کی دوسری دل آویز خصوصیات حضرت مرحوم کے خطوط میں ہوتی تھیں۔

حضرت مرحوم حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ اور دیگر اولیاء برحق کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرے کیا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، تدریسی ہو یا تصنیفی، اخلاقی ہو یا معاشی اور معاشرتی ہر ایک میں ان کے دردِ دل کا پرتو دکھائی پڑتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے "ندوۃ المصنفین" جیسے عظیم ادارے کی بنیاد اسی بنا پر رکھی اور ساری زندگی اس کے لئے جس طریقے سے وقف کر دی، یہ اسی دردِ قلب کی تڑپ کا نتیجہ ہے ــــ سچ ہے

وَمَا فَقْدُهٗ وَاللّٰہِ فَقْدٌ لِوَاحِدٍ
وَرَبِّي جَنَاحُ الْعِلْمِ مِنْهُ تَكَسَّرَا

مجھے خوشی ہے کہ حضرت مرحوم کی دارین میں کامیاب زندگی کی شہادت کے لئے رسولِ رحمت کا یہ فرمان شاہد عدل ہے" اذا مات الانسان انقطع عنه عملهٗ الا من ثلثة الا من صدقة جارية او ولد صالح يدعوله او علم ينتفع بهٖ" ــــ بالخصوص اس حدیث کا آخری جملہ پوری طرح ندوۃ المصنفین کی کارگذاریوں اور اس کے افادات کو حاوی ہے ــــ اللهم ارحمه رحمة واسعة۔

●●

مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

جمیل مہدی

مفتی عتیق الرحمن عثمانی ان مغتنم روزگار شخصیتوں میں سے تھے جن کے بارے میں میرا خیال ہے کہ انہیں نہ دیکھتے تو دنیا کی دوسری مشہور اور تاریخی شخصیتوں کا وجود تخیلی افسانوی محسوس ہوا کرتا، وہ دیوبند کے ایسے علمی خاندان اور خانوادے کے فرد تھے جو مسلمانوں کی دینی اور علمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے دادا مولانا فضل الرحمن ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے حاجی عابد حسینؒ کی رہنمائی میں دیوبند کے عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے ہندوستان کا سب سے بڑا علمی اور دینی مرکز بن گیا اور جس نے آگے چل کر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبیداللہ سندھی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ ابراہیم بلیاوی اور مولانا منصور انصاری جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا کیں۔

مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے والد ماجد مفتی عزیز الرحمن عثمانی مشہور صاحب نسبت بزرگ ہونے کے علاوہ فتاویٰ اور مذہبی احکام پر اتنا عبور رکھتے تھے کہ ان کے لکھے ہوئے ہزاروں فتووں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب فتاویٰ عزیزیہ کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اور ابھی تک بھی بڑی تعداد غیر مطبوعہ فتووں کی موجود

ہے۔ ان کے والد ماجد کے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ایک صاحب تصنیف عالم تھ
ان کی ذکاوت، دانش اور تدبر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سلاطین جیسے دماغ ا
مشہور حکمار عالم جیسی عقل کے مالک تھے، ان ہی کے حسن انتظام اور ناخن تدبیر نے
دیوبند کے مدرسہ عربی کو دارالعلوم کے عظیم الشان ادارے میں تبدیل کیا اور وہ اپنی زندگی
کے یوم آخر تک دارالعلوم دیوبند کے منتظم اور نگراں کار بنے رہے

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے ایک چچا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جو تحریر و تقریر کے بادشاہ
کہے جاتے تھے، وہ عالموں کے مجمع میں بے مثال عالم اور خطیبوں کے مجمع میں بے نظیر اور
سحر طراز خطیب نظر آتے، مدتوں خلافت کمیٹی کے ممتاز رہنماؤں اور جمعیۃ العلمائے ہند
کے معزز اور قابل احترام لیڈروں میں ان شمار ہوتا رہا، خلافت تحریک کے زمانے اور
اس کے بعد کے اہم ترین سیاسی دور میں کتنی ہی کانفرنسیں اور اہم اجتماعات ان کی صدارت
میں منعقد ہوئے، آخر میں وہ تحریک پاکستان کے ہم نوا ہوگئے اور پاکستان کے پہلے اور شاید
آخری شیخ الاسلام کے بھی عظیم الشان درجہ کے عالم اور دینی پیشوا کی حیثیت سے ان کا
انتقال ہوا۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ علامہ انور شاہ کشمیری کے مایۂ ناز شاگردوں میں شمار
ہوتے تھے اور ان ذہین اور باصلاحیت طلبار کی صف کے ایک ممتاز رکن تھے جو
آگے چل کر علمی، تصنیفی، سیاسی اور دینی خدمات کے لحاظ سے ایک کہکشاں کی صورت
اختیار کر گئی، اس صف میں مولانا محمد یوسف بنوری، قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم
دیوبند، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا حامد الانصاری
غازی، میر واعظ مولانا یوسف شاہ کشمیری، مولانا عبدالوحید غازی پوری، مولانا
منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور درجنوں
ایسے ممتاز لوگ شامل تھے جو آگے چل کر دین علم، سیاست اور صحافت کے آسمان پر

چاند سورج بن کر چمکے اور جن کی روشنی سے ایک عالم نے فیض حاصل کیا۔
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی ذہانت، ذکاوت اور صلاحیت طالب علمی کے زمانے سے ہی نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگی تھی اس لئے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد انھیں دارالعلوم میں ہی معین المدرسین کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا، یہ عہدہ اس زمانے میں ایسے ذہین طالب علموں کی تدریسی تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا جو غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت کے مالک ثابت ہوتے تھے لیکن اس عہدہ پر کام کرتے ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کا وہ پہلا دور شروع ہوا جس کے نتیجہ میں صدر مدرس علامہ انور شاہ کشمیری کے ساتھ علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ ابراہیم بلیاوی اور مفتی عزیز الرحمٰن جیسے بے نظیر عالموں اور ماہرین تعلیم و مذہب کو دارالعلوم چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا۔ دارالعلوم دیوبند سے سبکدوشی کے بعد علامہ انور شاہ کشمیری گجرات کے ایک قصبہ ڈابھیل میں منتقل ہو گئے جہاں ان کے لائق شاگردوں اور معتقدوں نے ایک مدرسہ کھول کر ان کے فیضان علمی کو جاری رکھنے کا انتظام کیا تھا، علامہ انور شاہ کشمیری کے ساتھ جہاں علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ جیسے بڑے اور مشہور عالم ڈابھیل گئے وہاں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ بھی اپنے شفیق استاد علامہ کشمیری کی گہری عقیدت اور محبت کی وجہ سے ڈابھیل منتقل ہو گئے اور دراصل یہیں سے ان کی علمی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی الوطنی باغیانہ خیالات اور قوم پرستانہ جذبات کا اظہار تو دیوبند کے ان اجتماعات اور جلسوں میں ہونے لگا تھا جو تحریک خلافت اور جمعیۃ العلمائے ہند کے زیر اہتمام آئے دن ہوتے رہتے تھے لیکن ان کے قوم پرستانہ اور سامراج دشمن نظریات میں نکھار ڈابھیل کے قیام کے زمانے میں گاندھی جی

سے ان کی ملاقات کے بعد آیا جس سے انھوں نے ڈابھیل سے کچھ میل دور ڈانڈی کو جانے والی سڑک پر جا کر اس وقت گفتگو کی جبکہ وہ مشہور عالم ڈانڈی مارچ کے قافلے کے ساتھ سڑک سے گذر رہے تھے۔ اس ملاقات کے دوران جب انھوں نے گاندھی جی سے یہ کہا کہ اسلام میں ہوا اور پانی کے ساتھ نمک بھی ایک ایسی چیز ہے جس پر روک یا ٹیکس لگانا مذہب کی رو سے ناجائز ہے تو گاندھی جی حیران رہ گئے اور انھوں نے فرمائش کی کہ اس حکم کی اصل عبارت کو اس کے حوالے کے ساتھ نقل کر کے انھیں دیدیا جائے۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اس ملاقات کے بعد ڈابھیل واپس آئے اور انھوں نے اس حکم کو نقل کر کے گاندھی جی کے پاس بھیج دیا۔ اور گاندھی جی نے نمک تحریک سے متعلق اپنی کئی تحریروں میں اس کا حوالہ بھی دیا۔

اسی دوران مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے والد ماجد مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ آب ہوا کی ناسازی کے سبب ڈابھیل چھوڑ کر دیوبند چلے گئے تو مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ڈابھیل مدرسہ کے شعبۂ افتاء کے انچارج مقرر کئے گئے جہاں انھوں نے فتویٰ نویسی کی خدمات بڑی تندہی، انہماک اور محنت کے ساتھ انجام دینی شروع کیں۔ اسی فتویٰ نویسی کی خدمات کے دوران انھوں نے ایسی جائیدادوں کو نیلام میں خریدنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کو حرام قرار دینے کا فتویٰ جاری کیا جو حریت پسندی اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں ضبط کر لی گئی ہوں، اور جنھیں بعد میں نیلام پر اٹھایا گیا ہو۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں ڈانڈی مارچ تحریک کے سلسلے میں حکومت نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دے کر تحریک میں شامل لوگوں کی جائیدادوں کو ضبط کرنے اور نیلام کر دینے کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا، اس لئے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے اس فتوے کی بڑی دھوم مچی اور ہندوستان کی سبھی زبانوں میں اس کا ترجمہ لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ اس فتوے کی پاداش میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے بازپرس اور پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری

تھا ان کو مدن پکٹ کا اعلان ہوگیا اور یوں وہ ایک لمبی مدت کے لئے جیل خانے جانے جاتے رہ گئے۔

اس فتوے کے بعد ڈابھیل مدرسہ کی انتظامیہ نے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کے فتوی پر پھبتیاں لگانا چاہیں تو انھوں نے اپنے عہدے اور ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور کلکتہ چلے گئے۔ جہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات ہو گئے۔ ان کی کلکتہ کی سرگرمیوں میں درس قرآن بڑا مقبول ہوا جس میں شہر کے ہر طبقہ کے لوگ جوق درجوق شریک ہونے لگے۔ اس درس قرآن سے متاثر ہو کر کچھ متمول تاجروں کی مالی امداد سے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح نے دہلی آکر ادارہ ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھی اور قرول باغ میں اس کا دفتر قائم کرکے اس زمانے کے مشہور علماء و مصنفین پر مشتمل سچ مچ ایک علمی اکادمی قائم کردی جس کا ترجمان رسالہ برہان بھی جاری کیا گیا۔ دینی، تاریخی اور علمی موضوعات پر ایسی وقیع تصنیفات اور اہم کتابیں اس ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں کہ اس کا شمار ملک کے بہت زیادہ باوقار ادارے میں کیا جانے لگا۔

۱۹۴۷ء کے ان فسادات میں جو تقسیم ملک کے وقت شروع ہوئے اور جنھوں نے دہلی سمیت پورے شمالی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ندوۃ المصنفین کا قرول باغ کا دفتر بھی برباد ہوگیا اور اس کی کتابوں کا ذخیرہ بھی جو کئی لاکھ کی مالیت تک پہونچ چکا تھا، جل کر خاک ہوگیا لیکن مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے ہمت نہیں ہاری۔ اور انھوں نے اس صورت میں اس ادارے کو دوبارہ اس کی راکھ سے پیدا کیا کہ ان کے دوستوں اور رفیقوں میں سے ایک آدمی کو بھی اس کی احیاء جدید کا یقین نہیں تھا۔

آزادی کے بعد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح دہلی کی علمی، دینی، تعلیمی اور سیاسی زندگی کا مرکز بن گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور تمدنی سرگرمیوں کی

رہنمائی کا فرض ایسی شان اور دل آویزی کے ساتھ انجام دیا کہ وہ ایک دوسرے کی مخالف جماعتوں اور متصادم لیڈروں کے درمیان ثالث بالخیر کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ دہلی کے علاوہ پورے ملک کے تقریباً ہر بڑے اور اہم مسلم ادارے کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے اور ہندوستان بھر میں ان درجنوں اداروں کی میٹنگوں میں شرکت کا وقت نہ جانے کہاں سے نکال لیتے تھے۔ ان کے علاوہ اخلاق، صلح کن طبیعت، دردمندانہ مزاج، ہر اجنبی اور شناسا شخص کی تالیف قلب کے رویے نے ان کی شخصیت کو ایسی عظمت ایسی مقبولیت، محبوبیت اور ہر دلعزیزی کی بلندیوں تک پہونچا دیا تھا کہ بڑے بڑے قدآور لوگوں کے مجمع میں وہ سربلند نظر آتے، جو اُن سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ان کے طرز فکر میں پرانے صوفیوں کی صلح جوئی، اُن کے طرز عمل میں جلیل القدر عالموں کی شان اور ان کے ذہن و دماغ میں پرانے دانش وروں اور مدبروں کی جو خصوصیت پائی جاتی تھی اس نے انھیں اپنے عہد کی بے نظیر شخصیت بنا دیا تھا۔ ان کی وفات بلا شبہ پورے ہندوستان کا ایک ایسا علمی اور تہذیبی نقصان ہے جس کی تلافی کی کوئی شکل ممکن نہیں۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

دعا کی درخواست

جناب جمیل مہدی صاحب ایڈیٹر رسالہ برہان کی شدید و سخت علالت سے میں بہت پریشان ہوں۔ غالباً ایسا قلم لکھنے والا شاید اب دنیا میں دوبارہ جنم نہ لے سکے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ خصوصی اوقات میں صحت کاملہ کے لئے دعا فرمائیں۔

عمید الرحمٰن عثمانی

مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم کی یاد میں

از محمد ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ

۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے، راقم جامعہ دارالسلام عمرآباد کا طالب علم تھا، مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے کا شوق تھا، دو چار چیزیں اِدھر اُدھر چھپی بھی تھیں، کسی رسالہ میں علامہ جمال الدین افغانی مرحوم پر عربی میں ایک مضمون نظر پڑا، جو شام کے مشہور فاضل محمد علی کُرد مرحوم کے قلم سے تھا، میں نے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا اور "بُرہان" میں اس کی طباعت کی خاطر صاحبِ برہان مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔اے کے نام دہلی کے پتہ پر مراسلت شروع کر دی، جواب مولانا عتیق الرحمن صاحب کا لکھا ہوا جلد ہی وصول ہو گیا، یہ مولانا مرحوم کی ہستی سے میری غالباً پہلی شناسائی تھی، کچھ مدت تک یہ مراسلت جاری رہی اور میرے دل و دماغ پر مولانا کی شفقت کی چھاپ بیٹھ گئی ــــ اب مولانا کا پہلا مکتوب گرامی ملاحظہ کیجئے:

(۱)

۳ر دسمبر ۱۹۵۸ء

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کرم نامہ مولانا سعید احمد کے نام پہنچا، مولانا موصوف کا قیام کلکتہ میں ہے اور پتہ یہ ہے:

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پرنسپل کلکتہ مدرسہ، ۲۱ ویلزلی اسکوائر، کلکتہ ۱۶، مولانا دہلی سے "برہان" کے لئے "نظرات" تحریر فرماتے ہیں ــــ آپ کا مقالہ کتنے صفحوں پر مشتمل ہے؟ اس کا ترجمہ کسی دوسری جگہ تو نہیں شائع ہوا؟ مجھے یاد آتا ہے کہ کلکتہ کے کسی پرچہ میں "جمال الدین افغانی" پر عربی میں کوئی مضمون نکلا ہے وہ یہی مضمون تو نہیں؟ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا "برہان" میں طبع شدہ مضمون شائع نہیں ہوتا، اگر آپ یہ مضمون "برہان" کے معیار و طریق کار کے مطابق خیال فرماتے ہیں تو بھیج دیجئے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط

والسلام۔

عتیق الرحمن عثمانی ۔ ندوۃ المصنفین دہلی

جواب میں عرض کر دیا گیا کہ مضمون کہیں چھپا نہیں ہے، مضمون ملاحظہ کیجئے، بشرط پسند شائع کیجئے، مولانا مرحوم نے مضمون کی رسید ان الفاظ میں بھیجی:

(۲)

مکرمی، السلام علیکم

مضمون گرامی تھوڑی سی نظر ثانی کا طالب ہے، موقع ملے تو دیکھوں، علامہ جمال الدین پر مضامین چھوڑ مستقل کتابیں ہیں، جیسے "آثار جمال الدین افغانی" (قاضی عبد الغفار مرحوم) مضامین تو کتنے ہی نکلے ہیں، اب بھی ہند و پاک کے اخباروں میں آ رہے ہیں، بہرحال نظر ثانی کے بعد اشاعت کا فیصلہ کیا جائے گا، اغلب ہے کہ شائع ہوگا، امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ فقط

۵ رفروری ۵۹ء

والسلام

عتیق الرحمن عثمانی

ندوۃ المصنفین، دہلی

مولانا نے ازراہ کرم علامہ افغانی سے متعلق میرا مذکورہ بالا مضمون "برہان" میں شائع فرما دیا، جناب [illegible] کے ابتدائی پرچے ہیں، اس سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ میں نے لکھا کہ عربی سے ترجمہ کرنے کا شوق ہے، دفتر برہان میں ایسے کتابچے یا رسالے موجود ہوں جن کے مضامین کی اردو میں تلخیص مقصود ہو تو ناچیز اس خدمت کے لئے حاضر ہے۔ مولانا نے میرے اس خط کو کبھی درخور التفات سمجھا اور جواب سے سرفراز فرمایا:

(۳)

مخلصم مولوی ثناء اللہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ بہت دن ہوئے ملا تھا، میں ان دنوں باہر تھا، واپس آیا تو دوسری مصروفیتوں میں لگ گیا اور آپ کا خط ڈاک کے انبار میں رہ گیا، تاخیر جواب کے لئے معذرت خواہ ہوں، آپ کا ذوق علم لائق داد ہے، یہ بڑا قیمتی جوہر ہے، ایک زمانے میں دفتر میں مصر کے بعض معیاری ماہنامے "الہلال"، "المقتطف" وغیرہ آیا کرتے تھے اور "برہان" میں ان کے بعض مضامین کی تلخیص شائع ہوا کرتی تھی، مگر اب عرصے سے یہ سلسلہ بند ہے، کیونکہ روپیہ بھیجنے کی کوئی باقاعدہ صورت نہیں ہے، کوشش میں ہوں کہ یہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر جڑ جائے، ان دنوں صرف ایک پرچہ "صوت الشرق" آتا ہے جس میں غالباً "برہان" کے مطلب و معیار کی کوئی خاص چیز نہیں ہوتی، کوئی چھوٹی موٹی کتاب سامنے آ گئی تو خیال رکھوں گا، آپ اپنی مشق جاری رکھیں، مشق کی حد تک وہاں (عمر آباد میں) کتب خانہ میں بہت سی کتابیں ہوں گی، زبان کو زیادہ سے زیادہ صاف، دل پذیر اور سہل بنانے کی کوشش کیجئے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام۔

عتیق الرحمن عثمانی ۹ اپریل ۱۹۶۰ء
ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی

اس اثنا میں ڈاکٹر طہٰ حسین مرحوم کی ایک چھوٹی سی کتاب "قادة الفکر" نظر پڑی، فاضل مؤلف نے اس میں یہ بتایا تھا کہ فکر ونظر کی رہنمائی عہد بعہد مختلف طبقوں کے ہاتھ آتی رہی ہے۔ فلاسفہ، شعراء، علماء اور سیاست داں یکے بعد دیگرے اس منصب پر ہوتے رہے ہیں، اس ضمن میں مؤلف نے مختلف ملکوں کی تاریخ سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا تھا، مجھے یہ کتاب پسند آئی، استاذ محترم مولانا سید عبدالکبیر صاحب مدظلہٗ کی نگرانی میں "رہنمایان فکر" کے نام سے اس کا ترجمہ پورا کرلیا۔ پھر خیال ہوا کہ ماہنامہ "برہان" میں وہ قسط وار چھپ جائے تو اچھا رہے گا، مگر اندیشہ ہوا کہ مضمون بہت طویل ہے، برہان کے صفحات اس کے متحمل نہ ہوسکیں گے، پھر ڈھارس بندھی کہ طہٰ حسین مرحوم ہی کے طویل مضمون حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر مولانا عبدالحمید نعمانی کے قلم سے اردو میں منتقل ہوکر اسی برہان میں قسط وار شائع ہوچکے تھے۔ بہرحال برہان کی اسی نظیر کا حوالہ دے کر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سے خط کے ذریعہ درخواست کی کہ میرے ترجمہ کے لئے بھی "برہان" میں گنجائش نکالیں، مولانا نے جواب مرحمت فرمایا جو درج ذیل ہے:

(۴)

برادرم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! جواب قدرے تاخیر سے لکھ رہا ہوں، آپ منتظر ہوں گے، یہ معلوم ہوکر کہ آپ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، مسرت ہوئی، کام کئے جائیے، یہی وقت بننے کا ہے، "برہان" کے صفحات جیساکہ آپ کو معلوم ہے، محدود تر ہیں، یہی وجہ ہے کہ نعمانی صاحب کے مضامین کی طوالت پر بھی بعض اصحاب انگشت نما ہوئے تھے، چالیس پچاس صفحات ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں بھیج دیجئے، مضمون قسطوں میں حسب سہولت شائع کردیا جائے گا، "برہان" بہرحال اسی کام کے لئے ہے، دو ہی رسالے ہیں، "معارف" اور "برہان" جو اس طرح کے مقالات شائع کرسکتے ہیں، مقالہ

کیجیے سے پہلے نظرثانی اور نظرثالث ضرور ہونی چاہیے، ترجمہ زبان سے زیادہ مطابق سلیس اور رواں ہونا چاہیے، اسلوب کا خیال رہے، بعض اسالیب وہاں مستعمل ہیں، اردو میں نہیں، ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جائے اسی زبان کا اسلوب اور قالب اختیار کیا جائے، امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ میں آپ کے مقاصد کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

فقط والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ندوۃ المصنفین، دہلی

ترجمہ کی برہان میں اشاعت کی نوبت ہی نہیں آنے پائی تھی کہ میں نے اس کی کتابی شکل میں اشاعت کی بابت استفسار کیا، مولانا نے از راہ ذرہ نوازی جواب سے نوازا:

(۵)

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلے آپ ترجمہ پر نظرثانی، ثالث، رابع کرلیں اور جب اس کی صحت، اسلوب اور شگفتگی پر قلب مطمئن ہوجائے تو مسودہ یہاں بھیج دیں، مضمون کا ایک حصہ "برہان" میں ضرور آنا چاہیے، کون سا حصہ آئے، یہ آپ ہی متعین کریں، اس کے بعد ان شاء اللہ کتاب ندوۃ المصنفین یا مکتبہ برہان سے شائع ہوجائے گی، یاد رکھئے کہ پہلی چیز بہتر سے بہتر لانے کی سعی کیجئے، عجلت کی ضرورت نہیں، پہلی چھاپ کا اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے، اس بات کی پھر یاد دہانی کرتا ہوں کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جائے اس کا اسلوب پیش نظر رہے، نہ کہ اصل کا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ترجمہ کی حد تک ایک جملے کا ترجمہ درست ہی ہوتا ہے، اس کو غلط نہیں کہا جاسکتا، مگر جس زبان میں کیا گیا ہے اس میں وہ جملہ اس طرح

مستقل نہیں ہے، اس لئے مترجم کے لئے دونوں زبانوں پر، دونوں زبانوں کے محاورں پر، دونوں زبانوں کے طرز ادا پر عبور ضروری ہے۔ نعمانی صاحب جدید عربی کے بہت اچھے جاننے والے ہیں، مگر ان کو اردو کے محاوروں اور جملوں کے نظم و نسق پر اتنا عبور نہیں، اسی لئے ان کا ترجمہ اول درجہ کا ترجمہ نہیں رہا۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے، فقط والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۳ راگست ۱۹۶۰ء

اس کے بعد میں نے مولانا سے درخواست کی کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا پتہ دریافت کرکے لکھ بھیجیں تاکہ ترجمہ و طباعت کی اجازت حاصل کرلی جائے، مولانا نے حسب ذیل جواب تحریر فرمایا:

(۹)

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں ہے اور غالباً اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، آپ خط اس پتے پر بھیج دیں، پہنچ جائے گا کچھ بعید نہیں یہ مصنف ہی کا مکتبہ ہو۔

دار المعارف، قاہرہ، مصر

مضمون پر خوب خوب نظر ڈال لیئے، ہر نظر میں طرز تعبیر جان دار ہو جائے گا، اور یہ چیز آپ کے مستقبل کے لئے مفید رہے گی، جواب میں تاخیر ہو گئی، فقط والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین دہلی

۱۲ ستمبر ۱۹۶۰ء

عرفہ نفسی بفسخ العزائم والی بات پیش آگئی، انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے ذمہ داروں نے لکھا کہ کسی صاحب نے طٰہٰ حسین کی کتاب "قادۃ الفکر" کا ترجمہ کر دیا ہے اور وہ انجمن کی طرف سے طباعت کے لئے منظور ہوچکا ہے ـــــ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اس خبر سے طبیعت بجھ سی گئی، خیر، بات آئی گئی ہوگئی، ناچیز بھی جامعہ دار السلام عمرآباد سے فارغ ہوکر دائرۃ المعارف، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے وابستہ ہوگیا تھا اور اس کے شعبۂ تصحیح میں ملازم تھا، دائرۃ المعارف کے دار المطالعہ میں جو دراصل اسلامک کلچر نامی انگریزی رسالہ کا ایک حصہ تھا ایک عربی رسالہ نظر پڑا، دمشق کے المجمع العلمی کا ترجمان، اس میں شام کے مشہور فاضل شیخ محمد کرد علی مرحوم پر ایک سوانحی مضمون موجود تھا، میں نے اس کا ترجمہ شروع کر دیا، اس سلسلے میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے میرے عریضہ کے جواب میں ذیل کا مکتوب گرامی تحریر فرمایا:

(۷)

مخلص ومکرم جناب مولوی ثناء اللہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ پہنچا تھا، میں ان دنوں کلکتہ گیا ہوا تھا، واپس ہوا تو رمضان المبارک شروع ہوگئے، رمضان المبارک کے مشاغل جدا ہی ہوتے ہیں، چونکہ حافظ بھی ہوں، اس لئے زیادہ وقت تلاوتِ کلام پاک میں صرف ہوتا ہے، بہرحال تاخیرِ جواب کے لئے معذرت خواہ ہوں، یاد آتا ہے کہ شیخ محمد کرد علی پر میں نے کوئی مضمون کسی رسالہ میں پڑھا ہے مگر اس وقت بات پوری طرح یاد نہیں اگر یہ مضمون "المجمع العلمی" کے کسی تازہ نمبر میں آیا ہے تو یقیناً جدید ہوگا، بھیج دیجئے، ـــــ کیا کہوں، یہ سال ادارے پر سخت گذرا ہے اور اب بھی یہی صورت ہے، دشواری سے گاڑی کھینچی جارہی ہے، ترجمے کے لئے متعدد کتب سامنے ہیں، مگر وسائل کی کمی سے مجبوری ہے، ان شاء اللہ خیال

دیکھوں گا، آپ اب کیا کرتے ہیں؟ ترجمہ کی مشق تو فرصت ہی رہی ہوگی، یکسوئی بڑی چیز ہے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط

عتیق الرحمن عثمانی
۸ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ
مطابق ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء

میں نے یہ مضمون ترجمہ کرکے بھیج دیا، ایک عریضہ میں حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن مرحوم کی علالت پر تشویش کا اظہار کیا جو ان دنوں امریکہ میں زیر علاج تھے، مفتی صاحب نے جواب سے شاد فرمایا، جو میرے نام ان کا آخری مکتوب ہے:

(۸)

برادرم مخلصم جناب مولوی محمد ثناء اللہ صاحب دام مجدہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ مع مضمون ملا، ان شاء اللہ بوقت فرصت نظر ڈالوں گا، آپ حیدر آباد کب آئے اور وہاں کیا کر رہے ہیں؟ امید ہے کوئی بہتر مشغلہ ہوگا، مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب کی علالت کی نوعیت نے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا، بیالیس ۴۲ سال کے مخلص ترین دوست ہیں اور ملت کا قیمتی سرمایہ ہیں، میڈیسن (امریکہ) میں خاص اہتمام سے علاج ہو رہا ہے، خدا نے چاہا صحت کی توقع ہے، ابھی تک کسی خاص افاقے کی خبر نہیں ہے مرض پیچیدہ اور خوفناک ہے، رفتہ رفتہ آرام ہوگا، میں شکر ہے غنیمت ہوں، ان دنوں طبیعت ماندہ رہتی ہے، ادارے کی گاڑی بھی بہرحال چل رہی ہے، امید ہے آپ بخیر ہوں گے، فقط والسلام

عتیق الرحمن عثمانی
دفتر برہان، جامع مسجد، دہلی

۵ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ ۱۰ مئی ۱۹۶۲ء

خدا جانے کیا رکاوٹ پیش آگئی کہ میرا کردہ "علا" مضمون شائع نہیں ہوا، مگر مولانا کے شفقت آمیز اور نصیحت آمیز خطوط نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان خطوط میں بڑی ادبی خوبی موجود ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ در اصل ادبی اور علمی میدان کے آدمی تھے، مگر اپنی تمام صلاحتیں انتظامی اور تنظیمی امور کے لئے وقف فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے، جف القلم بما هو كائن۔

اتنی طویل مراسلت کے باوجود مدتوں ملاقات سے محرومی رہی، ۱۹۵۹ء کے اواخر میں عمر آباد سے ایک امتحان کے سلسلہ میں علی گڑھ جانا ہوا، دہلی بھی گیا، مفتی صاحب سے ملاقات کے لئے ندوۃ المصنفین میں حاضری دی، مگر دفتر کے ایک ملازم نے بتایا کہ مولانا آرام فرما رہے ہیں، مخل ہونا اچھا نہیں معلوم ہوا، واپس چلا آیا، پھر میرے قیام حیدرآباد کے زمانے میں مسلم مجلس مشاورت کے وفد کا لیڈی حیدری کلب میں بڑا شاندار جلسہ ہوا، ڈاکٹر سید محمود مرحوم، سندر لال وغیرہ تشریف لائے تھے، مگر مفتی صاحب نہیں آئے، اس طرح دیدار کی حسرت ہی رہ گئی۔

غالباً ۱۹۸۱ء کی بات ہے، ناچیز ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام عمر آباد سے وابستہ تھا کہ مولانا صاحب جامعہ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے عمر آباد تشریف لائے، مدتوں کی آرزو بر آئی، میانہ قد، قدرے خمیدہ، رنگت گندمی، سن سفید داڑھی، بڑے کم سخن، ٹوپی ایسی وضع کی اوڑھ رکھی تھی کہ بعض تصویروں میں مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اوڑھے ہوئے نظر آتے ہیں، میں کچھ دیر تک اسی خیال میں کھو گیا۔

خیال قد بلند تو می کند دل من
تو دست کوتہ من بیں و آستین دراز

مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا، مفتی صاحب مسجد میں تشریف رکھتے تھے،

اذان ہوئی، میں مفتی صاحب کی خوش الحانی کی بات کہیں پڑھ چکا تھا، درخواست کی کہ نماز پڑھائیں، مگر عذر فرمایا کہ طبیعت سست اور آواز پست ہے، آخر امامت اسی بے بضاعت کو کرنی پڑی۔

دوسرے دن جلسہ ہوا، مفتی صاحب کا تعارف مولوی حافظ ضیاء الدین نے کرایا، پھر مہمان خصوصی نے صدارتی تقریر فرمائی، ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے، طالبانِ علم نبوت کو بڑی اچھی اچھی نصیحتیں فرمائیں ——— اس دیرینہ نیازمند نے حسب عادت مصافحہ پر اکتفا کرلیا۔ پرانی مراسلت کا ذکر تک نہیں کیا۔ اخیر عمر میں مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم سے قومی پریس کے تابڑ توڑ حملوں کے باوجود بڑی بے باک قیادت کا ثبوت دیا۔

مردے از غیب بروں آید وکارے بکند

اللہ مرحوم کے درجات بلند کرے، آمین۔

مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر

رسمِ اجراء اور محفلِ علم و دانش

از عبد اللہ صدیقی ڈائریکٹر انڈو عرب پریس فیچرس انٹرنیشنل

رب العزت کا شکر ہے کہ طویل انتظار اور انتھک محنت کے بعد ماہنامہ برہان کا "مفکر ملت نمبر" منظر عام پر آگیا۔ یہ نمبر جلیل القدر علماء، صاحبِ طرز اہل قلم کے مقالات اور ارباب اخلاص و محبت کے تاثرات اور حضرت مفکر ملت کی حیات، خدمات، اخلاق و کردار کے تذکروں پر مشتمل ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ نقشِ اول اور خشتِ اول کی ہی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم نمبر بھی ان تمام گوشوں اور مضامین کو اپنے اندر نہ سمو سکا جو اس موقع پر ـــ حضرت مفتی صاحب کے انتقال کے بعد لکھے گئے ہیں اور ادارہ کو موصول ہوئے ہیں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اشاعت ان تمام لوگوں کی آرزوؤں کی تکمیل کی طرف ایک قدم ہے جن کے دلوں کی دھڑکنوں میں حضرت مفتی صاحب کے اخلاصِ بیکراں کے نقوش جلوہ گر ہیں، جو حضرت مفکر ملت کے ساٹھ سالہ دورِ خدمت اور جہد جہد و عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اور جن کی یہ خواہش و آرزو بار بار سامنے آتی رہی ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی عظیم و بلند مرتبہ شخصیت کے وہ سارے گوشے اور وہ تمام عملی گوشے اور ان کے اخلاق و کردار کے وہ

روشن نقوش محفوظ کر دیئے جائیں جن کی روشنی میں آنے والی نسلیں یہ دیکھ سکیں کہ ہمارے بزرگوں نے کس قدر سخت و ناگوار حالات اور سنگین و نازک صورت حال میں بھی ملت اسلامیۂ ہند کی مدبرانہ، دانشمندانہ اور بصیرت افروز انداز سے رہنمائی کی ہے۔

امید ہے کہ مفکر ملت نمبر کا مطالعہ کرنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے گا کہ وہ ایک ایسی ہستی کے حالات اور کارناموں کا مطالعہ کر رہا ہے جس نے اپنے عمل و کردار سے ایک روشن تاریخ مرتب کی ہے، ــــ ایک تاریخ جس کے سینے میں صبر و تحمل، فہم و تدبر، تبحر علمی، اخلاق و شرافت، اخلاص و للّٰہیت فکر و شعور، تفقہ فی الدین اور شریعت و طریقت کے نہ جانے کتنے ستارے جگمگ کر رہے ہیں ــــ ایک تاریخ جو عمل کی توانائی اور فکر و ذہن کو روشنی دے سکتی ہے ــــ ہاں ــــ! ایک تاریخ جو آج کے نفرت، تعصب، پھوٹ، خود غرضی، بے راہ روی اور عداوتوں سے لبریز ماحول کی تاریکیاں دور کرنے کا فرض انجام دے سکتی ہے اور دلوں سے فکر و شعور کے گوشوں اور ذہن کے پردوں سے اُن اندھیروں کو ہٹا سکتی ہے جن سے مایوسیوں اور حرماں نصیبیوں کی جھلک کیفیت پیدا ہوگئی ہے ــــ جس طرح مفکر ملتؒ سے ملاقات کرنے والا اپنے اندر ہمت و حوصلہ لے کر رخصت ہوتا تھا اسی طرح "مفکر ملت نمبر" کے مطالعہ سے بھی "یاس" کو "آس" میں بدلا جا سکتا ہے ــــ بشرطیکہ خود بھی میدان عمل میں قدم رکھنے کا ارادہ اور کچھ حوصلہ ہو اور ملت کی دردمندی کا تھوڑا بہت جذبہ دل میں موجود ہو ــــ!

قدرتی بات ہے کہ اس موقع پر وہ ساری خصوصیات ذہن کی سطح پر نمودار ہوں جن سے حضرت مفکر ملت کی ذاتِ گرامی عبارت تھی، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ملت کے بکھرے ہوئے عناصر کو یکجا کرنا، آپس میں دست و گریباں ہونے والے لوگوں کو ایک اسٹیج پر لانا، ملی و ملکی مسائل میں مختلف ذہن و فکر کے حامل لوگوں کو مل جل کر مسائل کا حل تلاش کرنے پر آمادہ کرنا

کتنا مشکل اور صبر آزما کام ہے یہ سب پر عیاں ہے مگر سوال یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے جس طرح ان تعمیری مقاصد کے لئے زندگی بھر پاپڑ بیلے، سخت محنت کی، ان کی سادگی و خلوص کا وہ انداز، استقامت اور عزم و حوصلہ کی پختگی کا وہ کوہ وقار، معاملہ فہمی اور دوسروں کے جذبات و احساسات کا پاس و لحاظ کرنے کا وہ طریقہ، ناگوار و تلخ حالات میں، ماحول کی شدت و گرمی میں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے، مسائل پر غور کرنے اور معتدل و متوازن فیصلے کرنے کا وہ اسلوب وہ طریق فکر و عمل، ہر فرد سے ہمدردی اور دل سوزی کا وہ جذبۂ بے کراں، وہ دردمندی وہ تڑپ کیا ہمیں یہ دعوت غور و فکر نہیں دے رہی ہے اور کیا یہ سب کا فرض اولین نہیں ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کے اس مشن کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں جس کو انھوں نے زندگی بھر اپنائے رکھا اور آخری سانس تک اس کی سعی، کاوش اور جد و جہد کرتے رہے کہ ملت کے تمام گروہ اور جماعتیں مسلک و مشرب کے اختلافات اور جماعتی گروہ بندیوں سے بلند ہو کر اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں اور اپنی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کے ذریعہ نہ صرف اپنی ملت کے افراد کی اصلاح و خدمت اور رہنمائی کا فرض انجام دیں بلکہ ملکی سماج کو بھی اصلاح و رہنمائی سے سدھارنے کی ذمہ داری کو پورا کریں، کیا شبہ ہے کہ اس وقت ملک کے اندر صورت حال تو تشویشناک ہے ہی مگر خود ہماری صفوں میں، ہمارے دینی اداروں میں، ہماری ملی تنظیموں اور افراد کے درمیان بھی حالات اس قدر تفرقہ انگیز و حسرت آمیز ہیں کہ یہ سے

آتش کدوں کا جوشِ غضب ہے شباب پر
مقتل سجے ہوئے ہیں بہ اندازِ دلنشیں

کا ہولناک منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور مستقبل کے لئے بھی کسی اطمینان بخش صورت کی کوئی ہلکی سی کرن دکھائی نہیں دے رہی ہے، ان اندوہناک اور فکر انگیز حالات میں یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ملت کے کچھ دردمند بزرگ، کچھ باحوصلہ افراد آگے آئیں اور اپنے اسلاف و بزرگوں

کی سیکڑوں سالہ محنتوں کو برباد ہونے سے بچانے کی سعی وکاوش کریں۔

آہ! کیا غضب ہے؟ کہ روحانیت کا وہ پُرعظمت قلعہ، ہزاروں اولیائے کرام کی محنت وکاوش اور خود امام طریقت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کی نیم شبی دعاؤں سے وجود میں آنے والا وہ ادارہ (دارالعلوم دیوبند) جو کل تک ایشیا میں مسلمانوں کی دینی وملی عظمت کا پروقار نشان اور علم وروحانیت کا ایک پرعظمت مرکز کیا جاتا تھا اور جس کی آغوش تربیت سے ہزاروں علماء وصلحاء، محدثین مفسرین اور واعظ وخطیب پیدا ہوکر نکلے اور دنیا کے گوشے گوشے میں دین ومذہب، رشد وہدایت اور درس وتدریس کی مسندوں کو روشنی بخشنے کا سبب بنے، وہی بلند مقام دینی ادارہ آج آپس کی رسہ کشی، اختلاف اور مقدمہ بازیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، سچ پوچھئے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مفکر ملت اور ایسے ہی سراپا اخلاص بزرگوں کی روحیں تڑپ رہی ہیں، اگر کسی کو وہ کان نصیب ہوں جو روح کی آواز کو سن سکیں، وہ دردمند اور روشن دل میسر ہوں جو اس درد وسوز کرب وتڑپ کو محسوس کرسکیں تو صاف محسوس ہوگا کہ آج حالات کا تقاضہ اور بزرگوں کی روحوں کی پکار ہے کہ اختلافات کی اس بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور مزید تباہیوں اور بربادیوں سے پہلے ہی کچھ اصلاح وعلاج کا سروسامان کرلیا جائے ــــ کیا اس وقت ملت اسلامیہ ہند کی کشتی حیات منجدھار میں ہچکولے نہیں کھا رہی ہے؟ اور یہ آواز فضاؤں میں، زمین وآسمان میں اور جو درو دیوار سے سنائی نہیں دے رہی ہے؟ کہ سے

اک کرب جانگداز ہے اور ناتواں سا دل
طوفاں ہے اور ایک شکستہ سی ناؤ ہے

اس موقع پر جب کہ ہمارے بزرگوں، دانشوروں، علماء اور رہنماؤں اور اکثر دینی اداروں کے سربراہوں نے حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ سے اپنی عقیدت وتعلق کا مظاہرہ

گیا ہے۔ ان کے طرز فکر و عمل کی ستائش کی ہے، ان کے مشن ـــــ اتحاد و اتفاق، باہمی ربط کا تذکرہ بھی تحریر و تقریر میں خوب خوب کیا گیا ہے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ادب و احترام کے ساتھ اکابر ملت کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی جسارت کریں کہ وقت اور حالات کی نزاکتوں اور دین و شریعت کے عظیم الشان مرکزوں کی زبوں حالی کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں ـــــ یہ دینی ادارے صرف ہمارے تعلیمی ادارے ہی نہیں ہیں بلکہ یہ مسلمانان ہند کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی حیات، ان کی بقا، ان کی سربلندیوں، ان کے عقائد و اخلاق بلکہ ان کے ایمان و یقین کی ساری کائنات ہی ان اداروں سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کا ادراک و احساس ہمارے ملی رہنماؤں، علمائے کرام اور ارباب صحافت سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے ـــــ؟

کاش ہم سب ہی اپنی مصروفیتوں میں سے وقت نکال کر اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے دینی ایوانوں اور روحانی مرکزوں کو بھسم کئے دے رہی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے شاندار ماضی، ہماری تاریخ اور عمل و کردار کا وہ تاج محل ہی زمین بوس ہوا جارہا ہے جس کی بنیادوں میں ہزاروں علمائے حق و اولیائے کاملین اور مخلصین ملت کا خون دل و جگر شامل ہے ـــــ!

آسمان علم و دانش کی کہکشاں

اکثر ارباب اخلاص اور عمید میاں کی دلی خواہش تھی کہ مفکر ملت نمبر کے اجراء کے موقع پر ایک سیمینار بھی کرلیا جائے جس میں حضرت مفتی صاحب کی شخصیت پر ارباب فکر و دانش اور اہل قلم حضرات تحقیقی و تفصیلی مقالات پڑھیں اور اس طرح حضرت مفتی صاحب پر ایک سنجیدہ علمی و تحقیقی کام کا آغاز ہو جائے جو ان کے شایان شان ہو، اور جس کے ذریعہ حضرت مرحوم کی حیات مبارک کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی جاسکے۔ اس مقصد

کے لئے سعید میاں نے کافی سعی و کاوش اور دوڑ بھاگ بھی کی مگر بخت و اتفاق کی دنیا ہی کچھ اور ہوتی ہے بالآخر کئی وجوہ کی بنا پر فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال سیمینار کو کسی اور مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے اور اس نمبر کے اجراء کے موقع پر اکابر ملت، دانشوروں، مفکروں اسکالرس اور ارباب فضل و کمال کا اجتماع کرلیا جائے، چنانچہ کافی انتظار کے بعد ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو دہلی کے مشہور و معروف پُرشکوہ ہال ـــــ ایوان غالب ـــــ میں ایک با وقار، سنجیدہ اور ایسا اجتماع منعقد ہوا جس میں دور و نزدیک سے بڑے بڑے علمائے کرام، دانشور، صحافی، ارباب سیاست، اہل ادب، دینی مدارس کے لائق احترام اساتذۂ کرام، دہلی کی مختلف ادبی انجمنوں، علمی اداروں کے سربراہ، سعودی عرب کے قائمقام سفیر محترم حافظ الموفق اور مصری سفارت خانہ کے اعلیٰ افسران اور راجدھانی کے ہر طبقہ کے معزز شہری شریک تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ علم و دانش، تاریخ و ادب، دین و شریعت، صحافت و سماج، سیاست اور تعلیم و تدریس غرض ہر میدان اور ہر طبقہ کے ارباب فضل و کمال اور اصحاب فکر و دانش اتنی بڑی تعداد میں جمع ہوگئے تھے کہ برادر محترم ڈاکٹر محسن عثمانی کے بقول ـــــ "آسمان علم و دانش کی کہکشاں ایوان غالب میں اتر آئی ہے۔"

آغاز

دہلی کی تاریخی مسجد فتحپوری کے امام حضرت قاری مفتی محمد مکرم صاحب نے تلاوت کلام پاک سے اس اہم اجتماع کا آغاز فرمایا ـــ کفیل الرحمٰن نشاط اور متین امروہوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا، ملک و ملت کے جانے پہچانے مخلص اور سرگرم رہنما محترم جناب یونس سلیم صاحب نے ہم خدام کی درخواست پر نظامت کے فرائض انجام دئے اور ابتدائی تقریر میں اجتماع کی غرض و غایت بیان فرماتے ہوئے حضرت مفکر ملت کو نہایت پر اثر

دلکش اجتماع اندازمیں خراج عقیدت پیش کیا اور ملک و ملت، علم و دین، شریعت و اخلاق اور مختلف گوشہ ہائے حیات میں ان کے کارناموں اور خدمات پر روشنی ڈالی۔

سچ ہے کہ اس اجتماع کو کئی ایک حیثیتوں اور وجوہ کی بناپر ایک منفرد و بے مثال یادگار اجتماع کہا جاسکتا ہے، سب سے اول تو یہ کہ ہماری تاریخ عزم وعمل، اور عالم اسلام کی فکری قیادت کے ایک روشن ستون اور موجودہ دور میں ملتِ اسلامیہ عالم کی کشتی فکر وعمل کے ناخدا مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم جیسی بزرگ و محترم شخصیت جو علم وفکر اور روحانیت کے روشن نقوش، اخلاق وشرافت اور وضعداری کے حسین وجمیل پیکر کی حیثیت سے نہ صرف برصغیر ہند وپاک میں ممتاز ہیں بلکہ عرب ممالک، ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں بسنے والے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دل کی دھڑکنوں میں جن کے لئے بے حد ادب واحترام کے جذبات موجود ہیں، اپنی گوناگوں مصروفیات، علالت، کمزوری وضعف کے باوجود اس اجتماع کی قیادت و صدارت کے لئے لکھنؤ سے تشریف لائے اور کئی گھنٹے (یعنی پروگرام کے اختتام پذیر ہونے تک تشریف فرما رہے۔ آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں حضرت مفکر ملت کو بھرپور موثر، اور باوقار و وقیع الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب کے ملت پر بہت زبردست احسانات ہیں، ان کا تقاضہ ہے کہ ہم ان کی تعلیمات اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوشِ اتحاد واتفاق پر چلنے کی سعی وکاوش کریں کیونکہ اپنے اسلاف اور بزرگوں کو فراموش کر دینا خود اپنی زندگی کو محرومیوں اور تاریکیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خاص طور پر حضرت مفتی صاحب کی چھوڑی ہوئی یادگار ندوۃ المصنفین، ادارۂ برہان، مسلم مجلس مشاورت کو ہر طرح قائم وباقی رکھنے بلکہ ترقی دینے کی جدوجہد اور کوشش کرنا ہم سب کا اولین عہد اہم ترین فریضہ ہے۔ آپ نے اس اجتماع کے انعقاد پر اظہار مسرت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ حضرات نے مجھ ناچیز کو یہ اعزاز

بخشا اور محبت کا معاملہ کیا اس کے لئے میں شکر گذار ہوں اور آپ لوگوں کو آپ کی کوشش کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔

جناب محترم یونس سلیم صاحب نے عزت مآب ڈاکٹر شنکر دیال شرما کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں نائب صدر جمہوریۂ ہند نے حضرت مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی جنگ آزادی کے دوران مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی خدمات ناقابل فراموش تھیں اور ان کا رول خاص طور پر مسلم عوام میں بہت اہم رہا ہے، انھوں نے محبت، رواداری، بھائی چارہ کا جو راستہ دکھایا ہے اس پر چلنا سب کے لئے ضروری ہے اور ہر محب وطن ہندوستانی کی طرف سے مفتی صاحب جیسے مادرِ وطن کے عظیم فرزند کو یہی بہترین خراج عقیدت ہوسکتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا کہ مسلم عوام پر مفتی صاحب کا بہت اثر تھا اور لاکھوں لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ دلی کے میئر مسٹر مہندر سنگھ ساتھی نے بھی اپنے پیغام میں حضرت مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ہمارے سرپرست و مربیٔ خاص حضرت محترم مولانا حکیم محمد زماں صاحب نے جو اس اجتماع میں شرکت کے لئے کلکتہ سے تشریف لائے تھے، ایک جامع، پرمغز پراثر مقالہ پڑھا جو ہر اعتبار سے منفرد، دلکش وجامع اور اہم مقالہ تھا اور حضرت مفتی صاحب کی زندگی، مہر و مروت، سادگی، عاجزی، تفقہ فی الدین، تبحر علمی پھر ان کے خاندانی حالات و خصوصیات سب پر محیط تھا۔ مقالہ کو تمام حاضرین نے بہت دلچسپی، احترام اور سنجیدگی سے سنا اور پسند کیا۔ (یہ مقالہ برہان کی اسی اشاعت میں دیا جارہا ہے)

عزت مآب ڈاکٹر حافظ الموفق قائمقام سعودی سفیر کی تشریف آوری

اس محفل علم و عرفان کے شہ نشین (ڈائس) کی رونق، تابانی، عظمت و رفعت میں ایک خوش اطوار، خوش مزاج، متبسم نوجوان کی دلکش و جاذب نظر اور پر وقار

شخصیت سے بھی مزید اضافہ ہوگیا تھا، حضرت صدر محترم کی بائیں جانب تشریف فرما یہ نوجوان تھے عالم اسلام کے روحانی، دینی جذبوں اور عقیدتوں و امنگوں کے امین و محور، حرمین شریفین سے مملکت سعودی عربیہ کے قائمقام سفیر محترم عزت مآب ڈاکٹر حافظ الموفق حفظہ اللہ۔

سچی بات یہ ہے کہ حرمین شریفین سے متعلق اور اس مرکز اسلام سے نسبت رکھنے والے کسی شخص بلکہ کسی ذرہ پر بھی نظر پڑجاتی ہے تو دل و دماغ ذہن و وجدان، شعور اور روح کی گہرائیاں جو مسرت، بشاشت اور تازگی محسوس کرتی ہیں ان کا اظہار لفظ و بیان زبان قلم کے بس کی بات نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہٗ مملکت سعودیہ عربیہ، شاہ فہد بن عبدالعزیز اور ان کی حکومت کو تمام خطروں، یورشوں اور حملوں سے محفوظ و مامون رکھے اور ہر طرح ترقیات عطا فرمائے، اس موقع پر موصوف کی تشریف آوری ہمارے لئے دلی مسرت و شادمانی، افتخار و اعزاز کا باعث ہوئی اور حضرت مفکر ملت کے جذبات اور اخلاص بے کراں کا ایک طرح اعتراف بھی ہوا ہے، حضرت مرحوم ہمیشہ عربوں اور خاص طور پر سعودی عرب کے معاملات سے گہری والہانہ وابستگی اور تعلق و ہمدردی رکھتے تھے۔

اسی طرح سفیر کبیر متحدہ عرب جمہوریہ مصر جو اس محفل علم و دانش کے مہمان خصوصی تھے موصوف اچانک حالات کی وجہ سے خود تشریف نہ لا سکے تو اپنے قونصل جنرل کو اپنا قائمقام بنا کر بھیجا اور ایک موقر بیان بھی حضرت مفتی صاحب اور مفکر ملت نمبر کے سلسلے میں ان کے ہاتھ ارسال فرمایا اور اپنے ملک کی ایک اہم علمی اور ادبی شخصیت کو بھی اجتماع میں شرکت کے لئے بھیجا، ہز ایکسی لینسی سفیر مصر کا یہ بیان، محترم ڈاکٹر محمد السعید صاحب نے پڑھا۔ جس میں حضرت مفکر ملت کی عظیم الشان خدمات کے ساتھ ساتھ مفکر ملت نمبر کے اجراء پر اظہار مسرت کیا گیا تھا۔

اس اجتماع میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے جانشین مولانا سالم صاحب قاسمی مہتمم وقف دار العلوم دیوبند نے نہایت عالمانہ انداز میں

تقریر فرمائی اور حضرت مفتی صاحب کو قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق ایک "مرد مومن" قرار دیا اور ان سے اپنے قدیم خاندانی تعلقات کا تذکرہ فرمایا۔ آپ کی تقریر کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا۔ اسی طرح مجلس مشاورت کے صدر محترم ممبر پارلیمنٹ سید شہاب الدین نے اس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک دانشور، ایک عظیم مفکر، ایک بزرگ رہنما اور سراپا اخلاص و شرافت عالم دین کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے گہر افشانی کر رہا ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی، مجلۂ اسلامی کے مولانا محمد شفیع مونس، سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سید اوصاف علی صاحب، مسٹر شفیع آگوانی وائس چانسلر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، مولانا عبد الحمید خلجی قائم مقام ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کی تقاریر بھی پسند کی گئیں۔ مفتی [illegible] بیگم حمیدہ قدوائی نے بھی تقریریں فرمائیں ——— ہمدرد خلائق محسن طب اور [illegible] کے بہت قدیم و مخلص رفیق عالی جناب الحاج حکیم عبد الحمید صاحب متولی ہمدرد [illegible] سے اس اہم نمبر کی رسم اجراء ادا ہوئی۔

دعا اور شکریہ

آخر میں حضرت صدر محترم نے دعا کرائی اور [illegible] سلمہ، نجیب الرحمٰن اور دیگر تمام متعلقین اور خود اپنی طرف سے حضرت صدر محترم [illegible] شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ جیسے سرکردہ ارباب فضل و کمال اور معزز و محترم [illegible] تعداد میں تشریف آوری ہم سب کے لئے مسرت، افتخار اور [illegible] ہم آپ کے شکر گذار بھی ہیں اور درخواست بھی کرتے ہیں کہ آئندہ بھی یہ محبت و شفقت [illegible] تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

ناشتہ و عشائیہ

عمید میاں نے اعلان کیا کہ کافی اور ناشتہ کا انتظام کیا گیا ہے [illegible]

سب حضرات اس میں شرکت فرمائیں، بعد نماز عشاء ندوۃ المصنفین میں ایک پر تکلف عشائیہ ترتیب دیا گیا جس میں بہت سے سرکردہ حضرات نے شرکت فرمائی۔

بحمد للہ یہ تمام پروگرام بحسن وخوبی انجام پذیر ہوئے اور تمام حضرات نے اس کامیاب پروگرام پر عمید میاں کو مبارکباد دی اور حقیقت یہ ہے کہ اس جد وجہد اور اس نمبر کی اشاعت اور سارے پروگرام میں جو محنت کی اس کے لئے وہ ہم سب ہی کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ناسپاس گذاری ہوگی اگر اس موقع پر ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا نہ کریں جنھوں نے [illegible] مقالات کی تحریر و ترتیب، رسم اجراء کے پروگرام اور دیگر تمام امور میں دست [illegible] اکادمی دلی کے جناب سید شریف الحسن نقوی، محترم [illegible] حکیم [illegible] حسین صاحب ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ ان [illegible] ارباب فکر و دانش، سفارت خانوں، دینی مدارس اور [illegible] سے رابطہ قائم کرنا، ان کو اجتماع میں آنے کے لئے مدعو کرنا [illegible] تعاون کے لئے ڈاکٹر محسن عثمانی (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) [illegible] بھی ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ ان سب [illegible] اپنے فضل وکرم سے نوازے اور بہترین اجر عطا فرمائے۔

[illegible] افسوس ہے کہ برادر محترم جناب جمیل مہدی اپنی شدید علالت کی وجہ سے [illegible] پروگرام میں شرکت نہ کرسکے اور مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنی مصروفیت کی [illegible] تشریف نہ لاسکے۔ یہ امر بھی افسوس ناک ہے کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے بعض بہت [illegible] کی تقاریر نہ کرائی جاسکیں۔

اورنگ زیب اور سیکولرزم

(۳)

عبدالرؤف ایم، اے اور ٹی کلاس

چنانچہ اُس کے عہدِ حکومت کے اواخر میں مغل طبقۂ امرا میں مرہٹوں کا تناسب دو اعشاریہ نو فیصد ہوگیا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے نصف اول میں مرہٹوں کا تناسب پانچ اعشاریہ پانچ فیصد اور نصف آخر میں سولہ اعشاریہ سات فیصد ہوگیا۔ اِن میں تین ہزاری اور اس سے بلند تر درجات کے منصب دار جو امراء اعظم کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے وہ یہ ہیں: راجہ ساہو پسر سمبھاجی ولد سیواجی سات ہزاری، سمبھاجی اور کانہوجی شرکے چھ چھ ہزاری، اَچلاجی نمبالکر، ناگوجی مانے، بہراجی پاندھرے، سوم شنکر، راناجی جنار دھن، جنکوجی، مالوجی، ستواجی دفلے، نیعقوجی (بعد از قبول اسلام محمد قلی خاں) پانچ پانچ ہزاری، جادون رائے دکنی، داماجی، ہرسوجی، یشونت راؤ، باجی چوان دفلے اور سیاجی چار چار ہزاری نیز دیگر چند مرہٹہ ساڑھے تین ہزاری اور تقریبًا تیرہ مرہٹہ تین تین ہزاری منصب دار تھے۔ سیواجی کے بیٹے سمبھاجی اور پوتے ساہو کے علاوہ اُس کے بعض دیگر خویش و اقارب بھی مغل ملازمت اختیار کیے، مثلاً مہادجی نمبالکر جو سیواجی کا داماد تھا، اورنگ زیب کے کمانڈر دلیر خاں کے ماتحت مغل منصب دار تھا۔ اِسے سمبھاجی کی ہمشیرِ خاص سکوار بائی عرف سکھو بائی

جو سیواجی کی بیوی سئی بائی کے بطن سے تھی، بیاہی گئی تھی۔ شرکے خاندان کے بھی کئی افراد اورنگ زیب کے منصب دار تھے۔ جبکہ شرکے سیواجی کے سسرالی خاندان کے افراد تھے۔ سیواجی کے داماد مہادجی کا باپ باجاجی نمبالکر بھی شاہی ملازمت اختیار کئے ہوئے تھے جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

گذشتہ سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ راجپوت اور مرہٹوں کو ملا کر اورنگ زیب کے منصب داروں میں ہندو امراء زبردست اکثریت میں تھے۔ کیونکہ اس کی حکومت کے نصف اول میں چار سو چھیاسی منصب داروں میں ایک سو پانچ یعنی اکیس اعشاریہ چھ فیصد ہندو تھے اور دوسرے دور حکومت میں پانچ سو چھہتر امراء میں ایک سو بیاسی یعنی اکتیس اعشاریہ چھ فیصد ہندو اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ گویا دونوں ادوار میں اوسطاً ستائیس فیصد ہندو امراء تھے۔ اس کے باوجود معاندین اس پر یہ الزام عائد کرتے رہتے ہیں کہ اس نے بیک جنبشِ قلم ہندوؤں کو سرکاری ملازمتوں سے موقوف کر دیا تھا۔ ہماری معلومات کی حد تک اس الزام میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ اس نے ۱۶۷۰ء میں صرف یہ حکم صادر کیا تھا کہ محکمۂ مالگذاری سے صرف وہ ہندو منشی (کلرک) دیوان اور عامل جو مرتشی (رشوت خور) ہوں اپنے عہدوں سے برطرف کر دیے جائیں۔ لیکن جلد ہی اس حکم میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ محکمہ مالیات میں نصف پیشکار ہندو اور نصف مسلمان رکھے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس فرمان کا مقصد صرف رشوت ستانی کا خاتمہ کرنا تھا نہ کہ کسی قسم کا تعصب و تنگ نظری۔ مؤرخ سر جدو ناتھ سرکار (متوفی ۱۹۵۸ء) معترف ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد محکمۂ مالگذاری کا سارا نظم و نسق رائے رایان رگھوناتھ[۵] کے سپرد تھا جو نہایت (نسبتاً دیانتدار) اور کاشتکاروں

ع۵ راجہ رگھوناتھ اولاً علامی سعد اللہ خاں شاہجہانی کے انتقال (۷ر اپریل ۱۶۵۶ء) سے ۷ر جولائی ۱۶۵۶ء یعنی اِس عہدہ پر میر جملہ کی تقرری تک، تین ماہ اور بعد ازاں ۱۶۵۷ء سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کا ہمدرد تھا، اورنگ زیب نے اُسے راجہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ لیکن جیسا کہ مؤرخ موصوف کی عادت ہے کہ ایک ہی سانس میں نہایت چابک دستی سے متضاد باتیں کہہ جاتے ہیں پس اورنگ زیب کی اس غیرجانبدارانہ پالیسی پر بھی سردست یہ اتہام عائد کر ہی دیا کہ راجہ رگھوناتھ جین حیات نائب دیوان ہی بنا رہا دیوان اعلیٰ کبھی نہ بن سکا۔ حالانکہ وہ عمر بھر دیوان اعلیٰ کے سارے فرائض انجام دیتا رہا[1]۔ لائق ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں پروفیسر نورالحسن صاحب وزیرِ مملکت برائے تعلیم رہ چکے ہیں، وہ محکمۂ تعلیم کو پوری طرح سنبھالے ہوئے تھے مگر موصوف وزیرِ کابینہ کبھی نہ بن سکے اور قارئین کرام کو یہ بھی یاد ہوگا کہ موصوفہ کی کابینہ میں ایک عرصہ تک کوئی مسلمان وزیرِ کابینہ کی حیثیت سے شامل نہ تھا۔ جناب سید میر قاسم صاحب کو وزیرِ کابینہ بنانے کے بعد ہی یہ خلا پُر ہوا تھا۔ راجہ رگھوناتھ رایان اور پروفیسر نورالحسن صاحب کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے غور طلب امر یہ ہے کہ جمہوری اور سیکولر ہندوستان کی حکمراں اور مطلق العنان فرمانروائے ہند کی کارکردگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اگر پروفیسر نورالحسن صاحب کے سلسلہ میں کوئی مناسب تاویل کی جاسکتی ہے تو یہ تاویل اورنگ زیب کے حق میں بدرجۂ اولیٰ کی جانی چاہئے کیونکہ وہ ایک مطلق العنان شہنشاہ تھا۔

اورنگ زیب کے ہندو امراء کی تعداد کے مذکورہ بالا اجمالی جائزے کے بعد اس بیان میں کیا صداقت باقی رہ جاتی ہے کہ "اکبر نے راجپوتوں کا تعاون اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر کے ان کو حسبِ لیاقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جین حیات (۱۶۶۳ء تک) نائب دیوان کی حیثیت سے اس اہم ترین محکمہ کے بلا شرکت غیرے تمام فرائض انجام دیتا رہا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو "مغل ایڈمنسٹریشن" ص ۱۱۳-۱۱۴ ہندی ایڈیشن، مطبوعہ ۱۹۶۰ء از پروفیسر جدوناتھ سرکار۔

اعلیٰ مناصب اور عہدے عطا کیے؀ اس کے برخلاف اورنگ زیب نے راجپوتوں سے عداوت پیدا کی اور انھیں نیز دیگر ہندوؤں کو شاہی ملازمتوں سے موقوف کر دیا۔" اور ڈاکٹر آشیرواد ی لال سری واستو سابق صدر شعبۂ تاریخ آگرہ یونیورسٹی نے اورنگ زیب کے بارے میں یہ کہکر اپنی بھڑاس نکالی ہے کہ "محمد علی جناح کے ماسوا اورنگ زیب جیسا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے اس ملک کے باشندوں کی دو اہم ذاتوں (ہندو اور مسلمانوں) میں تفریق کی خلیج کو اتنا وسیع کیا ہو۔ؔ"

سردست اورنگ زیب کے ہمعصر سیواجی کے مسلم افسران و ملازمین اور اس کی مذہبی پالیسی کے ضمن میں بھی اجمالاً عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کیونکہ اس کے بارے میں بظاہر یہ مشہور ہے کہ "وہ سرکاری ملازمین تفویض کرتے وقت مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتے تھے علی الخصوص انھیں فوج اور جہازی بیڑہ میں ذمہ دار عہدوں پر تعینات کیا کرتے تھے۔ تمام لوگوں کو بلا امتیاز مذہب وملت اس کی ملازمت حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم تھے۔ وہ ہندو سادھو سنتوں کے ساتھ مسلم بزرگوں کا بھی یکساں احترام کیا کرتے تھے مسلم رعایا کو مرہٹہ راج میں اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوئی خطرہ لاحق نہ تھا جیسا کہ اورنگ زیب کی کٹر مسلم حکومت میں ہندوؤں کے لئے تھا۔ اور اس (سیواجی) کی مذہبی پالیسی نہایت رواداری تھی۔" مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اس ہیرو

عہ گو یہ جداگانہ بات ہے کہ اس وسیع النظر جہاں امرائے اکبر کے امرائے اعظم میں ہمیں صرف ایک راجپوت یعنی راجہ مان سنگھ زمیندار انبیر ہی ہفت ہزاری منصب پر فائز نظر آتا ہے جبکہ "متعصب اور تنگ نظر" اورنگ زیب کے یہاں ہفت ہزاری منصب پر دو راجپوت (جے سنگھ و جسونت سنگھ) اور ایک مرہٹہ یعنی ساہو ابھرتا دکھائی دیتے ہیں۔

ی بکمال وتمام مدح سرائی کے باوجود سرجدوناتھ سرکار جس نے اورنگ زیب اور اس کے پہلو بہلو
سیواجی پر تحقیقی کام کرنے میں اپنی عمر عزیز کے تقریباً پچیس سال صرف کرکے تحقیق و تفحص کی
دنیا میں یقیناً ایک عظیم خدمت انجام دی، ہندو پد پادشاہی کے نمائندے شیواجی کی کثیر فوج
میں (جو دو لاکھ پانچ ہزار فوجیوں اور چھیانوے کمانڈروں پر مشتمل تھی) تلاش بسیار کے
باوجود صرف سات سو بیجاپوری سپاہ کے مفرور اور برخاست شدہ (Disbanded)
پٹھان فوجیوں کو ہی شمار کرا سکے اور کمانڈروں میں سیدی حلال اور نور خاں نیز امراء البحر
(Admirals) میں سیدی سنبل، سیدی مصری اور دولت خاں اور خارجہ سیکریٹری قاضی
حیدر کا نام ہی اپنی تصنیف کے اوراق میں ثبت کر سکے۔ لیکن سیواجی کے مسلم ملازمین کی یہ
فہرست یقیناً نامکمل رہے گی اگر ہم اس کے ذاتی خدمت گار فراش مداری مہتر کو شامل نہ کریں
فراش مداری مہتر کے تعاون سے ہی سیواجی آگرہ سے فرار ہوا تھا۔ بہرحال یہاں مداری مہتر
کی خدمات کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ بچہ بچہ ایک مہتر کے "فرائض منصبی" سے
بخوبی واقف ہے۔ قاضی حیدر کو عربی، فارسی جاننے کے سبب امور خارجہ کا انچارج بنایا
تھا (قاضی صاحب نے سمبھاجی کے عہد حکومت میں اس کے مظالم سے تنگ آکر شہنشاہ
اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کرلی تھی جہاں وہ دہلی کے قاضی القضاۃ بنائے گئے) عام
طور سے حکومتیں علوم وفنون اور تمام زبانوں کی سرپرستی کیا کرتی ہیں لیکن سیواجی کو فارسی
زبان سے انتہائی نفرت تھی اور اسے وہ غلامی کی علامت سمجھتا تھا لہذا اس نے سنسکرت زبان
کو اپنی سرکاری و دفتری زبان بنانے کے لئے رگھوناتھ پنت ہنومنتے کی سرکردگی و رہنمائی میں
پنڈتوں کی ایک جماعت سے "راج بیوہار" نام کا ایک فرہنگ تیار کرایا۔ اور فارسی کو اپنی حکومت
سے جلا وطن کر دیا گیا۔ بحری فوج کی سربراہی مسلمانوں کے سپرد کرنا سیواجی کی مجبوری تھی کیونکہ
آج تک برادرانِ وطن۔ بحری سفر کو مذہبًا "مہا پاپ" خیال کرتے تھے۔ جہاں تک مسلم بزرگانِ
دین کے احترام کا سوال ہے تو بقول مرہٹہ مورخ گووند سکھا رام سردیسائی ہمیں یہ تسلیم

کو سیواجی کیلسی کے بزرگ بابا یاقوت کو اپنا "دھرم گرو" مانتے تھے مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ نومبر ۱۶۷۹ء میں جالنا کے نواح میں شیخ جان محمد کی خانقاہ کو سیواجی تاراج کرتا ہوا نظر آتا ہے یہاں تک کہ اس خدا رسیدہ بزرگ کو ڈرایا دھمکایا اور ہتک آمیز سلوک کرتے ہوئے انھیں گالیاں تک دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی اِس بدسلوکی سے کبیدہ خاطر ہو کر شیخ علیہ الرحمۃ نے اُسے بددعا دی جس کے نتیجہ میں وہ (سیواجی) پانچ ماہ بعد ۴ اپریل ۱۶۸۰ء کو اپنی خانگی زندگی یعنی بیوی بچوں سے تنگ و عاجز آکر نہایت مایوس کن حالات میں اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا[۵۶]

دراصل سیواجی کی نگاہیں روزِ اول ہی سے ہندو دھرم کے عظیم احیائی منصوبہ پر مرتکز تھیں چنانچہ وہ نومسلموں کو حرص و طمع اور ترغیب و ترہیب کے ذریعہ از سرِ نو شدھی کر لیا کرتے تھے۔ بالاجی نمبالکر اور نیتاجی پالکر اس کی روشن مثال ہیں[۵۷]۔ وہ خود کو بقر (گاؤ) و برہمن کا محافظ و سرپرست خیال کرتے تھے جیسا کہ مفرور مغل منصب دار چھترسال بندیلہ سے دورانِ ملاقات اس کی جذباتی اور اشتعال انگیز گفتگو سے ثابت ہے[۵۸]۔ فی الحقیقت کچھ تو پیدائشی طور پر اور کچھ تربیتی اثرات کے تحت وہ اتنے متعصب اور کٹر قسم کے ہندو واقع ہوئے تھے کہ خود اپنے باپ شاہ جی کو محض اِس وجہ سے ناپسندیدہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ وہ رندولہ خاں کی ماتحتی میں بیجاپوری ملازمت اختیار کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ شاہ جی کی بیجاپوری سلطنت کے تئیں وفاداری اور خدمات کے پس منظر میں پیشواؤں کے اتہاس (۱۷۸۳ء) میں نانا فرنویس رقمطراز ہیں کہ "شاہ جی نے بھارت کو ایک مسلم ملک بنانے اور ہندو دھرم کے استیصال میں "ترکوں" (مسلمانوں کے لئے حقارت آمیز لفظ) سے تعاون کر کے جو ذلیل و کمینہ برتاؤ (آچرن) کیا وہ بھگوان کو بھی اچھا نہ لگا[۵۹]۔ بہر سو تمام تر تاویلات کے بعد بھی سرجدو ناتھ سرکار کو اپنے آنجہانی ممدوح کے اِس مذہبی کٹر پن (Orthodoxy) کے بارے میں یہ کہنا ہی پڑا کہ "سیواجی کے

سوراج کا آدرش جس مقدار میں (ہندو) کٹرپن پر منحصر تھا اسی تناسب سے اس کی تباہی اور
ت کے بیج اس میں مضمر تھے (In Propertion as Shivajis ideal
of a Hindu 'Swaraj' was based one orthodox)
it contained with in itself the seed of i
oren death". See 'Shivaji and his times', P.3
Sixn Edition, F. 1961)

اورنگ زیب کے امرا میں غیر مسلم منصب داروں کے اعداد و شمار کی وضاحت کے بعد اس
ایرانی امرا (شیعی) کے فیصد تناسب اور حیثیت پر بھی اختصاراً عرض کرنا ضروری ہے تاکہ
تیں وغیرہ تفویض کرنے کے سلسلہ میں اس کا نظریہ سیکولرزم قدرے وضاحت سے ناظرین
سامنے آسکے۔ اکثر ہندو مورخین نے اُسے 'ہندو کش' ہونے کے ساتھ 'رافضی کش' بھی بتلایا
نیز یہ کہ وہ انھیں بالعموم 'ایرانی غول بیابانی' کے الفاظ سے یاد کیا کرتا تھا اور انھیں شدید
ت اور حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک اہلِ تشیع اسلام دشمن لوگ
ہے اور یہ بھی کہ جنگ برادران میں اس نے اہلِ تسنن کو اہلِ تشیع کے بالمقابل کمربستہ اور
سرپیکار کر دیا تھا۔ لیکن اُس کے کل منصب داروں کے اعداد و شمار پر نظر کرنے کے بعد
تو یہ دعویٰ ہی قابل قبول ہو سکتا ہے اور نہ اس کی شیعہ دشمنی ہی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ
سموگڈھ (مئی ۱۶۵۸ء) ایک ہزاری اور اس سے بلند تر درجات کے ایک سو چوبیس
منصب داروں میں ستائیس یعنی اکیس اعشاریہ آٹھ فیصد ایرانی امرا اورنگ زیب کے

---

۵ ہندوی سوراج کی اصطلاح سیواجی نے اپنے اُس مراسلہ میں استعمال کی ہے جو انھوں نے دادا جی نرس پربھو
ارسال کیا تھا۔ دیکھئے "دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز" از ڈاکٹر سرندر ناتھ سین ص ۶ ط ۲
طبوعہ اکتوبر ۱۹۵۸ء۔

دفعدار تھے۔ ان میں چار کا منصب پانچ ہزاری اور اس سے بلند تر تھا، جن میں اُس (اورنگ زیب) کا ماموں امیر الامراء مرزا ابوطالب شائستہ خاں اور محمد سعید میر جملہ سات سات ہزاری ذات و سوار اور دو اسپہ سہ اسپہ منصب پر فائز تھے۔ یہ دونوں سموگڑھ کے معرکہ میں اورنگ زیب کے کمانڈر تھے۔ دوسری طرف شہزادہ بلند اقبال داراشکوہ کے ستاسی منصب داروں میں تیئیس (۲۶٫۴ فیصد) ایرانی تھے یعنی اورنگ زیب کے شیعی امراء سے صرف چار اعشاریہ آٹھ فیصد زیادہ۔

جنگِ وراثت میں اورنگ زیب کی مکمل فتح و کامرانی یعنی ۵ جون ۱۶۵۹ء کو اورنگ نشینِ عہ سلطنت ہونے کے بعد بھی ایرانیوں کی شاہی ملازمت میں تعدادی قوت اور مناصب و درجات پر کوئی اثر نہ پڑسکا اور ان کی حیثیت علیٰ حالہٖ قائم رہی۔ حکیم برنیر بھی اپنے سفرنامہ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ اورنگ زیب کے غیر ملکی امراء کا معتدبہ حصہ ایرانیوں پر مشتمل ہے۔ برنیر کے اس قول میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی کو دخل نہیں ہے کیونکہ اس کی حکومت کے نصف اول میں چار سو چھیاسی منصب داروں میں ایک سو چھتیس (تقریباً ۲۸ فیصد) ایرانی امراء تھے جبکہ تورانیوں (اہلِ تسنن) کی تعداد ستر سٹھ یعنی تیرہ فیصد ہی تھی۔ البتہ اس کے دورِ حکومت کے نصف آخر میں پانسو پچھتر منصب داروں میں سے ایرانی ایک سو چھبیس (تقریباً بائیس فیصد) تھے۔ اس معمولی تخفیف کا سبب اس کے آخری دورِ حکومت میں مرہٹوں کا شاہی ملازمتوں میں

عہ اورنگ زیب کی رسم تخت نشینی دو دفعہ عمل میں آئی۔ اول مرتبہ جنگ سموگڑھ کے بعد یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو۔ اس کا مادۂ تاریخ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم سے مستخرج ہوتا ہے اور دوسری مرتبہ ۲۴ رمضان ۱۰۶۹ھ مطابق ۵ جون ۱۶۵۹ء کو تکمیلی طور پر یہ رسم ادا کی گئی جبکہ وہ ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔

شمولیت تھا، جس کا اثر نہ صرف ایرانیوں بلکہ راجپوتوں، افاغنہ، ہندوستانیوں اور تورانی امراء کی تعداد پر بھی پڑا واضح ہو کہ شہنشاہ خود تورانی النسل تھا، باوجود یکہ دونوں وقفوں میں تورانی (سنی) علی الترتیب تیرہ اور بارہ فیصد ہی تھے۔ گویا تورانیوں کی تعداد اورنگ زیب کے پورے عہد حکومت میں پست ہی رہی۔ عصری سیاح ٹیورنیر کا بیان ہے کہ مغل مملکت میں ایرانی بلند ترین عہدوں پر تابعی ہیں۔ ٹیورنیر کا بیان مبنی بر صداقت ہے کیونکہ اورنگ زیب کے اول دور حکومت میں تیئیس ایرانی پنج ہزاری یا اس سے بلند تر منصب پر فائز تھے۔ جبکہ تورانی صرف نو ہی تھے اور دور آخر میں بلند ترین مناصب پر چودہ ایرانی تھے جبکہ تورانی صرف چھ۔ دراصل ایرانیوں کی بہتر پوزیشن قائم رہنے کے مختلف وجوہ تھے۔ اولاً دکن کی خود مختار شیعی ریاستوں کا مغل امپائر میں الحاق، جن کے شیعی امراء شاہی ملازمت میں شریک ہو گئے۔ ثانیاً ایرانی، تورانیوں اور افغانوں کی بہ نسبت زیادہ مہذب ہوتے تھے۔ افاغنہ (پٹھانوں) کو مغل تہذیبی اعتبار سے نہایت پست اور حقیر خیال کرتے تھے۔ شہنشاہ بابر کہا کرتا تھا کہ "یہ پٹھان بھی بڑے گنوار اور جاہل ہیں[۲۳]۔" ثالثاً اورنگ زیب اہلِ خواف (ایران کے صوبہ خواف کے باشندوں) پر نہایت اعتماد کیا کرتا تھا۔ اس دعوے کی تائید میں یہاں بخوفِ طوالت صرف سیرک سعید الدین احمد خافی کا نام پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ امیر موصوف کا شمار اورنگ زیب کے انتہائی معتمد علیہ امراء میں ہوتا ہے۔ کابل و دکن کے دیوان کے فرائض نہایت حسن تدبیر سے انجام دیئے [illegible] "بہشتی فرد" سے تاریخ وفات [illegible]

[illegible]

[illegible] دیگر نسلوں۔ [illegible]

[illegible]

شہنشاہ کے نہایت متشرع ہونے کے باوجود کوئی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب بادشاہ کے حضور عرض کیا گیا کہ بخشی الممالک (Pay Master General) شیعہ ہے تاہم اس نے کسی اور تقرر کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دور حکومت کی بیشتر مدت میں بخشی الممالک شیعہ ہی رہے۔ مثلاً سربلند خاں (م ۱۶۷۹ء) ۱۶۷۲ء میں بخشی دویم اور بعدازاں بخشی الممالک کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔ بعدازاں روح اللہ خاں پسر خلیل اللہ خاں جنوری ۱۶۸۰ء تا ۱۶۹۲ء اس اہم ترین عہدہ پر تعینات رہا۔ میر حسن خانزادگان عرف روح اللہ خاں ثانی جس نے ۱۷۰۴ء میں عین عالم شباب میں انتقال کیا، ۱۶۹۲ء میں بخشی دویم اور اپنی وفات کے وقت خانساماںؐ کے معزز عہدہ پر مقرر تھا۔ علاوہ ازیں مخلص خاں پسر صف شکن خاں متوفی ۱۷۰۱ء، بہرہ مند خاں متوفی ۱۷۰۲ء اور مرزا صدرالدین خاں صفوی (جو بہادر شاہ اول کے دور حکومت میں شاہنواز خاں کے خطاب سے مفتخر کیا گیا) بخشی گری کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۲۴۔ مزید برآں بہت سے دیگر ایرانی (شیعی) دوسرے اعلیٰ ترین اور بلند مناصب پر قابض تھے۔ مثال کے طور پر رعد انداز خاں جیسے ستناسیوں کی بغاوت کو فرو کرنے کے صلہ میں شجاعت خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔

ؐ مغل عہد حکومت میں خانساماں (High Steward) یا میر ساماں انتہائی اہمیت کا حامل عہدہ تھا جس کے تحت شاہی محل و حرم، مطبخ اور شاہی کارخانوں کا انتظام و انصرام نیز شہنشاہ کے ... کا ذمہ ہوتا تھا۔ وہ شہنشاہ کے سفر و حضر میں سایہ کی طرح ہمیشہ ... تھا۔ بادشاہ کا نجی عملہ بھی اسی کی ماتحتی میں اپنے فرائض انجام دیتا ... اعلیٰ (وزیر اعظم) کے بعد یہ دوسرے درجہ کا عہدہ تھا۔ چنانچہ یہ ... اور معتمد علیہ شخصیت کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو مغل ایڈمنسٹریشن ...

شمولیت تھا، جس کا اثر نہ صرف ایرانیوں بلکہ راجپوتوں، افاغنہ، ہندوستانیوں اور تورانی امراءؒ کی تعداد پر بھی پڑا واضح ہو کہ شہنشاہ خود تورانی النسل تھا، باوجود یکہ دونوں وقفوں میں تورانی (سنی) علی الترتیب تیرہ اور بارہ فیصد ہی تھے۔ گویا تورانیوں کی تعداد اورنگ زیب کے پورے عہد حکومت میں پست ہی رہی۔ عصری سیاح ٹیورنیر کا بیان ہے کہ مغل مملکت میں ایرانی بلند ترین عہدوں پر قابض ہیں۔ ٹیورنیر کا بیان بھی برصداقت ہے کیونکہ اورنگ زیب کے اول دور حکومت میں تیئیس ایرانی پنج ہزاری یا اس سے بلند تر منصب پر فائز تھے۔ جبکہ تورانی صرف نو ہی تھے اور دورِ آخر میں بلند ترین مناصب پر چودہ ایرانی تھے جبکہ تورانی صرف چھ۔ دراصل ایرانیوں کی بہتر پوزیشن قائم رہنے کے مختلف وجوہ تھے۔ اولاً دکن کی خودمختار شیعی ریاستوں کا مغل امپائر میں الحاق، جن کے شیعی امرا شاہی ملازمت میں شریک ہوگئے۔ ثانیاً ایرانی، تورانیوں اور افغانوں کی بہ نسبت زیادہ مہذب ہوتے تھے۔ افاغنہ (پٹھانوں) کو مغل تہذیبی اعتبار سے نہایت پست اور حقیر خیال کرتے تھے۔ شہنشاہ بابر کہا کرتا تھا کہ "یہ پٹھان بھی بڑے گنوار اور جاہل ہیں"[۳۳]۔ ثالثاً اورنگ زیب اہلِ خواف (ایران کے صوبہ خواف کے باشندوں) پر نہایت اعتماد کیا کرتا تھا۔ اس دعوے کی تائید میں یہاں بخوفِ طوالت صرف میرک معین الدین احمد خوافی کا نام پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ امیر موصوف کا شمار اورنگ زیب کے انتہائی معتمد علیہ امرا میں ہوتا ہے۔ کابل و دکن کے دیوانی کے فرائض نہایت حسنِ تدبیر سے انجام دیتے ہوئے میرک معین الدین نے ۱۰۹۵ھ میں رحلت فرمائی۔ "سید بہشتی شد" سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے[۳۴]۔

اورنگ زیب کے دورِ فرمانروائی میں ایرانی امرا کی حیثیت دیگر نسلوں، ذاتوں اور فرقوں کے بالمقابل بہتر و برتر ہونے کے باوجود سرجدو ناتھ سرکار فرماتے ہیں کہ ایرانیوں کے سلسلہ میں اورنگ زیب کا طبعی عدم اعتماد اس کے سارے امورِ جہانبانی میں مسلسل مانع رہا[۳۵]۔" لیکن اس کے برعکس تاریخی شواہد اور خود مورخ موصوف کی تحقیقات ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایرانی امراء کے بلند مراتب پر

شہنشاہ کے نہایت متشرع ہونے کے باوجود کوئی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب بادشاہ کے حضور عرض کیا گیا کہ بخشی الممالک (Pay Master General) شیعہ ہے تاہم آپ نے کسی اور تقرر کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دورِ حکومت کی بیشتر مدت میں بخشی الممالک شیعہ ہی رہے۔ مثلاً سربلند خاں (م ۱۶۷۹ء) ۱۶۷۲ء میں بخشیِ دوم اور بعدازاں بخشی الممالک کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔ بعدازاں روح اللہ خاں پسر خلیل اللہ خاں جنوری ۱۶۸۰ء تا ۱۶۹۲ء اس اہم ترین عہدہ پر تعینات رہا۔ میر حسن خانزادگان عرف روح اللہ خاں ثانی جس نے ۱۷۰۴ء میں عین عالم شباب میں انتقال کیا، ۱۶۹۲ء میں بخشی دوم اور اپنی وفات کے وقت خانساماںؑ کے معزز عہدہ پر مقرر تھا۔ علاوہ ازیں مخلص خاں پسر صف شکن خاں متوفی ۱۷۰۱ء، بہرہ مند خاں متوفی ۱۷۰۲ء اور مرزا صدرالدین خاں صفوی (جو بہادر شاہ اول کے دورِ حکومت میں شاہنواز خاں کے خطاب سے مفتخر کیا گیا) بخشی گری کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے[۲۴]۔ مزید برآں بہت سے دیگر ایرانی (شیعی) دوسرے اعلیٰ ترین اور بلند مناصب پر قابض تھے۔ مثال کے طور پر رعد انداز خاں جسے ستنامیوں کی بغاوت کو فرو کرنے کے صلہ میں شجاعت خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔

عہ مغل عہدِ حکومت میں خانساماں (High Stawards) یا میر ساماں انتہائی اہمیت کا حامل عہدہ تھا جس کے تحت شاہی محل و حرم، مطبخ اور شاہی کارخانوں کا انتظام و انصرام نیز شہنشاہ کی حفاظت کا ذمہ ہوتا تھا۔ وہ شہنشاہ کے سفر و حضر میں سایہ کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ بادشاہ کا نجی عملہ بھی اسی کی ماتحتی میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ دیوانِ اعلیٰ (وزیرِ اعظم) کے بعد یہ دوسرے درجہ کا عہدہ تھا۔ چنانچہ یہ عہدہ نہایت باثر اور معتمد علیہ شخصیت کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو مغل ایڈمنسٹریشن از پروفیسر سرکار۔

قلعہ اکبر آباد کا کمانڈنٹ اور پانچ ہزاری منصب دار تھا۔ اس کے کارہائے نمایاں سے عہد عالمگیر
کی تاریخ بھری پڑی ہے، یہ ۱۶۷۲ء میں افغانوں سے داد شجاعت دیتا ہوا کرم پا دڑہ میں
مارا گیا۔ عمدۃ الملک جعفر خاں اورنگ زیب کا وزیر (Chancellor) اور اس کا لڑکا کامگار خاں
۱۶۸۲ء میں عہدۂ خانساماں پر مامور تھا۔ عنایت اللہ جو اورنگ زیب کا مستلور نظر سکریٹری تھا،
۱۶۹۲ء میں دیوانِ تن اور ۱۶۹۹ء میں دیوان خالصہ کے عہدہ پر تعینات کیا گیا تھا۔ اسی طرح
موسوی خاں عرف مرزا معز فطرت ہم زلف اورنگ زیب ۱۶۵۸ء میں دیوانِ تن اور بعد ازاں
دیوان بنایا گیا۔ میر ملک حسین خاں خانِ جہاں کوکلتاش ظفر جنگ اورنگ زیب کے اعلیٰ ترین
امرار میں تھا جس نے ایک عرصہ تک دکن میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ حافظ محمد امین خاں
پسر میر جملہ جو نہایت غالی شیعہ تھا ۱۶۷۲ء سے اپنی وفات (۱۶۸۲ء) تک گجرات کا صوبیدار رہا
اور یہ زنگ امیر خاں پسر شائستہ خاں فاتح چٹ گام و آسام ۱۶۸۲ء سے ۱۶۹۲ء تک بہار کا گورنر
تھا۔ غازی الدین بہادر فیروز جنگ اورنگ زیب کے سپہ سالاروں میں امتیازی شخصیت
کا حامل تھا۔ ۱۶۸۵ء میں محاصرۂ بیجاپور کے دوران شہزادہ اعظم اور اس کی سپاہ کو نیست
نابود اور تباہ ہونے سے بچانا اسی فیروز جنگ کی حوصلہ مندی اور سوجھ بوجھ کا کام تھا۔
شہنشاہ اورنگ کے امیر عسکر اور مصاحب خاص عاقل خاں رازی کے بارے میں کچھ
تفصیل حاصل ہوگا کہ اس کی شخصیت سے تاریخ کا ابجد خواں بھی واقف ہے۔ اورنگ زیب
کے ہاں ایرانی امرار میں سات ہزاری منصب داروں کی تعداد چھ تھی جبکہ شاہجہاں
حکومت کے اواخر میں شاہی خاندان کے باہر سات ہزاری ذات و سوار کا معزز منصب
صرف تین امرار یعنی علی مردان خاں، سعید خاں اور اسلام خاں کو نصیب ہوا جن میں
اول الذکر ہی شیعہ تھا۔ آصف خاں کو جو نوہزاری ذات و سوار کا منصب دار تھا،
مستثنیٰ سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ شاہ جہاں کا خسر تھا جس نے شاہ جہاں کو اورنگ نشین
کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ اس کے برعکس رافضی کش اورنگ زیب کا

امراء میں شائستہ خاں، میر ملک حسین کوکلتاش، خانِ خاناں میر جملہ اور محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں عرف مہابت خاں سات سات ہزاری ذات وسوار اور دو اسپہ وسہ اسپہ نیز محمد ابراہیم اسعفاں اور عزیز الدین بہرہ مند خاں سات سات ہزاری ذات کے منصب دار تھے۔ اگر ان سات ہزاری امراء کی فہرست میں دکن کی شیعی ریاستوں کے مغل سلطنت میں انضمام کے بعد وہاں سے آئے ہوئے دو امرا نواب عبدالرؤف خاں میانہ[۳۳] عرف دلیر خاں اور سید مخدوم عرف شرزہ خاں بعد رستم خاں مہدوی[۲۹] کو بھی شریک کر لیا جائے تو یہ تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا شواہد کے پیش نظر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے Careers open to talent پر عمل کرتے ہوئے بلا امتیاز مذہب و ملت قابل لوگوں کے لئے شاہی ملازمتوں کے دروازے کُل طور پر کھول رکھے تھے جو اس کے سیکولر ہونے کی بین دلیل ہے۔ یہی نہیں شہنشاہ اپنے امراء کے رنج و راحت میں بھی برابر شریک رہتا تھا۔ بخشی الممالک روح اللہ خاں جب بستر مرگ پر آخری سانسیں گن رہا تھا تو بادشاہ بہ نفس نفیس اُس کی عیادت کو گئے اور اسے تسکین دیتے ہوئے فرمایا کہ انسان کو کسی حال میں بھی رحمت خداوندی سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، اپنی جو کچھ خواہش کو بتلائیے اُسے پورا کیا جائے گا۔ چنانچہ اُس کی حسبِ خواہش اورنگ زیب نے اُس کی اولاد کے ساتھ ہمیشہ نہایت فیاضانہ سلوک روا رکھا[۳۵]۔

(باقی آئندہ)

ہادیٔ عالم، محسن انسانیتؐ غیروں کی نظر میں

(۲)

محمد سعید الرحمٰن شمس، مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر

نپولین بونا پارٹ نے لکھا ہے:

"I Praise God and have reverence for the Holi Prophet Muhammad and the Holi Quran"

یعنی میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتا ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تعظیم وتکریم کرتا ہوں۔

ریلنڈ گیلام جو لندن یونیورسٹی کے پروفیسر تھے پیغمبر اسلامؐ کے تئیں یوں رقمطراز ہیں:

"At the out set let it be said that Mohammed (peace be upon him) was one of the great figures of

history whose over mastering conviction was that there was one God alone and there shold be one community of belivere this a bility as a statesman faced with problems of extra ordinrary complexity istruly amazing with all the Pover of armies policeand civil service no Arab has ever Snecceded in holding is country man together as he did"

یعنی ابتدامیں مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ میں عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کا یہ یقین کامل تھا کہ خالقِ کائنات یکتا وتنہا ہے اور مسلمانوں کی ایک ہی ملت ہونی چاہیئے انھیں غیر معمولی پیچیدہ مسئلوں کا سامنا تھا لیکن ایک مدبر اعظم کی حیثیت سے ان کی قابلیت یقیناً حیران کن ہے۔ کوئی بھی عرب اپنی فوجی پولیس اور سول سروس کی طاقت کے باوجود آج تک کبھی اپنے ہم وطنوں کو متحد رکھنے میں اس طرح کامیاب نہیں ہوا جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہوئے۔

ڈیل بائیون شینڈر اپنی کتاب (RELITIONS OF THEEST) میں لکھتا ہے:

"When Mohammed (peace be upon him)

died in 632. A.D. Virtually all of Assia his Under his Control Hehad Succeded in uniting his countrymen as had no other Aras sefore him in a century aftr the Joundimg of Islam the Jollowers of Mohammed seeme the Master of an empire greeter than that of Rome at its zenith."

یعنی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۶۳۲ء میں انتقال کر گئے تو لگ بھگ سارا عرب ان کے زیر نگیں تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو متحد کرنے میں اس طرح کامیاب ہوئے جس طرح کوئی بھی عرب ان سے پہلے کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اسلام کے وجود میں آنے کے بعد ایک ہی صدی میں حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ایک ایسی مملکت کے حکمراں بن گئے جو کمالِ عروج کے وقت کی سلطنت روم سے زیادہ بڑی اور وسیع تھی۔"

سر ولیم میور جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے سخت ترین نقادوں میں شامل ہے اپنی کتاب LIFE OF MOHAMMED میں یوں اعتراف حق کرتا ہے :

"THe first peculiarity then wich attracts our atten tion in the sus division of the Arass in to innom era sle Sedies ..... each independentof

of the others restless and of ten at war amongst them selves and e ven when united sy slood or sy intrest, ever ready on some insignift cant cause to separate and give way to an implaccble huslility thus at, the ern of Islam the retras peet of Arsian history exhibies, as in the kalidos cope, an ereverying stali of comsination and repulsion, such as had hitherro rendered asor live any attempt at a genral union The problem had let to se solved. by what force these tribes could se sued.ed or drawn to one common centere and it was solved by Mohammed (peacse upor him).

یعنی پہلی انوکھی بات جس کی طرف ہماری توجہ مبذول ہوتی ہے یہ ہے کہ عرب کے لوگ بے شمار قبیلوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے تھے جن میں ہر قبیلہ دوسرے

سے آزاد تھا، یہ قبیلے بے چین اور اکثر ایک دوسرے سے آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اور جب کبھی وہ رنگ، نسل، رشتہ یا باہمی مفاد کی بنا پر وہ متحد ہوتے پھر وہ معمولی بات پر جدا ہونے کو تیار رہتے تھے اور شدید دشمنی پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس طرح سے اسلام کے آغاز کے وقت عرب کی تواریخ پر نظر ڈالنے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ ہمیشہ تغیر پذیر اتصال اور نفرت کی حالت دوروں پر تھی جس نے اب تک انھیں متحد کرنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا اس مسئلہ کو حل کرنا ابھی باقی تھا۔ کون سی طاقت ان قبیلوں کو مسخر کر سکتی تھی یا ایک مشترک مرکز کی طرف کھینچ لا سکتی تھی، یہ مسئلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حل کر دیا۔"

دورِ حاضر میں ایک عیسائی عالم کے تاثرات :

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی جلد صفحہ ۴ پر لکھا ہے کہ بیروت کے ایک عیسائی اخبار "الوطن" نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں مذکورہ عالم نے لکھا:

"دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے کہ جس نے دس برس (مدینہ منورہ کی زندگی میں) کے مختصر زمانے میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا کی
اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ ایک اُمّی اور ناخواندہ تھے۔ وہ کون، حضرت محمد بن عبداللہ قریشی صلی اللہ علیہ وسلم

عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو انھوں نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود ہی مہیا کر دیے۔"

ڈاکٹر ہٹی (Hitti) مشہور مورخ، مفکر و مبصر جب قلم اٹھاتا ہے تو یہ الفاظ لکھنے پڑتے ہیں:

"Mohammed was sorn within the Aull Light of History"

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر مائیکل۔ ایچ ہارٹ مصنف "THE 100" نامی کتاب جس میں ساری انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے آدمیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے مصنف کے نزدیک تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ کتاب کا مصنف نسلی طور پر عیسائی اور تعلیمی لحاظ سے سائنس داں ہے مگر اپنی فہرست میں اس نے نمبر ایک پر نہ حضرت مسیح کا نام رکھا ہے اور نہ نیوٹن کا، اس کے نزدیک وہ شخصیت جس کے اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نمبر ایک پر رکھا جائے وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپ نے انسانی تاریخ پر جو اثرات ڈالے وہ کسی بھی دوسری شخصیت خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی نے نہیں ڈالے۔ مصنف نے آپ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"He Was the Only man in History Who Was Supremely Successfulan Soth the religious and Seculer level."

یعنی آپؐ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی۔

انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے پیغمبر اسلامؐ کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا تھا۔ مائیکل ہارٹ (امریکی) نے آپؐ کو ساری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی عظمت اتنی واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیرؤں کے ایک "عقیدہ" کی حیثیت نہیں رکھتی، وہ ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے اور ہر آدمی جو تاریخ کو جانتا ہے وہ مجبور ہے کہ اس کو بطور واقعہ تسلیم کرے۔

سنٹرل کلچرل اسلامک پیرس (centrel cultural Islamic Paris) کی طرف سے اسلام پر جو کتاب شائع کی گئی ہے اس کا نام ہے Intruduction of Islam Policetion کتاب میں پیغمبر اسلامؐ اور اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ نبی اکرمؐ کے تعلق سے کتاب میں لکھا گیا ہے:

"He sequethed to posterity, a religion of pure monutheism, he created a well disciplined stale out of the existent chaos and gave peace in place of was of every body ajainst every body else; he established a harmonious equilisrium set ween the spiritual and the temporal, set ween the

Mosqal and the citadel, he lezt a new system of law, Which dispensed imurliel justice in which even the head of the stali was as much a subject to it as any lomm oner and in which religious to learnance was so join it that nor Muslim in hasitants of Muslim Countries equally enjoyed Complete juridical, judicial and cultural outonomy Asove all, the prophet Mohammed (piece saupon him) Seme .nosl example and fully practised all that he taught to others."

یعنی انھوں نے آنے والی نسلوں کو خالص توحید کا مذہب ورثے میں دیا۔ آپؐ نے افراتفری میں سے ایک باقاعدہ اور منظم مملکت قائم کی اور ہر شخص کے خلاف ہر شخص کی لڑائی کی جگہ امن وامان دیا۔ آپؐ نے روحانیت اور مادیت اور مسجد و حصار کے درمیان موافق توازن پیدا کیا۔ آپؐ نے قانون کا نیا نظام عطا کیا جس میں بے ریا طریقہ پر انصاف مہیا ہوتا ہے اور جس میں سربراہِ مملکت

بھی ایک عام انسان کی طرح ہے اور جس میں مذہبی رواداری اس قدر عروج پر تھی کہ مسلم ممالک کے غیر مسلم باشندے کو بھی مکمل قانونی، عدلی اور تمدنی خود مختاری حاصل تھی؛ اس کے علاوہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پاکیزہ مثال قائم کردی اور خود بھی مکمل طور پر اس پر عمل کیا جس کی تعلیم انھوں نے دوسروں کو دی۔"

مذکورہ سنٹر کی طرف سے ایک اور کتاب "محمد رسول اللہ" شائع کی گئی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرت مقدسہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مصنف نے لکھا ہے:

"There are thousands books in different languages of the world on the biography of the founder of Islam, both by friends and foes. All agree unanimously that Mohammed (Peace be upon him) was a very great man, even if they do not like him on account of his religion being a rival to theirs. Those who have wilfully misrepres-ented him and there have been very many of them are in fact indirectly paying him homage;

They misrepresent him only because they are afraid that a true portrait of him would mistead their coreligionists. Whom they want to disuade from embracing Islam by telling them bareless stories about him. This sort of dishonest work is continuing even today. What is however amazing that inspite of the means and materials at the dispusal of modern west, this all out propaganda agunerent the person of Mohammad (peac Icse pon him) is not succeeding as if ought to have succeeded in the face of the printed word, spoken broad cost, and shown pictores. We do not know what will happen if Islam had at its dispusal the seme means and resources as

the christicn and commenist missionarries, but it is afact that Islam is spreading even in both the chris ticn and commun-ist west with astionishing rapi-dity. An the thirty years sinc - the end of second great was England bas built over a hondred musques; France is not ligging for behind, germiny thor. Conversions amung Amarican whires are not less. These converts are found among ambassadors, protessors, and mimbars of all imagaible pro-fessions. No, wounder hun-dreds of weshern foorists embrace Islam very year even in Islambol where religeons fervoor is not so great as in Anatohe »

یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر دوستوں اور دشمنوں
نے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہزاروں کتابیں لکھی ہیں یہ سب اس بات
پر متفق ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہت عظیم انسان تھے
اگرچہ وہ اس لئے اسے پسند بھی نہیں کرتے کہ آپؐ کا مذہب ان کے
مذہبوں کا حریف ہے، جن لوگوں نے دیدہ و دانستہ انھیں غلط رنگ
میں پیش کیا ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، وہ بھی درحقیقت
بالواسطہ طور پر انھیں خراج عقیدت ادا کر رہے ہیں، وہ انھیں صرف
اس لئے غلط رنگ میں پیش کر رہے ہیں کیونکہ انھیں خدشہ ہے کہ ان کی
صحیح تصویر ان کے مذہبی ہم خیالوں کو گمراہ کرے گی جنھیں وہ آپؐ کے متعلق
بے بنیاد کہانیاں بتا کر اسلام قبول کرنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ اس
قسم کے غدارانہ اور غیر دیانتدارانہ کام اب بھی جاری ہیں۔ لیکن یہ بات
حیران کن ہے کہ جدید مغرب کے پاس بے شمار ذرائع کے باوجود حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا شان کے خلاف یہ شدید پروپیگنڈہ اس طرح
کامیاب نہیں ہو رہا ہے جس طرح یہ اخباری اشاعت، نشریات اور تصویروں
کے پیش نظر ہونا چاہیئے تھا۔ اگر اسلام کے پاس بھی وہی ذرائع ہوں جو
عیسائی اور کمیونسٹ مبلغوں کے پاس ہیں تو ہمیں معلوم نہیں کیا کچھ واقع ہوگا
لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائی اور کمیونسٹ مغرب میں بھی اسلام حیران کن
سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تیئیس برسوں
میں برطانیہ میں ایک سو سے زیادہ مساجد تعمیر کی گئیں۔ فرانس اس بارے
میں پیچھے نہیں اور نہ ہی جرمنی کسی سے پیچھے ہے۔ سفید فام امریکیوں میں
تبدیلی مذہب کے واقعات کم نہیں۔"

اسلام قبول کرنے والے یہ لوگ سفیروں، پروفیسروں اور تمام قابل ذکر و تعلیم پیشوں کے ممبروں میں سے ہیں، اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ استنبول میں بھی جہاں مذہبی جوش اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ اناتولیا میں ہے ہر سال سینکڑوں مذہبی سیاح اسلام کے دائرے میں آتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اصلاحِ انسانی کی تاریخ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکتا اور بے نظیر انسان ہیں۔

"دنیا کی تمام مذہبی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"

بہر حال اوپر جو کچھ پیش کیا گیا احاطہ مقصود نہیں یہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہے اور مقصد یہ ہے کہ ع

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

ضروری اطلاع

ماہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانی نمبر شائع کیا گیا ہے اس لئے دسمبر کا شمارہ منسوخ کر دیا گیا۔

اس خصوصی شمارہ کی قیمت باسٹھ روپے ہے۔ آپ یہ زائد رقم ارسال کر دیں تاکہ آپ کو یہ نمبر دسمبر کے شمارہ کے بدلے میں روانہ کر دیا جائے

(ادارہ)

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمٰن عثمانی

جلد ۱۰۱ | جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق فروری ۱۹۸۸ء | شمارہ ۲

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگلو میں چھپوا کر دفتر برہان
اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

آہ جمیل مہدی

از محمد اظہر صدیقی

واحسرتا! کہ دل ہے بہت بے قرار آج
سینے میں چبھ گئی ہے کوئی نوکِ خار آج

دل میں درد ہے، روح مضطرب اور بے چین ہے، قلم پر لرزہ طاری ہے، زبان و بیان کی قوت دم بخود اور مردہ سی ہے، نبضِ حیات ڈوبتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے کہ میرے گذشتہ تیس سال کے قابلِ احترام بزرگ مگر بے تکلف رفیق اور ہمدم و دمساز۔ بھائی جمیل مہدی (مدیر روزنامہ عزائم لکھنؤ و ماہنامہ برہان دہلی) ۱۳ فروری ۱۹۸۸ء کی صبح کو ساڑھے سات بجے اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ وہ بیباک، بے خوف، جیالا بے باک و بے لاگ انسان، وہ صاحب طرز ادیب، وہ سراپا اخلاص و ایثار صحافی، وہ دوستوں کا دوست، اپنوں کا غمخوار، چھوٹوں کا مشفق و مربی، بزرگوں کی محفلوں میں باادب مگر بے لاگ انسان ہمیں چھوڑ گیا۔

جس کے دم سے قلم کی آبرو سلامت تھی، اردو صحافت کی عظمت قائم تھی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، غلام رسول مہر، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد عثمان فارقلیط کی پاکیزہ روایات کی پاسداری تھی، اردو میں دیانت دارانہ صحافت کا بھرم قائم تھا، آج کے خود غرضانہ ماحول، مفاد پرستیوں، ضمیر فروشیوں اور مصلحت اندیشیوں کے پُرہول سناٹے میں بھی جس کی ولولہ انگیز اور چونکا دینے والی تحریروں سے حق و صداقت کی بلند آواز گونج اٹھتی تھی، افسوس وہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی جس کی بدولت ملت کے زریں عہد اور شاندار

ماضی سے اس درماندہ، شکستہ اور چاروں طرف سے مہیب و مہلک خطروں سے گھرے ہوئے حال کی تاریکیاں، روشنی کی کرنیں، عمل کی توانائیاں فکر و بصیرت اور تجربوں کی تجلیاں حاصل کرتی تھیں۔

آج ملک وملت کے افق پر زبردست انتشار و افتراق اور سنگین و نازک صورت حالات کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں، ایسے خوفناک وقت میں جبکہ طرح طرح کے طوفانوں، سیلابوں اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ چاروں طرف سنائی دے رہی ہے جمیل مہدی جیسے بے لاگ، بے خوف اور بے لوث اور اس قدر دیانت دار اور زندہ کردار و ضمیر کے حامل صحافی اور عقیدہ کے پختہ اور روشن فکر کے حامل انسان کی شدید ضرورت تھی۔ مگر ؎

ضرورت جتنی جتنی بڑھ رہی ہے صبح روشن کی
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

جمیل مہدی نے انقلاب وحریت، علم وشریعت، دین وہدایت کے سرچشمۂ صافی۔ دیوبند کی تاریخی سرزمین پر جنم لیا، اس کی علم پرور فضاؤں میں عظیم و بے مثال علمائے کرام کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی اور یہیں قلم پکڑنا سیکھا، اپنی خداداد ذہانت، قدرت حافظہ، کثرتِ مطالعہ اور محنتِ شاقہ کے طفیل ابتدا ہی میں ادب و انشاء کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کرلیا، "نگار" جیسے شہرۂ آفاق ماہنامہ میں پہلی نگارش افسانہ کی شکل اور ان کے چھوٹے بھائی محزون نیازی کے نام سے شائع ہوئی، بمبئی کے ماہنامہ شاعر کے نائب مدیر اور روزنامہ جمہوریت کے مدیر کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، یہیں سے بحر ادب و انشاء کے اس شناور کا رخ سیاست کی راہوں کی طرف مڑ گیا، اُس وقت کی مشہور سیاسی شخصیتوں سے ربط وضبط پیدا ہوا، قلم اور ادب کی بڑی بڑی ہستیوں نے جمیل مہدی کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا، شکیل بدایونی، علی سردار جعفری وغیرہ سے بے تکلف دوستانہ تعلقات قائم ہوئے،

اس کے بعد بہت عرصہ تک دیوبند میں جما قیام رہا، یہیں سے ایک سہ روزہ اخبار "مرکز" جاری کیا جس کے انقلاب انگیز اداریوں نے ایوان حکومت میں تہلکہ مچا دیا، ۱۹۶۲ء میں ہم لوگوں نے دیوبند میں مجلس مشاورت قائم کی اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا منظور نعمانی، پنڈت سندرلال، مسٹر ایم این انور، جعفر امام، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور بہت سے اصحاب علم وفضل تشریف لائے، اس جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی اور تلاوت کلام پاک کے بعد بھائی جمیل مہدی نے ایک پر مغز طویل مقالہ پڑھنا شروع کیا ابھی مقالہ شاید نصف ہی پڑھا گیا تھا کہ جمعیۃ علماء کے ایک مخصوص گروہ کی طرف سے تخریب کاری کے مقصد سے بھیجے گئے کچھ لوگوں نے جلسہ میں ہلڑ بازی شروع کی، اس پر قابو پا کر دوبارہ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو پنڈت سندرلال نے ایسے پر اثر انداز میں تقریر فرمائی کہ مجمع تڑپ تڑپ اٹھا، لیکن اسی شرپسند گروپ کے کئی سو آدمی دارالعلوم دیوبند کے طلبار کے ساتھ دوبارہ بھیجے گئے اور لوٹ مار، پتھراؤ، آتش زنی کا وہ ننگا ناچ ناچا گیا کہ تہذیب وشرافت اور عدل وانصاف کے سارے تقاضے پامال ہو کے رہ گئے، حد یہ ہے کہ اکابر علمائے کرام مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی وغیرہ پر قاتلانہ حملوں کی کوشش کی گئی خاص طور سے حضرت مفتی صاحب کو نشانہ بنایا گیا اور ان کے سر اور جسم پر چوٹیں آئیں، اس جلسہ پر حملہ بلاشک دیوبند کی تاریخ وتہذیب کے دامن پر بدنما داغ تھا مگر اس واقعہ نے جمیل مہدی کو پورے طور پر سرگرم ہو جانے پر مجبور کر دیا، کچھ عرصہ کے بعد ہی وہ لکھنؤ بلائے گئے جہاں روزنامہ قائد میں بحیثیت مدیر کام شروع کیا، کچھ عرصہ بعد قائد کی ادارت چھوڑ کر ندائے ملت سے وابستہ ہوئے اور پھر ۱۹۶۹ء میں خود اپنا ہفتہ وار اخبار عزائم جاری کیا جس کو دس سال کے بعد روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا، حقیقت یہ اخبار جمیل مہدی کے خونِ دل وجگر سے سینچا ہوا ایک ایسا پودا ہے جس کی حفاظت، بقا اور ترقی کی ساری ذمہ داریاں ان کی وفات کے بعد اب ان لوگوں کے کاندھوں پر آ گئی ہیں جن کو اردو صحافت کی صحت مند روایات، ایماندارانہ اظہار خیال، بے لاگ تبصرے

اور ملک و ملت کے مسائل پر شعور و تجربہ کی پختگی کے ساتھ دیانتدارانہ اظہار خیال سے دلچسپی ہے اور جن کو جمیل مہدی سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔ یہ ہی ان کی روح کو بہترین نذرانۂ عقیدت ہے۔ خدا کرے عزائم زندہ رہے، باقی رہے، ترقی کی منزلیں طے کرے اور ملک و ملت کی خدمت و رہنمائی کا فرض انجام دیتا رہے، رب کریم دکارساز مسٹر حسام صدیقی، عزیز عدیل مہدی سلمۂ اور دوسرے اراکین ادارہ عزائم کو حوصلہ، ہمت اور استقامت عطا فرمائے اور ان کو عزائم کی بقا کے لئے قدم قدم پر کامیابیوں اور اپنی نصرتوں سے نوازے۔ (آمین)

جمیل مہدی صرف ایک نثر نگار، صرف ایک صحافی اور صرف ادیب ہی نہ تھے بلکہ وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ اور ہماری ان روایات اور قدروں کے ترجمان، نشان اور علامت تھے جو ہماری تاریخ ملی کی جان، آبرو اور وقار ہیں۔ وہ بہت لکھتے تھے، بے تحاشہ اور بے تکان لکھتے تھے مگر اس کے باوجود بہت خوب بلکہ خوب تر لکھتے تھے، ان کی تحریروں میں بلکہ ان کی رگ رگ میں ملت کا درد بے کراں، بے پایاں اور گہرا درد موجود تھا۔ سوز و تڑپ کی ایک جانگداز کیفیت سے فکر و احساس اور شعور و جذبات معمور تھے۔ ان کے قلب و دماغ اور عزم و حوصلہ نے کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے کسی طرح اور کسی قیمت پر مرعوب ہو جانا سیکھا ہی نہ تھا، اصولوں پر سمجھوتہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی ریب و ریا سے کوسوں دور اور مصلحت اندیشی سے پاک تھی، ان کا قلب ایسا صاف و شفاف آئینہ تھا جس میں بھلے برے، کھرے کھوٹے، سچ اور جھوٹ کا عکس نمایاں طور سے دکھائی دیتا تھا۔

اکابر دیوبند، علمائے کرام مثلاً شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح، مولانا عبیداللہ سندھی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حکیم الاسلام

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور دوسرے بزرگوں سے ان کا تعلق ہمیشہ ادب و احترام رہا اور ان ہی بزرگوں کے سایہ میں ان کے فکر و شعور کی نشوونما ہوئی۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر جو اداریہ انھوں نے عزائم میں لکھا تھا وہ ان کے تعلق خاص کے ساتھ ساتھ حق پسندی، بے باکی، آزادیٔ فکر اور ان کے مخصوص اسلوب نگارش کا عظیم خوبصورت، پُراثر نمونہ تھا، حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے ان کے والد بزرگوار کا بھی تعلق رہا اور مرحوم بھائی جمیل مہدی بھی حضرت مفتی صاحب سے بہت قریب تھے، یہ ہی قربت و عقیدت تھی کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کے انتقال کے بعد سے وہ برہان کی ادارت بڑے خلوص کے ساتھ کر رہے تھے، ان کی وفات راقم الحروف کا ذاتی صدمہ اور نقصان تو ہے ہی لیکن قبلہ مفتی صاحب کی علمی امانت (جس کی حفاظت و بقا ہم تمام خدام ہی کا فریضہ ہے) یعنی ماہنامہ برہان کو بھی اس سے زبردست دھکا لگا ہے، برادر عزیز عمید الرحمٰن سلمہٗ پر اس حادثہ کا قدرتی طور پر بہت اثر ہے، حق تعالیٰ شانہٗ ہم کو اس علمی یادگار 'برہان' کی خدمت و حفاظت کی توفیق بخشے اور ہماری مدد فرمائے۔ آمین۔

جیسا کہ قارئین کے علم میں آچکا ہوگا کہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں دمہ کے شدید و پریشان کن اور پرانے عارضہ کے علاج کے لئے ان کو بلرام پور ہسپتال (لکھنؤ) میں داخل کرایا گیا لیکن جب دیکھا گیا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہے تو ڈاکٹروں کے مشورہ سے انھیں دہلی لایا گیا، چند روز کے علاج کے بعد کچھ افاقہ بھی محسوس ہونے لگا تھا مگر ۱۲ر فروری کو قلب کا دورہ پڑا تو ان کو رام منوہر لوہیا ہسپتال میں منتقل کیا گیا اور ۱۳ر فروری کی صبح کو ساڑھے سات بجے اچانک وہ آواز بند ہوگئی جس کی گھن گرج سے بڑے بڑے

(باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

مولانا واصف دہلویؒ

(ایک تاثر)

ڈاکٹر گلزار نستعلیق دہلوی

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی
(گلزار دہلوی)

مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی مرحوم بھی ہمیں چھوڑ کر مغفور ہوئے۔ اردو اور دلّی ایک اور مایۂ ناز سپوت سے محروم ہو گئی۔ وہ ایسے خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس نے بیسویں صدی میں دینی بصیرت، ملی دردمندی، علمی سیرابی، ادبی و لسانی تزئین و تدوین اور ملک و قوم کی وطن پرستانہ، مشترکہ اور جمہوری روایات کو خونِ جگر اور خونِ قلم سے یکساں مزین کیا تھا۔

مولانا واصفؒ، ابوحنیفۂ ہندی، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ مفتی کفایت اللہؒ نے نہ صرف مسلمانوں میں اسلام کو سنوارا، نکھارا اور ابھارا، اور مسلمانوں کی عام پسماندگی، جہل و لاعلمی، توہمات، اور

شرک و بدعت کو دور کیا، اور کتاب و سنّت کو اور قال اللہ اور قال الرسولؐ کو، قرآن اور احادیث نبویؐ کو عام فہم انداز میں، صحیح صحیح عوام تک پہنچایا بلکہ اپنے سیکڑوں ہندو اور غیر مسلم عقیدت مندوں کو اپنے علم و کردار سے متاثر کیا اور بیشتر سیاسی سماجی، معاشرتی، جماعتی اور قومی موضوعات پر آگاہ، آسودہ اور قائل و معقول کیا۔

آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے اُن جانشینوں اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو، تمام دنیائے اسلام کو اور مغربی فرنگیوں اور برطانوی سامراج کو یہ بتایا کہ "ملّت بنتی ہے دین سے، اور قوم بنتی ہے ملک سے" اور حُبّ الوطنی جزو ایمان ہے مغربی برطانوی سامراجی استبداد سے لڑنا، برادرانِ وطن کا ساتھ دینا، اور راسخ العقیدہ مسلمان رہنا، اس میں کوئی تضاد یا ٹکراؤ نہیں ہے۔ انھوں نے بہ بانگ دُہل کہا کہ ہم سچّے پکّے مسلمان بھی ہیں، سچّے پکّے وفاکیش ہندوستانی بھی ہیں اور سچّے پکّے انسان بھی ہیں۔ عالمگیر امن، جہانگیر دوستی اور آفاقی اخوت کے جذبہ کے ساتھ غلامی سے نجات پانا اور ساتھ ہی ساتھ سچّے دین کی تعلیم کو عام کرنا اُن کا منشور اور تعلیم کا نچوڑ تھا۔

اسی لئے مفتیٔ اعظم ساری زندگی اسلام اور انسانیت کی فلاح کے لئے بھی کام کرتے رہے، سامراج سے ٹکراتے بھی رہے، قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلتے رہے اور انڈین نیشنل کانگریس، جمعیۃ العلمائے ہند کے لئے یکساں و مساوی تگ و دو بھی کرتے رہے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

وہ اس کی سراپا مصداق و مثال تھے۔ علم فقہ میں اُن کا ثانی نہ تھا۔ وہ بے مثال مجتہد اور فقیہہ اعظم تھے۔ سیاسی شعور اور سُوجھ بُوجھ کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۱۸ء سے تقریباً ۱۹۴۲ء تک وہ اے آئی سی سی کی اکثر تجاویز، منشور، اور کارروائیاں بے ساختہ اور برجستہ اور قلم برداشتہ پہلے اردو میں تحریر فرماتے تھے، پھر اس کے انگریزی اور دیگر زبانوں میں تراجم کیے جاتے تھے۔

عالم اسلام میں جب "سعودی عرب" دنیا کی سب سے بڑی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تو بڑے بڑے عالم اسلام کے عرب و عجم کے علمائے دین، اور اکابر نیز جلالت الملک پاسبان حرمین شریفین، شاہ عزیز السعود بھی آپ کی پیشوائی کو کھڑے ہو گئے اور آپ کو مسند صدارت پر اپنے قریب جگہ دی۔

آپ نے ساری زندگی شریعت کے عین مطابق اور سیرت و سنتِ رسول ؐ کے عین موافق گذاری، محنت اور اکلِ حلال سے زندگی گذاری۔ مدرسۂ امینیہ کی بنیاد رکھی، کتب خانہ رحیمیہ قائم کیا، اور لاتعداد عالم دین اور مجاہدین قوم پیدا کیے۔

اُن کے جانشین و فرزند تھے حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی، مولانا واصفؒ شعر و سخن میں ابوالمعظم نوّاب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی جانشین و دامادِ داغ کے شاگردِ رشید بلکہ جانشین تھے۔ عربی و فارسی کے منتہی تھے، صرف و نحو، زبان و ادب، عروض و قوافی، معائب و محاسنِ سخن، روزمرہ، محاورات اور ٹکسالی اردو و ٹھیٹھ بولی پر قادر تھے۔

اپنے استاد نواب سائل سے شستہ مذاقِ سخن، شئے لطیف، ذوقِ جمالیات زبان کی شوخی و چونچلے اور فنِ شاعری کا بھرپور اکتساب کیا۔ آپ کی عربی دانی اور مذہبی و دینی شغف، کبھی آپ کی شاعری میں زاہدِ خشک اور کٹر ملّاپن لے کر داخل نہ ہو سکا۔ آپ اسس معاملے میں وسیع المشرب، روشن دماغ، کشادہ ذہن، رواداد

اور وسیع القلب واقع ہوئے تھے، اپنی ذات سے ہمہ صفت موصوف، بااخلاق، مرنجاں مرنج، گوشہ نشین وکم آمیز، کم گو اور شریف الطبع انسان تھے۔ دین کے طالب علموں کی دینی پیاس بجھاتے اور فرصت کے اوقات میں ادب کی تخلیق کرتے۔ شعر کہتے، مضامین سپردِ قلم کرتے، زبان کی اغلاط اور اصلاحوں پر توجہ دلاتے۔ تلفظ، لب ولہجہ لغات کا صحیح محلِ استعمال، محاورہ کا برمحل و بامزہ برتنا، اور مروجہ محاورے، روزمرہ سلاست وفصاحت کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے رہتے تھے۔ املا، انشا، عبارت آرائی، فعل، فاعل، مفعول کا مناسب جگہ استعمال و ترتیب، حاصل مصدر اور صفات کا موزوں سیاق اور قرینہ، زبان، محاورے، اور الفاظ کے تابع مہمل اور ماقبل ومابعد برجستگی پر ان کی گہری نظر تھی جو وہ کبھی کبھی اپنے مضامین میں لکھ کر زبان کے طالب علموں اور ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کی اصلاح وتنظیم کا بھی فریضہ انجام دیتے رہتے تھے۔

انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش میں اور جملہ وہمہ گیر دینی ودنیوی نشوونما میں، عربی وفارسی کے ساتھ ساتھ، انگریزی، اردو اور ہندی کو مساویانہ اہمیت اور جگہ دی۔ اپنے اسلاف کے سرمایہ سے بھی انھیں مالا مال کیا اور موجودہ معاشرے کے جدید تقاضوں سے بھی آگاہ رکھا اور جدید تعلیم سے بھی آراستہ و پیراستہ کیا۔

مدرسۂ امینیہ کی ذمہ داری کے بعد تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی منہمک اور مشغول رہے۔ بے شمار دینی، ادبی اور تہذیبی کتب ترتیب دیں اور نشر واشاعت سے بھی غافل نہ رہے۔

آپ کی زبان مستند اور فصیح تھی۔ داغ اسکول کے عظیم نمائندہ تھے۔ زبان میں داغؔ، بیخودؔ، سائلؔ، نوحؔ اور علامہ زارؔ کو اپنا آئیڈیل یا آدرش سمجھتے تھے۔

مولانا واصف دہلوی کی چند مقبول تصانیف و تالیفات مندرجہ ذیل ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

۱۔ کفایت المفتی کامل نو جلد (مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کے فتاوی کا مجموعہ)
۲۔ مفتیٔ اعظم کی یاد
۳۔ درس الاسلام (منظوم تعلیم الاسلام)
۴۔ اردو مصدر نامہ
۵۔ سہ لسانی مصدر نامہ
۶۔ زرگل (مجموعۂ کلام واصفؒ)
۷۔ ادبی بھول بھلیاں (تحقیق و تنقید)
۸۔ تذکرۂ سائل
۹۔ قرآنی پند نامہ
۱۰۔ مطلقہ کی شرعی حیثیت
۱۱۔ عقیدہ اور رواداری
۱۲۔ جمعیۃ علماء پر تاریخی تبصرہ
۱۳۔ مدرسہ امینیہ کی مختصر تاریخ
۱۴۔ مدرسہ حسین بخش کا تعارف
۱۵۔ قصہ یاں کا (فارسی نظم کا اردو منظوم ترجمہ)

اور اس کے علاوہ کچھ کتابیں، مضامین، کلام اور دیگر یادداشتیں غیر مطبوعہ ہیں جو توقع ہے کہ جلد شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گی۔

مولانا واصف نے تقریباً ۸۰ - ۷۹ برس کی بھرپور عمر پائی اور آخر وقت تک فعال و متحرک اور قابلِ رشک دینی، مذہبی اور ادبی زندگی گذاری۔ مولانا واصف

نمود ونمائش، صلہ وستائش اور حکام رسی سے ہمیشہ دور رہے۔ایک خاموش اور عالمانہ و بزرگانہ پاکیزہ زندگی گذاری، جو آج کی نسلوں کے لئے قابل فخر اور باعث تقلید تھی۔ آپ ۱۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو بعد سہ پہر ہم کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے کر داعیٔ اجل کو لبیک کہکر واصل حق ہوئے اور دار باقی میں، جنت الفردوس میں تشریف لے گئے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی قبر پر تا قیامت باران نور فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم ایسے کم مایہ لوگوں کو ان کی زندگی کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان کی موت میرا ذاتی نقصان بھی ہے۔میں ۴۲-۱۹۳۹ء سے نواب سائل چچا استاد کے ساتھ مفتیٔ اعظم مولانا کفایت اللہ مرحوم کے بالا خانہ پر اور اردو بازار جامع مسجد دلی میں ان کے قائم کردہ کتب خانہ رحیمیہ میں باقاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ اور دن میں ۲ دو بار تو یوں بھی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک اسکول آتے جاتے مولانا واصف سے سلام کرتا ہوا جاتا تھا، ۱۹۳۹ سے بالعموم اور ۱۹۴۳ سے بالخصوص کتب خانہ عزیزیہ مفتیٔ اعظم رح کے خویش اور مولانا واصف کے بہنوئی حضرت مولانا سمیع اللہ قاسمی رح کی دکان پر، اپنے احباب کے ساتھ میری نشست تھی، جہاں شکیل بدایونی، محشر بدایونی، آغا طاہر، حکیم کامل خاں، مولانا احمق پھپھوندوی، مولانا عبداللہ فاروقی اور اس دور کے نوجوان اور مشاہیر شعراء کی نشست تھی۔

چنانچہ اردو بازار کے علاقہ میں ہماری نشست و برخاست اور شرکت واکتساب اور تفریح وجولانی ادب کے جو چند مرکز تھے، ان میں کتب خانہ رحیمیہ اور کتب خانہ عزیزیہ کو خاص طرۂ امتیاز تھا، حضرت خواجہ حسن نظامی رح کا اردو گھر (جہاں اب آزاد ہند ہوٹل اور قدیم مسلم ہوٹل وغیرہ قائم ہے)۔ مولانا راشد الخیری کی دکان اور نشست گاہ، شاہد احمد صدیقی رح کے رسالہ ساقی کا مرکز اور نذیریہ بک ڈپو،

مولانا واآصفؒ اور مولانا سمیع اللہؒ کی دُوکانیں ، نگارستان ایجنسی اور چمنستان ماہنامہ کا دفتر اور دُکان ، آغا شاعر قزلباشؒ کے صاحبزادگان آغا آفتاب اور آغا سرخوشؒ کے مرکز ، جہاں صابر دہلوی ، راز مرادآبادی ، جمیل الدین عالی وغیرہ حضرات رونق افروز ہوتے تھے ۔ اور گلی ملیا محل میں پروفیسر خواجہ عبدالمجید مؤلف ضرب الامثال دلی اور ان کے فرزند ، بلبل ہزار داستان ، ادیب شہیر ، خواجہ محمد شفیع دہلوی کی اردو مجلس کے مرکز تھے ۔ اور پنڈت امرناتھ مدن ساحر ، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ، اور نواب سائلؒ کے دولت کدوں اور ادبی نشستوں کے علاوہ ، ہمیں ۱۹۴۰ کے بعد ، مندرجہ بالا احباب کے ادبی مرکزوں تک ہی جانے اور اٹھنے بیٹھنے کی اجازت تھی ، جو پنڈت ساحر کی بزم سخن دلی کے بعد اپنی دوسرے درجہ کی ادبی اہمیت کے لئے مشہور تھے ، گویا اردو بازار جامع مسجد کا جانا حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن واآصف مرحوم سے ساری زندگی کا ملاقات کا واسطہ تھا جو ۱۹۳۹ء کے بعد اب ان کے انتقال ۱۹۸۷ء تک باقاعدہ جاری رہا ۔ اور اب اُن کے فرزند اور مولوی سمیع اللہ کے فرزند ، دونوں خاندان کے چشم وچراغ ، یعنی مفتی کفایت اللہؒ کے پوتے اور نواسے دونوں اُسی مُروّت اور محبت و ارادت سے ملتے ہیں اور عزت کرتے ہیں ، جس کی اُن سے توقع کی جا سکتی ہے ۔

اب مولانا واآصف دہلوی شاہ ولی اللّٰہی قبرستان مہندیاں نئی دلی میں تاریخی علماء واکابر کے ساتھ آسودۂ خاک ہیں ، جہاں ہم نے اس سے پہلے مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اصحاب کو بھی سپردِ خاک کیا تھا ۔

مولانا عبدالحفیظ مکی ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفہ ہیں ، جو اتفاقاً واآصف صاحب کی تجہیز و تکفین اور تدفین میں بھی شریک ہو سکے کہ اچانک اُن کا دلی آنا ہو گیا تھا ۔ نمازِ جنازہ بھی انھوں نے ہی پڑھائی ۔

مولانا واصف ہمارے پیر بھائی تھے۔ میں نے نثار صاحب اور کیفی صاحب کے علاوہ جن لوگوں سے کچھ سیکھا اور علم و ادب میں فیضان حاصل کیا ان میں مفتی اعظم اور نواب سائل دونوں ہستیاں شامل ہیں، جن سے میں نے کچھ حاصل کیا اور وہ ان دونوں کے جانشین تھے گویا آج میرے لئے وہ سب ہستیاں بھی مولانا واصف کے ساتھ آج ہی اٹھیں جو ان کے دم سے ہمارے لئے زندہ تھیں۔ سوائے دعا اور شکر و صبر کے چارہ ہی کیا ہے۔ رضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

الواح الصنادید

(پروفیسر محمد اسلم، شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

شیخ عبدالقادر، مدیر مخزن کی قبر سے دس میٹر جانب شمال مشرق مشہور شاعر احسان دانش کی قبر ہے۔ اُن کی قبر کا ذکر پہلے الواح الصنادید میں آچکا ہے لیکن اُس وقت اس پر کتبہ نصب نہیں تھا، اب ان کی قبر پر کتبہ لگ گیا ہے اور اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

یا اللہ　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　یا محمدؐ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شاعر مزدور

حضرت احسان دانشؒ

مرید خاص حضرت حافظ تفضل حسینؒ

(معروف بہ بھگڑے[1] والے پیر)

تاریخ وفات　۲۲؍ مارچ ۱۹۸۲ء

---

[1] میرے خیال میں صحیح لفظ بگھرہ (ضلع مظفر گڑھ) ہونا چاہیئے۔

دانش میں خوفِ مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنّت حضورؐ کی

احسان دانش کی ابدی آرام گاہ سے چالیس میٹر جانب جنوب ان کی والدہ مرحومہ محوخواب ابدی ہیں۔ ان کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے :

۷۸۶
مرقد
والدہ شاعرِ مزدور احسان دانش
۱۹۵۸ء

حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ کا ذکر الواح الصنا دید میں ہوچکا ہے۔ اس وقت اُن کی قبر پر کتبہ نہیں لگا تھا۔ موصوف امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگردِ رشید اور داماد تھے۔ انھوں نے حضرت سندھیؒ سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کی روشنی میں قرآن حکیم کا درس لیا اور اِسے عام کیا۔ ان کی قبر آغا حشر کاشمیری اور خواجہ عبدالحیٔ فاروقی کی قبروں سے تین چار میٹر جانب جنوب مشرق ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
تربت
شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ وصال ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ
مطابق ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء بروز جمعۃ المبارک

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی قبر سے متصل جانب قبلہ اُن کے فرزند ارجمند مولانا عبیداللہ انور قدس سرہٗ کی آخری آرام گاہ ہے۔ مرحوم راقم الحروف پر بڑے مہربان تھے اور کبھی کبھی میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر میری عزت بڑھایا کرتے تھے۔ اُن کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

یا حی یا قیوم

موت العالِم موت العالَم

مرقد اطہر

جانشین شیخ التفسیر امام الہدیٰ

حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ

وفات در شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ

ان حضرات کی قبروں سے پندرہ سولہ میٹر جانب شمال مشرق میاں محمد شفیع کی ابدی آرام گاہ ہے۔ مرحوم لاہور اور ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے ہیں۔ انھوں نے "۱۸۵۷ء" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جو ۱۹۵۷ء میں جنگ آزادی ...... کی سو سالہ تقریب کے موقع پر شائع ہوئی تھی۔ ان کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آخری آرام گاہ

میاں محمد شفیع ستارۂ خدمت

سکریٹری منصوبہ بندی مغربی پاکستان

تاریخ ولادت ۱۰ر فروری ۱۹۱۱ء

تاریخ وفات ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۶ء

گذر گیا ہے چمن سے مثالِ ابرِ بہار
روش روش پہ نئے گلستاں کھلائے ہوئے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

ابوسعید انور کی قبر سے پندرہ بیس میٹر جانب شمال مشرق مدرسۃ البنات جالندھر و لاہور کے بانی مولانا عبدالحق عباس محو خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ
فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

ترجمہ: اے مطمئن روح تو اپنے رب (کے جوار رحمت) کی طرف لوٹ چل کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

آغا جی مولانا عبدالحق عباس

بانی

مدرسۃ البنات

تاریخ پیدائش ۶ر اپریل ۱۸۸۲ء

تاریخ وفات یکم اپریل ۱۹۷۰ء

شمس العلماء علامہ احسان اللہ خاں درّانی تاجور نجیب آبادی کے مزار کا ذکر الواح الصنادید میں ہو چکا ہے لیکن اُس وقت ان کی قبر پر کتبہ نصب نہیں تھا۔ میں نے ان کی قبر کی نشان دہی کی تو جناب عبدالصمد صارم نے اس پر کتبہ لگوا دیا لیکن تاریخ کندہ کروانے میں غلطی ہو گئی۔ علامہ صاحب کا انتقال ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو صبح ساڑھے چار بجے ہوا تھا اور راقم الحروف نے ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی تھی۔ روزنامہ نوائے وقت بابت یکم فروری ۱۹۵۱ء میں بھی یہی تاریخ اور وقت درج ہے۔

علامہ تاجور نجیب آبادی بڑے اونچے پایہ کے شاعر تھے۔ احسان دانش، پنڈت ہری چند اختر اور میلارام وفا کا شمار ان کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے، علامہ مرحوم کا یہ شعر تو ضرب المثل بن چکا ہے:

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

مرقد
شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی
۲۹ جنوری ۱۹۵۱ء

غازی علم الدین کے احاطۂ مزار کے شمال مشرقی کونے میں شیخ عطاء اللہ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ موصوف مرے کالج سیالکوٹ میں پڑھا چکے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان میں اقتصادیات کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب لکھی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے علامہ اقبال کے خطوط جمع کرنے پر توجہ دی اور اس کام کو بڑے سلیقے

سے انجام دیا۔ ان کے فرزند ارجمند مختار مسعود لاہور ڈویژن کے کمشنر رہ چکے ہیں۔ ان کے مزار کا کتبہ فن خطاطی کا شاہکار ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خط طغریٰ میں، قرآنی آیت و دعا خط ثلث میں اور مرحوم کا نام اور تاریخ وفات خط نستعلیق میں مرقوم ہیں۔ کتبے کی عبارت یوں ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ وقنا

عذاب النار

وادخلنا الجنۃ مع الابرار یا عزیز یا غفار

یارب العالمین

شیخ عطاء اللہ مرحوم ومغفور

وصال ۲۷ اپریل ۱۹۶۸ء بعمر ۷۲ سال

نگا ہے یا رسول اللہ نگا ہے

غازی علم الدین کی قبر سے ۲۵ میٹر جانب جنوب، محمد مالک شہید کے قدموں میں ایک بلند چبوترے پر لاہور کے معروف عالم دین مفتی غلام جان ہزاروی کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کے لوح مزار پر عبارت کندہ ہے:

یا اللہ جل جلالہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۷۸۶

۹۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موت العالِم موت العالَم

مرقدِ منوّر

فاضل اجل مفتی اعظم قبلہ عالم حضرت علامہ ابو المظفر مولانا محمد غلام جان

قادری رضوی ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ

خلیفۂ مجاز

امام اہلسنت اعلیٰحضرت مجدد دین و ملت حضرت مولانا محمد احمد رضا خاں

قادری بریلوی قدس سرہ

تاریخ وصال

در بست و پنج محرم بگذشت زیں جہان

اسم شریف اورا مفتی غلام جان

درسال سیزدہ صد و ہفتاد و نُہ بروز

شنبہ بوقت نیم ویک شد داخل جنان

۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

یکم اگست ۱۹۵۹ء

پسران

محمد مظفر اقبال ۔ محمد اشرف ۔ غلام صابر ۔ غلام مصطفیٰ

میانی صاحب کے جس خطے میں عابد علی احمد اور عبدالعزیز فلک پیما کی قبریں ہیں، اسی خطے میں حضرت نذر محی الدین قادری فاضلی بٹالوی کے روضہ سے ۲۰ میٹر جانب مغرب ڈاکٹر سید ظفر الحسن محو خواب ابدی ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کو اُن سے شرف تلمذ ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پاکستان میں فاروقی صاحب اُن کے افکار کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ سید صاحب کے لوحِ مزار پر یہ

عبارت منقوش ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کل نفس ذائقۃ الموت

مرقد الحاج ڈاکٹر سید ظفر الحسن

(ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی فل)

(ابن خان صاحب سید دیوان محمد رئیس کھرڑ ضلع انبالہ)

پروفیسر فلسفہ و صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تاریخ وفات دوشنبہ ۲۲ر شعبان ۱۳۶۸ھ

مطابق ۱۹ر جون ۱۹۴۹ء

اللھم اغفر لہ و ارحمہ۔ آمین

ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی قبر سے متصل جانب قبلہ اُن کے خسر اور مشرقی پنجاب کے مشہور سیاست دان اور تبلیغی جماعت کے روح رواں سید غلام بھیک نیرنگ کی قبر ہے۔ جس زمانے میں سوامی شردھانند نے شدھی تحریک کا ڈول ڈالا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی، خواجہ حسن نظامی اور غلام بھیک نیرنگ مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے پر کمربستہ ہو گئے۔ غلام بھیک نیرنگ نے انبالہ سے "تبلیغ" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جس کے چند پرچے راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے :

۷۸۶

تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوًا فی الارض

ولا فسادًا و العاقبۃ للمتقین

مرقد

الحاج سید غلام بھیک نیرنگ عفا اللہ عنہ

خلف سید قاسم علی ترمذی رضوی غفر لہ ساکن دورانہ ضلع انبالہ

وکیل انبالہ ناظم عمومی جمعیۃ مرکزی تبلیغ الاسلام انبالہ شہر

و ممبر مرکزی اسمبلی ہندوستان و ممبر مجلس دستور ساز پاکستان

تاریخ وفات ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء

مطابق ۲۶ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ

مادہ تاریخ وفات

میر غلام بھیک نیرنگ پارسا

۱۹۵۲ء

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

سید ظفر الحسن کے سرہانے، ان کے قریبی عزیز اور سید غلام بھیک نیرنگ کے برادر زادے سید محمد قاسم رضوی مدفون ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا حی   یا قیوم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل وسلم وبارک علی سیدنا ومولنا وحبیبنا محمد النبی الامی

وعلی آلہ واصحابہ وعترتہ بعدد کل معلوم لک و بعدد

خلقك ورضی نفسك وزنة عرشك ومداد كلمـا تك
استغفر الله الذی لا اله الا هو الحي القیوم واتوب الیه
الله لا اله الا هو الحي القیوم لا تاخـذه
سنة .... وهو العلی العظـــیم

سید محمد قاسم رضوی

وفات ۶ جون ۱۹۷۵ء لاہور

خدا مغفرت کرے

لوح مزار کے علاوہ ان کی قبر کے تعویذ پر یہ عبارت درج ہے :

سید محمد قاسم رضوی

زمانہ طالب علمی

پنجاب اور پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن

زمانہ ملازمت

ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ و لائل پور

کمشنر سرگودھا ڈویژن

ڈائریکٹر سول سروس اکیڈمی لاہور

وفات

۶ جون ۱۹۷۵ء لاہور

خدا مغفرت کرے

میانی صاحب کے خطہ باغ گل بیگم میں پروفیسر محمد شجاع الدین کا مزار ہے۔
موصوف نامور مؤرخ سید عبدالقادر کے شاگرد رشید اور دیال سنگھ کالج لاہور

میں تاریخ کے استاد تھے۔ انھوں نے اپنے استاد گرامی کے ساتھ مل کر تاریخ ہند و پاکستان اور تاریخ اسلام لکھی تھیں جو انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل تھیں۔ مرحوم نے انگریزی زبان میں نور جہاں کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی اور اسرار احمدی کو بڑے سلیقے کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ان کے تحقیقی مضامین پاکستان کے اکثر علمی جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ قدیم لاہور کے بارے میں انھیں بہت معلومات تھیں۔ راقم الحروف کی توجہ پرانی عمارتوں اور قبروں کی طرف انھوں نے ہی دلائی تھی۔ میں نے طہاس نامہ کا انتساب ان ہی کے نام کیا ہے۔ ان کا انتقال شادی کے دو سال بعد ۴۲ سال کی عمر میں ہوا اور اولاد جیسی نعمت سے محروم رہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

یا اللہ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

: مزار حسرت آیات

پروفیسر شجاع الدین

پئے دیدار آیم بر مزارے — توانم دید شاید آں نگارے
چرا در گِل روی اے گُل عذارے — دلم سوزد دریں سینہ نگارے

زیر تہِ خاک آنکھوں کا نُور — شادی کے جوڑے میں روتی ہے حُور
سینہ میں پنہاں جلتا ہوا طُور — یہ کیا دکھایا یا ربِ غفور

انجام اور اتنا قریب — دورِ جوانی کتنا مہیب
آہوں میں اشکوں میں ذکر حبیب — کچھ بھی نہ کر پائے سارے طبیب

یہ آندھیاں اور ایسی بہاریں کن کن کو ڈھونڈیں کن کو پکاریں
بڑی پیاری قدریں بنی یادگاریں لٹا کرتی ہیں اس طرح کب بہاریں

کجا روز روشن کجا کالی رات بڑا مختصر ہے فریبِ حیات
فریبِ نظر ہے حیات و ممات جہانِ الم ہے یہ سب کائنات

(بیگم شجاع الدین) (محمودہ سوز)

عمر بیالیس سال
تاریخ وفات ۲۳ر رمضان ۱۳۸۴ھ
مطابق ۲۷ر جنوری ۱۹۶۵ء بوقت ۹ بجے صبح

گارڈن ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں شاکر علی مصور کی قبر سے تیس میٹر جانب شمال اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کی قبر سے تیس میٹر جانب مشرق ڈاکٹر محمد صادق کی ابدی آرام گاہ ہے۔ انھوں نے "محمد حسین آزاد، احوال و آثار" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے SEVEN ONE ACTS، ریاض الادب، "آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین"، آپ بیتی (غیر مطبوعہ) A HISTORY OF URDU LITERATURE، ابوالاثر حفیظ (غیر مطبوعہ) اور TWENTIETH CENTURY URDU LITERATURE جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں نعیمہ منیر راؤ نے "ڈاکٹر محمد صادق، تحقیقی وتنقیدی مقالہ" لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی ہے۔ نعیمہ راؤ کے خیال میں ان کی تحقیق میں کافی جھول ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اللہ یا محمدؐ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

مرقد مطہر

جناب ڈاکٹر محمد صادق صاحب

تاریخ وفات

۱۷ جون ۱۹۸۴ء بمطابق ۱۷ رمضان ۱۴۰۴ھ بروز اتوار

از جہاں سوئے جناں رفت محمد صادق — صاحب علم و ہنر بود عمیم الاحساں
زندگی کرد بسر بہر فروغِ علمی — شد زبان و قلمش فیض رساں بہر جہاں
درس و تدریس و تعلم بہ تصانیف لطیف — بہ ہمیں ذوق و تجسس سفر عمر رواں
جادۂ زیست فروزاں شدہ از حسنِ عمل — منزلے یافت کہ باقیست ازاں حمد زناں

فضلِ حق شامل حال شفاعت ز رسول
گفت ہاتف کہ درین مغفرت و راہِ جناں

۱۹۸۴ء

ڈاکٹر محمد صادق، ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے برادر بزرگ تھے اور مرحوم ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے تھے۔ اس منظر کو لاکھوں ناظرین نے پردۂ سکرین پر دیکھا۔ ان کا انتقال ۸۶ برس کی عمر میں ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے قریب دارالسلام کے نام سے لاہوری احمدیوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے اور ان کا اپنا قبرستان ہے۔ اس قبرستان میں شیخ عبدالرحمٰن مصری اور حکیم عبدالوہاب عمر ابن خلیفہ نور الدین بھیروی جیسے افراد مدفون ہیں۔ اسی

قبرستان میں مولوی صدر الدین، امیر جماعت احمدیہ (لاہوری گروپ) کی ابدی آرامگاہ
مولوی صاحب، مولانا عبید اللہ سندھی، مولوی برکت اللہ بھوپالی اور اقبال شیدائی
ساتھیوں میں سے تھے۔ جس زمانے میں یہ حضرات ترکی، افغانستان اور اٹلی میں جلاوطنی
زندگی گذار رہے تھے، مولوی صدر الدین برلن کی مسجد میں خطابت کے فرائض
دے رہے تھے۔ مولانا سندھی کے مکاتیب میں ان کا کئی بار ذکر آیا ہے۔ ان
پر جو لوح نصب ہے، اس پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

رب اغفر وارحم وانت خیر الرّاحمین

حضرت امیر قوم مولانا صدر الدین

تاریخ پیدائش

یکم جنوری ۱۸۸۱ء بمطابق ۱۲۹۹ھ

تاریخ وفات

۱۵ نومبر ۱۹۸۱ء بمطابق ۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ

مولوی صدر الدین کی اہلیہ کی قبر بھی اسی قبرستان میں ہے۔ ان کا انتقال مورخہ
۱۳ جون ۱۹۷۹ء کو ہوا تھا۔ راقم الحروف نے مولوی صاحب کو اقبال شیدائی
جنازے پر دیکھا تھا۔ جس وقت موصوف پہنچے اس وقت شیدائی صاحب کی نماز جنازہ
ہو چکی تھی۔ مولوی صدر الدین نے چند ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ نماز جنازہ ادا کی۔
اقبال شیدائی حنفی العقیدہ مسلمان تھے۔ مولوی صاحب نے پرانے تعلقات کی
بنیاد پر ان کے جنازے میں شرکت کی تھی۔

"الحصن المتین فی احوال الوزراء والسلاطین"

تاریخ اودھ اور سلاطین اودھ سے متعلق ایک نادر عربی مخطوطہ

جناب مسعود انور علوی کاکوروی، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

صوبہ اودھ کی تاریخ اور نوابین وامراء کے حالات وواقعات بہت سی فارسی اور انگریزی نیز اردو کتابوں میں اجتماعی وانفرادی صورت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ فارسی میں ایسی بکثرت کتابیں ہیں جن کے مؤلف ان واقعات اور حالات کے چشم دید گواہ ہیں اسی وجہ سے تاریخ اودھ پر کام کرنے والوں کے لئے یہ فارسی مآخذ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے درج ذیل کسی نہ کسی وجہ سے کافی اہم وبیش قیمت ہیں:

۱۔ تاریخ فرح بخش ۔ منشی محمد فیض بخش علوی کاکوروی ۔ عبدالسلام کلکشن مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ ۔ مؤلف شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں فیض آباد میں قیام پذیر تھے، اس وجہ سے انھوں نے اپنے چشم دید واقعات وحالات قلم بند کیے ہیں جو بہت اہم اور معاصر مآخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲۔ رسالۂ صبح صادق ۔ محمد صادق خاں اختر ۔ عبدالسلام کلکشن ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ اس رسالہ کے مؤلف نے نظام حکومت اور اس دور کی سماجی برائیوں کا ذکر کیا ہے۔ معاصر ہونے کی بنا پر امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد سلطنت پر تنقید بھی کی ہے۔ مخطوطہ

ادجمادی الثانی ۱۲۶۷ھ کا ہے

۳۔ مراۃ الاوضاع ۔ لال جی ۔ رضا لائبریری رامپور ۔ مؤلف کا ۱۸۲۹ء میں ایک قائع نگار کی حیثیت سے لکھنؤ ریزیڈنسی میں تقرر ہوا ۔ وہ اس عہدہ پر کتاب کی تکمیل یعنی ۱۸۵۱ء تک فائز رہا ۔ اس میں سول، ملٹری اور مال گذاری نظام، دارالسلطنت لکھنؤ کا ایک تفصیلی جائزہ اور ۱۸۲۹ء یعنی نصیرالدین حیدر کے عہد سے چشم دید واقعات تاریخ وار قلم بند کیے ہیں ۔ اس مخطوطہ سے ریزیڈنسی اور حکومت اودھ کے باہمی تعلقات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے کیونکہ مؤلف کی سوجھ بوجھ اور وقائع نگاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح حالات سے پوری طرح آگاہ تھا ۔

۴۔ تاریخ اودھ معروف بہ زبدۃ الکوائف ۔ جے گوپال ثاقب ۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری ۔

۵۔ عمادت السعادت ۔ سید غلام علی ۔ یہ طبع ہو چکی ہے ۔

ان مندرجہ بالا کتب کے علاوہ دیگر مآخذ بھی ہیں ۔ اردو میں درج ذیل مخطوطے اہم ہیں :

۱۔ تاریخ آفتاب اودھ ۔ مرزا محمد تقی ۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری ۔ مخطوطہ تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے میں لکھنؤ اور فیض آباد نیز برہان الملک سے واجد علی شاہ اور انتزاع سلطنت تک کے حالات ہیں ۔ دوسرے حصہ میں غدر کے حالات ہیں ۔ تیسرے حصہ میں اودھ کے تعلقداروں کی ریاست کا حال نقشہ کی صورت میں ہے، اس کے مطالعہ سے ان کی ترقی اور تنزلی کی پوری کیفیت واضح ہو جاتی ہے ۔ مؤلف، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد سے واقف تھا ۔

۲۔ مرقع خسروی ۔ محمد عظمت علی نامی کاکوروی ۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری ۔ مؤلف سلطنت اودھ کے بیشتر اعلیٰ عہدے داروں سے مراسم رکھتے تھے ۔ آخری شاہانِ اودھ

کے معاصر ہونے کی بنا پر اکثر واقعات ان کے چشم دید ہیں۔ چودہ ابواب پر منقسم ہے۔ برہان الملک سے واجد علی شاہ تک ایک ایک باب میں ہر نواب کے حالات ہیں۔ آخری چار ابواب میں ادبی و ثقافتی حالات اور دو ابواب میں ان حالات کا ذکر جو غدر اور انتزاع سلطنت کا پیش خیمہ تھے۔ مخطوطہ اہم ہے اور اس میں موجود مواد دوسری جگہ عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا ہے (یہ مخطوطہ کچھ روز پہلے لکھنؤ سے ڈاکٹر ذکی کاکوروی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے)۔

۳۔ نسب نامہ سادات جرول۔ حیدر مہدی۔ مخطوطہ ذاتی۔ ڈاکٹر مصطفی احمد کاکوروی۔ سرسید اکاڈمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اس کا مؤلف آخری تین بادشاہوں کا معاصر ہے۔ اس میں اودھ کی سماجی حالت اور مال گذاری کے نظام کا ذکر ہے۔

۴۔ کتاب سلطان التواریخ۔ راجہ رتن سنگھ زخمی ہشیار جنگ بہادر۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری

۵۔ رپورٹ بابت مسائل تعلیم مسلمانانِ ہند۔ مولوی مسیح الدین خاں علوی کاکوروی سفیر شاہ اودھ از مقام کاکوری۔ محفوظہ سرسید اکاڈمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۶۔ تاریخ انگلستان۔ سفر نامہ لندن۔ مولوی مسیح الدین خاں علوی۔ کتب خانہ انوریہ کاکوری۔ ان مخطوطہ کتابوں کے علاوہ چند مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جن کا شمار معاصر ماخذ میں ہے مثلاً فسانۂ عبرت رجب علی بیگ سرور اور قیصر التواریخ از سید کمال الدین حیدر وغیرہ۔

انگریزی زبان میں بھی گزیٹیرس وغیرہ میں جستہ جستہ حالات ملتے ہیں۔ لیکن راقم الحروف کی نظر سے اب تک تاریخ اودھ اور امرا و سلاطین سے متعلق کوئی مستقل عربی تصنیف کسی معاصر کی نہیں گذری تھی۔ زیر نظر مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ (۱۲۸۹) میں محفوظ ہے۔ اس کے مؤلف عباس مرزا بن سید احمد الحسینی بن سید محمود کاظم

ہیں۔ مؤلف معروف نہیں ہیں۔ راقم کی نظر سے اب تک ان کی کوئی دوسری تصنیف نہیں گذری ہے۔ کتاب کے مختلف صفحات کے مطالعہ سے ان کے بارے میں یہ معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ اُن کے اجداد نوابین اودھ کے یہاں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ ان کے دادا سید محمد کاظم انجینئر تھے۔ سعادت علی خاں کے عہد میں ان کی زیر نگرانی کئی شاہی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مؤلف کے باپ غازی الدین حیدر بادشاہ کے معتمد خاص تھے۔ مرزا امجد علی شاہ نے شروع میں ان کی بڑی عزت و توقیر کی اور اُن کو "سلون" کا گورنر بنادیا۔ مگر انجام کار درباری سازشوں کی بناپر انھیں اس عہدہ سے ہٹادیا گیا۔ ان کی تمام جائداد و سامان کو ضبط کرلیا گیا۔ لیکن بعد میں سٹو روپیہ مشاہرہ ان کی گذرمعاش کے لئے دے دیا گیا جو واجد علی شاہ کے عہد تک ان کو ملتا رہا۔ ۱۲۷۰ھ میں مؤلف مشہد بھی گئے تھے۔

یہ مخطوطہ ۲۱۱ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں۔ بخط نسخ ہے عنوانات عام طور پر سرخ روشنائی سے ہیں، سنہ کتابت اگرچہ مذکور نہیں ہے مگر قیاس یہ ہے کہ تیرھویں صدی کا ہے، نسخہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں تمام واقعات بالتفصیل درج ہیں۔ امراؤ حکام، علماء، اطباء اور ماہرین فن کے اسماء اور حالات تک درج ہیں۔ نسخہ کی تکمیل ۱۲۸۱ھ میں ہوئی لیکن بعد میں معمولی اضافے بھی ہوئے ہیں اس لئے کہ اقبال الدولہ بن فتح علی کپتان تاریخ وفات ۱۲۸۷ھ اور چند لوگوں کی درج ہے۔

پورا مخطوطہ تین ابواب اور ایک خاتمہ پر منقسم ہے۔ پہلا باب (۳-۷۸ اورق ب) اس میں سلاطین اودھ اور امراء کے حالات ہیں۔ دوسرا باب (۷۸ اب سے ۱۹۲ الف) نوابین اودھ کی ماؤں کے نسب ناموں پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں ۱۹۲ الف سے ۲۰۳ ب) دس فصلیں ہیں جن میں امراء، وزراء اور ملازمین کے حالات

ہیں۔ خاتمہ میں (۲۰۳ ب سے ۲۰۸ تک) دار السلطنت لکھنؤ کے بارے میں مفید معلومات ہیں۔

ابتدا اس طرح ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ان احلی ثمرات تشتهی الیها النفوس، واسنی کلمات تزین بها الطروس حمد من جعل النظام منوطا بآراء السلاطین واحسن نغمات یترنم بها عنادل الاقلام وازین حلی یترشح بها خرائد المرام الخ

نعت ومدح کے بعد لکھا ہے:

اما بعد فیقول اقل الخلیقة بل لا شیٔ فی الحقیقة القصیر الباع والکاسد المتاع الاسترستانی اصلا والکنوی موطنا ومنشأ المدعو بعباس مرزا ابن السید احمد الحسینی ابا والرضوی اما انی حصلت فی زمان لیس لی شغل من الاشغال ولا تعلق بشیٔ من الاعمال فکنت مشوش الخاطر ومضطرب البال فاردت ان اترجم احوال ولاة الاوده من النواب برهان الملك الی اخلافه..

قیاس یہ ہے کہ یا تو یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی یا اس کی نقل کسی ناقص نسخے سے کی گئی ہے اس لیے کہ مندرجہ ذیل عبارت پر کتاب کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آخری صفحات غائب ہو گئے ہوں۔

وفات نادر مرزا ابن شاه میر خان بن مرزا النصیر بن مرزا یوسف العجمی یوم السبت العاشر من شعبان

من السنة المذکورة و لہ ستون سنة۔

الباب الاول فی بیان ولایة صوبة الاوده وفیہ اذکار الاولیاء وھو النواب المدعو بالسید محمد امین بن السید محمد نصیر برھان الملک بہادر جنگ۔ (۳ الف ۔ ۹ ب)

سہسم

اسماء الامراء فی عہدہ (۹۹ ب)
بیان الوثیقۃ (ای القرضۃ التی اخذ ھا الدولۃ المسیحیۃ من السلطان) (۱۰۲ الف)
تفصیل الوثیقۃ واسماء ارباب المشاھرات (۱۰۳ الف)
بیان خلفۃ الوزارۃ (۱۰۶ ب)
بیان وفاۃ العلامۃ السید دلدار علی المعروف بہ غفران مآب (۱۰۸ الف)
ذکر اولاد العلامۃ المذکور (۱۱۰ الف)
ذکر اساتذۃ العلامۃ (۱۱۶ الف)
ذکر تلامذۃ العلامۃ (۱۱۹ الف)
ذکر سلطنۃ مومن النصیر الدین حیدر المخاطب بہ سلیمان جاہ ونبذ مما وقع فی عہدہا من الوقائع (۱۲۸ ب)
اسماء العلماء فی عہدہ (۱۴۱ الف)
قصۃ مناجان الملقب بہ فریدون جاہ وجلوسہ علی سریر السلطنۃ (۱۴۲ الف)
ذکر سلطنۃ محمد علی شاہ الملقب بنصیر الدولہ ونبذ مما وقع فی عہدہ من الوقائع (۱۴۳ ب)
احوال سبحان علی خان (۱۴۵ ب)
العہود التی کتبت بین الدولتین (۱۴۸ الف)
ذکر بعض السوانح التی وقعت فی مدۃ ھٰذہ السلطنۃ کوفاۃ رنجیت سنگھ وواقعات کابل (۱۵۴ ب)

اورنگ زیب اور سیکولرزم

(۴)

از عبدالرؤف ایم اے اودی کلاں

خواجہ سربلند خاں جو اکتوبر ۱۶۷۲ء سے ۷ / دسمبر ۱۶۷۹ء (وفات) تک بخشیِ دوم کے عہدہ پر مامور رہا، تقیہ کیے رہتا تھا۔ ایک دفعہ شہنشاہ نے اس سے پوچھا کہ تمہاری باتوں سے بعض اوقات شیعیت کی بو آتی ہے تو اُس نے جواباً عرض کیا کہ "جہاں پناہ بہت سے سید اس فرقہ (شیعیت) سے تعلق رکھتے ہیں مجھ پر بھی ان کی سابقہ مصاحبت کے سبب شیعیت کے کچھ اثرات باقی ہیں لیکن میں اس فرقہ کا غالی معتقد نہیں ہوں۔ میں نے اپنے تئیں اس فرقہ سے علیحدہ کرلیا ہے تاہم مکمل طور پر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا ہوں۔" شہنشاہ اس کے جواب پر صرف مسکرا کر رہ گیا[۱۲۰] اور کسی قسم کی بازپرس نہ کی اس سے ثابت ہے کہ وہ (شہنشاہ) لوگوں کے ذاتی معتقدات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہی سربلند خاں ایرانیوں کا برملا طرفدار تھا اور شہنشاہ سے انھیں اعلیٰ مناصب اور بلند عہدے تفویض کرنے کی سفارشیں کیا ہی کرتا تھا۔ اس کی سفارش پر ہی ایک ایرانی کو کابل کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس سب کے علاوہ محکمۂ دیوانی پر تو شیعہ مکمل طور پر قابض تھے۔ ساداتِ بارہہ (جن کی اکثریت شیعہ تھی) کی پوزیشن تو اتنی بہتر

تھی کہ وہ یہاں تک خود سر ہو گئے تھے کہ ایک دفعہ بادشاہ کے درباریوں سے خانہ جنگی تک نوبت آئی اور جب اورنگ زیب نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش کیا جائے تو ساداتِ بارہہ نے کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے۔ اس پر شہنشاہ نے آستین چڑھا کر بہ نظرِ عتاب فرمایا کہ جو لوگ میری شمشیرِ برّاں کا مزہ چکھ چکے ہیں وہ شریعتِ غرّا کے حکم کے بالمقابل ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہیں؟ کہہ دو سب مل کر آجائیں۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ پہرے وغیرہ پر جس قدر سادات ہیں برطرف کر دیئے جائیں۔ یہ سن کر ساداتِ بارہہ کا تمام نشۂ جرأت ہرن ہو گیا۔[۳۲]

معاشی اعتبار سے بھی[۳۳] عہدِ عالمگیر میں ہندو اور شیعہ علی الخصوص[۳۴] اسماعیلی و داؤدی بوہرے ملکی تجارت پر پوری طرح قابض تھے۔ اُس وقت کے GATE WAY OF INDIA یعنی بندر سورت پر یا تو ہندو بنیوں کا کنٹرول تھا یا بوہروں کا۔ سورت کا سوداگر بہادر جی بوہرہ تو اس وقت دنیا کا متمول ترین تاجر (ملک التجار) سمجھا جاتا تھا، بعدہٗ حاجی سید یا سعید بیگ اور حاجی قاسم کا شمار تھا۔ ہندو بنیئے ویرجی بوہرے کی دولت کا بھی کوئی شمار نہ تھا، جس سے خود شہنشاہ اورنگ زیب بھی بوقتِ ضرورت لاکھوں روپیہ قرض لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس سے شہنشاہ نے چار لاکھ روپیہ قرض مانگا تو اس نے عرض کیا کہ جہاں پناہ جس سکّہ کا نام فرمائیں مطلوبہ رقم اسی سکّہ میں حضور کے قدموں پر نثار کر دی جائے (واضح ہو کہ اُس وقت سورت میں آٹھ قسم کے سکّے رائج تھے یعنی طلائی روپیہ، اٹھنی و چونی علی الترتیب بھی نقرئی سکّے نیز طلائی پگوڈا اور نقرئی لرین (LARINS) اِن آٹھ قسم کے سکوں میں سے وہ چار لاکھ روپیہ کسی بھی ایک سکّہ میں پیش کرنے کو تیار تھا۔ ایک عصری یورپین سیاح رقمطراز ہے کہ مغلِ اعظم (اورنگ زیب) ایسے قرضوں کو بالعموم ابواب (مالگذاری) کی وصولیابی ہونے پر ادا کر دیتا ہے اور ادائیگی حسبِ وعدہ اتنے معینہ وقت پر ہوتی ہے کہ اُسے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتی ہے۔ رعایا کو بادشاہ

سے جتنا زیادہ امن و سکون اور مراعات حاصل ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ فراخدلی کے ساتھ رعایا بھی اپنی تحصیل کا منہ شہنشاہ کے قدموں پر کھول دیتی ہے۔ بالفرض محال اگر اورنگ زیب ہندو اور شیعوں کے استحصال و استیصال پر ہی تنہا ہوا تھا تو انھیں نہایت مفلس و قلاش ہونا چاہیے تھا۔ دراصل ہندو اور شیعوں کا استحصال اورنگ زیب نے نہیں بلکہ سورت کو دو دو دفعہ "بے صورت" کر کے سیواجی نے کیا۔ پہلی دفعہ ۶ جنوری ۱۶۶۴ء بروز بدھ بوقت ۱۱ بجے دوپہر سے ۱۰ جنوری ۱۶۶۴ء بروز اتوار بوقت ۱۰ بجے دوپہر تک سیواجی اور اس کے غارت گر ہمراہی سورت کے لوگوں کو لوٹتے اور مکانوں کو نذرِ آتش کرتے رہے، جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب آگ زنی کے سبب نہایت مہیب تھی۔ آگ کے شعلوں اور التہاب نار اور شب دیجور کو روشن دن میں اور دھوئیں کے کالے بادلوں نے دن کی تابانی کو سیاہ رات میں تبدیل کر دیا تھا۔ دھواں اتنا کثیف اور گہرا تھا کہ اس نے ایک گھنے بادل کی طرح سورج کو ڈھانپ لیا تھا۔ بہارجی بوہرہ کے محل کو انھوں نے جمعہ کی رات تک جی بھر کر لوٹا، فرش کھود ڈالا گیا اور اس کے بعد محل کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ یہاں سے انھیں اٹھائیس سیر بڑے بڑے موتی، بہت سے لعل، جواہر اور زمرد نیز دوسری بے شمار دولت حاصل ہوئی۔ دو تین ہندو تاجروں کو بھی کئی کروڑ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ مزید برآں ایک دن چھبیس ۲۶ آدمیوں کے سر اور تیس آدمیوں کے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیئے۔ انگریزوں کی کوٹھی کے قریب حاجی سعید بیگ کا محل اور گودام تھا۔ بدھ کی دوپہر کو مرہٹہ اس میں داخل ہوئے۔ تمام دروازوں اور صندوقوں کو تہس نہس کر ڈالا اور محل میں جتنا اور جو کچھ مل سکا اُسے اپنے قبضہ میں کیا اور پھر گودام کا رُخ کیا، وہاں رکھے ہوئے سیماب کے کنستروں کو توڑا اور تمام پارے کو فرش پہ لنڈھا دیا۔ جمعرات کی سہ پہر لیٹیرے انگریزوں کے خوف کے سبب سعید بیگ کے محل اور گودام سے بھاگ

چوسنگھ[۳۸] سورت میں مرہٹوں کے مظالم اور کشت و خون" عنوان کے تحت مرجود نا تھ سرکار لکھتے ہیں کہ "اپنا چھپا ہوا سرمایہ بتانے کے لئے مرہٹوں نے لوگوں پر مظالم ڈھانے میں کوئی کور کسر باقی نہ چھوڑی۔ انھیں کوڑوں سے پیٹا گیا اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ کسی کا ایک اور کسی کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے اور بہت سے لوگوں کو جان سے مار ڈالا گیا۔ قیدیوں میں سے جو شخص مرہٹوں کو کچھ نہ دے سکا اُس کا کوئی نہ کوئی عضو قلم کر دینے یا اُسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ سیواجی نے ہر ایک گھر سے جتنا مال سکا اتنا مال لے لیا اور پھر صاحبِ خانہ سے کہا کہ اگر مکان محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو کچھ اور پیش کرو۔ اپنا گھر بچانے کے لئے جب رہا سہا مال و متاع اور اثاثہ بھی سیواجی کو دیدیا گیا تو اُس نے وعدہ کی پرواہ کیے بغیر اسی وقت اُس گھر کو بھی نذرِ آتش کروا دیا۔ انھی ایام میں ایک بوڑھا تاجر آگرہ سے چالیس بیلوں پر کپڑے کے تھان لاد کر لایا تھا۔ اس سے بھی رقم کا مطالبہ کیا گیا مگر کپڑا فروخت نہ ہونے کے سبب وہ سیواجی کو نقد روپیہ نہ دے سکا اور اپنا تمام اسباب دینا چاہا جسے سیواجی نے قبول نہ کیا اور روپیہ نہ دینے کی پاداش میں اس کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا گیا نیز تمام تھان جلا کر راکھ کر دیئے[۳۹]۔ سیواجی کی فوج کے سپاہیوں نے تمام پارسیوں کو بھی لوٹ لیا اور ان کے مکانات جلا دیے۔ پارسیوں میں سے جو مقید کر لیے گئے تھے انھیں رستم مانک جی نے دس ہزار روپیہ زرِ فدیہ دے کر سیواجی کے خونی پنجوں سے رہائی دلائی[۴۰]۔ بہرحال چوتھے دن مغل فوج کی آمد کی خبر سن کر سیواجی سورت سے بقول پرتگالی مورخ کاسمیڈا گو آرڈا لوٹ کے مال و اسباب کو نو سو بیلوں پر لدوا کر اپنی راجدھانی رائے گڑھ بھاگ گیا۔ آمتھ جین ڈے تھیونٹ لکھتا ہے کہ اس غارت گری میں تقریباً تین کروڑ کی مالیت سیواجی کے ہاتھ لگی[۴۱]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بے شمار مالِ غنیمت کو شمار کرنے کی اسے کبھی فرصت نہ مل سکی[۴۲]۔ اس سنگدلانہ کارروائی کو

سربستہ نامہ سرکار سیواجی کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ قرار دیتے ہیں اور اس تمام ترظلما کارروائی سے اغماض برتتے ہوئے نہایت معصومانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ شہر سورت کے چار روزہ قیام کا سیواجی نے لوٹ مار اور غارت گری کرنے میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا مگر دولت حاصل کرنے کے لئے بیجا ظلم وستم اور سفاکانہ خون خرابہ سے گریز کیا تھا" گویا پروفیسر موصوف کے نزدیک سیواجی نے جو بھی ظلم وستم اہل سورت پر ڈھائے وہ سب ایک رحمدلانہ کارروائی تھی۔ ۳؍اکتوبر ۱۶۷۰ء کو موقع پاکر سیواجی نے سورت کو دوسری دفعہ لوٹا جس میں کم از کم چھیاسٹھ لاکھ روپے مرہٹوں کے ہاتھ لگے تھے اس مرتبہ بھی انھوں نے بڑے بڑے مکانات کو اپنی قزاقی کا نشانہ بنایا اور تقریباً نصف شہر کو جلاکر خاکستر کردیا۔ چھیاسٹھ لاکھ مال غنیمت میں ترپن لاکھ زرنقد، جواہرات اور قیمتی اسباب کی صورت میں تھا۔ باقی تیرہ لاکھ نہن ساہو (ساہوکار) بری ساہو اور سورت کے ایک مضافاتی قصبہ سے لوٹے گئے تھے۔ سیواجی کے اس کارنامہ کی تفصیل لذیذ بود حکایت دراز ترگفتیم کی مصداق قدرے طویل ضرور ہوگئی ہے لیکن اس تطویل سے ناظرین کرام پر یہ واضح ہوجائے گا کہ "ہندو اور رافضی کش" اورنگ زیب تھا یا سیواجی۔

آخر میں محقق شہیر علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ مستعار میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ:

"مسلم حکمرانوں کے عیوب اور خامیوں کے ساتھ، مسلمان حکومتوں اور حکمرانوں کے محاسن، اُن کی ملکی خدمات اور کارناموں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ انھوں نے ہندوستان کو جو گوناگوں فوائد پہنچائے اور اس کو جس ابتدائی درجہ سے معراج کمال تک پہنچایا، اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ پھر اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے والے واقعات کی بھی کمی نہیں، اُن کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور قومی اتحاد کا یہ زریں اصول بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ آگے بڑھنے میں

پچھلے واقعات پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔"[۱۰]

حواشی و تعلیقات

[۱] تا [۱۰] حاشیہ کے لئے ملاحظہ فرمائیں برہان بابت ماہ اکتوبر ۱۹۸۷ء

[۱۱] ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳ ص ۶۴، از پروفیسر جدوناتھ سرکار۔

[۱۲] بھارت کا برہت اتہاس ج ۳ ص ۳۲۷ طبع سوم از ڈاکٹر سری نیترپانڈے۔

[۱۳] مغل کالین بھارت ص ۴۱۹ مطبوعہ ۱۹۶۵ء از ڈاکٹر اے ایل سری واستو۔

[۱۴] ہاؤس آف سیواجی ص ۳۷۵، از سرکار۔ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز از سرکار ص ۳۶۸، نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ج ۱ ص ۶-۲۵ از جی۔ ایس۔ سردیسائی، فال آف دی مغل امپائر از سڈنے جے اوون ص ۵۴ طبع ۱۹۶۰ء، ہسٹاریکل الیمینز از قانون گو ص ۱۰۲۔

[۱۵] شیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۳۵۹۔

[۱۶] نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز (ہندی ایڈیشن) ج ۱ ص ۲۶۵ و ۳۳۵۔

[۱۷] اے شارٹ ہسٹری آف اورنگ زیب (ہندی) ص ۷-۳۰۶، نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۲۱۶، سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۸-۳۲۷، دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز از ڈاکٹر سریندر ناتھ سین ص ۱۸ حاشیہ ۲۔

[۱۸] نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۳۲۵ و ۳۵۵۔

[۱۹] دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز ص ۱۷ حاشیہ ۲۔

[۲۰] مین کرنٹز آف مرہٹہ ہسٹری از جی ایس سردیسائی ص ۱۳ و ۱۴۔

[۲۱] جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جب کسی امیر نے رافضی کش نام کا ایک پیش قبض (خنجر) شہنشاہ کے حضور پیش کیا تو اورنگ زیبؒ نے اظہار مسرت فرماتے ہوئے اس قسم کے کچھ اور خنجر تیار کرانے کا حکم صادر فرمایا۔ ملاحظہ ہو مغل ایڈمنسٹریشن (ہندی)

ص ۱۲۶، مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔

۲۲؎ ایضاً ص ۱۲۶ نیز انیکڈوٹس آف اورنگ زیب صفحات ۱۲۲ تا ۱۲۵۔

۲۳؎ تزکِ بابری اردو ترجمہ ص ۲۶۲ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۶۵ء۔

۲۴؎ میرک معین الدین احمد خوافی کے سوانحی حالات اور ان کی خدمات کے لئے ملاحظہ ہو مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ تلخیص و ترجمہ از محقق شہیر حضرت مولانا مفتی نسیم احمد صاحب امروہی مدظلہ العالی ص ۴۶ تا ۵۱ حاشیہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۹۶۰ء۔

۲۵؎ اے شارٹ ہسٹری آف اورنگ زیب ہندی ص ۳۶۱ طبع ستمبر ۱۹۵۱ء

۲۶؎ اینک ڈوٹس آف اورنگ زیب ص ۸۴۔

۲۷؎ ہسٹری آف شاہ جہاں آف دلی از ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ ص ۲۸۷ مطبوعہ ۱۹۵۸ء۔

۲۸؎ میانہ قبائل افغانستان میں سے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اس قبیلہ کا مورثِ اعلیٰ حسن خاں میانہ جہانگیری دورِ حکومت میں وارِدِ ہندوستان ہوا۔ دربار میں رسائی حاصل کرکے دکن میں کسی عہدہ پر مامور ہوگیا۔ نواب عبدالرؤف خاں میانہ خانِ موصوف ہی کے احفاد میں سے تھا جو دکن کی عادل شاہی حکومت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ ۱۶۸۶ء میں اس ریاست کے مغل سلطنت میں انضمام کے بعد نواب موصوف نے اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کی ملازمت اختیار کرلی۔ شہنشاہ نے اُسے سات ہزاری منصب اور دلیر خاں کے خطاب سے نوازا۔ مختلف مقامات پر شاہی خدمات انجام دیتے ہوئے بعہد بہادر شاہی ۱۷۱۱ء میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔

۲۹؎ مہدوی فرقہ سید میر محمد جونپوری متوفی ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء کی طرف منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مہدی ہونے کے مدعی تھے۔ سترہویں صدی کے وسط تک اس فرقہ کے باقیات بیجاپور میں موجود تھے۔ اس فرقہ کے بانی اور حالاتِ زندگی کے لئے دیکھئے "تذکرہ" مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

مرتبہ جناب ملک علم صاحب ص ۲۲ نیز ۴۶ تا ۵۰ ، اور ص ۲۵۷ حاشیہ ۲ مطبوعہ ۱۹۵۱ء۔
اُردو آف سیوا جی ص ۹۰۔

ایک ڈائنس آف اورنگ زیب ص ۳ ۔ ۱۲۲ نیز مغل ایڈمنسٹریشن ص ۱۲۷۔

ایک ڈائنس آف اورنگ زیب ص ۸۴ نیز مغل ایڈمنسٹریشن ص ۱۲۶۔

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر از علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۲۵ مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔

اسماعیلی شیعہ سیدنا امام جعفر صادقؒ (م ۱۴۸ھ) کے صاحبزادے سیدنا اسماعیلؒ سے انتساب کے سبب اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔ ان کا دوسرا نام تعلیمیہ بھی ہے۔ یہ امامیہ (اثنا عشری) فرقہ کی ہی ایک شاخ ہے جو جمہور امامیہ سے سیدنا جعفر صادقؒ کی جانشینی کے بارے میں اختلاف رکھتا ہے چنانچہ صرف سات اماموں کو تسلیم کرنے کے سبب ابتدا میں سبعیہ بھی کہلاتا تھا ملاحظہ ہو مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی ایم ۔ اے ۔ آئی ۔ ای ۔ ایس صفحات ۲۱۵ تا ۲۲۸ نیز ص ۲ ۔ ۳۲۳ ۔

لفظ بوہرا ہندی زبان کے لفظ بیوہرا (ब्योहरा) سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی روپیہ قرض دینے والا (Money - lender) یا تاجر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بوہروں کا پہلا داعی عبداللہ یمن سے روانہ ہوکر ہندوستان میں کھنبائت (صوبہ گجرات) کے ساحل پر ۱۰۶۷ء میں وارد ہوا۔ اس کی تبلیغی مساعی نے قلیل عرصہ میں حیرتناک کامیابی حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ گجرات کا راجہ سدھ راج جے سنگھ اور اس کی رعایا کی اکثریت اسماعیلی ہوگئی۔ ہندوستان کے بوہرے داؤدی اور خوجے اسماعیلیہ ہی کے باقیات ہیں۔ ان میں بوہرے نسبتاً ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ بوہرہ اسماعیلیہ جماعت دو بڑے فرقوں میں منقسم ہے جن میں سے ایک داؤد بن قطب شاہ کی رعایت سے داؤدیہ (داؤدی) اور دوسری شاخ سلیمان ابن یوسف کی پاسداری سے سلیمانیہ کہلاتی ہے۔ تعدادی لحاظ سے داؤدی فرقہ کو غلبہ حاصل ہے۔ چونکہ اس فرقہ کی غالب اکثریت

ہندو نژاد ہے اس لئے اسماعیلیوں کے بعض فرقے بہت سے ہندو رسم و رواج اور اعمال و عقائد مثلاً حلول و تناسخ کے قائل ہیں اور فاطمی خلیفہ حاکم کو خدا کا اوتار تسلیم کرتے ہیں۔ ان عقائد کے سبب غیر مسلم مورخین کا ان سے اظہار ہمدردی کرنا لازمی بات ہے۔

۳۵ کریسنٹ ان انڈیا ص ۹۰-۵۸۸۔

۳۶ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۹۶، نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۱۷۷۔ کریسنٹ ان انڈیا ہندی ترجمہ ص ۵۹۰ نیز وِدُرُوہ کا مہادیر (ہندی) ص ۱۰۶ مصنف مسٹر ڈینس۔

۳۷ شیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۹۷-

۳۸ ایضاً حاشیہ ص ۹۹ نیز اسی تصنیف کا ہندی ملخص ایڈیشن ص ۴۔۵۳۔

۳۹ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ضمیمہ ص ۱۰۳۔

۴۰ کریسنٹ ان انڈیا ص ۹-۵۸۸۔

۴۱ نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۱۷۸ نیز سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۹۸۔

۴۲ ایضاً ایضاً ص ۹۲، ۹۹۔

۴۳ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۱۷۲، ۱۷۴ نیز نیو ہسٹری آف مرہٹاز ۲۳۹۔

۴۴ ایضاً۔ سورت کی اس غارت گری کے سلسلہ میں مرہٹی زبان کے تاریخی لٹریچر میں سورت کے ساتھ فخر و مباہات کے طور پر جا بجا "بے سورت" یعنی بدشکل کا استعمال کیا گیا ہے (ہندی زبان میں سورت اور صورت کا املا یکساں ہوتا ہے) ملاحظہ ہو نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ہندی ایڈیشن ص ۱۷۸ ج ۱۔

۴۵ دیباچہ تاریخ سندھ۔

(ختم شد)

مُسلم خواتین اور تعلیم
(قرونِ اولیٰ اور وسطیٰ میں)

از پروفیسر ڈاکٹر آنسہ لعل بہا ، شعبۂ تاریخ پشاور یونیورسٹی ۔ پاکستان

علم کی فضیلت قرآن کریم اور احادیث نبوی میں کئی بار اور بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے ۔ اور مسلمانوں کو تحصیل علم کی ہدایت اور تاکید کی گئی ہے ۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نے نوع بشر پر جو ان گنت احسانات کیئے اُن کی وجہ سے صنفِ نازک کے مقام و رُتبہ ، عزت و وقار اور حقوق میں جو انقلاب آفریں خوش آئند تغیر ظہور پذیر ہوا ، اُس کی مثال تاریخ عالم میں کوئی دوسری قوم ، کوئی دوسری تہذیب اور کوئی دوسرا معاشرہ پیش نہیں کرسکتا ۔ شعبہ ہائے حیات میں مرد و زن کے حقوق میں ایک مساویانہ روش اختیار کی گئی ہے اور ضیائے علم سے بھی دونوں کو منور ہونے کی اجازت دی گئی ہے بلکہ تاکید کی گئی ہے ۔

صرف چند احادیث فضیلت علم کے بارے میں پیش کی جاتی ہیں ۔ ارشاد نبوی ہے :
طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان عورت اور مرد پر فرض ہے) ایک اور فرمانِ رسولؐ ہے : من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتیٰ یرجع (جو شخص علم کی طلب میں نکلے ، وہ اللہ کی راہ میں ہے ، یہاں تک کہ وہ واپس لوٹے)

ندیہ اقوال اُطلبوا العلم من المہد الی اللحد اور اطلبوا العلم ولوکان بالصین
م جھولے سے لے کر لحد تک علم حاصل کرو۔ اور تم علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے چین
انا پڑے) تو زبان زدِ عام ہیں۔

علم دین کا حاصل کرنا مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں ضروری قرار دیا گیا ہے۔
ق کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم سکھانے کی تاکید فرما کر اسے باعث
اب بتایا ہے اور لڑکیوں کو علم و ادب سکھانے کی ہدایت فرمائی۔

مسجد نبویؐ کو اسلام کی اولین علیم درسگاہ کا شرف حاصل ہوا۔ جہاں آنحضرت صلعم
صحابہ کرامؓ کو درس دیتے رہتے تھے۔ اور اس طرح آپؐ نے اسلامی نظام تعلیم کی خود بنیاد
بھی اور نظارت بھی خود فرمائی۔

ابتداء میں مسلم خواتین ان درسوں میں شرکت نہیں کرتی تھیں۔ اور اُن کے مرد بھی اُن کو
سجد نبویؐ جانے سے روکتے تھے۔ نبی کریم صلعم نے ان کو حکم صادر فرمایا کہ "تم اللہ کی بندیوں
عورتوں) کو اللہ کی مساجد میں جانے سے نہ روکو" نتیجتاً مسلم خواتین کی ایک کثیر تعداد اُن کی
جالس وعظ و تعلیم میں حاضر ہونے لگی۔ اور آپؐ کی تعلیمات سے مستفید ہونے لگیں۔ مگر
ونکہ بعض زنانہ مسائل حضورؐ سے براہ راست نہیں معلوم ہو سکتے تھے۔ اس لئے مسلم خواتین
م المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری ازواج مطہراتؓ سے اس بارے میں رجوع
رتیں، اور اس طرح خواتین کے مخصوص مذہبی مسائل سے وہ ان کو آگاہ کرتیں۔ خواتینِ انصار کا
وق و شوقِ علم مندرجہ ذیل حدیث سے عیاں ہوتا ہے:

وَقَالَتْ عَائِشَۃُ رضؓ نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ۔ لَمْ یَمْنَعْھُنَّ الْحَیَاءُ
ن یَتَفَقَّھْنَ فِی الدِّیْنِ (عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انصار کی عورتیں کیا اچھی عورتیں ہیں۔
ن کو حیا نے اِس بات سے نہیں روکا کہ دین میں سمجھ حاصل کریں)

اگرچہ خواتین کو یہ سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ پھر بھی انھوں نے محسوس کیا کہ

اُنھیں ہفتہ میں ایک دن بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لئے مخصوص کرالینا چاہیئے۔ چنانچہ آن کی درخواست پر ہفتہ میں ایک دن ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اُس دن آپؐ اُن کے سوالات کے جوابات دیتے، اور وعظ و نصیحت فرماتے۔ ان اجتماعات کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے۔ مسلم خواتین غزوات میں اپنے جان و مال کے ذریعہ دل کھول کر مدد کرنے لگیں۔ نیز آپ صلعم نے خواتین کو یہ مشورہ بھی دیا کہ چرخہ کاتیں اور گھریلو صنعتوں میں دلچسپی لیں۔

اہل بیت یں ازواج مطہراتؓ، حضرت فاطمہؓ، ان کی صاحبزادیاںؓ اور پوتیاںؓ تحصیل علم اور فروغ علم میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ اور اس طرح مسلم خواتین کے لئے ایک عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے رہبری اور رہنمائی فرماتی ہیں۔ اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے تبحرِ علم کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دین کا آدھا علم حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔ آپ سے ۲۲۱۰ احادیث مروی ہیں۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ جو فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "میں نے کسی ایک کو بھی معانی قرآن، احکام حلال و حرام، اشعارِ عرب اور علم الانساب میں عائشہؓ سے بڑھ کر نہیں پایا۔" فقہ کے علاوہ ان کو ادب اور طب میں بھی بڑا دخل تھا۔ حضرت عائشہؓ کو اسلام میں اولین معلمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت عائشہؓ کا حلقۂ درس و تدریس بہت وسیع تھا۔ لڑکے، عورتیں اور جن مردوں سے حضرت عائشہؓ کا پردہ نہ تھا، وہ حجرہ کے اندر آکر مجلس میں بیٹھتے تھے۔ اور دوسرے لوگ حجرہ کے سامنے مسجدِ نبوی میں بیٹھتے۔ دروازہ پر پردہ پڑا رہتا۔ پردہ کی اوٹ میں وہ خود بیٹھ جاتیں، لوگ سوالات کرتے، یہ جوابات دیتیں، کبھی کوئی سلسلۂ بحث چھڑتا اور استاذ شاگرد اس خاص موضوع پر گفتگو کرتے کبھی خود کسی مسئلے کو چھیڑ کر بیان کرتیں اور لوگ خاموشی کے ساتھ سنتے۔ تابعین میں اُس عہد کے جو علمائے حدیث ان کے خوشہ چین نکلے ان میں اڑتالیسؓ عورتیں تھیں۔

امہات المومنین حضرت حفصہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ دونوں پڑھنا اور لکھنا جانتی تھیں۔ آنحضرت صلعم کے حکم پر حضرت حفصہؓ نے پڑھنا لکھنا شفاء بنت عبداللہ العدویہ سے سیکھا تھا۔ یہ حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں۔ حضرت ام سلمہؓ شاعرہ بھی تھیں۔ اُن کی دختر زینب بنت ابو سلمہ اپنے وقت کی عورتوں میں بہت بڑی فقیہہ تھیں۔ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ قرآن پاک، حدیث کے ساتھ عروض میں بھی درک رکھتی تھیں اور بہترین خطیبہ تھیں۔ ان کی صاحبزادیاں حضرت زینبؓ اور حضرت اُم کلثومؓ زیور علم سے آراستہ تھیں۔ ان کی پوتیاں حضرت سکینہ اور حضرت فاطمہ صغریٰ تعلیم یافتہ خواتین تھیں۔ حضرت سکینہ کو شاعری اور ادب سے لگاؤ تھا۔ مدینہ منورہ میں ان کی قیام گاہ، مرجع علماء، فقہاء، شعراء اور ادباء تھی۔ حضرت عائشہؓ کی بھانجی عائشہ بنت طلحہ جو آپ ہی کی تربیت یافتہ تھیں، بہت بڑی عالمہ تھیں۔

عہد بنو عباس کی اولین دو صدیاں اور اندلس میں دولت بنو امیہ کا عروج مسلمانوں کے سیاسی اور ذہنی ارتقار کی انتہا ثابت ہوا۔ اِس سنہری دَور میں مسلمانوں نے علوم و فنون میں جو بے مثال ترقی کی، اس سے بعد میں مغربی دنیا نے اپنی شمعِ علم روشن کی۔

اُس زمانے میں درس و تدریس کا قدیم طریقہ رائج تھا، اور مساجد میں اور علماء کے ہاں حلقے اور مجالس منعقد ہوتی تھیں اور ذوق و شوق علم کا یہ عالم بیان کیا گیا ہے کہ ایک ایک حلقۂ درس میں ہزاروں کی تعداد میں حاضرین ہوتے تھے جن میں لکھنے والے اور سننے والے دونوں شامل ہوتے تھے۔ امراء، رؤساء، خلفاء کے یہاں مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ تعلیم کی نوعیت و ماہیت اور درس و تدریس میں ایک بڑا انقلاب آیا۔ باقاعدہ اور منظم تعلیم کے لئے مدارس، کلیات، جامعات اور اکادمیاں معرض وجود میں آنے لگیں۔ جن کی سرپرستی خلفاء، وزراء، امراء اور علماء کرنے لگے۔ بغداد میں بیت الحکمۃ اور نظامیہ جیسے شاندار تحقیقی اور علمی ادارے قائم ہوئے، جن میں اساتذہ کے لئے تنخواہوں اور طلباء کے لئے وظائف کا

انتظام بھی کیا گیا۔ نظامیہ کی طرز پر خراسان، عراق، شام اور مصر میں سیکڑوں مدارس تعمیر کیے گئے۔

دنیائے اسلام میں چاروں طرف شمعِ علم روشن تھی اور دخترانِ اسلام نے بھی اس کی روشنی میں بہت کچھ سیکھا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ علوم و فنون کی اتنی زیادہ ترقی اور وسیع پیمانے پر پھیلاؤ دخترانِ اسلام کے ذوق و شوق کے لئے باعثِ کشش نہ ہوا ہو۔ اور تاریخ اسلام ایسی روشن اور قابلِ فخر مثالوں سے بھری پڑی ہے جن ادوار کا ذکر ہو رہا ہے ان میں خواتین اسلام نے قابلِ ستائش علمی سرگرمیوں کا ثبوت دیا ہے۔

کئی خواتین زمرۂ علماء میں شامل تھیں اور کئی علماء اور فقہاء کی ماؤں اور بہنوں نے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی علم کی کٹھن راہوں میں راہبری کی، امام ابن جوزیؒ کی پھوپھی ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام صحیح طور پر نہ کرتیں تو ہم ان جیسے جلیل القدر امام سے محروم رہتے۔ اگر امام ربیعۃ الرائیؒ (استاد امام مالکؒ) و حسن بصریؒ کی والدہ ماجدہ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہ دیتیں تو وہ اتنے بلند پایہ امام و عالم نہ ہوتے۔ اگر قاضی زادۂ روم کی خواہر اُن کی مالی اعانت نہ کرتیں تو شرح چغمنی (عربی کی ریاضیات پر کتاب) جیسی نادر کتاب ہمارے کتب خانوں کی کیونکر زینت بنتی؟ اسی طرح اگر امام بخاریؒ کی والدہ ماجدہ اور ان کی خواہران کی کفالت نہ کرتیں تو ہم کو صحیح بخاری شریف کہاں سے ملتی؟

ہمیں علماء خواتین کی تعداد ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ امام حافظ ابن عساکر مؤرخِ دمشق نے فن حدیث جن علماء سے سیکھا اُن میں اسّی سے زیادہ خواتین تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ کے اساتذہ میں کئی عورتیں شامل تھیں۔ علامہ سیوطی کی معلمہ آسیہ الکمنا کو علم حدیث میں کمال تھا۔ بوران خلیفہ مامون الرشید کی ملکہ جیّد عالمہ تھیں۔ رضیہ جو

نجم سعیدہ کے لقب سے مشہور تھیں، شاعرہ اور مؤرخہ تھیں۔ علماء اور فضلاء کی محفلوں میں شرکت کرتی تھیں۔ اسی طرح شہدہ خاتون جید عالمہ تھیں اور حدیث، تاریخ اور ادب میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ ان کے ہم عصر بغداد کے کئی علماء کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ شیخہ سیدہ فخرالنساء جامع مسجد بغداد میں کثیر التعداد حاضرین کے سامنے علم کلام، شاعری اور ادب پر بڑے بلیغ خطبے دیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ان کے فخرالنساء کہلانے کی ہوئی۔ فاطمہ بغدادیہ جو مصر میں سکونت پذیر ہوگئی تھیں، نہایت جلیل القدر واعظہ تھیں۔ ان کی مجلس وعظ میں اکابرین حتیٰ کہ شاہ مصر بھی شرکت کرتے تھے۔ صبح کے وقت وہ عورتوں کو فقہ و حدیث کا درس دیا کرتی تھیں۔ جن میں تقریباً پچاس ساٹھ طالبات شریک ہوتی تھیں۔

اسپین میں جب اموی خاندان عروج پر تھا۔ علوم و فنون میں مسلم خواتین نے قابل رشک کمال حاصل کیا۔ قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ اور اشبیلیہ میں کثیر تعداد میں عالمہ اور فاضلہ عورتیں موجود تھیں۔ وہ کالج کے کمروں میں لڑکوں کے ساتھ لیکچر سنتی تھیں، شاعری کرتی تھیں اور ادبی مذاکروں اور مجمعوں میں مردوں کے مد مقابل آتی تھیں۔ حفید بن زہر اشبیلیہ کے مشہور طبیب کی بہن اور بھانجی طب اور معالجات میں عالمہ تھیں اور امراض نسواں کے معالجے میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ خلیفہ منصور (فرماں روائے اندلس) کے محلات کا علاج اُن کے سپرد تھا۔

اسلامی معاشرے کے اونچے اور اوسط طبقوں میں خواتین اتنی کثرت سے زیور علم آراستہ ہو رہی تھیں تو ایسی سازگار اور خوشگوار فضا میں کنیزوں اور لونڈیوں تک کو علم سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم ہوئے اور بہت سی باندیوں نے اپنے دامنوں کو علمی جواہر پاروں سے بھرا۔ خلفاء اور امراء کی حرم سراؤں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ کنیزیں داخل ہوتی تھیں۔ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ کی کنیزوں میں سے سَو کنیزیں

حافظِ قرآن بتائی جاتی ہیں جو کہ اُن کو روزانہ قرآن مجید سناتی تھیں۔

دختران اسلام نے علوم وفنون کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی عملی طور پر کرتے ہوئے تدریسی ادارے قائم کرنے کا شرف بھی حاصل کرکے اپنی علم دوستی کا بیّن ثبوت فراہم کیا۔ مشہور ومعروف تدریسی ادارے دمشق، بغداد اور مصر میں معرضِ وجود میں آئے جن کے بانیوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے خاندان کی خواتین سرِفہرست نظر آتی ہیں۔ دمشق میں رابعہ بنت نجم الدین اور ستّ الشبام بنت نجم الدین (صلاح الدین ایوبی کی بہنیں) نے مدارس قائم کیے۔ ایک اور شہزادی عذرا بنت نور الدولہ نے العذرویہ کی بنیاد رکھی۔ شاہی خاندان کی ایک خاتون بنتِ عزّ الدین نے الاتابکیہ قائم کیا۔ خاتون عزیزہ نے المرزانیہ کی بنیاد ڈالی۔ ایک اور مدرسہ الدّماغیہ قائم کیا گیا جو ایک جیّد عالمِ دین شجاع الدین بن الدماغ کی بیوی کی علم دوستی کا نتیجہ تھا۔

فاس میں جامعہ قرّوبین کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اور یہ ایک رئیس زادی جو فاطمہ کہلاتی تھیں، کے شوقِ علم کا نتیجہ تھا۔ بغداد کی بنت ابی یعقوب جو کہ مشہور معروف معلمہ تھیں، اپنے نام کا ایک مدرسہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کھول کر پائندہ بنا دیا۔ مصر میں شہزادی عصمۃ الدین بنت العادل نے القطبیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ اسی طرح مصر ہی میں ایک امیر شخص کی بیوی عشوراء بنت ساروع نے ایک تعلیمی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔

بقیہ نظرات

ایوانوں میں زلزلہ سا آجاتا تھا، وہ چمن خاموش ہو گیا اجڑ گیا جس میں "آئینِ جواں مردان حق گوئی و بیباکی" کے جیتے جاگتے، ہنستے اور بولتے ہوئے پھول مہک رہے تھے، جمیل مہدی کی وفات ایک فرد کی ہی موت نہیں ہے بلکہ ایک دورِ حریت، آزادیٔ فکر و ضمیر، خود داری و خود اعتمادی کے ایک درخشاں عہد کی موت ہے۔ دیوبند کے "خطۂ صالحین" (قبرستان قاسمی) میں سینکڑوں اولیائے کاملین، مفسرین، محدثین اور شہدائے کرام کے مزارات کے درمیان صرف جمیل مہدی کی تدفین عمل میں نہیں آئی بلکہ ملی دردمندی، خلوص، بے غرضی اور بے خوف اظہار خیال کی گراں قیمت روایات منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گئی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دورِ زوال و پستی میں جب کہ بہت سے قلم اور بہت سی زبانیں بازار کی ایک جنس بن کر رہ گئی ہیں، ان گراں مایہ قدروں اور روشن روایات کی بڑی اہمیت ہے جن کو جمیل مہدی نے اپنا خونِ دل و جگر دے کر زندہ رکھا اور آخر دم تک ان کو سینے سے لگائے رہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے، قارئین کرام سے پرخلوص گذارش ہے کہ مرحوم کے لئے ایصال ثواب کا خاص اہتمام فرمائیں۔ یہ ادارۂ برہان اور خود راقم الحروف پر بہت بڑا احسان ہوگا!

ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی ۔۔۔!!

از۔ عمید الرحمن عثمانی

برہان، اور ادارۂ ندوۃ المصنفین کی کشتیٔ حیات کیسے کیسے طوفانوں اور کیسی کیسی خوفناک موجوں سے گزر رہی ہے، اس کی ایک اہم، اندوہناک اور دل دوز کڑی وہ حادثۂ فاجعہ ہے جو ۱۳ فروری کی صبح کو پیش آیا جس سے دل و دماغ کی کائنات اور ہوش و حواس کی دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔۔۔ برادر محترم جمیل مہدی کی وفات حسرت آیات ادارہ برہان کے لئے ایک خوفناک، لرزہ خیز اور تہلکہ انگیز واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، حضرت والد ماجد مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کی وفات حسرت آیات کے بعد ایک شجر سایہ دار سے محرومی تھی، مگر زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں ہولناک تپش اور دھوپ کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ سہارے نظر آتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی سرپرستی مجھے ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا حوصلہ دیتی تھی، ان کی شدید علالت اور سفر پاکستان کے موقع پر میرے بہنوئی جناب بھائی اظہر صدیقی نے میرا ساتھ دیا، دست تعاون بڑھایا اور کچھ عرصہ برہان کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے انتقال کے بعد بھائی جمیل مہدی نے برہان کی ادارت سنبھال لی تو مجھے ایک گونہ اطمینان ہوگیا تھا مگر اس زندگی میں اطمینان و سکون تو

اب دولتِ گم گشتہ ہو کے رہ گئی ہیں بھائی جمیل مہدی بھی اس دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے اور میں پھر ایک بار بے سہارا ہو کر رہ گیا ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور ہم سب لوگوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین۔

باہ کرم دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ میری مدد فرمائیں اور میں حضرت مفتی صاحب کی علمی یادگار بربان کو "بادِ خزاں کے مسموم جھونکوں" سے محفوظ رکھ سکوں بلاشبہ حق تعالیٰ ہی محافظ حقیقی ہیں، وہی ہمارے حافظ و ناصر ہیں۔

جمیل مہدی کیا تھے اور کیا نہیں تھے یہ تو ملک بھر کے اخبارات و رسائل میں لکھا جا چکا ہے مگر مجھے سب سے زیادہ ان کے خلوص اور بے نوشی و بے نیازی کی شان اور اس تعلق کا احساس بہت دنوں تک بلکہ ہمیشہ یاد رہے گا جو گذشتہ دو سال میں مجھے ان کے اندر بدرجۂ اتم نظر آیا۔ میں تمام قارئین کرام سے خصوصی درخواست کرتا ہوں کہ بباہ کرم جمیل مہدی کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعائے مغفرت فرمائیں اور ان کے پس ماندگان کے لئے صبر جمیل کی توفیق کی دعا کریں بشکریہ۔!

والسلام۔

غم آگیں

عمید الرحمٰن عثمانی

(ڈائریکٹر ندوۃ المصنفین و برہان دہلی)

تبصرہ

باب التقریظ والانتقاد

از محمد عبداللہ طارق دہلوی رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

مصنّف ابن ابی شیبۃ جلد دہم (عربی)

تحقیق وتعلیق : مختار احمد الندوی

سائز : ۲۳ـــ۱۵ س م

کاغذ عمدہ ـ طباعت معیاری ٹائپ

ضخامت : ۵۷۸ مع فہرست

جلد : فل ریگزین عمدہ مضبوط

ناشر : الدار السلفیۃ ۱۳ـ محمد علی بلڈنگ ، بھنڈی بازار بمبئی ۴۰۰۰۰۳

زیر تبصرہ کتاب اپنے سیٹ کی دسویں جلد ہے اور اس کے بعد بھی کام جاری ہے، الدار السلفیہ نے محترم مولانا مختار احمد ندوی صاحب کی سرکردگی میں جو عظیم منصوبہ شروع کیا تھا وہ گویا مکمل ہونے کو ہے اور اس میں شک نہیں کہ الدار السلفیہ نے جو کثیر تعداد میں بڑی چھوٹی کتابیں شائع کی ہیں ان سب سے قطع نظر یہ ایک کام بھی اس کے لئے بڑا قابل فخر کارنامہ ہے ۔

ابن ابی شیبہ تیسری صدی ہجری کے شروع کے اونچے محدث اور بخاری ، مسلم ، ابوداؤد اور ابن ماجہ کے اساتذہ میں ہیں ، ان کی اس کتاب کے بعض اجزاء اب سے پہلے

چھپے تھے مگر پوری کتاب تحقیق وتعلیق کے ساتھ نہ چھپی تھی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا مختار احمد ندوی صاحب کو کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کتاب کو زندہ کر کے ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا بلکہ تحقیق وتعلیق کر کے کتاب کو اغلاط سے بھی بڑی حد تک پاک کر دیا۔ امید ہے بقیہ جلدیں بھی جلد چھپ کر منظر عام پر آجائیں گی۔

اتنے عظیم دفتر میں پورے اہتمام کے باوجود بھی کچھ بھول چوک ہوجانا کوئی عجیب بات نہیں ہے بالخصوص جبکہ کتاب میں سندیں بھی ہیں اور متون بھی، متن کی غلطی کا پکڑنا نسبتہً آسان ہے سیاق وسباق اس میں رہنمائی کر دیتے ہیں مگر سند کی غلطیوں کا پکڑنا بہت دشوار کام ہے اس لئے کہ بقول ابو اسحاق ابراہیم بن عبداللہ بخیرمی (م نحو ۲۵۵ھ) کے اس میں نہ سیاق سے کوئی رہنمائی ملتی ہے اور نہ قیاس اس میں کچھ رہبری کر سکتا ہے (المؤتلف والمختلف ص ۲ لعبدالغنی بن سعید الازدی)

چنانچہ خاص طور پر ہم سند کی بعض فروگزاشتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں تاکہ آئندہ ان کو درست کیا جا سکے:

(۱) صفحہ ۲۶۷ سطر ۴ میں جو سند ہے اس میں ایک نام "ابوالعدبس" جو کتاب کے دو مخطوطوں میں تھا محقق نے حذف کر دیا ہے اس لئے کہ سنن ابن ماجہ میں وہ نام نہیں تھا جبکہ سند ہو بہو وہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ نام یہاں ہونا چاہئے اس لئے کہ "ابوالعدبس" "ابوالعنبس" کے استاد ہیں جیسا کہ ابن ماکولا نے الاکمال میں (ج ۶ صفحہ ۸۱ - و - ۱۵۱) لکھا ہے چنانچہ ابن ماکولا نے یہ سند ہو بہو اسی طرح نقل کی ہے جس طرح مصنف ابن ابی شیبہ کے قلمی نسخوں میں ہے یعنی ابوالعنبس اور ابو مرزوق کے درمیان "ابوالعدبس" موجود ہے اگرچہ اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حاشیہ میں یہ نام "ابوالعدبس" دال کے

بعد یار (آخر الحروف) سے لکھا ہے، صحیح بار موحدہ سے ہے ع د ب تینوں مفتوح ہیں اور بار مشددہ ہے۔

سنن ابن ماجہ کی سند میں یہ نام نہ ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے نسخوں میں اختلاف ہے۔ حاشیہ پر ایک نسخے میں اس نام کی موجودگی کا بھی اشارہ دیا گیا ہے۔

(۲) صفحہ ۳۰۵ پر سطر ۳ اور سطر ۶ میں "جبل" ہے جو طبقات ابن سعد سے لیا گیا ہے قلمی نسخوں میں جمیل (ج م ی ل) تھا۔ اور اتفاق سے یہی جمیل جیم میم اور یار سے اصابہ (ج ۲ ص ۱۱۷) میں ہے اور ابن ابی شیبہ کی اسی روایت نمبر ۹۵۱۵ کا حوالہ دیا ہے مگر درست جبیل ہے (ج ب ی ل) جیسا کہ تاریخ کبیر بخاری (جلد ۲ قسم ۲ صفحہ ۲۴۴) اور ثقات ابن حبان (ج ۴ ص ۳۲۳) میں ہے۔ طبقات ابن سعد سے جو نقل ہوا ہے اس میں یار مثناۃ تحتیہ کے بجائے موحدہ آگئی ہے یہ بھی غلط ہے۔

(۳) صفحہ ۳۳۲ سطر ۱۰-۱۱ میں چھپا ہے: .... أخبرنا حصين عن أبي اليقظان حصين بن يزيد الثعلبي ـــــ اس کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ ابوالیقظان کا نام حصین بن یزید ہے حالانکہ ایسا نہیں محقق نے لکھا ہے کہ اس کا نام عثمان بن عمیر ہے اس لئے انہوں نے حاشیہ میں "کذا" لکھ کر اپنی بے اطمینانی کا اظہار تو کر دیا ہے مگر اس عقدے کا حل نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ابوالیقظان کے بعد "عن" چھوٹ گیا ہے یعنی ابوالیقظان نے حصین بن یزید التعلبی سے روایت لی ہے چنانچہ امام بخاری نے تاریخ کبیر (ج ۲ ق ۱ ص ۶) میں بعینہ یہی روایت اسی سند سے بیان کی ہے وہاں یہ "عن" موجود ہے اور ابن حبان نے الثقات (ج ۴ ص ۱۵۸) میں لکھا ہے کہ حصین بن یزید ثعلبی حضرت ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں اور حصین سے ابوالیقظان روایت کرتے ہیں۔

(۴) صفحہ ۳۴۳ حدیث نمبر ۹۶۱۳... عن الجریری عن أبي الورد عن ابن أعبد آو

ابن معبد قال: قال علی ....

محقق نے لکھا ہے "یہ تصحیح اس کتاب کی کتاب العقیقہ کی مدد سے کی گئی ہے، اصل کے دونوں نسخوں میں یہاں "ابن عبد" تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں اور کتاب العقیقہ میں جو کچھ ہے سب محرّف ہے صحیح "ابن أغیل" ہے بالهمزة واسكان الغين المعجمة وفتح التحتية ــــ اس نام میں تقریب کے نسخوں میں تحریف ہوگئی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لسان المیزان (ج ۶ ص ۱۲۱) میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے شمامۃ ابوالورد روایت کرتے ہیں، یہ بعینہ وہی سند ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ لہذا یہاں اور کتاب العقیقہ دونوں جگہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔

جدید علمی طریقے کے مطابق احادیث پر نمبرات بھی دیے گئے ہیں اسی طرح ابواب پر بھی نمبر ہیں اور ابواب اور کتاب کا ایک ہی تسلسل ہے یعنی کتاب الدعاء کا نمبر مثلاً: ۲۳، ۷۵ اہے تو اس کے ذیلی عنوان کا نمبر ۲۴، ۱۵ اہے۔

آج کے طرز تحقیق میں عربی میں یہ بھی ضروری چیز ہے کہ مشکل الفاظ اور غیر مانوس صیغوں پر اعراب دیدیے جائیں یہ گویا اشاروں کی زبان میں لفظ کی شرح ہوتی ہے، اس سے پڑھنے والوں کو بڑی سہولت ہو جاتی ہے، یہ اہتمام اس کتاب میں نہیں ہو سکا ہے جس کی بڑی وجہ غالباً طباعت کی دشواری ہے، ہندوستان میں ایسے پریس ناپید تو نہیں مگر ابھی ایک دو ہی ہیں جہاں ہر سائز کے تمام حروف اور جملہ اعراب دستیاب ہوں اور جہاں ہیں بھی وہاں کمپوزیٹران ابھی اتنے ماہر نہیں ہیں کہ ان تمام نزاکتوں کا لحاظ رکھ سکیں۔

یہ چند چیزیں فاضل محقق کی توجہ کے لئے عرض ہیں۔ امید ہے آئندہ تحقیق کا معیار مزید بلند ہوگا ہم اس عظیم کارنامے پر مولانا مختار احمد ندوی صاحب اور ان کے رفقاء کو اور

کارکنان الدار السلفیہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایسے ہی کسی اور اہم حدیثی دفتر کو زندہ کرنے کی طرف توجہ کریں گے۔

محمد عبداللہ طارق
۱۴۸ ۔ حضرت نظام الدینؒ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

خریدارانِ برہان کی خدمت میں
ایک ضروری گذارش

ماہنامہ برہان کے مفکر ملت نمبر کی اشاعت ماہ دسمبر میں ہوئی اس لیے دسمبر کا عام شمارہ شائع نہیں ہوسکا اس لئے خریدار حضرات کی مدت خریداری میں ایک ماہ کا اضافہ کردیا گیا۔

---

(۲) جو خریدارانِ محترم مفکر ملت نمبر حاصل کرنا چاہیں ان کو چاہیئے کہ مبلغ 6/51 روپے (زائد قیمت اور خرچ رجسٹری ڈاک) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ان کی خدمت میں مذکورہ نمبر بلا جلد بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ارسال کر دیا جائے گا۔

والسلام

منیجر
ادارۂ برہان
اردو بازار
جامع مسجد دہلی ۶

برہان

جلد ۱۰۱ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ مطابق مارچ ۱۹۸۸ء شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی میں چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

پورے ملک کے سماجی اور سیاسی نظام کو تعصب، نفرت، دہشت گردی، تفریق، نفاق، اختلاف، انتشار، بغض، کینہ، حسد، شرانگیزی، لسانی اور طبقاتی کشمکش کے مہلک امراض نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہمارے اردگرد کے ماحول میں خوف وہراس کی فضا چھائی ہوئی ہے اور یہ صورت حال یقیناً انتہائی تشویشناک اور قابل توجہ ہے۔ بداعتمادی، بے اعتباری اور جنگ وجدل کے ماحول اجتماعی طور پر ہمارے دل ودماغ کو متاثر کیے جارہے ہیں۔ ہم کہاں جارہے ہیں؟ کدھر جارہے ہیں؟ اور ہماری منزل مقصود کیا ہے؟ یہ ایسے بنیادی اور اہم سوالات ہیں جن کی طرف فوری سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مجموعی طور پر قوم وملّت کے ذی شعور افراد اور دانشور طبقے اس معاملہ میں تساہل برت رہے ہیں۔

یہ اصولی حقیقت ہے کہ "اچھا معاشرہ اچھے افراد سے بنتا ہے" اور دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ دنیا کے کسی بھی مذہب کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ اچھے افراد مذہب اسلام میں پیدا ہوئے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اسلام نے ہمیشہ شخصیت کی کی تعمیر اور فرد وجماعت کے اخلاق کی تطہیر پر زور دیا ہے، وہ آدمی سے اچھے کردار کا مطالبہ کرتا ہے نہ کہ صرف گفتار کا۔ انسانی زندگی کے جملہ تقاضوں، اس کی ذہنی، فکری،

جسمانی اور روحانی بالیدگی اور ارتقاء کو اسلام فکری انداز سے پورا کرنے کا قائل ہے۔ اسلام اپنے پیروکاروں کو دوسروں سے محبت کرنا سکھاتا ہے نہ کہ نفرت وعداوت۔ وہ اپنے ماننے والوں میں انسانیت، شرافت، اخلاق اور مروت کے اعلیٰ اقدار دیکھنے کا خواہاں ہے نہ کہ حیوانیت، شیطنت اور بداخلاقی کے جراثیم وامراض۔

اسلام بحیثیت تخلیق پوری نوع انسانی کو ایک "وحدت" اکائی اور کنبہ سمجھتا ہے، اس کا فلسفہ ہے کہ بحیثیت خالق اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے اور تخلیق و پیدائش کے اعتبار سے انسان ایک ہی جنس کی مختلف کڑیاں ہیں، اسلام تواضع، انکساری، ایثار وقربانی، حلم وبردباری اور عزم وہمت، عالمی اور انسانی مذہب ہے۔ اس کے باوجود دورِ حاضر میں ہمیں اس تلخ حقیقت کے ماننے سے کبھی انکار نہیں ہے کہ آج مجموعی طور پر ہمارا معاشرہ ابتری کا شکار ہے۔ ملت اسلامیہ جس پستی اور انحطاط کے دور سے گذر رہی ہے وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ مسلمان آج نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر بے کردار کیوں ہو رہا ہے؟ ان میں ہی زیادہ ترسنگین نوعیت اور بھیانک قسم کے جرائم کیوں پھیل رہے ہیں؟ اگر ہم بے لاگ انداز سے اپنا محاسبہ کریں تو پتہ چل جائے گا کہ ہمارا زوال خود ہمارے اعمال کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اسلام نے زندہ رہنے کا جو ہمیں گُر سکھایا تھا اُسے ہم نے نظر انداز کر کے فراموش کر دیا اور اُن راہوں پر چل پڑے جو بظاہر ہیں تو پرکشش لیکن وہ زوال پذیر قوموں کی گذرگاہیں ہیں۔ وہی تن آسانی، عیش وعشرت، لذتِ نفس کی راہیں جن پر ہزاروں قافلے گذر رہے اور دنیا سے مٹ گئے۔ عروج وزوال کے لئے قدرت کا بنایا ہوا قانون اٹل اور بے لچک ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ زوال کی راہوں پر چل کر ایک گروہ عروج حاصل کرے اور دوسرا پستی ونکبت سے دوچار ہو جائے۔ خواہ کوئی بھی اس راہ پر چلے قدرت کے مقرر کردہ اصولوں اور نتائج سے اُسے بہرحال

دوچار ہونا پڑے گا

یہ صحیح ہے کہ موجودہ وقت میں ہمارے معاشرے کی تقریباً وہی حالت ہے جو ظہور اسلام کے وقت لوگوں کی تھی اور جس کی بہترین تصویرکشی حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے بھرے دربار میں مظلوم مہاجر مسلمانوں کے وفد کے قائد سیدنا جعفرؓ بن ابی طالب نے اپنی معرکۃ الآرا تقریر میں کی تھی۔ ہمیں یہاں لینا چاہیئے کہ ہم دن بدن اخلاقی پستی کی طرف گرتے چلے جارہے ہیں۔ چھوٹی، بڑی اور نئی و پرانی ایسی کوئی برائی نہیں جو مسلم معاشرہ میں وبا کی صورت میں پھیل کر ہماسا مذاق نہ اُڑا رہی ہو۔ غور کیجئے! مجموعی طور پر اس قوم کا حال ہو رہا ہے جس کا کام نہ صرف برائی سے بچنا تھا بلکہ انسانیت کو برائی کے ارتکاب سے روکنا بھی تھا۔

"اَلنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ" (التوبہ) جس کا طرۂ امتیاز اور صفت تھی، ہمارے معاشرے میں کبائر اور سنگین جرائم کا ارتکاب جس طرح عام ہو رہا ہے اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے "خیرالامم" کے لقب سے سرفراز کی جانے والی قوم اپنا ماضی بھلا بیٹھی ہو۔ اپنا ملّی کردار کھو چکی ہو اور اپنی انفرادیت فراموش کر چکی ہو۔ یہ صورت حال بڑی الم انگیز ہے۔

معاشرتی اور سماجی برائیوں کی مثال ایسی ہے کہ ان کے وبال اور نتائج سے معاشرے کے وہ افراد بھی نہیں بچتے جو بظاہر ان میں شریک نہ ہوں۔ ایک ہی کشتی میں سوار بظاہر کچھ لوگ ڈوبنے سے اس لئے نہیں بچ سکتے کہ وہ سوراخ کرنے میں شریک نہیں تھے۔ ایک گھر کے کچھ مکین اگر گھر کو آگ لگا دیں تو اس گھر کے دوسرے مکین جلنے سے تو اس لئے نہیں بچ سکتے

کہ انھوں نے آگ نہیں لگائی، مکافات عمل کا یہ فطری قانون اور منطقی نتیجہ ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن کریم کی سورۂ انفال کی اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (انفال)

اس عذاب سے بچو جو صرف ان لوگوں پر ہی نہیں آتا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوں۔

اس وقت بلا مبالغہ بگاڑ اس قدر پھیل گیا ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہا۔ اصلاح حال کے لئے ہمیں اپنے کام کی ابتدا وہاں سے کرنی ہوگی جہاں سے خاتم النبیین، رسول رحمت جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت کے بگڑے ہوئے معاشرۂ انسانی کی اصلاح کے لئے کام کی ابتدا کی تھی اور انہی خطوط اور حدود میں اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہوگی جس کی رہنمائی قرن اول کے مسلمانوں کی دینی، علمی، دعوتی، تبلیغی، اصلاحی اور سیاسی زندگی میں ملتی ہے۔ ہمیں اپنے عقائد کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا، اسلام کی مقرر کردہ عبادات کو ان کی روح کے ساتھ عام کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا، معاملات کو صحیح اسلامی خطوط پر درست کرنا ہوگا۔ معیشت کا ایسا نظام قائم کرنا ہوگا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو۔ انسانیت، محبت، شرافت اور اخلاق کے اعلیٰ اور عظیم اقدار کے فروغ کے لئے تعمیر سیرت اور شخصی کردار کی طرف پوری توجہ دینی ہوگی۔ موجودہ بے اصول سیاست کو صحیح اسلامی تصور سیاست سے آشنا کرکے اس کو حسن انتظام اور خدمت خلق کی عظیم روایات سے ہمکنار کرنا ہوگا۔ مروجہ علوم و فنون کے بگڑے ہوئے مزاج کو درست کرنے کی سبیل کرنی ہوگی۔ نئے علوم و فنون

کی تحویل قبلہ کرنی ہوگی اور مادیت کی طرف سے ان کا رُخ موڑ کر روحانیت کی طرف کرنا ہوگا۔ فساد کے ان سوتوں کو بند کرنا ہوگا جہاں سے برائی نکل کر پھیلتی ہے۔ اصلاح کا کام اس وقت تک مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہر محاذ پر بیک وقت بُرائی اور استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا جائے گا۔ یہ سارے کام مشکل اور دشوار طلب ضرور ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہی کام کرنے کے ہیں، یہی وقت کا تقاضا بھی ہے اور مجموعی طور پر ملتِ اسلامیہ کا فریضہ بھی۔

انسانیت کے خیر خواہ اور بہی خواہ شب و روز ارتقائے انسانیت کی جدوجہد میں مصروف رہیں تو انسانیت کے حریف اور دشمن بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہتے۔ جہاں اور جس جگہ عوام کے ہمدرد، محب وطن اور انسان دوست افراد صلاح و فلاح کی دعوت دیں گے وہاں شر کے حامی بھی اپنے ابلیسانہ اور عیارانہ ہتھکنڈوں سے لیس ہو کر پہونچ جائیں گے۔ اچھے لوگوں کی اگر یہ کوشش اور دعوت ہوگی کہ نیک کام کرنے سے انسان کو حقیقی مسرت اور خوشی حاصل ہوتی ہے تو بدی کے فروغ کے خواہشمند بھی تشدد، نفرت، فرقہ واریت، لوٹ مار، قتل و غارت اور دوسری شیطانی خصلتوں میں مخلوق خدا کو مبتلا کرنے کے لئے اخلاق باختہ سماجی برائیوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ انسانیت اور شرافت کے ازلی دشمنوں سے نپٹنے اور ان پر غالب آنے کا سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ ہم صرف ذہنی اور فکری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر

مکمل مسلمان ہوں۔

آزادی کی چار دہائیاں پوری ہو جانے کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ملک ذہنی، عقلی، فکری اور سماجی اعتبار سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ آزاد ہندوستان میں انسانی زندگی اور مسائل حیات تو بے عدو بے شمار ہیں اور اس کی تفصیل کا یہ موقع بھی نہیں ہے۔ تاہم ملک کی آزادی کے بعد تعمیر و ترقی کا جو دور شروع ہوا اس کے عمومی فوائد اور نتائج براہ راست سماج کے غریب، کمزور، دبے کچلے اور پسماندہ طبقوں تک تاحال ذکر حد تک نہیں پہونچ پائے۔ سماج کے غریب اور کمزور طبقوں کے ساتھ مسلسل حق تلفی، ناانصافی اور استحصال کا عمل جاری ہے۔

قضا و قدر کے فیصلے اور قدرت کا نظام، اس وقت ہمارے ملک کے اکثر علاقے یا تو سوکھے اور خشک سالی کی زد میں ہیں جبکہ بعض حصوں میں بے پناہ بارش اور سیلاب نے جانی و مالی اعتبار سے ناقابل تلافی نقصان پہونچایا ہے، اور اس کا اثر بھی براہ راست اور زیادہ تر دیہاتوں اور قصبات میں رہنے والے غریبوں اور کسانوں پر پڑا ہے۔ اگرچہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں عوام کے فلاح و بہبود، بازآبادکاری اور ان کے اونچا اٹھانے کے لئے مقدور بھر کوشش اور جد و جہد کر رہی ہیں لیکن اس کا بھی اظہار یہاں ضروری ہے کہ اس کا فائدہ بھی بعض قوتوں کو ہی زیادہ پہونچ رہا ہے اور اس طرح حق دار اپنے بنیادی

حقوق اور امداد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے ارباب اقتدار و اختیار محض زبانی دعاؤں اور بیان بازیوں سے کام نہ لیں بلکہ موقع پر جاکر حالات کا عملی جائزہ لیں اور غریب و ضرورت مند لوگوں تک حکومت کی راحت رسانی اور تعمیر و ترقی کے زیادہ سے زیادہ فوائد پہونچانے کی کوشش کریں۔

ملک کا ایک اہم داخلی مسئلہ مختلف مذہبی، لسانی اور تہذیبی اکائیوں کے مابین اعتماد و اعتبار کی فضا کو بڑھاوا دے کر قومی یک جہتی کے کاز کو تقویت دینا ہے، اگرچہ مختلف فرقوں کے درمیان خلیج اور بعد کو بڑھاوا دینے کے ذمہ دار ہمارے موجودہ سیاست دانوں کے علاوہ حکمراں طبقہ بھی ہے تاہم اس کے انسداد کے لئے اخلاقی، روحانی اور جمہوری اقدار کو اجاگر کرنے کے ساتھ تمام جماعتوں کے سربراہوں سیاسی، سماجی اور مذہبی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ذاتی، وقتی اور پارٹی مفادات سے بالاتر ہو کر قومی مفاد کے تحفظ اور ملکی یکجہتی کے لئے کمربستہ ہوجائیں۔ اور یہی ایک راہ ہے متحدہ قومیت کے بقا کی۔ ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میرے بھائی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ صاحب

جناب شمس نوید عثمانی

معروف دردمند اہل قلم جناب شمس نوید عثمانی کی یہ مختصر مگر پراثر تحریر —— برہان کے "مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر" —— کے لئے لکھی گئی تھی مگر یہ دفتر برہان میں اس وقت وصول ہوئی جب مذکورہ نمبر ترتیب، کتابت وطباعت کے تمام مراحل سے گذر چکا تھا اس لئے اب اس کو برہان میں شائع کیا جارہا ہے۔

(ادارہ)

اپنے خاندان عثمانی کے جن بزرگوں کو "سُننے" کا ہی موقعہ ملا، "دیکھنے" کا نہیں، اس لئے کہ وہ دنیا میں میرے آنے سے پہلے یا ہوش میں آنے سے پہلے یا ہوش میں آنے سے پہلے ہی جاچکے تھے! —— ان میں سے مجھے سب سے زیادہ عقیدت روحانی جس خون کے رشتے والے بندۂ خدا سے محسوس ہوئی وہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے والد ماجد حضرت مفتی عزیز الرحمٰنؒ عثمانی ہیں! —— جو میرے بڑے چچا یا "تاۓ" دیوبند کی زبان میں تھے! ——

اور ——

خود مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح یا واقعات میں سب سے زیادہ

جس واقعہ نے مجھے اپیل کیا اور وہ میرے لئے اللہ کی رحمت سے سفرحیات کے زادِراہ میں شامل ہوگیا وہ مختصراً حسب ذیل ہے :-

"اپنی بیوی یعنی میری تائی اماں مرحومہ سے ان کے حسنِ معاشرت نے مجھے اپیل کیا اور پڑوس کی بیکسوں، بیواؤں کے ساتھ مفتی صاحب کے غمگسارانہ حسنِ معاشرت نے گہرا اثر ڈالا ۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری تائی اماں کی گفتگو نرم کم اور گرم زیادہ تھی ۔ مگر مفتی صاحب [illegible]' کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کی ہر گرمی کے جواب میں نرم ترین نرمی کی شان سے گرم" ہوتا تھا !! ۔ یعنی جس بات پہ تائے ابا کو غصہ ۔ بشری طور پر غصہ آجاتا تو اس کی پہچان یہ نہ تھی کہ ان کی آواز غصہ کے پارے کے ساتھ چڑھتی اور بلند ہوتی جائے ! ۔ بلکہ یہ تھی کہ غصہ کا پارہ جوں جوں چڑھتا جاتا تھا آواز پست تر ہوتی چلی جاتی تھی یہاں تک کہ اگر آواز محض زیرلب ہونٹوں کی سرسراہٹ تک ڈوب جائے تو سمجھ لیا جائے کہ اس وقت ان کا عتاب بشری اپنے شباب اور نقطۂ عروج پر ہے ؟ ۔

حقیقت میں شب بیداریاں اور روزہ داریاں سب اس کے آگے آسان تر ہیں کہ جذبات نفسانی کی تیز و تند آندھیوں اور زلزلوں میں اپنے اندرون کے گھر کا ایک پتہ بھی نہ ہل رہا ہو ۔ ایک ذرہ کو بھی اپنے مقام سے ہلنے کی کی اجازت نہ مل رہی ہو ۔

حقیقت میں یہ مومن کا دوہرا کردار تھا ۔ جس کے ذرے کے آگے پہاڑ بھی بھی بے وزن ہیں ۔ دوہرا اس لئے کہ ایک طاقت ور 'مرد' کا ردّعمل تھا ایک کمزور اور نہایت بدزبان تُنُک 'عورت' کے مقابلے میں !! ۔ اسی جگہ تو پیغمبر اسلامؐ نے ہم سے ہمارے 'مسلمان' ہونے اور 'عبد' ہونے کی

عملی دلیل وشہادت طلب" تھی ـــــ ان کے نزدیک وہی 'بندہ' جس کی باندی اور بیوی کی شکل میں کمزور بندی یہ گواہی دیدے کہ یہ میری کمزوری کے آگے اس لئے شیر نہیں ہو پاتا کہ اس کے پیش نظر ہمیشہ اس 'معبود' کی ذات رہتی ہے جس کا وہ بھی خود ایک بندہ ہے اور اس کی بیوی بھی اسی کی تخلیق اور بندی ہے ـــــ اور جس نے محض سنت کے اور خدا کے نام پر اپنی آزادی کی قربانی شوہر کے تابع ہو کر رہنے کی قربان گاہ پر دیدی ہے اس کے یا شوہر کے نفس کی قربان گاہ پر نہیں! ـــــ اس لئے شوہر کو حق نہیں پہونچتا کہ اپنے نفسانی جذبات کے وقت وہ اپنی 'شریک حیات' سے یہ مطالبہ کرے کہ یہاں میرے مقابلہ میں نیچی نظر آؤ! ـ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے بھی مفتی باپ کا یہ اُسوۂ حسنہ تھا کہ وہ نفس کے غیظ و غضب کے وقت خوفِ خدا سے مغلوب ہو کر پہلے اپنے آپ 'بندہ' ہونے کا عملی ثبوت دیتے تھے اور پھر ـــــ پھر خاموشی سے گویا 'بیوی' سے 'بندگی' کے ثبوت کی امید فرماتے تھے! ـــــ

ـــــ 'بیوی' ہی نہیں، ہمسائیگی کے لحاظ سے ہر کمزور 'بیوہ' کا بھی یہ تجربہ تھا کہ وہ ان کی تکلیف لیتے تھے اور اپنا آرام انھیں دیتے تھے! ـــــ برسات کی آمد سے پہلے ان بیواؤں کی کچی چھتوں پر یہ پکا مسلمان ایک 'بلا مزدوری والا مزدور' بن کر مٹی کوٹتا نظر آتا تھا اور روزانہ اپنا سودا لاتے ہوئے اس کی کمر پر محلے بھر کی بیکسوں کے سودوں کی الگ الگ پوٹلیاں اور بنڈل سوار ہوتے تھے۔"

یہ تھا مفتی صاحب کے مفتی صاحب کا کردار! ـ ایک ایسے باپ کے بیٹے میرے سامنے دو تھے ـ ان میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہمارے دیوبند سے دور دلی میں تھے

اور دوسرے صاحبزادے خود دیوبند میں قریب تر تھے لیکن یہ دور افتادہ دہلی والا تائے زاد بھائی جب بھی ہمارے قریب گھر یا سفر میں آیا ہم حیران ہو کر رہ گئے کہ وہ روحانی طور سے ان بھائی صاحب سے زیادہ ہم سے قریب نظر آیا کہ جو دیوبند میں تھے۔ اپنے والد کا یہ ورثہ بھی انہیں بطور خاص ملا تھا کہ حقوق العباد کو ایک لحاظ سے حقوق اللہ سے بھی زیادہ اہمیت دی جائے!۔ اس لئے کہ حقوق اللہ کی معافی اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے مگر حقوق العباد کی معافی بندوں ہی کے پاس رکھی ہے؟۔ اور بندے ؟ بندے کے لئے معاف کرنا اور بھول جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا خدا کے لئے آسان ہے!۔ دوسری طرف ٹھیک اپنے والد مرحوم کی طرح مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو بھی اپنی زندگی کے نصف آخر میں اپنی مرحومہ بیوی کی ناز برداری کا مجاہدہ کرنے کا موقعہ ملا تھا ۔ ان کی بیوی مفتی صاحب کی زندگی کے نصف اول میں یہی مجاہدہ خود کرچکی تھیں لیکن ۔ یعنی اول دور میں بیوی کو گرمی کے جواب میں نرمی کا صحرا کے ریاضت طے کرنا پڑا مگر پھر بیوی کی اس بندگی نے آخر اپنے شوہر کو بھی بندگی کے اسی امتحان میں ہنسی خوشی اترنے کی تحریک بخش دی اب بیوی کا مقام اپنے شوہر پر ناز کرنا تھا اور شوہر کا کام عمر بھر اسی بیوی کے ناز اٹھانا ۔

۔ گویا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ تو اس مجاہدے کے اول و آخر کامیاب مجاہد اور شہید حق تھے مگر ان کے بیٹے اور میرے بھائی عتیق الرحمٰن صاحب کا نصف آخر حیات آخر کار اتنے بڑے باپ کی سیرت کا شاہکار اور آئینہ دار بن گیا تھا!۔ ایک لحاظ سے یہ بیٹے کی کمی ہے اور باپ کی فضیلت!۔ مگر دوسرے زاویئے سے بیٹا، باپ سے آگے نظر آتا ہے: اس لئے کہ گناہ نہ کرنا ملکوتیت کی شان ہے مگر گناہ میں پھنس کر ملکوتیت تک اڑ جانا صرف معراج بشریت ہے؟۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دارالسلام میں۔ جنت الفردوس اور خلق عظیم والے حضورؐ کے پڑوس میں دائمی رفاقت و معیت کا تحفہ عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

●●

غزوۂ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت کے اسباب

قرآن، حدیث اور تاریخ کی روشنی میں

سید امین الحسن رضوی

احد کی جنگ، ۷ر شوال ۳ھ ہجری میں واقع ہوئی، اس میں مسلمانوں کی تعداد سات سو اور کفار قریش کی تعداد تین ہزار تھی۔ تمام کتب تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ اس جنگ میں اول مرحلہ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور قریشِ مکہ پسپا ہونے لگے لیکن بعد کو پانسہ پلٹ گیا اور بظاہر ہوتی ہوئی فتح، شکست نہ بھی سہی تو مسلمانوں کی یک گونہ ہزیمت میں تبدیل ہوگئی۔ اس صورت حال کے پیدا ہو جانے کے بارے میں بھی اجمالاً کتب تاریخ متفق ہیں کہ اس کا باعث دو باتیں ہوئیں۔ ایک تو مسلمانوں کا پسپا ہوتے ہوئے لشکرِ قریش کا تعاقب سے رک کر مالِ غنیمت کو جمع کرنے میں لگ جانا اور دوسرے مسلمان تیراندازوں کے اس دستہ کا، جسے آنحضور صلعم نے کوہ احد کی ایک گھاٹی پر متعین فرمایا تھا کہ اس طرف سے حملہ نہ ہونے دیں، درہ کو چھوڑ کر ہٹ جانا اور مال غنیمت جمع کرنے والوں میں شامل ہو جانا جس کے باعث خالد بن ولید کو (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) اس بات کا موقع ملنا کہ وہ اس طرف سے آکر مسلمانوں پر پہلو سے حملہ آور

ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مختلف پہلوؤں سے یہ تاریخی واقعہ زیادہ گہرائی سے مطالعہ کا متقاضی ہے۔

غزوات نبوی کے بارے میں یہ بات مستحضر رہنی چاہئے کہ ہر غزوہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قرآنی کے ذریعہ جو اس غزوہ کے متصلاً بعد نازل ہوئیں، اس غزوہ پر مجملاً اور کبھی نسبتاً تفصیل سے تذکرہ فرمایا ہے جبکہ متعلقہ واقعات مع اپنی جزئیات کے متعدد لوگوں کے ذہن میں تازہ تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان واقعات کے بہ کثرت چشم دید گواہ موجود تھے۔ اگر قرآن میں بیان کردہ ان واقعات اور اس کی جزئیات میں جو قرآن میں بیان ہوئیں کوئی ذراسی بات بھی خلاف حقیقت ہوتی تو کفار و منافقین کی زبانیں اس کی تردید میں بے محابا حرکت میں آجاتیں اور خود مسلمانوں کے دل میں قدر تاً ان آیات کے وحی الٰہی ہونے کے بارے میں شبہ پیدا ہوجاتا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور آج چودہ سو سال گذرنے تک ان واقعات کے کاملاً صحیح ہونے کے بارے میں اسلام کے بدترین مخالف و معاند کو بھی شبہ کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی اور اس بناء پر یہ بات پورے اعتماد اور بلا خوف تردید بلکہ بطور چیلنج کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح ان واقعات کا جس مستند ترین انداز کا ریکارڈ تاریخ میں محفوظ ہوگیا ہے اس کی ہمسری ممکن نہیں۔ لہذا جنگِ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے بھی آیاتِ قرآنی سے استناد کیا جائے گا جس سے واقعات کی صحت پر کلام کرنے کا محل باقی نہیں رہے گا البتہ جو نتائج ہم اخذ کریں گے ان سے اختلاف کی گنجائش باقی رہے گی۔

جنگِ احد کے مختلف مرحلوں کو پہلے ذہن میں تازہ کرلیں۔ اس جنگ میں آنحضورؐ نے لشکر اسلام کو اس طرح کھڑا کیا تھا کہ اس کی پشت پر احد کی پہاڑی تھی اور دائیں و بائیں بھی اس کا پہاڑی سلسلہ چلا گیا جو داہنی سمت تو بالکل مستحکم تھا البتہ بائیں سمت میں ایک درّہ تھا جس میں سے آدمی گذر سکتے تھے۔ سامنے احد کا میدان تھا، اس

طرح لشکرِ اسلام پچھلی سمت کی طرف سے اور دائیں پہلو سے کسی بھی حملہ سے بالکل مامون تھا صرف بائیں طرف کے درہ سے اس پر حملہ کا امکان تھا اور اس کے دفاع کے لئے آنحضورؐ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کے دہانے پر حضرت عبداللہ بن جبیر کی زیر کمان ۵۰ تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرما دیا کہ اگر اس طرف سے دشمن حملہ کرنے کی کوشش کرے تو اس کو روکا جا سکے۔ اس موقعہ پر جو ہدایات آپ نے اس دستہ کو دی تھی وہ ان الفاظ میں تھی:

"اگر تم لوگ یہ دیکھو کہ احد کے چیل کوے اور گدھ ہماری لاشوں کا گوشت نوچ کر کھا رہے ہیں تو بھی اس جگہ سے نہ ہٹنا۔"

جنگ کا آغاز حسب معمول کفار قریش کی طرف سے مبارزت طلبی سے ہوا۔ پہلے قریش کے نامور سردار طلحہ نے اپنے سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کو للکارا۔ سپہ سالار فوج آنحضور صلعم کے ایماء پر حضرت علیؓ صفوں سے نکل کر اس سے نبرد آزما ہوئے اور اسے واصل جہنم کیا۔ اس کو دیکھ کر اس کا لڑکا بپھرتا ہوا میدان میں آیا اور مبارزت طلب ہوا۔ آنحضورؐ نے اس دفعہ اپنے محبوب چچا سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو مقابلہ کا اشارہ کیا جنھوں نے بہ آسانی اپنے مقابل کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے بعد جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی اور کفار کی عددی برتری اور بہتر اسلحہ کے باوجود شروع ہی سے مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور رفتہ رفتہ قریش پسپا ہونے لگے۔ مسلمان ان کو دھکیلتے اور رگیدتے ہوئے آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ لشکر قریش اپنے خیموں (Camps) سے بھی پیچھے ہٹ گیا اور اس کی صفیں منتشر ہو گئیں۔ اس نوبت پر مسلمانوں نے تعاقب و قتال ترک کر کے لشکریوں کے خیمہ سے مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا۔ یہ صورت حال جب اس دستہ نے دیکھی جو درّہ پر متعین تھا تو یہ سمجھ کر کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور مسلمان فتح یاب ہو چکے ہیں، اس دستہ کے سپاہیوں نے اپنے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر کے روکتے رہنے کے باوجود درّہ چھوڑ دیا اور میدان میں آ کر دشمن کے خیموں سے

ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مختلف پہلوؤں سے یہ تاریخی واقعہ زیادہ گہرائی سے مطالعہ کا متقاضی ہے۔

غزوات نبوی کے بارے میں یہ بات مستحضر رہنی چاہئے کہ ہر غزوہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قرآنی کے ذریعہ جو اس غزوہ کے متصلاً بعد نازل ہوئیں، اس غزوہ پر مجملاً اور کبھی نسبتاً تفصیل سے تذکرہ فرمایا ہے جبکہ متعلقہ واقعات مع اپنی جزئیات کے متعدد لوگوں کے ذہن میں تازہ تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان واقعات کے بہ کثرت چشم دید گواہ موجود تھے۔ اگر قرآن میں بیان کردہ ان واقعات اور اس کی جزئیات میں جو قرآن میں بیان ہوئیں کوئی ذرا سی بات بھی خلاف حقیقت ہوتی تو کفار و منافقین کی زبانیں اس کی تردید میں بے محابا حرکت میں آجاتیں اور خود مسلمانوں کے دل میں قدر تاً ان آیات کے وحی الٰہی ہونے کے بارے میں شبہ پیدا ہوجاتا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور آج چودہ سو سال گذرنے تک ان واقعات کے کاملاً صحیح ہونے کے بارے میں اسلام کے بدترین مخالف و معاند کو بھی شبہ کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی اور اس بنا پر یہ بات پورے اعتماد اور بلا خوف تردید بلکہ بطور چیلنج کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح ان واقعات کا جس مستند ترین انداز کا ریکارڈ تاریخ میں محفوظ ہوگیا ہے اس کی ہمسری ممکن نہیں۔ لہٰذا جنگِ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے بھی آیاتِ قرآنی سے استناد کیا جائے گا جس سے واقعات کی صحت پر کلام کرنے کا محل باقی نہیں رہے گا البتہ جو نتائج ہم اخذ کریں گے ان سے اختلاف کی گنجائش باقی رہے گی۔

جنگِ احد کے مختلف مرحلوں کو پہلے ذہن میں تازہ کرلیں۔ اس جنگ میں آنحضورؐ نے لشکرِ اسلام کو اس طرح کھڑا کیا تھا کہ اس کی پشت پر احد کی پہاڑی تھی اور دائیں و بائیں بھی اس کا پہاڑی سلسلہ چلا گیا جو داہنی سمت تو بالکل مستحکم تھا البتہ بائیں سمت میں ایک درّہ تھا جس میں سے آدمی گذر سکتے تھے۔ سامنے احد کا میدان تھا، اس

طرح لشکرِ اسلام پیچھے پشت کی طرف سے اور دائیں پہلو سے کسی بھی حملہ سے بالکل مامون تھا صرف بائیں طرف کے درّہ سے اس پر حملہ کا امکان تھا اور اس کے دفاع کے لئے آنحضورؐ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کے دہانے پر حضرت عبداللہ بن جبیر کی زیر کمان ۵۰ تیراندازوں کا ایک دستہ متعین فرمادیا کہ اگر اس طرف سے دشمن حملہ کرنے کی کوشش کرے تو اس کو روکا جا سکے۔ اس موقعہ پر جو ہدایت آپ نے اس دستہ کو دی تھی وہ ان الفاظ میں تھی۔

"اگر تم لوگ یہ دیکھو کہ احد کے چیل کوّے اور گدھ ہماری لاشوں کا گوشت نوچ کر کھا رہے ہیں تو بھی اس جگہ سے نہ ہٹنا۔"

جنگ کا آغاز حسب معمول کفار قریش کی طرف سے مبارزت طلبی سے ہوا۔ پہلے قریش کے نامور سردار طلحہ نے اپنے سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کو للکارا۔ سپہ سالار فوج آنحضور صلعم کے ایماء پر حضرت علیؓ صفوں سے نکل کر اس سے نبرد آزما ہوئے اور اسے واصل جہنم کیا۔ اس کو دیکھ کر اس کا لڑکا بپھرتا ہوا میدان میں آیا اور مبارزت طلب ہوا۔ آنحضورؐ نے اس دفعہ اپنے محبوب چچا سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو مقابلہ کا اشارہ کیا جنھوں نے بہ آسانی اپنے مقابل کو ٹھکانے لگادیا۔ اس کے بعد جنگ مغلوبہ شروع ہوگئی اور کفار کی عددی برتری اور بہتر اسلحہ کے باوجود شروع ہی سے مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور رفتہ رفتہ قریش پسپا ہونے لگے۔ مسلمان ان کو دھکیلتے اور رگیدتے ہوئے آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ لشکر قریش اپنے خیموں (Camps) سے بھی پیچھے ہٹ گیا اور اس کی صفیں منتشر ہوگئیں۔ اس نوبت پر مسلمانوں نے تعاقب وقتال ترک کرکے لشکریوں کے خیمہ سے مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کردیا۔ یہ صورت حال جب اس دستہ نے دیکھی جو درّہ پر متعین تھا تو یہ سمجھ کر کہ جنگ ختم ہوچکی ہے اور مسلمان فتح یاب ہوچکے ہیں، اس دستہ کے سپاہیوں نے اپنے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر کے روکتے رہنے کے باوجود درّہ چھوڑ دیا اور میدان میں آکر دشمن کے خیموں سے

مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اُدھر پسپا ہوتے ہوئے لشکرِ قریش نے جب یہ دیکھا کہ ان کا تعاقب نہیں ہو رہا ہے تو انھیں اپنی ہزیمت پر غیرت آئی۔ ان کے سرداروں نے ان کی پھر سے صف بندی کی اور یہ لوگ منظم ہو کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے جن کی صف بندی ختم ہو چکی تھی اور اکثر مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف (حضرت) خالد بن ولید نے جو اس سے پہلے دو دفعہ اس درّہ کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ جب درّہ کو محافظوں سے خالی پایا تو اس طرف حملہ کر دیا اور حضرت عبداللہ بن جبیر اور ان کے پانچ ساتھیوں کو جو ان کے ساتھ باقی رہ گئے تھے شہید کر کے درّہ میں سے گزر کر مسلمانوں پر ان کے بائیں پہلو سے حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح غیر صف بند مسلمانوں پر سامنے سے قریشِ مکہ نے یلغار کی اور بائیں پہلو سے (حضرت) خالد بن ولید اور ان کے زیر کمان دستہ حملہ آور ہو گیا۔ نتیجہ میں مسلمانوں میں افراتفری مچ گئی اور جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔ اس وقت اگر کفار کچھ اور استقامت دکھاتے اور جنگ کو جاری رکھتے تو بظاہر اسباب مسلمانوں کی مکمل شکست یقینی تھی اور اس کے جو بھیانک عواقب ہوتے ان کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے لیکن مشیّتِ الٰہی کے تحت چراغِ مصطفیٰ کو ضیا بار رہنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے (حضرت) ابوسفیان کے دل میں جو اس وقت لشکرِ قریش کی قیادت کر رہے تھے (جو بعد کو فتح مکہ کے وقت مشرف بہ اسلام ہوئے) یہ بات ڈالی کہ بدر کی شکست کا انتقام مکمل ہو گیا اور جنگ اسی غیر فیصلہ کن مرحلہ میں ختم کر دی جائے، حالانکہ (حضرت) خالد بن ولید نے اصرار بھی کیا کہ جنگ جاری رکھی جائے اور بدلی ہوئی سازگار حالت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔

جنگ کا حال جو اوپر مختصراً عرض کیا گیا اس سے مسلمانوں کی دو غلطیاں بالکل

اضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کا پسپا ہوئے دشمن کے لشکر کے تعاقب سے رک
بانا (اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ جانا) اور دوسرے درّہ پر متعین دستے کا اپنے
مقام سے ہٹ جانا، فوجی نقطۂ نظر سے ان دونوں کا یکسر غلط ہونا تو اظہر من الشمس ہے ہی
وران کا نتیجہ وہی ہوا جو ان غلطیوں کے سبب ہونا ہی تھا تاہم ان غلطیوں کا قرآنی
آیات کے سیاق میں جائزہ لیا جائے گا تاکہ ان کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کیا جا سکے۔
ذیل میں پہلے ہم مسلمانوں کے دشمن کے تعاقب سے رک جانے اور مال غنیمت جمع
کرنے میں لگ جانے کے معاملہ کو لیتے ہیں۔

اس معاملے کے دو رخ ہیں۔ ایک تو تعاقب و قتال سے رک جانا اور دوسرے
مال غنیمت جمع کرنے میں لگ جانا۔ ان دونوں کا قرآنی آیات کی روشنی میں الگ الگ جائزہ
لیا جائے گا۔

پہلے تعاقب اور نتیجتاً قتال سے رک جانے کے معاملے کو لیجئے۔ اسلام میں جنگ
ملک گیری اور مال و زر کے لئے نہیں لڑی جاتی بلکہ وہ مذہب جو ایک انسانی جان
کو ناحق لینے کو پوری انسانیت کے قتل اور ایک انسانی جان کو بچانے کو پوری انسانیت
کو بچانے کے مماثل قرار دیتا ہے (مائدہ : ۳۲) ظاہر ہے وہ مذہب نہایت ہی ناگزیر
ضرورتوں اور نہایت ہی ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لئے قتال (جہاد بالسیف) کی اجازت
دے گا۔ اسلام میں جہاد کا مقصد فتنہ کا استیصال ہے (البقرہ : ۱۹۳) اور اس
فتنہ سے مراد وہ فتنہ ہے جس کو قرآن نے اشد من القتل (البقرہ: ۱۹۱) کہا ہے
اور جس کے دفعیہ کی غایت یہ ہو کہ دین اللہ کے لئے خاص ہو جائے۔ کوئی گردن اس
کی باغی ہو کر سر فراز نہ رہنے پائے بلکہ ہر گردن یا تو اس کی بندگی کے قلادہ سے مزین ہو جائے
یا پھر اسلامی ریاست کی محکومی کا طوق اس گردن میں ڈال دیا جائے۔ فتنہ کے
استیصال کا ذریعہ یہ ہے کہ فتنہ پیدا کرنے والوں کے وسائل فتنہ کو مٹا ڈالا جائے

دوران جنگ اس کی صورت یہ ہے کہ دشمن کی نفری طاقت کو زیادہ سے زیادہ ختم کیا جائے ۔ عام جنگی اصول کے بھی یہ بات عین مطابق ہے اور اسلامی جنگ کی غایت اور اس کے اصول بھی اس کی حمایت کرتے ہیں ۔ میدان جنگ میں اولین اہمیت قتال کی ہے قیدی بنالینے کی نہیں ۔ چنانچہ سورہ محمد (جس کا دوسرا نام سورۃ قتال بھی ہے) اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت ان الفاظ میں ملتی ہے :

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ق فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ ولا وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ ط وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝

پس جب کفار سے مقابلہ ہو جائے تو ان کی گردنیں مارو اور جب ان کو اچھی طرح کچل چکو تب قیدی بناؤ اور مضبوط باندھو اس کے بعد یا تو احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو ۔

(۴ : ۴۷)

سورۂ محمد کی یہ آیت مدنی ہے اور بالاتفاق غزوۂ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی یعنی اس وقت جبکہ ابھی مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مقاتلہ کی کوئی نوبت ہی نہیں آئی تھی پھر بھی مسلمانوں کو میدان جنگ میں ان کے طرز عمل کے بارے میں ایک متعین ہدایت دی گئی ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی دعوت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہونے والی تھی اور اس کا انداز و منہاج بدلنے والا تھا یعنی سلبی مدافعت (Passive resistance) کا دور ختم ہوا ۔ کفار مکہ جو آپ کی دعوت کے اولین مخاطب تھے ان پر حجت تمام ہو چکی تھی انھوں نے اسے مسترد کر دیا تھا اور آپ کو اپنے ابتدائی دارالدعوۃ مکہ مکرمہ سے ہجرت

ابنا پر دعوت مدینہ میں منتقل کرنا پڑا اور چونکہ مشیت الٰہی سے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ
ہاتھوں کے باوجود اس دین کو غالب اور برپا ہونا ہے اس لئے کفر و شرک کو مغلوب
کے لئے بہ شرطِ ضرورت قتال ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس بنا پر حکیم مطلق نے ضروری
لہ دعوت اسلامی کے اس دوسرے مرحلہ میں داخل ہونے کے آغاز میں ہی
زں کو ذہنی طور پر قتال کے لئے تیار کر دیا جائے اور چونکہ یہ اللہ کی سنت رہی ہے
لسی بھی اہم مرحلہ میں رسولؐ اور اہل ایمان کو ضروری ہدایت کے بغیر نہیں چھوڑتا اس
تال کے تعلق سے یہ ہدایت نازل فرمادی گئی۔

اس آیت میں واضح طور پر یہ ہدایت موجود ہے کہ جب کفار و مشرکین سے میدان کارزار
قابلہ کی نوبت آ ہی جائے تو میدان جنگ میں یہ کوشش ہونی چاہئے کہ دشمن کی نفری
ت کو ممکنہ حد تک ختم کر دیا جائے اور آخر وقت تک قتال جاری رکھا جائے اس لئے
استیصال فتنہ کے لئے جو مقصد حیات ہے اولین درجہ میں ضروری ہے۔ جیسا کہ
کیا گیا یہ ہدایت غزوۂ بدر سے بھی پہلے، جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی جنگ
اور جیسا کہ معمول تھا کہ ہر سورۃ یا چند آیتوں کے نزول کے بعد انھیں قرأتِ
ں کے واسطے سے تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو سنا دیا جاتا تھا اور خود مسلمان
طور پر بھی اس بات کے مشتاق رہتے تھے کہ جب بھی کوئی نئی سورۃ نازل ہو وہ
سے واقف ہو جائیں اس لئے سورۂ محمد کی یہ آیتیں بھی تقریباً تمام ہی مسلمانوں کے علم
یں جنھوں نے غزوۂ احد میں حصہ لیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ غزوۂ بدر میں جب مسلمان
رہین سے یہ عمل سرزد ہوا کہ جب دشمن پسپا ہونے لگا اور انھوں نے قتال جاری
ہ کی بجائے دشمن سپاہ کے افراد کو گرفتار کر کے انھیں قیدی بنانا شروع کر دیا تو سورۂ
ل کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں غزوۂ بدر پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے اس
ر گرفت و سرزنش کرتے ہوئے فرمایا گیا:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖؗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ پہلے زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے اگر اللہ کی طرف سے تقدیر پہلے ہی سے لکھی ہوئی نہ ہوتی تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تمھیں سخت سزا دی جاتی۔ بہرحال اب جو کچھ مال تم نے حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ اللہ نے اسے تمھارے لیے حلال و پاک قرار دے دیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو کہ بیشک وہ بڑا درگزر کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

(انفال: ۶۷-۶۹)

یہاں ضمناً یہ بات عرض کر دوں کہ بعض مفسرین کے نزدیک سورۂ انفال کی یہ آیات بدر کے میدان میں قتال سے رک کر قیدی بنا لینے پر بطور سرزنش نازل نہیں ہوئیں بلکہ بدر کے قیدیوں کو جب مدینہ لے آیا گیا اور اس کے بعد ان سے جو معاملہ کیا گیا کہ حضرت عمرؓ کی تجویز کے خلاف ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مشورہ پر عمل کیا گیا کہ ان ۷۰ قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اس پر یہ آیات بطور تنبیہ نازل ہوئیں لیکن مجھے کسی دعوی کے ساتھ

کے بارے میں نہیں بلکہ اپنی ہیچمدانی کے عاجزانہ اعتراف کے ساتھ ان مفسرین عظام کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ اسیرانِ بدر کے ساتھ مدینہ پہنچنے کے بعد ان سے فدیہ لے کر انھیں رہا کرنے کا جو معاملہ کیا گیا وہ اِن آیات کا محلِ نزول ہے۔ یہ تسلیم کہ یہ آیت اسیران بدر سے فدیہ کا کا معاملہ کر لینے کے بعد نازل ہوئی لیکن محلِ نزول یہ معاملہ نہیں بلکہ فی نفسہ میدان بدر میں قتال روک کر دشمنوں کو قیدی بنا لینے کا عمل ہے۔ اس بارے میں مولانا مودودی مرحوم نے تفہیم القرآن میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حاشیہ نمبر ۴۹ میں یہی رائے ظاہر فرمائی ہے اور سورۂ محمد کی آیت ۴ کی نسبت سے اس کی عمدہ تطبیق کی ہے اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ امام جصاص اپنی کتاب احکام القرآن میں "اس تاویل کو کم از کم قابلِ لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں"۔ پھر مولانا مرحوم نے سیرت ابن ہشام سے یہ روایت اپنی تاویل کی تائید میں نقل کی ہے کہ "غزوۂ بدر میں جس وقت مجاہدین اسلام مالِ غنیمت لوٹنے اور کفار کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگے ہوئے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت سعد بن معاذ کے چہرہ پر کچھ ناگواری کے آثار ہیں۔ حضورؐ نے ان سے دریافت فرمایا "اے سعد معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی یہ کارروائی تمھیں پسند نہیں آرہی" انھوں نے عرض کیا "جی ہاں یا رسول اللہؐ یہ پہلا معرکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ شرک کو شکست دلوائی ہے۔ اس موقع پر انھیں قیدی بنا کر ان کی جانیں بچا لینے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ان کو خوب کچل ڈالا جاتا" جلد ۲، صفحہ ۲۸۰-۲۸۱)

سورۂ انفال کی اس آیت کے آخری ٹکڑے: "بہر حال اب جو کچھ مال تم نے حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ اللہ نے اسے تمہارے لیے حلال و پاک قرار دے دیا ہے ..." کے بارے میں مولانا مودودی فرماتے ہیں: "اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت تو دی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے اس فرمان کی رو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد ان سے جو فدیہ وصول کیا وہ تھا تو

بازت کے مطابق مگر غلطی یہ ہوئی کہ دشمن کی طاقت کو کچل دینے' کی جو شرط مقدم رکھی
ئی تھی اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں
ایک بڑا گروہ غنیمت لوٹنے اور کفار کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے
منوں کا کچھ دور تک تعاقب کیا۔ حالانکہ اگر مسلمان پوری طاقت سے ان کا تعاقب کرتے تو
یش کی طاقت کا اسی روز خاتمہ ہوگیا ہوتا۔"

دوسرے یہ کہ یہ بات خود اللہ تعالیٰ کے کریم ہونے کی صفت اور رسول اللہ کے
الفاظِ قرآن رحمۃ للعالمین ہونے کے منصب کے قطعاً منافی معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کے
ری طرح ختم ہوجانے کے بعد جب مسلمان اپنے مسکن کو پہنچ جائیں تو اس وقت ان قیدیوں
جو کامل بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں مسلمانوں کی تحویل میں ہوں ان کی گردن ماردی جائے۔
انچہ مختلف غزوات و سرایا میں دشمن کے افراد مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوتے رہے اور خصوصاً
زوۂ حنین اور جنگ اوطاس کے بعد تو ہزاروں قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے لیکن انھیں
پ نے قتل نہیں کیا۔ یہود بنی قینقاع کو آپ نے بعد محاصرہ قابو میں آنے پر قتل نہیں کیا بلکہ
رف مدینہ سے نکال دینے پر اکتفا کیا۔ یہود بنی قریظہ کے مرد بے شک قتل کئے گئے لیکن
ہ بھی اپنے جرم کی سنگینی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنا معاملہ رسول اللہ
چھوڑ دینے کی بجائے حضرت سعد بن معاذ کے فیصلہ کو قبول کرنا منظور کیا (ان سے ان
ے قبول اسلام سے قبل یہودیوں کے بہت اچھے تعلقات تھے اس بنا پر ان سے یہودیوں
رعایت کی امید تھی) اور حضرت سعد نے ان کے مردوں کے قتل کا فیصلہ دیا۔

یہاں ایک اور بات ضمناً عرض کردوں کہ سورۂ انفال کی اس آیت میں سرزنش کا خطاب
عتبار الفاظ رسول اللہ سے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عمل کا ذمہ دار آنحضور
قرار دے کر فی الواقع آپ ہی کو سرزنش کی گئی ہے۔ قرآن کا یہ معروف اسلوب ہے کہ
لفظاً تو نبی ہی کو مخاطب کیا جاتا ہے لیکن آیت یا آیات کے اصل مخاطب ہر عصر اور تمام

متقدمین مسلمان ہوتے ہیں۔ ویسے یہ کچھ مستبعد بھی نہیں کہ اس آیت کے مخاطب آنحضورؐ ہوں اس لئے کہ جنگ بدر میں سپاہ مسلمین کے کمانڈر اعلیٰ آپؐ ہی کی ذات اقدس تھی آپؐ ہی کے زیر کمان مسلمان جنگ کر رہے تھے۔ یہ عام اصول ہے کہ میدان جنگ میں سپاہیوں کے عمل کی اخلاقی ذمہ داری constructive responsibility بہرحال فوج کے کمانڈر پر ہی عائد ہوتی ہے اور خود قرآن شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کے بعض افعال پر گرفت فرمائی ہے اور اس سرزنش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قرآن نے ریکارڈ کر دیا ہے۔ سورۂ تحریم اور سورۂ عبس اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

تو یہ تھی مسلمانوں کی پہلی غلطی کہ احد کی جنگ میں جب لشکر کفار کو ہزیمت ہو اور وہ پسپا ہونے لگے تو مسلمانوں نے قتال روک دیا اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت ان کو پہنچ چکی تھی کہ جب میدان کارزار گرم ہو تو اولین تر قتال کو جاری رکھنے اور دشمن کی عددی طاقت کو زیادہ سے زیادہ کچل دینے کو حاصل ہو گی۔

مسلمانوں کی دوسری غلطی جو فی الاصل پہلی غلطی کا سبب تھی یہ تھی کہ انھوں نے پسپا ہوتے ہوئے دشمن کے قتال سے اپنے ہاتھ روک لئے اور دشمن کے چھوڑے مال جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مسلمانوں کے اس عمل کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں اس وقت تک کی مسلمہ جنگی روایت یہ تھی کہ میدان جنگ میں جو اور جتنا مال بھی کسی فوجی کے ہاتھ آ اس پورے مال کا وہ مالک ہو جاتا تھا۔ جس دشمن کو وہ قتل کرتا اس کے اسلحہ اور کے کپڑے بھی قتل کرنے والے کی شخصی ملک ہو جاتے تھے۔ لیکن جنگ بدر کے جب غنیمت کی تقسیم کا سوال اٹھا تو عرب کے اس مروجہ دستور کو منسو کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال کی یہ آیت نازل فرمائی:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ.......

حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں (کی ضروریات) کے لئے ہے.... (۸ : ۴۱)

اس آیت کی رو سے مالِ غنیمت کے تعلق سے قانون یہ وضع ہوا کہ کل مالِ غنیمت کا ⅘ حصہ جنگ میں شریک تمام افراد پر خواہ کسی نے عملاً قتال کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ بعض صحابہ آنحضورؐ کے باڈی گارڈ کے طور پر آپ کے قریب کھڑے رہتے تھے اور اس طرح ان کے لیے عملاً قتال کی نوبت ہی نہیں آتی تھی) اور خواہ اس نے اپنے ہاتھوں کوئی مالِ غنیمت جمع کیا ہو یا نہ کیا ہو، افسر اور عام سپاہی کے درمیان کسی فرق کے بغیر سب میں مساوی تقسیم کیا جائے گا اور بقیہ ⅕ (خمس) پر رسول اللہ اور ان کے بعد جو بھی اسلامی ریاست کے سربراہ ہوں ان کے تصرف میں آئے گا اور وہ اس کو ان مدات میں خرچ کریں گے جن کا ذکر اس آیت میں ہے لیکن اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ مالِ غنیمت کے خمس کا معاملہ زکوٰۃ کی رقم سے اس بارے میں مختلف ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو تو صرف اُن ہی مدات میں سے ایک یا چند پر صرف کیا جا سکتا ہے جو متعلقہ آیت (سورۂ توبہ آیت ۶۰) میں مذکور ہیں لیکن مالِ غنیمت کی جو مدات اس آیت میں مذکور ہیں ان کی حیثیت ایک رہنما اصول یا بطور نمونہ چند مدات کے تذکرہ کی ہے اور اسلامی مملکت کے سربراہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ ریاست کے مصالح کے پیشِ نظر کسی بھی اور مد میں اس رقم میں سے خرچ کر سکتا ہے۔

تو چونکہ غزوۂ احد سے قبل غزوۂ بدر کے بعد مالِ غنیمت کے تعلق سے یہ قانون وضع ہو چکا تھا اور بدر کی غنیمت کو خود رسول اللہؐ نے اسی کے مطابق تقسیم کیا بھی تھا تو پھر مسلمانوں کے لیے اس بات کا کوئی محل تھا ہی نہیں کہ وہ دشمن کے

تعاقب و قتال کو ترک کر کے دشمن کے خیموں میں مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ جاتے، اس لیے کہ اگر کوئی شخص ڈھیروں مال بھی لوٹ لیتا تو وہ سب کا سب تو اس کو ملنے والا نہیں تھا بلکہ اس کو ملتا تو کل کے حصے میں سے بقیہ تمام شرکاءِ جنگ کے مساوی ہی اس لئے مسلمانوں نے ایک ایسے عمل کو ترک کر کے (تعاقب و قتال) جس کا اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا ایک ایسے عمل کو اختیار کیا جو ان کے لئے کسی طرح بھی نافع نہیں تھا۔ یہ مالِ غنیمت تو تکمیل قتال کے بعد ان کے ہاتھ آنا ہی تھا اور ان کا مقررہ حصہ ان میں سے ہر ایک کو ملنا ہی تھا۔

یہ دو غلطیاں جن میں سے اول الذکر اپنی عین میں درحقیقت حکم خداوندی کی خلاف ورزی تھی مسلمانوں کی فتح کے متبدل بہ ہزیمت ہوجانے کا باعث ہوئیں۔

تیر اندازوں کے دستہ کا معاملہ

تیر اندازوں کے اس دستہ کا معاملہ جسے رسول اللہؐ نے اپنی فوج کے بائیں رخ پر کوہ احد کے ایک درہ پر مامور کیا تھا کہ اس رُخ سے دشمن کو حملہ آور ہونے نہ دیں بعض پہلوؤں سے علیٰحدہ سے غور کا متقاضی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا رسول اللہ نے ایک بیدار مغز فوجی جنرل کی طرح اس خطرہ کا ادراک فرمالیا تھا کہ جبل احد کے اس درّہ سے دشمن حملہ آور ہوسکتا ہے چنانچہ اس رخ سے امکانی حملہ کے دفاع کے لئے حضرت عبداللہ بن جُبیر کی سرکردگی میں ۵۰ تیر اندازوں کے ایک دستہ کو اس دہانہ پر متعین فرمادیا تھا جو میدان احد پر کھلتا تھا تاکہ اس کی طرف سے حملہ کی کوشش کی صورت میں حملہ آوروں کو پسپا کیا جاسکے۔ اور انھیں اس جگہ جمے رہنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی تھی کہ اگر وہ یہ دیکھیں کہ احد کی چیلیں اور گدھ مسلمانوں کی لاشوں کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تو بھی اس دستہ کے سپاہی اس درّہ سے نہ ہٹیں۔ اس طرف سے آنے والے حملہ آور کھلے میدان میں ہوتے اور درہ کے مسلمان محافظ

درہ میں محفوظ ہوتے اور ان سے دشمن دوبدو اور دست بدست جنگ کی نوبت ہی تو نہ آسکتی تھی جب دشمن سپاہی کھلے میدان کے کافی حصے کو عبور کرکے درّہ کے دہانے تک آجاتے۔ لیکن یہ اس لئے محال تھا کہ جب تک وہ کھلے میدان میں ہوتے مسلمان تیر اندازوں کی زد میں ہوتے اور کثیر جانی نقصان اٹھائے بغیر درّہ کے دہانہ تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ (حضرت) خالد بن ولید نے دو دفعہ اس رخ سے حملہ آور ہونے کی فی الواقعی کوشش کی بھی لیکن تیر اندازوں کی درّہ کے اندر سے ناوک افگنی کے باعث دونوں دفعہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔

جنگ مغلوبہ کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد درہ پر متعین دستہ کے سپاہیوں نے یہ دل خوش کن منظر دیکھا کہ دشمن کی عددی کثرت اور بہتر طور پر مسلح ہونے کے باوجود مسلمان اس پر بھاری پڑ رہے ہیں۔ پھر دشمن قلب، میمنہ اور میسرہ تینوں محاذوں پر پیچھے ہٹنے لگا اور مسلمانوں نے نصرتِ الٰہی کے اس مظاہرہ سے نیا حوصلہ پاکر دشمن فوج پر دباؤ بڑھایا تھا تا آنکہ دشمن لشکر پیچھے ہٹتے ہٹتے اپنے پڑاؤ کے خیموں کے قریب پہنچ گیا اور اس پسپائی کو دیکھ کر خیموں کے مٹھی بھر محافظ اور مکہ سے جو عورتیں لشکر کفار کا دل بڑھانے کے لئے لشکر کے ساتھ آئی تھیں ان سب کے دل بھی ڈوب گئے اور نہایت افراتفری کے عالم میں یہ سب بھاگ کھڑے ہوئے جس سے دشمن کے سپاہیوں کے حوصلے مزید پست ہوگئے اور ان کی صفیں بھی ٹوٹ گئیں اور انھوں نے مقاومت ترک کرکے مکمل پسپائی اختیار کرلی۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مسلمانوں نے اس صورت حال سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ صرف جنگ کے تقاضوں کو نظر انداز کرکے بلکہ سورۂ محمد اور سورۂ انفال میں ایسے موقعوں کے لئے اللہ کی دی ہوئی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تعاقب اور قتال سے ہاتھ روک کر دو پیچھے لوٹ آئے اور دشمن کے خیموں میں سے جو محافظوں اور مکینوں سے خالی ہوچکے تھے غنیمت کا مال جمع کرنا شروع کردیا

جب یہ منظر درہ پر متعین دستہ کے سپاہیوں نے دیکھا تو انھوں نے سمجھا کہ جنگ کفار کی شکست مسلمانوں کی فتح پر منتج ہوکر ختم ہوگئی اور خود بھی غنیمت کا مال حاصل کرنے کے شوق میں درہ کو چھوڑ کر دشمن کے خیموں کی طرف جانے پر آمادہ ہوگئے۔ ان کے سردار حضرت عبداللہ بن جُبیر نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی اور انھیں رسول اللہؐ کی ہدایت کی یاد دلائی لیکن انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ کی ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ اگر مسلمانوں پر دشمن کا دباؤ شدید سے شدید بھی ہوجائے تو ہم یہاں سے نہ ہٹیں لیکن اب جبکہ جنگ ہی ختم ہوگئی ہے اس ہدایت کی پابندی کا محل بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس عذر کے ساتھ ۴۵ افراد اپنے دستہ سے علیٰحدہ ہوکر دشمن کے کیمپوں کی طرف چلے گئے اور خود بھی دشمن کے خیموں سے مال ومتاع جمع کرنے میں لگ گئے اور درّہ پر حضرت عبداللہ بن جُبیر کے ساتھ صرف پانچ اصحاب رہ گئے۔ اس وقت (حضرت) خالد بن ولید جو برابر ایسے موقعہ کی تاک میں تھے درّہ پر حملہ آور ہوئے اور پانچ محافظین کی قلیل تعداد کو شہید کرکے اپنے ساتھیوں کے ساتھ درّہ میں سے گذر کر مسلمانوں کے داہنے رخ سے ان پر حملہ آور ہوگئے ادھر پسپا ہوتے ہوئے دشمن نے جب یہ دیکھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا ہے تو ان کے سردار ابوسفیان نے انھیں بھاگنے سے روکا، ان کی دوبارہ صف بندی کی اور منظم ہوکر مسلمانوں پر، جن کی صفیں بکھر چکی تھیں اور جن کی غالب تعداد خیموں سے مال جمع کرنے میں مشغول تھی، ٹوٹ پڑے۔ اس طرح مسلمان منتشر اور غیر منظم حالت میں دو طرف سے صف بستہ دشمن کے منظم حملہ کی زد میں آگئے۔

تیر اندازوں کے اس عمل کا جہاں تک تعلق ہے کہ انھوں نے بھی درّہ کو چھوڑنے کے بعد پسپا ہوتے ہوئے دشمن کا تعاقب اور قتال نہیں کیا اور مال غنیمت کے جمع کرنے میں لگ گئے تو اس میں اس دستہ کے افراد اور مسلمان لشکر کے دوسرے سپاہی جن سے یہی غلطی سرزد ہوئی دونوں برابر ہیں لیکن اس تیرانداز دستہ سے ایک اور پہلو سے بھی

غلطی ہوئی تھی اور وہ تھی رسول اللہ کی واضح اور مستحکم ہدایت کی خلاف ورزی اور اپنے سالار دستہ کی حکم عدولی۔ یہ بات بھی اصول جنگ کے خلاف ہے اور فوجی ڈسپلن کے منافی۔ وہ تیرانداز اپنے سالار دستہ حضرت عبداللہ بن جبیر کے ماتحت تھے جو اس وقت کمانڈر اعلیٰ آنحضور صلعم کی نیابت فرمار ہے تھے۔ میدان جنگ میں ہائی کمان کے احکام کی تعبیر کا حق سپاہیوں کو نہیں ہوتا بلکہ موقع پر موجود فوجی افسر کو ہوتا ہے اور اس کے احکام کی بلاچوں وچرا تعمیل سپاہیوں پر واجب ہوتی ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے ان تیراندازوں سے ایک غلطی تو یہ ہوئی کہ اپنے افسر کے منشار کے علی الرغم انھوں نے اپنے طور پر ہائی کمانڈ کی ہدایت کی ایک من پسند تعبیر کر ڈالی اور موقع پر موجود اپنے سالار کے منع کرنے کے باوجود اپنی تعبیر کے مطابق عمل کر ڈالا۔ یہ ڈسپلن کی سنگین خلاف ورزی تھی۔ مزید برآں مسلمان کی حیثیت میں بھی رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت ان پر لازم تھی، اس سے بھی انھوں نے انحراف کیا اور خصوصاً اس حالت میں جبکہ ایسی ہی صورت حال کے بارے میں اس جنگ سے پہلے ان کو واضح ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کے ذریعہ سورہ انفال ہی میں ان الفاظ میں دی جا چکی تھی:

یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝	اے ایمان لانے والو، جب کسی (دشمن) گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر اختیار

کرو۔ یقیناً اللہ صبر اختیار کرنے
والوں کے ساتھ ہے۔

(۸ : ۴۵-۴۶)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ عالم الغیب اللہ علیم وخبیر نے آئندہ ہونے والے غزوۂ احد میں تیر اندازوں کے دستہ کے تعلق سے پیدا ہونے والی صورت حال کے کامل علم کے ساتھ اس وقت جو طرز عمل انھیں اختیار کرنا چاہیئے اس بارے میں کھلی ہدایت انھیں دے دی تھی اور فوجی ڈسپلن کے قاعدے سے ہٹ کر اس آیت کی رو سے رسول خدا ؐ کے اُمتی ہونے کے ناطے حکم رسول کی مکمل اطاعت ان پر لازم تھی۔ اس آیت میں "آپس میں جھگڑو نہیں" کے الفاظ کھلے طور پر اس دستہ کے سپاہیوں کا اپنے سالار حضرت عبداللہ بن جبیر سے رسول اللہ ؐ کی بحیثیت کمانڈر ان چیف دی ہوئی ہدایت کی تعبیر میں اپنے کمانڈر سے اختلاف کرنے کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ اور اس بات کو غزوۂ احد پر تبصرہ کرتے ہوئے سورۂ آل عمران میں دہرایا گیا جس کو میں ابھی ایک دوسرے سیاق میں نقل کروں گا۔ پہلے میں یہاں بعض مسلمانوں کے ایک خاص طرز فکر کی طرف اشارہ کر دوں۔ بعض حضرات اس بات کو حُبّ و احترام صحابہ کے منافی اور صحابہ کے مقام ارفع سے فروتر سمجھتے ہیں کہ ان سے طمع مالِ غنیمت کو منسوب کیا جائے اور خصوصاً تیر اندازوں کے دستہ کے افراد کو اس سے مُبرّا قرار دیتے ہوئے ان کے عمل کو ہدایت رسول کی نیک نیتی کے ساتھ تعبیری غلطی پر محمول کرتے ہیں۱۔ اس بارے میں عرض ہے کہ غزوۂ احد کی جو تفصیلات

۱۔ پاکستان کے معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دہلی ہی میں اپنی ایک تقریر کے دوران یہ بات بہت زور دے کر اور بڑی تاکید کے ساتھ کہی تھی۔ راقم الحروف خود اس محفل میں موجود تھا۔

تواتر کے ساتھ تمام کتب مغازی میں موجود ہیں۔ ان سب میں مسلمانوں کا یہی عمل بلا اختلاف مذکور ہے۔ اور اس کی سب سے مستحکم شہادت خود قرآن میں بالکل واضح الفاظ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ آل عمران میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید و نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ اس نے تو پورا کر ہی دیا تھا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جوں ہی وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت تمھارے دلوں میں تھی (مال غنیمت) تو تم حکم عدولی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں سے کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت (کی کامیابی) کے خواہشمند تھے۔ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا۔ حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمھیں معاف کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ مومنوں پر بڑا فضل فرمانے والے ہیں۔

(۳: ۱۵۲)

اس بات کو اسی سورہ میں کچھ آگے مزید ان الفاظ میں فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى — تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ

الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ

پھر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ پر اللہ نے انھیں معاف کر دیا جو بہت درگذر کرنے والا اور بردبار ہے (۳: ۱۵۵)

پھر اسی بات کو کچھ اور آگے آیت ۱۶۵ میں تکرار کیا گیا کہ "اے نبی ان سے کہدو کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے ...."

قرآن کی اس شہادت کے بعد اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ احترامِ صحابہؓ کے عذر سے اس حقیقت سے گریز کیا جائے اور تیراندازوں کے دستہ کے طرزِ عمل کی قرآن کے علی الرغم صفائی پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ مولانا مودودی مرحوم نے سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۶۱ (کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے... الخ) کی تفسیر کے ذیل میں حاشیہ ۱۱۴ میں تحریر فرمایا ہے کہ تیراندازوں کے دستہ نے مالِ غنیمت کی کشش سے اپنا مقامِ تعیناتی ترک کر دیا تو جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لے آئے تو آپؐ نے ان لوگوں کو بلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عذر پیش کیے جو نہایت کمزور تھے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم (اصل یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا، تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصہ نہیں دیں گے) اس آیت کا اشارہ اسی معاملہ کی طرف ہے [۱]"

۱۔ مولانا مودودی مرحوم نے اپنے معمول کے خلاف یہاں وہ حوالہ نہیں دیا ہے جہاں سے انھوں نے یہ روایت لی ہے۔ راقم الحروف کو اعتراف ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اب رہی یہ بات کہ آخر صحابہ کرامؓ سے، جن کے بارے میں تمام مسلمانوں کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ ان کے بعد ان سے زیادہ صاحب ایمان اور افضلیت کا حامل کوئی نہیں ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ آخر یہ کمزوری کیوں ظاہر ہوئی تو اس کی وضاحت کے لئے عرض ہے کہ یہ سمجھنا کہ صحابہؓ میں سے ہر ایک کلمہ پڑھتے ہی راسخ الایمان، راسخ العمل اور اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل ہوجاتا تھا محض غلو رخوش عقیدگی ہے۔ ان سابقون الاولون میں جہاں کچھ ایسے تھے جو ایمان لانے سے قبل بھی نیک طینت، شائستہ اطوار اور مضبوط کردار کے مالک تھے تو کچھ ایسے بھی تھے جو عرب کی معروف جاہلیت میں گلے گلے غرق تھے اور خصوصاً جنگوں میں حصہ لینے اور مال غنیمت حاصل کرنے کا شوق تو عربوں کا خاصہ تھا چنانچہ دورِ جاہلیت کے شعری ادب میں عربوں کے اس خاص مزاج کی عکاسی کرنے والے شعر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک شاعر مال غنیمت کے اپنے شوق کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

فلئن بقیت لا احلن بغزوۃ
تحوی الغنائم اویموت کریمۃ

(اگر میں زندہ رہا تو ایک ایسی مہم پر جاؤں گا جس میں
غنیمت کا مال خوب ہاتھ آئے یا میں ایک شریف انسان
کی سی موت مرجاؤں۔)

سبعہ معلقہ کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم تو اس بارے میں عرب کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کہ وہ بھی باوجود کوشش کے اس روایت کے ماخذ کو پا نہیں سکا گو اس پر وثوق ہے کہ مولانا مرحوم نے شافی تحقیق کے بغیر یہ روایت نہیں کی ہوگی۔

...رتوں تک کے شوق کا تذکرہ کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے :

اخذن بعولتھن عھدا ۔۔۔ اذا لاقوا کتائب معلمینا
لیستلبن افراسا و بیضا ۔۔۔ و اسری فی الحبال مقرنینا

(عورتوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جب نشان لگائے ہوئے لشکروں سے مقابلہ ہو تو گھوڑے اور صیقل شدہ چمکتی ہوئی تلواریں لے کر واپس ہوں اور رسیوں میں بندھے ہوئے قیدی بھی ساتھ لائیں)

خود سورۂ انفال میں جو غزوۂ بدر کے متصل بعد نازل ہوئی اللہ تعالیٰ نے صحابِ رسولؐ کے ایمان کے اس وقت تک پختہ نہ ہونے کا ذکر ان الفاظ میں ...یا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ	اے نبی مومنوں کو جنگ پر ابھارو
عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ	اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں
عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا	تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر
مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم	سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں
مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ	سے ہزار کافروں پر بھاری پڑیں گے
كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ	کیونکہ وہ لوگ ایسے ہیں جو فہم سے
الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ	عاری ہیں ۔ اچھا اب اللہ نے تمہارا
أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن	بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ
مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا	ابھی تم میں کمزوری ہے پس اگر تم
مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ	میں سو آدمی صابر ہوں تو دو سو پر
يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ	اور ہزار ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے

وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○	حکم سے غالب آئیں گے۔ اللہ ان کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

(۸ : ۶۵-۶۶)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جس کمزوری کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کوئی جسمانی کمزوری نہیں بلکہ ایمان اور کردار کی کمزوری مراد ہے اور ایمان و کردار کی یہ کمزوریاں آنحضورؐ کے فیضِ تربیت اور فیضانِ نظر سے رفتہ رفتہ ہی ختم ہوئیں۔ لہٰذا اس بات کو مان لینے سے کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں سے استقامت کی کمی اور ایک مخصوص رُخ سے کردار کی کمزوری کا مظاہرہ ہوا اور جس کے باعث سامنے نظر آتی فتح ہزیمت میں تبدیل ہوگئی نہ تو عظمت صحابہ پر حرف آورنہ ہی اس کے اظہار سے اہانتِ صحابہ کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی تربیت کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ اس کمزوری کے مظاہرہ پر مسلمانوں کو ہلکی سی ایک چوٹ دی جائے۔ تاکہ آئندہ کے لئے انھیں سبق ہو، ورنہ وہ قادر مطلق تو بہرحال اس پر قادر تھا کہ مسلمانوں کے اس غلط عمل کے باوجود مسلمانوں کا نقصان نہ ہونے دیتا اور ان ہی کو فتحیاب کرتا۔ چنانچہ میدانِ جنگ کی عملی تنبیہ کے بعد ان الفاظ میں مسلمانوں کا حوصلہ بڑھایا گیا:

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُہٗ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیْنَ النَّاسِ ج وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ	دل شکستہ اور غمگین نہ ہو۔ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت تو تمھیں ضرور چوٹ لگی ہے لیکن اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے فریق مخالف کو بھی لگ چکی ہے[۱]۔ یہ تو زمانے کے

۱- جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے۔

شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۙ نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں....

(۳: ۱۳۹- ۱۴۰)

اور پھر زمانے نے شہادت دے دی کہ غزوۂ احد کے بعد کے دورِ نبوی میں اور عہدِ نبوی کے بعد بھی ایک عرصہ تک کبھی مسلمانوں کی طرف سے ایسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں ہوا اور انھوں نے ہر ایسے موقع پر صبر و استقلال اور دنیوی مال و منال سے بے رغبتی، ڈسپلن کی پابندی اور رفعتِ کردار کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

●●

اعلان

قارئین کے لئے یہ اطلاع ضروری ہے کہ شدید گرانی کی وجہ سے بدل اشتراک میں معمولی سا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

از راہِ کرم اب نئے سال کا بدل اشتراک ۴۵ روپے ارسال کریں۔

نوازش ہوگی

(ادارہ)

قرآنِ کریم غیروں کی نظر میں

محمد سعید الرحمٰن شمس مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر

ہر انسان اپنی مستعار زندگی سے بھرپور فائدہ اٹھائے، خاطر خواہ لطف اندوز ہو اور حقیقت میں ایک کامیاب اور پرمسرت زندگی بسر کرے، یقیناً یہ سبھوں کا مشترکہ حق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں لازوال خوشیاں اور حقیقی مسرت و شادمانی کس طرح حاصل کرے۔ جواب یہ ہے کہ جب اسے واقعی زندگی گذارنے، زندگی کو سنوارنے کا صحیح اور فطری طریقہ معلوم ہو جائے۔ انسانی زندگی کے حسین، دلکش اور خوبصورت خط و خال جس سے ظاہری و باطنی جمال میں نکھار پیدا ہو اور جس کی بدولت آدمی کی زندگی میں ایک غیر معمولی کشش اور جاذبیت پیدا ہو۔ اس کی پوری تفصیلات اور کامل ہدایات پیغامِ ربانی، صحیفۂ یزدانی، یعنی "قرآن مجید" میں موجود ہے۔ قرآن کریم منزل من اللہ، کلام اللہ، صحیفۂ مقدسہ، کتاب فطرت اور کتاب حکمت ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ "شفاء للناس" اور اور "ذکرٌ للعالمین" ہے۔ اس کی حکمت لایزال، اس کا پیغام دائمی، ابدی اور عالمگیر ہے۔ آیئے اس تناظر میں غور فرمایئے۔ ان غیر مسلم اسکالرس (Scallers) مفکرین، دانشوروں اور علماء کے خیالات، تاثرات اور احساسات جنھوں نے بنظرِ غائر اور

معروضی نقطۂ نظر سے قرآن کریم کا مطالعہ اور تحقیق کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ بلاشبہ قرآن کریم آسمانی کتاب اور پیغمبر اسلامؐ کا ایک زندہ جاوید علمی اعجاز ہے جو ببانگِ دہل پوری انسانیت کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے۔

مشہور مورخ و مفکر ایڈورڈ گبن قرآن مجید کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"قرآن مجید کو مسلمانوں کا ایک عام مذہبی، تمدنی، ملکی، تجارتی اور قومی قانون اور دیوانی اور فوجداری وغیرہ کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر ایک امر پر حاوی ہے۔ مذہبی عبادات سے لے کر رات دن کے کاروبار روحانی نجات سے لے کر صحت جسمانی، جماعت کے حقوق، حقوق افراد، اخلاق سے جرائم اور دنیوی سزا سے دینی سزا و آخرت تک تمام احکام و قوانین قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اسی سبب سے قرآن اور بائیبل دو مختلف چیزیں ہیں۔ بائیبل میں دینیات کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے بلکہ اس میں قصص ہیں جن سے عبادات اور پرہیزگاری کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ نہ قرآن اناجیل سے ملتا ہے کہ اس کو ہم صرف مذہبی رایوں اور افعال کی اصلاح ہی کا معیار قرار دیں، بلکہ بخلاف اس کے قرآن میں سیاسی اصول بھی موجود ہیں۔ انھیں اصول پر حکمت کی بنیاد پڑی۔ انھیں سے ملکی قوانین اخذ کیے جاتے ہیں اور روزمرہ کے جانی و مالی مقدمات کے فیصلے ہوتے رہتے ہیں۔"

جارج سیل کی شہادت:

"قرآن کریم بے شبہ عربی زبان کی بہترین اور مستند ترین کتاب ہے اور جیسا کہ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے اور خود یہ کتاب

انھیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہے جو مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزے سے بہت بلند پایہ ہے اور تنہا یہ صحیفہ دنیا کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے آنحضرت صلعم نے عرب کے نہایت فصیح اللسان ادبار کو ڈنکے کی چوٹ چیلنج دیا تھا کہ ان میں سے کوئی شخص ایک آیت ہی ایسی پیش کردے جو قرآن کریم کی آیت سے لگا کھا سکے، اس وقت ملک عرب میں ہزاروں فصحاء وبلغاء موجود تھے۔ عرب کے سب سے زیادہ فصیح و بلیغ شاعر لبید نے کعبہ پر اپنی نظم لٹکائی تھی جب اس کے پاس ہی قرآن کریم کی دوسری آیت لٹکائی گئی تو خود لبید شاعر (جو بُت پرست تھا) اس آیت کے ابتدائی الفاظ پڑھ کر انگشت بدنداں رہ گیا اور بے ساختہ تعریفی کلمات اس کی زبان سے نکل گئے، لبید فی الفور اس مذہب پر ایمان لایا جس کی تعلیم اس آیت کے الفاظ دہرار ہے تھے۔

قرآن پاک قریش کی زبان میں ہے جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے۔ انتہا درجہ کی پاکیزہ اور لطیف زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ وہ (قرآن شریف) فصیح ترین زبان کا نمونہ ہے بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسان اس کی مثال نہیں لاسکتا اور اسی واسطے اس کو ایک لازوال معجزہ قرار دیا ہے جو مردوں کو زندہ کر دینے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنا ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کو اکیلا کافی ہے۔ قرآن کا طرز تحریر عموماً خوش آئند اور رواں ہے بالخصوص اس جگہ جہاں پیغمبرانہ اشعار اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مختصر اور بعض مقامات پر مبہم ہے اور مشرقی ڈھنگ کے مطابق پُر حیرت صنعتوں

سے مرصّع اور روشن اور پر معنیٰ فقروں سے مزیّن ہے اور اکثر مقامات میں جہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان آتا ہے نہایت عالی مرتبہ اور رفیع الشان ہے۔"

موسیو ڈمونیتسن آف فرانس کی شہادت:

"قرآن شریف کے مضامین سے جو برق کی طرح تڑپا دینے والے ہیں اس کتاب کے حسن کا جلوہ نظر آتا ہے اور مسٹر گوئٹے کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ جس قدر ہم اس کے قریب پہنچتے ہیں تو وہ اور زیادہ ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور بتدریج فریفتہ کر لیتی ہے پھر متعجب کرتی ہے اور آخر کار فرحت آمیز تحیّر میں ڈال دیتی ہے اس لئے ہم بے اختیار اس عجیب و غریب کتاب کی ماہیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔"

جان جاک آسو فلاسفر کی شہادت:

"بعض تھوڑی سی عربی سیکھ کر (جیسے ڈاکٹر منکا نا وغیرہ) قرآن شریف کا معاذ اللہ تمسخر اڑاتے ہیں اور اگر اپنی خوش قسمتی سے کبھی ان کو یہ موقعہ حاصل ہوتا کہ آنحضرت صلعم اپنی فصیح زبان اور موثر لہجہ میں قرآن شریف کی کوئی سورۃ پڑھ رہے ہیں جس کا دلوں پر خاص اثر ہوتا ہے اور جب کسی آیت کے متعلق یہ احتمال ہوتا ہے کہ سامعین اس کے حقیقی مفہوم تک رسائی نہیں کر سکیں گے تو اپنی اعجازی قوت بیانیہ سے اس کی توضیح فرما دیتے ہیں تو یقیناً ہر شخص بے ساختہ سجدہ میں گر پڑتا اور سب سے پہلے اس کے مُنہ سے یہ آواز نکلتی کہ پیارے نبی، پیارے نبی، رسول خدا علیک الصلوٰۃ والسلام میرا ہاتھ پکڑ لیجئے اور مجھے اپنے پیروؤں میں شامل کرنے کی عزت اور افتخار سے مشرف کرنے میں دریغ نہ فرمائیے۔"

جے جے بول :

"تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز کتاب ہے اور گذشتہ سالوں میں مَیں نے غور سے جو اس کا مطالعہ کیا ہے تو اس کی بلاغت الفاظ کی شان و شوکت اور روانی سے حیران رہ گیا ہوں ۔"

مہاتما گاندھی کی شہادت :

"مجھے قرآن کو الہٰی کتاب تسلیم کرنے میں ذرہ بھر تامل نہیں ہے ۔"

پادری ریورانڈ ڈارمیکسویل کی شہادت :

"میرا ایمان ہے کہ اگر الہام دنیا میں کوئی شی ہے اور الہام کا وجود ممکن ہے تو قرآن شریف ضرور الہامی کتاب ہے ۔"

پنڈت چمپوپتی ایم اے کی شہادت :

"ان کے (آنحضرت صلعم) دل کی آواز قرآن کی آیات ہیں ۔ حضرت کی اولوالعزمیوں کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے حضرت کی شعلہ بیانیوں سے ان کے زندہ پیغام کو اخذ کرنا ضروری ہے ۔"

پرنسپل رام دیو ایم اے کی شہادت :

"قرآن کی بھاشا بہت سُندر ہے اس میں فصاحت و بلاغت بھری ہوئی ہے ۔"

مزک مورخ جرمنی کی شہادت :

"قرآن کی عبارت کیسی فصیح و بلیغ اور مضامین کیسے عالی و لطیف

ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک امین ناصح نصیحت کر رہا ہے
اور ایک فلسفی حکمت الٰہی بیان کر رہا ہے۔"

پروفیسر دوار کا داس کی شہادت :

"قرآن ایسا جامع اور روح افزا پیغام ہے کہ ہندو دھرم اور مسیحیت کی کتابیں اس کے مقابلہ میں بمشکل کوئی کتاب پیش کر سکتی ہیں۔"

میجر لیونارڈ کی شہادت :

"اگر کسی کتاب کی عظمت و تقدس کا اندازہ ان نتائج و اثرات سے کیا جائے جو وہ بہترین اور قابل ترین انسانی دماغوں پر نقش کرتی ہے تو یقیناً قرآن کریم کو دنیا کی بہترین و مقدس ترین کتابوں میں بلند و ممتاز جگہ ملے گی۔"

جرمن مشہور علامہ "گوئٹے" کی شہادت :

"جس قدر ہم اس کتاب کے قریب قریب پہونچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ اسی قدر زیادہ دور کھنچی چلی جاتی ہے یعنی زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے پھر متعجب کرتی ہے، فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے اور آخر کار اپنا احترام کرا کے چھوڑتی ہے اس طرح یہ کتاب نظروں میں زبردست اثر ڈالتی ہے۔"

مسٹر ایڈگر الفنسن کی شہادت :

"قرآن شریف اللہ کا کلام ہے، اس کے کلام ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن نے خود دعویٰ کیا ہے کہ مجھ جیسا کلام انسان سے

ممکن نہیں اور واقعی اس وقت سے لے کر آج تک کوئی کلام قرآن جیسا بڑے بڑے شاعروں سے اور فصیح خطیبوں سے نہیں ادا ہو سکا۔ عرب کے بہت سے فصحاء اور نہایت باکمال شعراء قرآن کی اس تحدی اور چیلنج کو سن کر اس پر ایمان لے آئیں۔ منجملہ شاعر لبید بھی ہے جس کی عمر کا بڑا حصہ جاہلیت میں گذرا اور اسلام میں بھی یہ ان سات شاعروں میں ہے جن کے قصیدے بے بدل مانے گئے اور ان قصیدوں کو کعبہ شریف میں لٹکایا گیا۔ جب عرب کے ایسے ایسے بڑے زبان داں اور شعراء کثیر تعداد میں قرآن کریم کو کلام الٰہی ماننے لگے تو یہ اس کے بے نظیر کلام الٰہی ہونے کا کافی ثبوت ہے اور جب وہ بے نظیر ثابت ہو گیا اور اتنے زمانہ تک جو ڈیڑھ ہزار سال کے لگ بھگ ہے کوئی اس جیسا کلام نہ لاسکا۔ تو قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ ثابت ہو گیا۔"

مسٹر کامس کارلائل کی شہادت:

"میرے نزدیک قرآن میں سچائی کا جوہر اس کے تمام معنیٰ میں موجود ہے جس کو اس نے وحشی نظر میں بیش بہا کر دیا تھا۔ سب آخر یہ کہا جاسکتا ہے یہ کتاب یعنی قرآن سب سے اول اور سب سے آخر جو محمد گیاں ہیں وہ اپنے اندر رکھتا ہے اور ہر قسم کے اوصاف کا بانی ہے بلکہ در اصل ہر قسم کے وصف کی بنا صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔"

مسٹر ڈاسٹین کی شہادت:

"پس جب سنا میں نے قرآن کریم رمضان کے مہینے میں تو میں نے دیکھا کہ یہ کتاب فصاحتِ عظیم اور بلاغتِ رفیع اور اعجاز سے مملو اور وہ واقعہ

جو کہ تصانیف میں دو جزو میں مذکور ہے قرآن کی ایک دو آیتیں اس کو مکمل کر دیتی ہیں اور یہی وہ حد اعجاز ہے کہ جس کے مقابلہ میں طاقت بشری سے یہ بات خارج ہے کہ وہ ایک آیت بھی پیش کر سکے۔ قرآن شریف کی یہی دو آیتیں لے لیجئے "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ الخ" اسی ہی واقعہ کو جو قرآن کی دو آیتوں میں مذکور ہے تورات کی دو فصلوں میں ذکر کیا گیا ہے۔"

مسٹر جان ڈیون پورٹ کی شہادت:

"منجملہ ان بہت سی اعلیٰ خوبیوں کے جو قرآن کے لئے واجب طور پر باعث فخر و ناز ہو سکتی ہیں۔ دو خوبیاں نہایت بیّن ہیں یعنی اول تو اس کا وہ مؤدبانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا طرز بیان جو ہر ایک مقام پر جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر یا اس کی ذات کی طرف اشارہ ہے اختیار کیا گیا ہے اور جس میں خداوند عالم کے ان جذبوں اور اخلاقی نقصوں سے منسوب نہیں کیا جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اس کا ان خیالات و الفاظ اور قصوں سے مبرّا ہونا جو فحش و خلاف اخلاق اور نا مہذب ہوں حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ عیوب توریت وغیرہ کتب مقدسہ یہود میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت قرآن ان سخت عیوب سے مبرّا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں اور اول سے آخر تک پڑھ جاؤ تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پاؤ گے جو پڑھنے والے چہرے پر شرم و حیا کے آثار پیدا کرے۔ قرآن میں ذات باری کی تعریف نہایت مشرّح اور صاف ہے اور جو مذہب اس نے اپنی ان خوبیوں کے ساتھ قائم کیا ہے وہ وحدانیت الٰہی کا

نہایت پختہ اور شدید یقین ہے اور بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو فلسفیانہ طور پر ایسا مسبب الاسباب مان لیا جائے جو اس عالم کو مقررہ قوانین پر چلا کر خود اسی شان وعظمت کے ساتھ الگ ہے کہ اس تک کوئی شئی نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کی رو سے وہ ہر وقت حاضر وناظر اور اس کی قدرت کاملہ ہمیشہ اس عالم میں عامل ومتصرف ہے۔ علاوہ ازیں اسلام ایسا مذہب ہے جس کے اصول میں کوئی امر متنازعہ فیہ نہیں اور چونکہ اس میں ایسا کوئی معمہ نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آئے اور نہ زبردستی قبول کرنا پڑے۔ اس لئے وہ لوگوں کے خیالات کو ایک سیدھی سادی اور ایسی پرستش پر قائم رکھتا ہے جو تغیر پذیر نہیں ہے "

پاپولر انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

"قرآن کی زبان بلحاظ لغت عرب نہایت فصیح ہے۔ اس کی انشائی خوبیوں نے اسے اب تک بے مثل وبے نظیر ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں احکام اس قدر مطابق عقل وحکمت واقع ہوئے ہیں کہ اگر انسان انھیں چشم بصیرت سے دیکھے تو وہ ایک پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے کفیل ہوسکتے ہیں"

اخبار نیرالیسٹ لندن ۱۹۲۲ء کا تبصرہ ہے:

"قرآن ایک محیر العقول اور معجز نما صحیفہ ہے"

جنم ساکھی بھائی بالا ص۱۴۱ پر مرقوم ہے:

توریت وزبور انجیل ترے رَن ڈٹھے وید لہے قرآن کتاب کل جگ میں پروار

ترجمہ: تورات، زبور اور انجیل کو ہم نے بغور دیکھا اور ویدوں کو بھی۔ مگر دنیا کے لئے جو ہدایت کامل کا موجب بن سکتی ہے وہ قرآن شریف ہے۔

یا کمی کلاں بھائی بالا نوشتہ شری گورو انگند جی صفحہ ۲۲۲ کی عبارت ہے :

" تے سرف قرآن دے تئے سیپارے تیں — تس وچہ پند نصیحتاں سن سن کر یقین

ترجمہ : عربی کے حروف تہجی تیئس ۲۳ ہیں اور قرآن شریف کے تیس سیپارے ہیں۔ قرآن شریف لاانتہا نصیحتوں کا مجموعہ ہے سنو اور یقین کرو اور ایمان لاؤ۔"

یا کر نتھ صفحہ ۸۶۳ پر مرقوم ہے :

تپ دان پوجا ست سنجم جب ڈھکا ہے جیو — ناد ہو دھو تلک چڑھا دیپ دن سو پچ ہوئی

کل پرمان کتیب قرآن ... — پوتھی پنڈ رہے پوران ...

ترجمہ : پوجا پاٹ کام نہیں دے سکتا۔ چھوت چھات بھی بیکار ہے جنیو اشنان، ماتھے پہ تلک لگانا کچھ کام نہ آئے گا۔ اس زمانہ میں اگر کوئی کتاب کام آوے تو وہ قرآن ہے جس کے آگے پوتھی پران کچھ بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر الفرڈ گیلام (Alfred guillaume) جو لندن یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے، اپنی کتاب " Islam " میں قرآن حکیم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"The Quran is one of the world's classics which cannot be translated without grave loss It has a rhythem of peculiar beauty and a cadence that charms the ear. Many Christian Arabs speak of its style with warm admiration and most Arabists

acknowledge its excellence. When it is read aloud or recited. It has almost hypnotic effect."

یعنی قرآن کریم دنیا کے شستہ اور فصیح ترین نسخوں میں سے ہے جس کا ترجمہ صحیح مفہوم اور اسرار و رموز کھوئے بغیر نہیں کیا جا سکتا اس کی روانی میں عجیب اور نادر جمال ہے اس میں وہ لحن اور ترتیل ہے جو کانوں کو مسحور کرتی ہے۔ عرب کے بہت سے عیسائی بھی اس کے اسلوب بیان کی نہایت مدح سرائی کرتے ہیں اور عربی زبان کے بیشتر محقق اس کی فضیلت اور برتری کا اعتراف کرتے ہیں۔ جب قرآن کریم اونچی آواز میں یا ترتیل سے پڑھا جاتا ہے تو اس کا اثر مسحور کرنے والا ہوتا ہے۔

سنٹرل کلچرل اسلامک پریس کی طرف سے جو کتاب شائع کی گئی ہے اور جس کا نام Introduduction to Islam ہے۔ اس کے صفحہ ۲۲ پر قرآن کریم کے تعلق سے مرقوم ہے:

"The Quran is addressed to all humanity. Without distinction of race, requin or time, further it seeks to quide men in all walks of like. Spiritual, tern poral, indivual and collective. It curtains directions for the conduct of the head of a state, as well as a simple commoner, of the rich as

well of the poor, for peace as well as for war, for spiritual culture as for commerce and material well being. The Quran seeks primarily to develop the personality of the individual."

یعنی قرآن کریم کا پیغام بلا امتیاز نسل، خط اور زبان ساری انسانیت کے لئے ہے اس کے علاوہ یہ انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ روحانی دنیوی، انفرادی یا مجموعی ہو، رہنمائی مہیا کرتا ہے۔ قرآن کریم میں سربراہ مملکت اور ایک عام انسان، امیر اور غریب، امن اور جنگ، روحانی، تمدنی، تجارتی اور مادی فلاح و بہبود کے لئے ارشادات ہیں۔ قرآن مجید بنیادی طور پر فرد کی شخصیت کو اُبھارنے کی کوشش کرتا ہے۔

آگے چل کر اسی صفحہ پر لکھا ہے:

"The Quran speaks of the best rules relating to social life, commerce, marriage inheritance, peral law, international law and so on; But the Quran is not a book in the ordinary sense; it is a collection of the words of god,

revealed, from time to time, during twenty-three years to this messenger sent among human beings."

یعنی، قرآن حکیم سماجی زندگی، تجارت، نکاح، وراثت، تعزیری قانون وغیرہ کے متعلق بہترین قواعد کا ذکر کرتا ہے، لیکن قرآن کریم کسی معمولی کتاب کے مانند نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ان الفاظ مبارک کا مجموعہ ہے جو تینی نوع انسان کی طرف بھیجے گئے۔ اس کے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر تیئیس ۲۳ سال کے دوران نازل فرمائے گئے۔

اسی طرح مشہور اہل قلم اور سائنسداں مورس بوکائے کی تازہ ترین اور اور مقبول عام تالیف "The Bible The Quran and Scienc" اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے جس میں مصنف نے قرآن کریم کے تعلق سے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے مصنف تعارف کے ذیل میں لکھتا ہے:

"قرآن وحی کا وہ اظہار ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچی جس کو فوراً قلمبند کر لیا گیا اور اہل ایمان نے حفظ کر لیا۔"

ہے قولِ محمدؐ قولِ خدا فرمان نہ بدلا جائے گا
بدلے گا زمانہ لاکھ مگر قرآن نہ بدلا جائے گا

مراجع وحوالہ جات

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد چہارم — از علامہ سید سلیمان ندویؒ
۲۔ عجائبات القرآن — از حکیم ملک حسن علی مرحوم
۳۔ فلاح دین و دنیا — از مفتی شوکت علی
۴۔ پیغمبر انقلابؐ — از مولانا وحیدالدین خاں
۵۔ زندہ نبی کی زندہ تعلیم — از محمد علی صاحب
۶۔ حضرت رحمۃ اللعالمین کا فیض علم — از جناب حبیب اللہ صاحب گانی
۷۔ بائیبل، قرآن اور سائنس — از موریس بوکائے
۸۔ ماہنامہ الرسالہ دہلی — بابت ماہ مارچ ۱۹۸۲ء
۹ " نصرۃ الاسلام کشمیر — بابت ماہ نومبر ۱۹۸۴ء
۱۰ " " " — بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء
۱۱۔ روزنامہ علمبردار بنگلور — ۳؍ مئی ۱۹۸۶ء

ابو حیان توحیدی

حیات و خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۱)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی ایم، اے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کسی بھی دور کے شاعر، ادیب یا فن کار کے فن سے بحسن و خوبی واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس دور کی سیاسی، معاشرتی اور سماجی زندگی پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ کوئی بھی فنکار یا ادیب اپنے آپ کو زمانے کے اجتماعی و معاشرتی رجحانات، تہذیبی و ثقافتی انقلابات، وقت کی سیاسی نزاکتوں اور مروجہ تعمیری و تخریبی قوتوں سے الگ ہو کر اپنی شاہراہ متعین نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی تخلیقات زمانے کے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ ایک انصاف پسند ناقد اور حقیقت پسند ترجمہ نگار کے لئے ناگزیر ہے کہ کسی بھی فنکار کے فن کو جانچتے وقت اس وقت کے سیاسی و اجتماعی حالات کو لازماً سامنے رکھے۔

اگر تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کیا جائے اور مختلف اسلامی حکومتوں میں ہونے والی علمی، سائنسی، سیاسی، فکری، تہذیبی و ثقافتی ترقیوں کا جائزہ لیا جائے تو عہد عباسی کو دیگر اسلامی حکومتوں کے مقابلہ میں عہد زریں سے موسوم

کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ اسلام میں پہلی بار مختلف عقلی ونقلی علوم وفنون کی باقاعدہ تدوین و ترتیب اور تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانہ پر شروع ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی ساری ذہنی و دماغی ترقیاں، علمی و سائنسی کارنامے، ادبی وفنی تخلیقات، تاریخی وفقہی انکشافات کے گرانقدر اور بیش قیمت ذخائر جو آج امت مسلمہ کے لئے باعث فخر و افتخار ہیں اسی عہد عباسی کی یادگار ہیں۔

ابوحیان توحیدی عباسی عہد حکومت کے تیسرے دور کی پیداوار ہے۔ بنو عباس کی حکومت کا زوال شروع ہوچکا تھا۔ پوری مملکت میں امن و امان کی جگہ اضطراب و انتشار اور سکون و اطمینان کی جگہ بدامنی ولاقانونیت نے لے لی تھی۔ ملک کے عرض و طول میں بغاوتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوچکا تھا، طرح طرح کے فتنے جنم لے رہے تھے۔ حکام، وزراء، گورنر اور دیگر عہدیداران حکومت لہو ولعب، عیش و تعیش عافیت کوشی و آرام طلبی اور تفریح و دل بستگی کے جملہ انواع و اقسام کے رسیا ہوچکے تھے۔ امور سلطنت کی دیکھ بھال اور نظم حکومت کی درستگی کے علاوہ ان کو ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ دنیا بھر کی برائیاں جنم لے چکی تھیں۔ گانے بجانے کا رواج اس قدر پروان چڑھا کہ دارالحکومت میں دنیا جہان کی عمدہ گانے والی لونڈیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ ملک کی مالیات کا بڑا حصہ اس طرح کی لغویات پر صرف ہونے لگا۔ غریب و محنت کش عوام دن بدن طرح طرح کے خراج اور ٹیکس کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے، جس کے نتیجے میں عوام کے اندر بے اطمینانی اور عدم اعتماد کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔

چوتھی صدی ہجری کے نصف میں عباسی حکومت کے حالات اور بھی خراب ہوگئے صوبوں پر مرکز کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی، قوت نافذہ نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی، اور حکومت میں عجمیوں کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔ مختلف خلفاء کے زمانے میں الگ الگ

غیر عرب قوموں کو آگے بڑھایا گیا۔ پھر نوبت یہاں پہنچ گئی کہ صوبوں کے گورنروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ واسط اور بصرہ میں بریدی، یمامہ اور بحرین میں قرامطی، مصر وشام میں اخشیدی، مغرب و افریقہ میں فاطمی، خراسان میں سامانی، طبرستان اور جرجان میں دیلمی، موصل اور دیار بکر و ربیعہ میں حمدانی اور ایران، رسی، اصبہان، طبرستان، جرجان اور جبل کرمان کے بعض علاقوں پر بویہی خاندان کی حکومت تھی[1]، عباسی حکمران کے ہاتھ میں بغداد کے سوا اور کوئی علاقہ باقی نہ بچا اور بغداد پر بھی حقیقی معنوں میں عباسی خلیفہ کی حکومت نہیں تھی بلکہ وہ صرف نام کا خلیفہ تھا۔ حکومت کے اصل کرتا دھرتا بویہی خاندان کے افراد ہی تھے۔ وزراء، قضاۃ، گورنر اور فوجی کمانڈر بویہی خاندان کے افراد ہی ہوا کرتے تھے۔ ۳۴۷ھ میں ان کا اثر ورسوخ اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور خطبہ میں عباسی خلیفہ کے ساتھ بویہی حکمراں کا نام بھی پڑھا جانے لگا[2]۔ رفتہ رفتہ عباسی خلفاء کی حیثیت صرف دینی پیشوا کی رہ گئی اور حکومت پر اغیار کا قبضہ ہوگیا۔ وسیع وعریض عباسی حکومت مختلف چھوٹے چھوٹے صوبوں اور علاقوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی جس کے سبب ہر علاقے میں الگ الگ دربار وجود میں آنے لگے اور ہر ایک دربار سے علماء، ادباء اور شعراء کی ایک جماعت منسلک ہوگئی جن کی تخلیقات وتصنیفات کا زیادہ تر حصہ علاقائی اور مقامی خوبیوں کے اظہار وبیان پر مشتمل تھا۔ علاقے وحکومت کے اختلافات کے ساتھ ساتھ مذہب ومسلک میں اختلاف کی شروعات ہوئی۔ قدریہ، شیعہ، حنابلہ، زردشت، حنفی، شافعی، مالکی وغیرہ متعدد فرقے وجود میں آگئے۔ پھر ان فرقوں کے درمیان باہمی مجادلے اور مناظرے میں شدت آگئی۔ علم کلام اور فلسفہ کو فروغ ملا۔ امراء وسلاطین نے بھی ان فلسفیانہ موشگافیوں اور مناظروں میں دلچسپی لینا شروع کردیا۔ امراء وسلاطین اپنے مزاج اور نفس کے خلاف کوئی بھی بات برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ لہٰذا حقیقت پسند اور جید علماء وحکماء کے ایک طبقے نے عوام کے خوف اور امراء کی جہالت کی بدولت

روپوشی اختیار کرلی۔ ارباب حل وعقد اور فلاسفہ کے اسی روپوش طبقے سے ابوحیان کا بھی تعلق تھا۔[۳]

ابوحیان توحیدی

چوتھی صدی ہجری میں دنیائے عربی ادب کے نامور ادبا اور شہرہ آفاق انشا پردازوں میں ابوحیان کا نام سرفہرست آتا ہے لیکن یہ عربی ادب کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی وفات کے بعد ایک طویل عرصے تک لوگوں کی عدم توجہی اور ناقدری کی بدولت گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بیشتر گرانقدر علمی و ادبی تصنیفات زمانے کی نذر ہوگئیں۔ چنانچہ یاقوت الحموی اس کی متنوع شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:

ترجمہ: "وہ بزم صوفیا کا صدر، طبقۂ ادبا کا سردار، گروہ فلاسفہ کا ادیب، فرقہ معتزلہ کا دانشور، محققین کا سرخیل، فن بلاغت کا امام، سامانیوں کا گل سرسبد، اہل زبان کا پیشوا، ذہانت، ذکاوت، فصاحت، زبان دانی اور قادر الکلامی میں یکتائے روزگار، مختلف علوم و فنون کی درایت و روایت کی رعایت کے ساتھ حصول کا ملکہ حاصل تھا، لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کی زندگی کا دائرہ بہت محدود تھا، وہ زمانے کی ستم ظریفیوں کی شکایت کرتا اور اپنی تصنیفات میں اپنی محرومیوں کا رونا روتا۔"[۴]

نام و نسب ترجمہ نگاروں کے درمیان آپ کے اصل نام کے سلسلے میں کچھ اختلاف ہے۔ مورخین کی اکثریت کا خیال ہے کہ آپ کا نام علی بن محمد بن العباس التوحیدی ہے۔ لیکن ساتویں صدی ہجری کے مورخ "معین الدین ابوالقاسم الجنید الشیرازی" اپنی کتاب

"مسند الاسرار عن حفظ الاوتاد" میں آپ کا اصل نام "ابوحیان احمد بن عباس الصوفی التوحیدی" بتاتے ہیں اور موصوف اپنی رائے میں منفرد ہیں۔[۵]

ابوحیان کی خود نوشت تحریروں اور کتابوں سے آپ کے اصل نام اور حسب ونسب کا کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ آپ کی تصنیفات وتخلیقات سے صرف آپ کی کنیت اور لقب کا پتہ چلتا ہے۔ "ابوحیان" آپ کی کنیت اور "توحیدی" لقب تھا۔ اس کی صراحت آپ کی کتاب "البصائر والذخائر" اور "الامتاع والموانسۃ" میں موجود ہے۔ آپ کی زندگی ہی میں آپ کی کنیت اور لقب آپ کے اصل نام پر غالب آگیا تھا۔

لقب اور کنیت آپ کے لقب کے سلسلے میں دو طرح کے اقوال ملتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کے آباواجداد میں سے کوئی ایسی کھجور بیچا کرتا تھا جسے "التوحید" کہتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب "التوحیدی" پڑ گیا۔[۶] ابن حجر العسقلانی کا خیال ہے کہ آپ کی نسبت "التوحید" کی طرف کرنے کا محرک دین اسلام ہے۔ کیونکہ معتزلہ اپنے آپ کو اہل توحید کہا کرتے تھے، جس کی وجہ سے آپ کا لقب "التوحیدی" پڑ گیا۔[۷] لیکن ان دونوں تاویلات کے پیچھے کوئی ٹھوس اور محکم دلیل نہیں ہے اور نہ ان دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر فضیلت دی جا سکتی ہے۔ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ آپ کے آباواجداد میں سے کوئی بغداد میں کھجور فروخت کیا کرتا تھا۔ اور دوسری تاویل میں بھی احتمال کی گنجائش ہے۔

اس کی وجہ جو بھی رہی ہو، یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ ابوحیان نے اپنی کتابوں میں بے شمار لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، ہر خاص و عام سے بحث کی ہے، مختلف بادشاہوں، صوفیاء اور حکماء کے حالات پر نہایت تفصیل سے لکھا ہے، لیکن اپنے حسب ونسب، اپنے خاندان اور اپنے آباء واجداد اور قریبی رشتہ داروں کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

وطن

ابوحیان توحیدی کے وطن کے بارے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ذکی مبارک نے اپنی کتاب میں نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ابوحیان فارسی الاصل تھے[8]۔ یاقوت حموی کا خیال ہے کہ وہ شیراز کے رہنے والے تھے۔ لیکن محمد کرد علی کا خیال ہے کہ آپ عربی النسل تھے[9]۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ فارسی زبان سے ناواقف تھے۔ اگر آپ ایران میں پیدا ہوتے تو فارسی زبان سے بخوبی واقف ہوتے۔ السندوبی نے المقابسات کے مقدمے میں لکھا ہے کہ گو کہ مسئلہ اختلافی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ایرانی النسل تھے۔ بہرحال مورخین کی اکثریت آپ کے ایرانی الاصل ہونے کے حق میں ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد کرد علی کی رائے بھی اپنی جگہ اس وجہ سے باوزن ہے کہ ایرانی مورخین نے بھی تقریباً آپ کے وطن کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ دلیل بھی اپنے ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ ایرانی زبان یعنی فارسی سے ناواقف تھے کیونکہ آپ کی تصنیفات و تالیفات کا جو علمی، ادبی اور تحقیقی سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ سب کا سب عربی زبان میں ہے۔

تاریخ پیدائش

ڈاکٹر ذکی مبارک کا خیال ہے[10] کہ آپ کی تاریخ پیدائش اور مقام ولادت کے سلسلے میں کوئی قطعی تاریخی ثبوت نہیں ملتا بلکہ آپ ایک ایسے گمنام ماحول کے پروردہ دانشور ہیں جس کے اندر شہرت و ناموری اور جاہ و منزلت کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ توحیدی کی تاریخ پیدائش ۳۱۰ھ ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۴۰۰ھ میں ابوحیان نے قاضی ابوسہل محمد کو ایک خط لکھا جس میں اس بات کی صراحت تھی کہ اس کی عمر اب نوّے سال کی ہے[11]۔ مورخین کا اندازہ ہے کہ آپ کی تاریخ پیدائش ۳۱۰ھ سے ۳۲۰ھ کے درمیان ہے۔ المقابسات کے مقدمہ میں

السندوبی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آپ کی پیدائش ۳۱۲ھ میں ہوئی ۔

تاریخ وفات آپ کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی ۔ صاحب روضات الجنۃ بیان کرتے ہیں کہ "انھوں نے شیراز کی معتبر تاریخوں میں سے کسی تاریخ میں یہ دیکھا کہ ابوحیان توحیدی کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی ہے[12]۔ احمد بن ابوالخیر زرکوب شیرازی اپنے والد کے واسطے سے بیان کرتے ہیں" ابوحیان کو شیخ کبیر کے سامنے مقام عفیف کی وادیوں میں دفن کیا گیا آپ کی قبر پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر" ابوحیان توحیدی بغدادی" کندہ تھا۔ پھر میں نے مزید چھان بین کی تو ایک اور تختی ملی جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ "یہ ابوحیان توحیدی کی قبر ہے جن کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی ہے"

ایک دوسری روایت کے مطابق آپ کی وفات ۳۸۰ھ میں ۔ بغیۃ الوعاۃ[13] میں امام سیوطی نے اسی خیال کی تائید کی ہے ۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ آپ کی وفات ۴۱۴ھ میں ہوئی ۔ ساتویں صدی ہجری کے مورخ ابوالعباس احمد بن ابی الخیر زرکوب الشیرازی اور معین الدین ابوالقاسم الجنید الشیرازی نے بالترتیب اپنی کتابوں شیراز نامہ اور شدالانہ ادعن حط الاونہاد میں ابوحیان کی تاریخ وفات ۴۱۴ھ بتائی ہے[14]۔ امام حجر العسقلانی اس کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "ابوحیان پر جب سکرات کا عالم طاری ہوا تو حاضرین نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ اللہ کا ذکر کرو ۔ کیونکہ یہ وقت خدا سے ڈرنے کا ہے ، یہی وہ گھڑی ہے جس کے لئے انسان تیاری کرتا ہے ۔ اور ابوحیان کے سامنے ذکر کرنے لگے اور توحیدی کو بھی خدا کی یاد دلانے کی کوشش کی ۔ یہ دیکھ کر ابوحیان نے سر اوپر اٹھایا اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی فوجی افسر یا پولس والے کے پاس جا رہا ہوں ؟ بلکہ میں تو اس رب کے حضور جا رہا ہوں جو عفو و درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے[15]۔"

زندگی کے ابتدائی حالات ابوحیان توحیدی عرب دنیا کا ایسا مظلوم لیکن بے مثال اور یکتائے روزگار ادیب اور دانشور ہے جس کے ساتھ تاریخ و ادب کی کتابوں نے ایک طویل عرصہ تک غفلت برتی۔ ابتدائی دور کے مورخین نے اس کے حق میں کچھ زیادہ امانت و دیانت کا ثبوت نہ دیا۔ ان کے وطن، خاندان، تاریخ پیدائش و وفات اور حسب و نسب کے بیان سے اغماض برتا تاکہ آپ کی متنوع شخصیت کے درخشاں پہلو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ لیکن بعد کے مورخین نے عربی ادب و فلسفہ کے اس درِ یتیم کو گمنامی کے کثیف بادلوں میں ہمیشہ کے لیئے روپوش ہونے سے بچا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات، ایام طفولیت کی تفصیلات اور عہد شباب کی مصروفیات کا کوئی قطعی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ زندگی کے ان مراحل میں آپ کی کیا سرگرمیاں تھیں۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ عہد طفولیت میں دوسرے بچوں سے مختلف تھے، بچپن ہی سے نہایت ذکی الحس تھے، گرد و پیش میں رونما ہونے والے حالات و حوادث کا گہرائی اور باریکی سے مطالعہ کرتے، جو کچھ سنتے یا دیکھتے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کا باریک بینی سے جائزہ لیتے۔ آپ دوسرے بچوں کے مقابلے میں نہایت لاغر اور ضعیف تھے لیکن ذکاوت و ذہانت، حکمت و فراست، حلم و بردباری اور عقل و دانش مندی میں ممتاز اور منفرد تھے، علم ادب اور فلسفہ و تصوف سے ابتدا ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر بھی آپ کی تیس سال سے قبل کے حالات زندگی کے بارے میں تاریخ و ادب کی مستند کتابوں سے کچھ زیادہ تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن تیس سال کے بعد سے آپ کے علمی کارناموں اور تحقیقی کاوشوں کے واضح اشارات ملتے ہیں۔ اور یہیں سے ان کے حالات زندگی،

ان کے اساتذہ، ان کی تصنیفات وتالیفات کے قطعی تاریخی ثبوت بھی ملتے ہیں۔

عقیدہ ومذہب ابوحیان توحیدی کے دین ومذہب اور عقیدہ ومسلک کے سلسلے میں مورخین اور ترجمہ نگاروں کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے۔ تاریخ میں مختلف روایتیں ملتی ہیں کوئی تو آپ کو زندیق، دہریہ، کذاب، ملحد اور بے دین گردانتا ہے کوئی آپ پر وضع حدیث کا الزام عائد کرتا ہے اور کوئی آپ پر وضع حدیث کا الزام عائد کرتا ہے اور کوئی آپ کو موحد اور صحیح العقیدہ بتاتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف ائمہ نے الگ الگ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

پہلا قول "ابوالحسین احمد بن زکریا بن فارس" کا ہے جو ابن فارس کے نام سے مشہور ہیں۔ جن کی وفات مورخین کے مختلف اقوال کے مطابق ۳۶۰، ۳۹۱ یا ۳۵۵ھ میں ہوئی۔ آپ ابوحیان کے معاصر تھے۔ ان کا ابوحیان سے مشاہدہ اور سماع ثابت ہے۔ طبقات الشافعیہ میں ـــــ ابوحیان کے سوانح کے تحت ـــــ "ذہبی" نے ابن جوزی کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ابن فارس نے کتاب الفریدہ والخریدہ" میں لکھا ہے:

> "ابوحیان ایک جھوٹا، بے دین، حد قذف سے بھاگا ہوا اور علانیہ بہتان کا مرتکب شخص تھا۔ اس نے شریعت کے نہایت اہم اور بنیادی مسائل پر اعتراضات کئے اور ان کی صحت وثقاہت پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ وزیر صاحب بن عباد کو اس کے گمراہ کن عقیدے اور غیر دینی افکار ونظریات نیز غیر اسلامی سرگرمیوں اور کارروائیوں کی خبر ہوگئی۔ اس نے اس کو قتل کرنے کے ارادے سے دربار میں حاضر کرنے کا حکم صادر کیا۔ ابوحیان کو اس کی بھنک مل گئی وہ جان بچاکر

عباد کے دشمنوں سے جا ملا، اس نے اپنی اختراع پردازیوں سے ان کو بھی گمراہ کرنا شروع کر دیا، ان کے عقیدے میں خرابی پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ لوگوں کو اس کی باطنی خرابیوں، لادینی نظریات، الحادی افکار اور ناقص عقیدے کا علم ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے گمراہ کن عقائد کی خبر وزیر تک پہنچادی۔ وزیر نے اسے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا تو وہ روپوش ہو گیا اور اسی روپوشی کے عالم میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے کیونکہ اس نے اس دنیا میں ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کیا۔[16]"

دوسرا قول ابوالفرج ابن جوزی کا ہے۔ جس کی تاریخ پیدائش ۵۱۰ھ اور تاریخ وفات ۵۹۷ھ ہے۔ ابوحیان کے ترجمہ کے تحت طبقات الشافعیہ للسبکی میں ابوالفرج بن الجوزی کا یہ قول موجود ہے "زنادق اسلام تین ہیں: ابن الراوندی، ابوحیان التوحیدی اور ابوالعلا المعری" اور ان میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوحیان توحیدی تھا لیکن اس کی اسلام دشمنی کھلی ہوئی نہیں تھی۔[17]

"ذہبی" شمس الدین بن محمد بن احمد بن عثمان بن قائماز (۶۷۳ ـــــ ۷۴۸ھ) کا کہنا ہے کہ ابوحیان اللہ تعالیٰ کا دشمن، خبیث اور سیئ العقیدہ شخص تھا۔[18]

احمد بن علی ابن حجر العسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) نے ابن فارس، ابن جوزی اور ذہبی کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے اس پر مزید وضع حدیث کی تہمت بھی لگائی ہے۔

عبدالرزاق محی الدین نے ان تمام روایات کی اسناد، عبارتوں اور زمانے کے تاریخی حقائق کے آئینے میں تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ابوحیان

پر الحاد و لادینیت، زندیقیت، کذب گوئی اور اسلام دشمنی کے جو الزامات عائد کیے گئے ہیں وہ سب کے سب محل نظر ہیں۔ ان الزامات کے پس پشت ابوحیان کی ذات سے دشمنی اور عداوت کا جذبہ کارفرما ہے یا پھر ان علماء کا اس کے فلسفیانہ نظریات اور متصوفانہ خیالات سے اختلاف کا عامل ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ ان نصوص اور عبارتوں کے مقابلے میں کچھ ایسی قدیم مستند روایتیں بھی ملتی ہیں جن سے ابوحیان توحیدی کے صحیح العقیدہ ہونے اور دین اسلام سے اس کے گہرے تعلق کے قطعی تاریخی ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔

ابن النجار الحافظ البغدادی کا قول ہے کہ "ابوحیان بہت ساری اچھی کتابوں کا مصنف تھا جیسے البصائر و الذخائر وغیرہ۔ وہ ایک فقیر، صابر، مذہبی اور صحیح العقیدہ شخص تھا"[۲۰]

یاقوت الحموی نے لکھا ہے کہ ابوحیان توحیدی ایک خاموش طبع صوفی تھا، دین و مذہب کے معاملے میں وہ لوگوں کے درمیان ثقہ سمجھا جاتا تھا۔"[۲۱]

زرکوب شیرازی نے "شیراز نامہ" میں ابوحیان کے سوانح کے تحت لکھا ہے کہ وہ توحید پرست امام، یکتائے روزگار عالم، مختلف علوم و فنون کا بحر ذخار، الٰہی انکشافات و خدائی الہامات کے سلسلے میں بے نظیر اور توحید و عقائد سے متعلق مسائل کے بحث و مناظرے میں منفرد تھا۔"[۲۲]

امام ابن حجر العسقلانی ابویعلی کے واسطے سے ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب ملک المعانی میں ابوحیان کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ صوفیوں کا سردار، دبابر کا استاد، فلسفیوں کا امام اور عوام کے درمیان سب سے زیادہ زاہد، عبادت گذار اور حسن الاسلام شخص تھا۔"[۲۳]

توحید پرست — اس طرح ہم ان مختلف اقوال کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابوحیان توحیدی ایک ماہر فلسفی، آزاد مفکر، شب زندہ دار صوفی، عجیب وغریب عادات واطوار کا مالک اور مختلف صفات وخوبیوں کا حامل شخص تھا۔ اسے بہت سارے اوراد و وظائف یاد تھے جن کے ذکر وورد میں وہ مشغول رہتا۔ وہ ایک مستند راوی تھا جس کی روایت و ترتیب کے اندر کسی غرابت یا نقص کا شبہ نہیں ہے۔ مختلف میدانوں میں اس کی اس قدر شہرت ومقبولیت کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فلسفہ وتصوف اور اس ضمن میں ہونے والی تحقیقات وایجادات سے اختلاف رکھنے والے لوگ اس کے مخالف ہو گئے اور اس کے سب سے زیادہ سخت مخالف حنابلہ تھے جنھوں نے جذبۂ انتقام میں آکر اس کے اوپر کفر، زندیقیت، الحاد ولادینیت تک کے الزامات عائد کر دئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ابوحیان سچا موحد، مخلص مسلمان اور دین اسلام کا بے باک ترجمان اور جانباز سپاہی تھا۔ اس نے اسلام کے عام بنیادی اصولوں کی بھی مخالفت نہیں کی۔ اس کے اندر خدمت اسلام کا شدید جذبہ تھا۔ جیساکہ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے دین اسلام کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کی، صحابہ اور سلف صالحین پر تنقیدیں کیں، عوام الناس کو ضلالت وگمرہی کے رستے پر ڈال دیا اور اسلام دشمن سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو اس کی زندگی کے حالات اور تاریخی ان اعتراضات کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔

(باقی آئندہ)

تبصرہ

رسالہ برہان کا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر

از ڈاکٹر ماجد علی خاں ، جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی ۲۵

تقریباً نصف صدی قبل رسالہ "برہان" ندوۃ المصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مرحوم کی زیر نگرانی اور اپنے دور کے معروف و جید عالم دین استاذی حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب مرحوم کے زیر ادارت وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرنے کے ارادے سے نکلنا شروع ہوا تھا اور وہ تقاضہ یہ تھا کہ جدید دور میں جدید اسلوب کے ساتھ جدید دلائل و براہین قاطع کے ہتھیاروں سے اسلام پر ہونے والے حملوں کا جواب دیا جائے نیز مسلمانوں کے دینی و علمی سرمایہ کو محفوظ کیا جائے ۔ چنانچہ اپنی پوری تاریخ میں "برہان" نے اپنے اس مشن کو پوری طرح نبھایا اور کامیابی کے ساتھ اپنے مقاصد کو حاصل کیا ۔ افسوس ہے کہ آج نہ تو مفتی صاحب ہی رہے اور نہ ہی اکبرآبادی صاحب ۔ "برہان" پھر بھی نکل رہا ہے جاری اور ساری ہے اور اپنے مقاصد کی تحصیل میں سرگرداں ہے ۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے جناب عمید الرحمٰن صاحب عثمانی اب اس کے روح رواں ہیں ۔

اُمید ہے کہ یہ رسالہ اسی شان سے نکلتا رہے گا جس شان سے اس کو مفتی صاحب مرحوم اور مولانا اکبر آبادی صاحب مرحوم چھوڑ گئے تھے۔

"برہان" کی تاریخ میں شاید پہلی بار اس کی خصوصی اشاعت ہوئی ہے اور وہ بھی اس شخصیت کی یاد میں جس نے نہ صرف اس رسالہ کی بلکہ اس ادارہ کی بھی، میری مراد ندوۃ المصنفین سے ہے، بنیاد ڈالی، جس سے ہزاروں سے تجاوز کر کے لاکھوں مسلمانوں کی دینی وعلمی پیاس بجھی، "برہان" کا یہ خصوصی نمبر، یعنی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر، ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں مشاہیر اہل قلم نے حضرت مفتی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ کتابت اور گیٹ اپ بھی بہت خوشنما ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین اس سے خصوصی استفادہ کریں گے۔

(ماجد علی خاں)

بیان ملکیت وتفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم ، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت	اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
۲۔ وقفہ اشاعت	ماہانہ
۳۔ طابع کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
۴۔ ناشر کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
سکونت	۳۶ ۱۴، اردو بازار، دہلی ۶
۵۔ ایڈیٹر کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
سکونت	۳۶ ۱۴، اردو بازار، دہلی ۶
۶۔ ملکیت	ندوۃ المصنفین ، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمیدالرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع وناشر

برہان

جلد ۱۰۱ | شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۸۸ء | شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگلو میں چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

فلسطینی عربوں پر وحشیانہ مظالم

ذرّہ ذرّہ ہے دہکتے ہوئے لاوے کا نقیب
شعلہ زن فتنۂ محشر ہے خدا خیر کرے

جیسا کہ آپ کو اخبارات و ریڈیو وغیرہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ برسہا برس سے اسرائیلی ظالم سرکار فلسطینی عربوں پر ظلم و ستم اور جبر و قہر کے پہاڑ توڑ رہی ہے معصوم بچوں، عورتوں، نوجوان مردوں اور بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو گولیوں، خنجروں، لاٹھیوں اور سنگینوں سے زخمی اور ہلاک کیا جا رہا ہے، ان کو بلا وجہ جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے جہاں ان پر انتہائی غیر انسانی مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور ان کے ہاتھ پیر توڑے جا رہے ہیں، ان مظالم کی رپورٹیں امریکہ، برطانیہ اور خود اسرائیلی اخبارات میں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ ہندوستان اور دوسرے بہت سے ملکوں کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن ان دردناک مظالم کو نشر کر رہے ہیں۔ جن کو سن کر اور ٹی وی پر دیکھ کر کروڑوں انسانوں کے دلوں میں درد اور کسک پیدا ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر دنیا کے اخبارات، سیاسی رہنما اور مفکرین مجبور ہیں۔ کہ بے پناہ مظالم کے مقابلہ پر فلسطین میں رہنے والا ہر عرب مرد، ہر عورت، ہر بچہ اور بوڑھا عزم و استقلال، پامردی اور جوش و جذبہ کا ایک کوہ گراں بن گیا ہے۔ اور ان مظالم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہے۔

تاریخ ان جیالے بہادر نڈر اور سرفروش لوگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہے قوموں کے عروج و زوال کے الٰہی فلسفہ اور خدائی قانونِ عدل

وانصاف کی روشنی میں یہ امید کی جا سکتی ہے کہ بے گناہ انسانوں پر ڈھائے جانے والے یہ قہرناک مظالم بہت جلد ایک ایسے انقلاب کو جنم دینے کا ذریعہ بنیں گے جو خوفناک آگ کی شکل میں نمودار ہوگا کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ سے ہر ظالم و جابر یہودی اور اس کے بے رحم حمایتی کسی صورت محفوظ نہ رہ سکیں گے ہاں ۔ ؟ اک ایسا انقلاب "جو خاک و خوں میں ملا دے ستم کی تعمیریں" ۔۔۔

ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ ان غیرانسانی مظالم پر امن عالم کے ٹھیکیدار چپ ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ جمہوریت کے دعویداروں کو سانپ سونگھ گیا ہے ۔ انسانی حقوق کے پاسبان خاموش ہیں، تہذیب و شرافت انگشت بدنداں اور عدل و انصاف سر بگریباں ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اس نام نہاد دور ترقی اور عہد عروج و ارتقاء میں وحشت و بربریت کا یہ ننگا ناچ کیوں ناچا جا رہا ہے اور وہ بڑی طاقتیں جو دنیا کے سیاہ و سفید کی مالک بنی ہوئی ہیں اسرائیل سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ وہ کیا کر رہا ہے ۔ ہٹلر اور نازیوں کے مظالم کا انتقام بے قصور عربوں سے کیوں لے رہا ہے ۔ ؟ کون ہے جو آتش و آہن کے اس سلسلہ کو بند کرا سکے ۔ ؟ کہاں ہے اقوام متحدہ، کہاں گیا اس کا حقوق انسانی کا منشور ؟ فلسطینی معصوم بچوں کی تڑپتی لاشیں، عورتوں کی دل ہلا دینے والی چیخیں اور نوجوانوں اور بوڑھوں کی وہ مظلوم آنکھیں جو بڑی حیرت سے ساری دنیا کی طرف، سارے انصاف پسند انسانیت دوست لوگوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھ رہی ہیں اور ان کی نمناک آنکھیں ان کے درد سے لبریز دل ان کے زخمی احساسات سوال کرتے ہیں ۔ آخر ان کو ایک باعزت شہری کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق خدا کی اس زمین پر کیوں نہیں ہے ۔ جہاں اُن کے آباء و اجداد پیدا ہوئے جہاں اُن کے گھر، ان کے کھیت اور ان کے کھلیان اور ان کے ایمان و یقین کے مرکز موجود ہیں ۔ آخر ان کو آزادی اور حق

خود اختیاری سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے اور اس حق کے طلب کرنے پر ان کو گولیوں سے کیوں بھونا جا رہا ہے۔ ؟؟؟

اسرائیل اور امریکہ کے دو معروف اخبارات ــــ یروشلم پوسٹ اور واشنگٹن پوسٹ" ــــ کے نمائندوں نے جو رپورٹیں اپنے اخباروں میں بھیجی ہیں ان میں گذشتہ مہینوں کے دوران پیش آنے والے واقعات کی جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف عربوں پر انسانیت سوز اسرائی مظالم کا دردناک سلسلہ ہے اور دوسری طرف ان وحشیانہ مظالم نے یہودیو کے ایک طبقہ کے "پتھریلے دلوں" میں درد کا تھوڑا بہت احساس پیدا کرد ہے، چنانچہ مشہور یہودی تنظیم ــ Peace now ــــ کی عملی سرگرمیاں بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ یروشلم پوسٹ اور بعض مغربی اخبارات اور نیوز ایجنس کی خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تنظیم کی طرف سے گذشتہ ماہ ایک بہت بڑا جلسۂ عام کیا گیا جس میں پچاس ہزار لوگ شریک ہوئے، یروشلم پوسٹ کے نمائندہ کی رپورٹ کے مطابق مقررین کے پرجوش لہجے اور حاضرین کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر صاف پتہ چل رہا تھا کہ عربوں کے جگر چھلنی کرنے والی ظالم اسرائیلی حکومت کی ناک کے نیچے اس کے سیاہ کارناموں پر نفرت اور ناراضگی غصے اور ملامت کا اظہار کرنے کے لیے ایک قابل ذکر گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ جلسہ کی یہ خصوصیت بھی اہم اور قابل ذکر ہے کہ فلسطینی عرب باشندے بڑی تعداد میں پی ایل او کے جھنڈے اٹھائے ہوئے اس میں شریک تھے

جلسہ کے مقررین نے فلسطینی عربوں پر کیے جانے والے مظالم کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور حکومت اسرائیل کی ظالمانہ پالیسیوں کو خود یہودیوں کے لیے تباہ کن قرار دیا۔ ایک مقرر نے نہایت پرجوش لہجہ اور پرزور الفاظ میں کہا کہ

"ہم یہاں یہ سوال کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہم نے ۱۹۸۲ء
میں لبنان پر حملہ کیا تو اس سے ہمیں کیا ملا اور اب جو فلسطینیوں
کے ہاتھ پیر توڑے جا رہے ہیں تو اس سے ہمیں کیا ملے گا"

اس جلسہ میں ایک فوجی جوان بڑے پُرجوش انداز میں مائک پر آیا اور پرزور طریقہ پر بولتے ہوئے جب اس نے یہ الفاظ کہے۔ تو لوگ سناٹے میں آگئے کہ۔

"ہم لبنان میں گئے تو ہمیں وہاں گولیوں سے اپنے جسموں کے چھلنی
ہونے کا خطرہ تھا لیکن غزہ کی پٹی اور مغربی اردن میں جو کچھ کیا جا رہا
ہے اس سے ہماری روحوں کے جھلس جانے کا اندیشہ ہے۔"

اسرائیلی پارلیمنٹ کے بعض ممبران نے بھی ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہودیوں میں دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو چکا ہے جو ان مظالم کے خلاف ہے اور ان کو ناپسند کرتا ہے۔ مگر اسرائیلی حکومت اور اس کے بدبخت وزیر اپنی روایتی سیاہ قلبی تاریک ضمیری اور تنگ ذہنی کی وجہ سے ہواؤں کے اس رُخ کو پہچاننے اور حالات کے ان تیوروں، وقت کے تقاضوں اور لیل و نہار کی ان گردشوں کے ہجوم میں سے ابھرتی ہوئی لکیروں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر پا رہے ہیں۔

خدا کرے کہ حالات کے کڑوے کسیلے گھونٹ ہمارے عرب بھائیوں اور تمام اسلامی حکومتوں کے سربراہوں کو اپنے اختلافات کی بساط سمیٹ لینے اور متحد ہو کر عملی اقدامات کرنے پر تیار و آمادہ کر سکیں اگرچہ کہ ان کی موجودہ حالت، بے حسی اور آپسی رسہ کشی اور غفلت و مدہوشی سے تو یہ المناک ذنا سف انگیز احساس ہوتا ہے کہ ؎

یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اتار دے

گجرات کے تین تعلیمی وتربیتی مراکز میں حاضری

جن کی بنیاد حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے رکھی تھی

(از عمید الرحمٰن عثمانی)

مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) کے زمانہ میں ان سے بہت سے علماء نے کسب فیض کیا جن سے تعلقات نہایت خوشگوار رہے، ان میں سرفہرست حضرت مولانا غلام محمد نور گت صاحب کا اسم گرامی ہے، حضرت مفتی صاحب کے گجرات کے تلامذہ ومتوسلین میں ان سے نہایت گہرے عزیزانہ تعلقات آخری دم تک قائم رہے۔

وفات سے چند سال پہلے حضرت مولانا غلام محمد نور گت صاحب کی دعوت پر حضرت مفتی صاحب نے گجرات کا دینی وعلمی سفر فرمایا اور تین دینی وتعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی۔

(۱) بچوں کا گھر حمایت نگر، ندرنہ ضلع سورت

(۲) بچوں کا گھر مدرسہ تجوید القرآن، گدود، ضلع سورت

(۳) بچوں کا گھر مدرسہ نور اسلام، نور نگر کیم ضلع سورت

مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت کے یہ تینوں مراکز چند سال گذرتے گذرتے عظیم الشان دینی ادارے بن گئے اور مولانا غلام محمد نور گت صاحب اور گجرات کے مخیر و باحوصلہ اصحاب خیر کی جدوجہد سے ان میں بڑی رونق پیدا ہوگئی، اور علم دین کے جو پودے حضرت مفتی صاحبؒ

نے لگائے تھے، تناور درخت بن کر پھل دینے لگے۔

ان بچوں کے گھروں اور تعلیمی و تربیتی مرکزوں کے سلسلے میں علمی و دینی تقریبات برپا ہوئیں جن میں بندہ بھی حضرت مولانا غلام محمد صاحب کی خصوصی دعوت پر شریک ہوا، یہ سفر میرے رفیق کار جناب فخرالدین کی معیت میں ہوا، چنانچہ مورخہ ۷ مارچ ۱۹۸۸ء کو دہلی سے سورت کے لئے روانگی ہوئی اور سب سے پہلے مدرسہ تجوید القرآن کدود میں حاضری ہوئی، سورت اسٹیشن سے بذریعہ کار کدود آئے، رات کو مدرسہ کا جلسہ ہوا جس میں اطراف و جوانب کے بہت سے مسلمان شریک تھے، اس جلسہ میں خاص طور سے مولانا سلمان ندوی صاحب کا بیان بہت پُرمغز اور پُراثر رہا۔

دوسرے دن صبح کو بچوں کا گھر مدرسہ تجوید القرآن میں جلسہ ہوا جس میں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اور مولانا سلمان صاحب ندوی کے بیانات ہوئے، دوپہر کا کھانا مولانا محمد قلیل صاحب کے دولت کدہ پر تھا، مولانا موصوف نے تواضع اور خاطر داری کا پورا حق ادا کیا اور شام کو مولانا غلام محمد فوزگت صاحب کے دولت کدے پر حاضری ہوئی، مغرب کی نماز جامعہ فلاح دارین ترکیسر میں ادا کی گئی، جہاں مولانا سلمان صاحب ندوی کا بیان ہوا۔

صبح کو بچوں کا گھر مدرسہ نور اسلام کیم میں مولانا احمد رضا بجنوری صاحب، مولانا سلمان ندوی صاحب اور مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کے بیانات ہوئے۔ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری صاحب کی صدارت میں یہ تمام پروگرام منعقد ہوئے۔

مولانا محمود سورتی صاحب نے ان تمام پروگراموں میں دلچسپی اور حصہ لیا اور ہماری رہنمائی کی۔

ان تعلیمی و تربیتی اداروں اور ان کے جلسوں میں عجیب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روح ہر جگہ موجود تھی اور اپنے لگائے ہوئے

ن علمی ودینی پودوں کی سرسبزی وشادابی اور بارآوری پر بیحد مسرور تھی ۔

ہم مولانا غلام محمد نورگت صاحب اور ان کے رفقا کے بیحد شکرگذار ہیں کہ انھوں نے ان جلسوں میں ہمیں دعوت دے کر نہ صرف عزت بخشی بلکہ اپنے اسلاف کی خدمات کے دیکھنے اور ان سے عبرت لینے کا موقع دیا ۔

اللہ تعالیٰ ان اداروں کو تادیر قائم رکھے اور ان کے مخلص خادموں کے ذریعہ دینی تعلیم وتربیت سے مسلمانوں کے بچوں کو فیضیاب کرے ، آمین ۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد

مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رامپوری

(عہد شخصیت اور علمی خدمات)

۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء ——— ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۸ء

از: ڈاکٹر ماجد علی خاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ جل شانہٗ نے اس عالم میں موت و حیات کا رشتہ ایک ایسا رشتہ بنایا ہے جس سے ادنیٰ و اعلیٰ کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ چاہے وہ انبیاء جیسے مقرب بارگاہ ہوں یا فرعون، ہامان و شدّاد جیسے مغضوب و ضال ہوں سب کو موت کی آغوش میں بالآخر جانا ہی ہوتا ہے اور اس کے ذائقہ کو چکھنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ (ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔) باقی رہنے والی صرف خداوند قدوس کی ذات ہے اس کے علاوہ ہر شے پر ازل سے ہی فنا کے نقطہ کو ثبت کر دیا گیا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

اس کے باوجود کچھ اموات ایسی ہوتی ہیں جن کو اس فانی دنیا میں موت سمجھا جاتا ہے لیکن اللہ کے یہاں وہ حیات شمار کی جاتی ہیں: وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (البقرۃ: ۱۵۴) ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جاتے ہیں اُن کی نسبت یوں بھی

مت کہو کہ وہ (معمولی مُردوں کی طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم (ان حواس سے اس حیات کا) ادراک نہیں کرسکتے۔ اسی مفہوم میں عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے:

موت التقی حیات لا نفاد لہا
قد مات قوم وہم فی الناس احیاء

(ترجمہ) متقی اور پرہیزگار کی موت غیر فانی زندگی ہے۔ یہ لوگ بظاہر مر چکے ہیں حالانکہ عالم انسانیت میں دراصل زندہ یہی ہیں۔

حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو بظاہر تو اس عالم فانی سے گزر چکے ہیں لیکن ان کے کارنامے اب بھی زندہ جاوید ہیں اور عالم انسانیت میں یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

آپ کی پیدائش رامپور میں ۴ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۸۹۹ء ہوئی اور وفات ۲۷ شوال ۱۴۰۸ھ / مطابق ۲۵ جون ۱۹۸۷ء بروز جمعرات ہوئی۔

حضرت مولانا کا تعلق پٹھان قوم سے تھا۔ حسن اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی راقم السطور کا تعلق بھی اسی قوم سے ہے۔ میرے ان دو متضاد الفاظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم میں بعض خصائص متضاد ہوتے ہیں۔ جہاں پٹھان اپنی جرأت، خودداری، دلیری، بہادری، اعلیٰ ظرفی اور بات کی پختگی کے لیے مشہور ہیں اور ان کے اندر یہ صفات ملتی ہیں وہاں اگر اس قوم کا جلا نہ ہوا ہو اور اصلاح کی منازل تک اس کی رسائی نہ ہو سکے تو پھر یہ غضب اور شہوت میں ڈوب کر انسانی حدود کو پار کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتی۔ جس کی مثال موجودہ دور میں کراچی کے پختون و مہاجر فسادات اور رامپور شہر میں آئے دن ایسی قتل و غارت ہے اور ماضی میں پٹھان ریاستوں کے حکمرانوں و امراء کا ظلم و تشدد اور نادر شاہ کا دہلی میں قتل عام ہے۔

ں وجہ سے ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ ایک صاحب نے ایک پٹھان سے کہا
ٹھان پٹھانوں میں کوئی پیغمبر ہی نہیں ہوا۔ یہ پٹھان صاحب نے جلا کر جواب دیا
تم جھوٹ بولتے ہو کیا (حضرت) عیسیٰ خاں اور (حضرت) موسیٰ خاں کا نام نہیں سنا؟
اصل یہ اسلام کی خوبی ہے کہ ان متضاد صفات کی حامل قوم بھی اس کے دامن سے
بستہ ہو کر حضرت سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ اور فیض
تہ سے مستفیض ہوئی۔

رامپور ایک ایسا شہر ہے جس کی گود میں سیکڑوں صاحب علم شخصیتوں، شعراء،
یاء، صوفیا اور علماء نے پرورش پائی اور اس کے آب و گل سے استفادہ کیا۔ اسی
ین کے بطن سے مولانا محمد علی اور شوکت علی جیسے جلیل القدر مجاہدین آزادی
لہ اگر رامپور کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالی جائے تو ایسی اعلیٰ شخصیتیں کم ہی ملیں گی۔
نھوں نے اس شہر کے دو تاریخی دوروں کو اچھی طرح دیکھا دیر کھا ہو اور اپنی زندگی
ے بڑے حصّوں کو دونوں دوروں میں گزارہ ہو۔ ایسے علماء میں اگر حضرت مولانا
متیاز علی خاں صاحب عرشی کا نام لیا جائے تو بیجا نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا
جیبہ الدین احمد خاں صاحب کا شمار نہ صرف ایسے علماء میں کیا جاتا ہے بلکہ
یسے صوفیاء میں بھی جنھوں نے اپنی زندگی کے بڑے حصّوں کو رامپور کے دو اہم تاریخی
دوار میں گزارا ہو۔ میری مراد رامپور کے ایک اُس دور سے ہے جو اس کا ریاستی
ور تھا اور دوسرے اُس دور سے ہے جو ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند کے بعد کا ہے پھر
ں کہا جائے کہ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد کا دور ہے جب کہ ریاست کا خاتمہ ہوا اور رامپور
ہندوستان کے نقشہ میں ایک ڈسٹرکٹ یا ضلع کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

حضرت مولانا کے علمی و دیگر کارناموں پر روشنی ڈالنے سے قبل میں مناسب سمجھتا ہوں
ہ اس شہر کے ان دو دوروں کے متعلق بھی سرسری طور پر کچھ نہ کچھ لکھ دیا جائے۔

رامپور کا ریاستی دور :

رامپور کا ریاستی دور جہاں ایک طرف شاہی دبدبہ اور پٹھانی شان و شوکت کا دور تھا تو وہاں یہ دور درباری خوشامد اور جی حضوری کا بھی دور تھا۔ ویسے عام طور پر رامپور کو ایسے حکمراں ملے جنھوں نے علماء اور مذہبی پیشواؤں کی قدر و منزلت کی۔ ریاست میں ایک اعلیٰ دینی ادارہ، مدرسہ عالیہ بھی قائم کیا گیا جس کی شہرت اندرون ملک سے نکل کر بیرون ہند تک پھیل گئی۔ بڑے بڑے علماء اس کی مسند درس پر بیٹھنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ مدرسہ عالیہ کے تمام اخراجات ریاست کی طرف سے ہی پورے ہوتے تھے بعد ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور میں کافی بڑی تعداد میں اہل علم و حرفہ آگئے تھے۔ یہاں کے نوابین ان کی امداد بڑی فراخدلی سے کرتے تھے۔ اس ریاست نے ایسے حکمرانوں کو جنم دیا جنھوں نے غالب، داغ، امیر مینائی جیسے شعراء اور حکیم اجمل خاں صاحب جیسے اطباء، اور اہلِ علم کی مہمان نوازی کی۔ البتہ یہ دور جاگیردارانہ نظام پر قائم تھا۔ اگر اس دور میں نوابین کی نظر عنایت سے راتوں رات ایک غریب و بے آسرا شخص جاگیردار، زمیندار یا مستاجر بن جاتا تھا تو ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر شہر کے بڑے بڑے اور چنیدہ مستاجروں سے گاؤں کو ضبط کر کے روٹیوں کا محتاج بھی کر دیا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ افراد کی ترقی و تنزلی حکمرانوں کی اشارۂ چشم و ابرو کی مرہون منت تھی۔ اصلاحی و علمی اور ٹھوس کام کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض وہ علماء، ادبا، اور اہل حرفا جو ان باتوں کو جھیل نہ سکتے تھے۔ ریاستوں کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جا بسے تھے۔

رامپور کے ریاستی دور کی بعض اہم خصوصیات بھی ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہاں پر اُس دور میں بے روزگاری عام طور پر نہیں تھی۔ لوگ نسبتاً خوشحال تھے۔ نوابین نے رامپور میں بہترین عمارات بنوا کر اس کو مغربی یو پی کا ایک منفرد شہر بنا دیا تھا۔ نواب

حامد علی خاں صاحب کا بنوایا ہوا قلعہ اور اس کے اندر کی حامد منزل نیز دوسری عمارات اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح نواب رضا علی خاں صاحب کے دور میں بھی کثیر تعداد میں عمارتیں بنیں، سڑکیں چوڑی ہوئیں، شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا۔ اس شہر کے باغات لکھنؤ کے باغات کے ہم پلّہ تھے۔ خسرو باغ اور بے نظیر باغ کے درمیان کی سڑک جس کو عام طور پر ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا، کی مثال دور دور تک ملنا مشکل تھی۔ نواب رضا علی صاحب نے آزادیٔ ہند سے قبل رامپور میں اتنے کارخانے قائم کر دادیے تھے کہ یہ شہر چھوٹا سا کانپور کہلایا جانے لگا۔ یہ ان کی دوربینی کی اہم مثال ہے۔ اگر وہ تمام کارخانے آج بھی اسی طرح قائم رہتے تو یہ شہر انڈسٹریز میں یو۔ پی کے بہت سے صنعتی شہروں سے آگے ہوتا۔

اگر نواب حامد علی خاں صاحب رامپور کے اکبر تھے تو نواب رضا علی خاں صاحب کو رامپور کا شاہجہاں کہنا بے جا نہیں ہوگا۔ ریاستی دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ رامپور میں فیملی سسٹم پوری طرح محفوظ تھا۔ گھر اور خاندان کے بڑوں کا چھوٹے ادب و احترام کرتے اور گھریلو و خاندانی روایات کو زندہ رکھتے۔ علماء کا عام طور پر احترام تھا اور صوفیاء کی توقیر و عزّت کی جاتی۔

رامپور کا حال، آزادی کے بعد:

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے چند سال بعد ریاستوں کا خاتمہ ہوا اور اس میں رامپور سرِفہرست رہا۔ اب رامپور ریاست کے بجائے اتر پردیش گورنمنٹ کا ایک ضلع بن گیا جس کا افسرِ اعلیٰ و منتظم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ضلع کلکٹر ہو گیا۔

ریاست کے خاتمہ پر سب سے بڑا اثر فوج اور پولیس کے ملازمین پر پڑا۔ ہزاروں کی تعداد میں ریاست کے دور کے فوجی اور پولیس والے ملازمت سے سبکدوش کر دیے گئے۔ اس کے نتیجہ میں بیروزگاری عام ہو گئی۔ جو کسر رہ گئی تھی زمینداری کے

خاتمہ نے اس کو بھی پورا کر دیا۔ رامپور کے زمیندار پٹھان کاشتکاری کو عیب سمجھتے تھے۔ چنانچہ زمینداری، جاگیرداری اور مستاجری کے خاتمہ سے بڑے بڑے صاحب حیثیت پٹھان روٹیوں کے محتاج ہو گئے۔ غربت اور افلاس نے ان کے دروازوں پر دستک دینا شروع کر دی۔ تعلیمی اعتبار سے بھی ان لوگوں کے پاس اعلیٰ ڈگریاں نہیں تھیں لہٰذا ان میں سے بہت سے لوگوں نے معمولی ملازمتوں پر گزر اوقات کرنے پر قناعت کی۔ اس طرح اس چھوٹی سی ریاست کی خوشحالی پامال کر دی گئی غربت کے نتیجے میں جرائم میں اضافہ ہوا۔

رامپور کے پٹھان مزاج کے اعتبار سے بہت گرم واقع ہوئے ہیں۔ جرائم کے اضافے میں مزاج کی اس گرمی کا بھی کافی اثر ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے غلط تصور نے بھی لاقانونیت میں اضافہ کیا ہے۔ عام لوگ آزادی کو غیر ملکی حکومت سے آزادی کی جگہ آزادیٔ قانون (یعنی قانون سے چھٹی) تصور کرنے لگے ہیں، چنانچہ عام طور پر قانون کا احترام دل سے اٹھ گیا ہے۔ پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے بڑی حد تک خود قانون شکن بن بیٹھے ہیں۔ غرض ان تمام اسباب کی وجہ سے رامپور میں بالخصوص اور اس ملک میں بالعموم آزادی کے بعد لاقانونیت کا دور دورہ ہوا۔ اس شہر میں آپسی قتل و غارت کی جو فضا اب پیدا ہو گئی ہے یا پیدا کر دی گئی ہے اس کی مثال ہندوستان کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ہی ملے گی۔ معمولی معمولی بات پر پستول کی گولی یا چاقو کی نوک سینے کے اندر ہوتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بچپن میں ایک قتل محض ساڑھے دس آنے (موجودہ تقریباً ۶۵ پیسے) کے لین دین کی تکرار پر ہوا تھا۔

ریاست کے خاتمہ کے بعد اس شہر سے فیملی سسٹم کا بھی آہستہ آہستہ خاتمہ ہونا شروع ہو گیا۔ گھر اور خاندان کے بزرگوں کی عزت و احترام آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع

ہوگیا البتہ اگر کسی کے خاندان میں کوئی شرابی، جواری اور بدمعاش قسم کا آدمی ہے تو اس کا احترام محض عزت بچانے کے ڈر سے ضرور ہوتا رہا فیملی سسٹم کے خاتمہ کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ عام لوگوں نے روزگار کی خاطر باہر کا سفر کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر تیل کی دولت کی وجہ سے خلیجی ممالک میں ملازمتوں کی بوچھار نے ان خاندانوں کے ذہنوں میں احساس برتری پیدا کر دیا۔ جو غربت و افلاس میں گرفتار تھے اور "نودولتیہ" کا ایک جدید طبقہ وجود میں آگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزت اور احترام کی وجہ مال اور عہدہ بن گیا۔ رامپور کا مثالی معاشرہ تقریباً تباہ ہوگیا۔ جو لوگ باہر نہ جا سکے انھوں نے مقامی طور پر غیر قانونی دھندے شروع کر کے دولت بٹورنے کی ریس میں شوق و ذوق سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے جوا، سٹہ اور شراب بنانے دیکھنے جیسے مخرب اخلاق کاروبار غیر قانونی طور پر محلوں میں عام ہوگئے، پولیس کی بھی جیبیں گرم ہوئیں۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے کہ عام اخلاقی سطح اور گر گئی۔

حضرت مولانا وجیہ الدینؒ کی اہم کرامت :

یہ تھے وہ حالات جن کا سابقہ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ کو پڑا لیکن ان تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مولاناؒ نے اپنے دینی، علمی اور اصلاحی مشن کو جاری رکھا۔ صوفیاء کے اندر ایک اصطلاح ہے، " الاستقامۃ فوق الکرامۃ " (یعنی دین پر استقامت کرامت کے اوپر فوقیت رکھتی ہے) حضرت مولاناؒ نے رامپور کے ریاستی دور اور آزادی کے بعد کے دور، دونوں دوروں میں بے مثال استقامت سے دین کی خدمت کی ہے وہ یقیناً حضرت مولانا کی ایک اہم کرامت ہے۔ ان کی اس بے لوث خدمت کی وجہ سے دونوں دوروں میں ان کی عزت اس شہر کے اشراف و اشرار میں سے ہر فرد کے دل میں یکساں طور پر رہی۔ یہاں تک کہ علم و تقویٰ میں ان کا نام رامپور میں ضرب المثل بن گیا۔ گھروں اور خاندانوں میں ان کے

نام کی مثالیں دی جانے لگیں۔ مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے کہ جب میں نے علی گڑھ میں دینیات کی تعلیمات شروع کیں تو والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ علی گڑھ میں دینیات پڑھ کر تم مولوی وجیہہ الدین صاحب تو بن نہیں جاؤ گے۔ اگر کوئی شخص بہت زیادہ عبادت اور نماز روزہ کی طرف راغب ہوتا تو لوگ کہتے کہ وہ تو مولوی وجیہہ الدین صاحب بننے کی فکر میں ہے۔ واعظین اور خطیب حضرات، حضرت مولاناؒ کے طرز پر وعظ و خطبہ کہنا اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگے۔ غرض حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب نے دونوں دوروں میں اپنی علمیت اور تقویٰ کا سکّہ رامپور کے عوام کے دلوں پر بٹھا دیا اور اپنے وعظوں، علمی مجالس، جمعہ کے خطبوں اور درس و تدریس کے ذریعہ دونوں دوروں اس شہر کے مسلمانوں کی نیز ملک کے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کی اصلاح فرماتے رہے۔

شہر کے بڑے وچھوٹے، ہندو و مسلمان، امیر و غریب، حکمراں و رعایا، زمیندار و کاشتکار، سرمایہ دار اور مزدور سب کے سب مولانا کی یکساں طور پر عزت کرتے اور ان کی شخصیت کو رامپور کے لیے باعث فخر جانتے۔ میری کوتاہ نظر میں اس شہر کی مختصر تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت بحیثیت عالم دین نہیں ابھری جس نے عوام و خواص دونوں کو اس طرح گرویدہ بنا لیا ہو جس طرح کہ حضرت مولاناؒ کے لوگ گرویدہ تھے۔

رامپور کے اس دور میں جو کہ آزادی ہند کے بعد شروع ہوا، مولاناؒ نے جس طرح رامپور کے عوام و خواص کی دینی و اخلاقی رہنمائی کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ نے اپنے مواعظ اور خطبات کے ذریعہ عوام کو احساس کمتری سے نکالا، ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور برائیوں سے دور کرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ میں نے تحریر کیا ہے یہ وہ دور ہے جس میں فیملی سسٹم تک اثر انداز ہوا ہے، عام طور پر بڑوں کا احترام دلوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ اس پرفتن دور میں جب کہ الیکشنوں میں

مخالف امیدوار کی سات پیڑھیوں تک کے حالات اگل دیے جاتے ہیں، جہاں بڑے بڑوں کی ٹوپیاں اچھالنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے۔ مولاناؒ نے اپنے بے مثال عمل و کردار کے ذریعہ اہلِ رامپور کے دلوں کو جیت لیا۔

اخلاق:

جو لوگ حضرت مولاناؒ سے ملتے رہے ہیں ان کو معلوم ہے کہ مولاناؒ کے مزاج میں ایسی شگفتگی تھی جس کا ان لوگوں کو اندازہ لگانا مشکل ہے جو مولانا کے قریب نہیں آئے تھے۔ اپنے ہم عمر لوگوں کی عزّت اور چھوٹوں سے محبت حضرت مولاناؒ کی مجلس کا ایک عام دستور تھا۔ اس کی وجہ سے رامپور کے عوام مولانا کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ چھوٹوں سے محبت کے ایک دو ذاتی واقعات ان سطور میں تحریر کرتا ہوں:

اپنی کسی ضرورت سے حضرت مولانا دہلی تشریف لائے۔ جمعہ کی نماز میں جامعہ ملیہ کی مسجد میں حضرت مولاناؒ کو دیکھ کر راقم السطور بہت خوش ہوا اور بعد نماز غریب خانہ پر چلنے کی درخواست کی۔ حضرت مولانا نے بہت خندہ پیشانی سے درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔ وہاں پر جامعہ کے کئی دوسرے حضرات بھی جمع ہو گئے۔ حضرت مولانا نے اُن سے کہا: ڈاکٹر صاحب میرے محلہ دار بھی ہیں۔ (یہ بات میرے لیے نئی نہیں تھی) پھر خود ہی اپنے مخصوص انداز میں تشریح کی اور فرمایا ان کے دادا اور میرے والدؒ... پڑوسی تھے اور بچپن میں میں بھی ان کے دادا کے مکان کے قریب محلہ کٹرہ جلال الدین خاں کے اُس حصّہ میں رہتا تھا جو کہ اب قلعہ میں آچکا ہے۔ ہم لوگ صبح کو فجر کے بعد ٹہلنے نکل جاتے تھے جب واپس آتے تو اکثر ان کے دادا مکان کے باہری حصّہ میں بیٹھے ہوتے ملتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے۔ بچوں چائے پیو گے۔ ہم لوگ ان کی چائے کو اس وجہ سے پسند کرتے تھے کہ وہ

خالص دودھ میں پتی اور قند ڈال کر چائے بنواتے تھے اور ہمیں پلاتے تھے۔
رامپور میں جب قلعہ کی تعمیر ہوئی تو حضرت مولاناؒ محلہ کرٹھ سے محلہ انگوری باغ منتقل ہو گئے اور ہمارا خاندان بدریا مُلّا ظریف۔ لیکن وہاں پر بھی مولانا سے اس طرح نسبت رہی کہ محلہ بدریا ملا ظریف حضرت مولاناؒ کے خاندان کے ہی ایک صاحب ملا ظریف خاں صاحب کے نام پر آباد تھا۔[1]

چھوٹوں پر شفقت کے سلسلہ میں ایک دوسرا ذاتی واقعہ بھی نقل کرتا ہوں راقم السطور کی ایک بھتیجی کا نکاح حضرت مولاناؒ نے ہی پڑھایا تھا۔ راقم السطور اس میں وکیل کی حیثیت سے آیا تو حضرت مولاناؒ نے ازراہ شفقت فرمایا: "آپ ہی نکاح پڑھادیں"۔ (نوٹ: عوام کی معلومات کی غرض سے تحریر ہے کہ ولی کی طرح وکیل بھی خود نکاح پڑھا سکتا ہے) لیکن احقر نے بہت ہی ادب سے درخواست کی کہ مولانا نکاح تو آپ ہی پڑھائیں گے۔ اس کے بعد برصغیر ہند و پاک کی ایک جماعت کے سربراہ جو کہ اس وقت حیات تھے ان کی ایک تحریر کے بارے میں مولاناؒ فرمانے لگے۔ دیکھیے انھوں نے یہ لکھا ہے حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ یہ میں اس وجہ سے نقل کر رہا ہوں کہ حضرت مولانا جب کبھی بھی ان حضرات کے مسلک یا رائے کا ذکر کرتے جن کا مسلک یا رائے حضرت مولاناؒ سے مختلف ہوتا تو ان لوگوں کے نام کو بہت مناسب الفاظ میں لیتے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی رائے بھی پرزور الفاظ میں ذکر کر دیتے۔ میں نے مولانا کی زبان سے اپنے مخالفین کے لیے بھی سخت الفاظ نہیں سنے۔

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں، حالات مشائخ، ص ۲۲۶؛ وجیہہ الدین احمد خاں صاحب، فیوضات وزیریہ، ص ۵۰

حضرت مولاناؒ کے اخلاق کے سلسلے میں ایک اور ذاتی واقعہ تحریر ہے۔ گو کہ یہ واقعات پرائیوٹ ہیں لیکن اُن سے مولاناؒ کے اخلاق وکردار پر روشنی پڑتی ہے اسی وجہ سے ان کو نقل کر رہا ہوں۔ راقم السطور ویسٹ انڈیز میں ملازمت کے دوران ایک مرتبہ ویسٹ انڈیز سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ بعد مغرب حضرت مولاناؒ سے ملنے کی غرض سے مدرسہ فرقانیہ حاضر ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت حلقۂ ذکر ہوتا ہوگا۔ معمول کے مطابق اس وقت حلقۂ ذکر ہو رہا تھا اور اس جگہ بہت ہی ہلکی روشنی تھی یا اندھیرا تھا جس میں ایک دوسرے کو دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ میں ایک کونہ میں بیٹھ گیا۔ لیکن حضرت مولاناؒ کو آہٹ محسوس ہوگئی۔ فوراً دریافت کیا، کون ہے؟ میں نے عرض کیا۔ ماجد۔ فرمایا، کیا امجد خاں صاحب کے لڑکے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ یہ سنتے ہی حلقۂ ذکر بند کروا دیا گیا۔ تیز تیز روشنی کروائی اور چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ اس طرح کے اور بھی متعدد ذاتی واقعات ہیں جن کو طول کی وجہ سے ذکر نہیں کر رہا ہوں۔

جب حضرت مولاناؒ کے یہ اخلاق اپنے چھوٹوں کے ساتھ تھے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معاملات واخلاق کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس ماحول میں ان اخلاق کا حامل وہی شخص ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت کے لیے منتخب کیا ہو۔

راست گوئی وبے باکی:

مومن کی ایک پہچان اس کی راست گوئی اور صاف گوئی ہے جب کہ منافق کی ایک پہچان اس کی کذب بیانی ہے۔ حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی راست گوئی اور صاف گوئی کے لیے مشہور تھے۔

آپ کی راست گوئی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ حضرت مولاناؒ شکار کے

بہت شوقین تھے۔ ایک مرتبہ شکار کو تشریف لے گئے۔ ساتھ میں اور صاحبان بھی تھے۔ شیر کا شکار تھا۔ حضرت مولاناؒ موقت پر شیر کی تاک میں بیٹھ گئے۔ اتفاق سے شکاریوں میں سے (یعنی ساتھیوں میں سے) ایک صاحب ایک جھاڑی میں کسی ضرورت سے گئے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں کی کھڑ کھڑاہٹ سے حضرت مولاناؒ سمجھے کہ جھاڑی میں شیر ہے چنانچہ بندوق داغ دی۔ گولی اُس شخص کے لگ گئی اور بعد میں انتقال کر گیا۔ یہ شکار نینی تال کے ترائی کے علاقہ میں کھیلنے گئے تھے۔ حضرت مولاناؒ پر قتل کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ بیان کے لیے جب پیشی ہوئی تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ ہاں میری بندوق کی گولی ان کے لگی تھی البتہ میں نے ان کو مارنے کے ارادے سے بندوق نہیں چلائی تھی بلکہ شکار کے ارادے سے چلائی تھی۔ عدالت نے حضرت مولاناؒ کو اس راست گوئی پر بری کر دیا۔ بعد میں حضرت مولاناؒ نے ان صاحب کے خاندان کے لوگوں کو خوں بہا کے طور پر کھیتی کی زمینیں دیں۔

حضرت مولاناؒ کی بے باکی کے سلسلہ میں "حالات مشائخ" میں تحریر کردہ ایک واقعہ قابلِ توجہ ہے جس کو یہاں ہوبہو نقل کیا جاتا ہے:-

"۱۹۶۵ء میں جب کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، رامپور کے قلعہ کے میدان میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں شرکاء کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار بیان کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اتنا بڑا۔۔۔ اجتماع غالباً رامپور کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ اس جلسہ میں ریاست کے سابق نواب رضا علی خاں اور سابق چیف منسٹر رامپور بشیر حسین زیدی بھی شریک جلسہ تھے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک کی ہندو اکثریت کے ساتھ حکومت وقت بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کا جو آپس میں

تعلق ہے وہ اسلام ہی کا نہیں بلکہ خون اور رشتے کا بھی ہے۔ اگر کسی کا باپ یہاں ہے تو کسی کا بیٹا یہاں کسی کا بھائی تو کسی کی بہن ۔۔۔۔(وغیرہ) ۔۔۔
اب ان حالات میں اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہم اس کے دشمن ہیں تو یہ بات بھی غلط اور واقعہ کے خلاف اور منافقت بھی اور پھر کوئی دل سے ماننے کو آمادہ نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے بہت گہرا تعلق ہے ہم اس کے دوست و ہمدرد ہیں تو ہم ملک کے باغی اور غدار قرار پائیں ــــــــــ ایسے نازک اور سنگین موقعہ پر آپ نے جو تقریر فرمائی بس وہ آپ ہی جیسے اولوالعزم حضرات کا کام ہے مسلمانوں کی زبان سے تو بے ساختہ کلمات تحسین ادا ہو رہے تھے اور غیر مسلم بھی آپ کی حق گوئی اور قابلیت کے گن گا رہے تھے۔ آپ نے نہایت حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ہم نہ باغی ہیں اور نہ غدار اور نہ منافق۔ اسلام منافقت کو پسند نہیں کرتا۔ وطن سے محبت کی اگر اہمیت ہے تو مسلمانوں کی، اسلام اور اہل اسلام سے بھی محبت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے رہنے والے مسلمان ہوں یا ترکی کے، انڈونیشیا کے ہوں یا ملیشیا کے، مراکش کے ہوں یا عراق کے، سعودی عرب کے ہوں یا مصر کے، شام کے ہوں یا الجزائر کے تونس کے ہوں یا اردن کے، ہم بحمداللہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف خون اور رشتہ کا یا نام کا نہیں بلکہ اسلامی کا ہے۔ سچا مسلمان کبھی منافقت کو پسند نہیں کرتا۔ ہم اسلام کے پیروکار ہیں اور اس کے حامی و مددگار۔ اسلام حقانیت کا علمبردار ہے۔ اگر وطن سے محبت اسلام اور اسلامیت میں خلل انداز نہ ہو تو اسلام وطن سے ایسی

محبت کی مخالفت بھی نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان و پاکستان ایشیا کے ممالک میں سے دو ملک ہیں۔ پہلے یہ دونوں ایک تھے۔ جغرافیائی حیثیت سے اب یہ دو الگ الگ ملک ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے سربراہوں کو چاہیے کہ لڑائی کے بجائے گفت و شنید کے ذریعے اپنے متنازعہ مسائل خود حل کریں۔ یوروپ، روس اور امریکہ کے دست نگر اور محتاج نہ بنیں۔ قرآن عظیم میں ہے کہ وَالصُّلْحُ خَیْرٌ۔ صلح بہتر چیز ہے۔" [۱]

حضرت مولاناؒ کی یہ بیباکانہ تقریر آج بھی اسی طرح مفید ہے جس طرح کہ ۱۹۶۵ء میں تھی۔

علمی مقام:

مولانا ایک بلند پایہ محدث، مفسر اور فقیہہ تھے۔ علم حدیث میں آپ نہ صرف ایک بہت بڑے محدث اور علامۃ العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے بلکہ خود بھی اونچے درجہ کے محدث تھے۔ آپ نے شوال ۱۳۲۹ھ میں دارالعلوم دیو بند میں داخلہ لیا اور ۲۸ رجب ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں حدیث شریف کی تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی۔ [۲] یہ سند بہت مشہور ہے رامپور میں بھی آپ نے کتب حدیث کی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی تھی چنانچہ آپ کو حضرت حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ اور ان سے شیخ حضرت مولانا شاہ وزیر محمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے۔ [۳]

---

[۱] مولانا سردار شاہ خاں۔ حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۴۳، ۲۴۴

[۲] مولانا سردار شاہ خاں صاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۳۰

[۳] ایضاً، ص ۲۳۰۔

حضرت مولاناؒ اپنے تلامذہ کو حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحبؒ محدث رامپوری کے توسط سے مندرجہ ذیل سند بھی مرحمت فرماتے تھے: حضرت مولانا حافظ شاہ وجیہہ الدین احمد خاں صاحب عن حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا شاہ سید عالم علی صاحب نگینوی محدث مرادآبادیؒ عن حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ عن حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ عن سراج المحدثین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ [۱] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ سے یہ سلسلۂ حدیث سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نے طویل عرصہ تک مختلف مدارس میں درس حدیث دیا۔ ایک مرتبہ راقم السطور سے خود فرمایا کہ میں نے ساٹھ (۶۰) سال سے زیادہ درس حدیث دیا ہے۔ یہ مدت قمری (ہجری) سنہ کے اعتبار سے فرمائی تھی۔ کتاب "حالات مشائخ" سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ریاست دادوں ضلع علی گڑھ کے مدرسہ حافظیہ سعیدیہ سے ہی مسلم شریف پڑھانا شروع کردی تھی [۲] یہ ملازمت غالباً ۱۳۴۳ھ سے شروع کی تھی اس طرح ساٹھ سال کی مدت ۱۴۰۳ھ میں مکمل ہو جاتی ہے۔ حضرت مولاناؒ نے مجھ سے مندرجہ بالا مدت ۱۴۰۳ھ کے بعد ہی کسی تاریخ میں بتائی ہے۔ مولانا کا درس بخاری ایک خاص انداز کا

---

۱ مولانا سردار شاہ خاں صاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۳۰

۲ ایضاً، ص ۲۳۵۔

ہوتا تھا جس میں آپ اکابر محدث کے طرز پر احادیث کی شرح کے ساتھ ساتھ ضرورت پڑنے پر حنفی نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کرتے تھے۔ راقم السطور کو اتفاقاً کئی بار مدرسہ فرقانیہ میں مولانا کے درس بخاری میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

اصول حدیث پر ایک کتاب "حدیثی اصول" مولانا کی اس فن میں گہری بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اردو میں اصول حدیث پر یہ کتاب ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے جس میں جگہ جگہ مولانا نے اصول حدیث کے سلسلہ میں ائمہ کے اختلافات سے بھی بحث کی ہے۔ مثلاً حدیث مرسل کے مقبول و ناقابل قبول ہونے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر مرسل کی عادت ثقات اور غیر ثقات کل کے حذف کرنے کی ہے تو باتفاق ائمہ مجتہدین قابل قبول نہیں، اور اگر محض ثقات راوی کو حذف کرتا ہے، تب بھی جمہور محدثین توقف کے قائل ہیں۔ اس لیے احتمال ہے کہ شاید محذوف راوی ضعیف ہو۔ اور یہی امام احمدؒ کا ایک قول ہے۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "کہ اگر حدیث مرسل کی تائید کسی دوسری حدیث سے ہو جائے خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو مرسل مانی جائے گی، ورنہ توقف کیا جائے گا" لیکن امام احمدؒ کا قول ثانی اور امام مالکؒ اور امام اعظمؒ بلکہ جملہ کوفیین کا مذہب یہ ہے کہ بغیر کسی تائید کے بھی مرسل قابل قبول ہے۔ یہی مذہب اشبہ بالحق ہے چونکہ جمہور کا یہ احتمال کہ ممکن ہے محذوف راوی ضعیف ہو، اس وقت قابل اعتبار ہو سکتا ہے کہ ہم ثقہ راوی کی مرسل میں قید نہ لگائے ہوں۔

---

[1] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰-۳۱

ظاہر ہے کہ ثقہ وہی ہوگا جو غیر ثقہ کو نہ چھپائے۔ مرسل کی ثقاہت خود محذوف کی ثقاہت کی دلیل ہے۔" [1]

حدیث میں ناسخ و منسوخ کی بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"...... یہ تفصیل تعارض سے متعلق مذہب شافعیؒ کی بنا پر تھی اب ہم حنفیہ کے مطابق تفصیل بیان کرتے ہیں۔ حنفیہ کا قول ہے کہ اول نسخ ہے پھر ترجیح پھر توفیق پھر توقف۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حنفیہ نے توفیق کو مذہب شافعی کے مطابق کیوں مقدم نہیں کیا، اس لیے توفیق کی صورت میں دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا، اور نسخ کی صورت میں صرف ایک پر۔

حضرت استاذی مولانا شاہ محمد انور صاحب مدظلہ العالی نے اس طرح جواب دیا ہے کہ: "ہمارے امام کا قول حق ہے، اس لیے کہ نسخ سے مراد وہ نسخ ہے جو بطریقہ نقل ثابت ہو اور جہاں ہم کو نقل مجبور کرتی ہے کہ ایک حدیث ناسخ ہے اور دوسری منسوخ، پھر بھی توفیق کی طرف رجوع کرنا تو ایسا ہے کہ جیسے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ درحقیقت اسلام یہودیت اور نصرانیت کا ناسخ ہے پھر بھی ہم توفیق کے طالب بن کر فروعات میں اتحاد تلاش کریں۔" [2]

اصح الاسانید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعض اسانید کے متعلق اصح الاسانید ہونے کا قول کہا گیا ہے۔ احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ سند ——— "زہری عن سالم بن عبداللہ

---

[1] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰، ۳۱

[2] ایضاً، ص ۵۲

بن عمر عن ابیہ" کو اصح الاسانید کہتے ہیں۔ علی المدینیؒ سند "محمد بن سیرین عن عبیدۃ بن عمر عن علی" کو اصح کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معینؒ اور امام نسائیؒ سند "ابراہیم النخعی عن علقمہ عن ابن مسعود" کو اصح کہتے ہیں۔ بخاریؒ سند "مالک عن نافع عن ابن عمرؓ" کو اصح کہتے ہیں۔ ابوبکر بن شیبہؒ سند "زہری عن علی بن الحسن عن ابیہ عن علی" کو اصح کہتے ہیں۔

لیکن قول مختار یہ ہے کہ کسی خاص سند پر مطلقاً اصحیت کا اطلاق کرنا اور جملہ اسانید کو ہر طرح اس کو کم کر دینا مناسب نہیں۔ اور یہ جس کی تفصیل ہم ائمہ کرام مذکورین سے بعض اسانید کی اصحیت کے متعلق نقل کر چکے ہیں، بعض امورات کو مدنظر رکھ کر اصحیت جزئیہ کا حکم لگایا گیا ہے ہاں جس کی اصحیت کے متعلق ائمہ سے صراحت آچکی ہے وہ ضرور ...... ان طرق سے اعلیٰ ہیں جن پر کسی نے آج تک اصحیت کی بالخصوص تصریح نہیں کی ......"[1]

اس طرح اس کتاب میں مولانا نے بڑی خوبی سے اصول حدیث میں اختلاف ائمہ کو بھی جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب غالباً ۱۳۲۴ھ میں لکھی گئی تھی کیونکہ مولانا محبوب علی صاحب (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ، رامپور) کے مطابق یہ کتاب تصنیف کرنے کے تقریباً ۵۸ سال بعد[2] پہلی بار ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ (مطابق ستمبر ۱۹۸۲ء) میں طبع ہوئی۔ کتاب کا یہی اڈیشن اس وقت ہمارے پاس ہے۔

---

[1] ایضاً، ص ۷۹، ۸۰

[2] ملاحظہ ہو: "تعارف" کتاب ہذا، ص ۲

مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب[۲] نہ صرف ایک بلند پایہ محدث تھے بلکہ ایک مفسر بھی تھے۔ اپنے مواعظ و تقاریر میں قرآنی آیات کی ایسی جچی ہوئی تفسیر فرماتے تھے جس سے آپ کی جلالت علم کا اندازہ ہو سکتا تھا۔" جس زمانے میں آپ کا ریاست دادوں ضلع علی گڑھ میں قیام تھا اور وہاں پر مدرسہ حافظیہ سعیدیہ میں مسند نشین درس تھے تو اس زمانہ میں رئیس اعظم دادوں نواب ابوبکر خاں صاحب نے ایک روز آپ سے آیت کریمہ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کی تشریح کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے اس پر کافی دیر تک تقریر فرمائی۔ دوسرے روز نواب صاحب موصوف نے پھر یہی آیت کریمہ پیش کی۔ آپ نے پھر اس موضوع پر بڑی طولانی تقریر کی تیسرے روز پھر نواب صاحب موصوف نے اسی آیت کریمہ کو تقریر کا موضوع قرار دیا۔ آپ نے تیسرے روز ایسی جامع اور بصیرت افروز تقریر فرمائی جس سے نواب صاحب موصوف کا قلب مطمئن ہو گیا۔"[۱۱]

اصول تفسیر کے موضوع پر مولانا کی ایک تصنیف "مقدمۃ القرآن یعنی تفسیر اصول" کے نام سے ہے۔ اس میں مولانا نے فہم قرآن، تفسیر قرآن کے طریقے، اسرائیلیات اور قرآن، ترتیب سور اور سائنس اور قرآن جیسے مضامین سے بحث کی ہے۔ فہم قرآن کے سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

"قرآن عظیم کو چند مقامات پر "کتابٌ مُّبین"، یعنی کھلی ہوئی کتاب کہا گیا ہے، اس لفظ سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ "قرآن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کی اعانت درکار نہیں ہے۔" اس غلط فہمی سے بہت سے نتائج بد پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ہم بھی

۱۱- سردار خاں صاحب، حالات مشائخ، رامپور، ص ۴۰-۲

اس بات کے قائل ہیں کہ فی الواقع "قرآن کھلی ہوئی کتاب ہے" لیکن اس کے مراتب ہیں۔ جو شخص علوم عربیہ اور لسان عرب سے واقف نہیں وہ کسی ایک جملہ کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کیا کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ غیر عربی داں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن" کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے؟ اگر نہیں سمجھ سکتا، اور یقیناً نہیں سمجھ سکتا تو اس کے حق میں قرآن کھلی ہوئی کتاب کہاں ہوئی؟ اس لیے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ عربی زبان سے جو واقف ہے؛ اس کے لیے قرآن عظیم کھلی ہوئی کتاب ہے اور جو اس سے واقف نہیں؛ اس کے لیے کھلی ہوئی کتاب نہیں۔ اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے لیکن تاریخ اسلام اس کے پیش نظر نہیں تو تاریخی واقعات میں اُس کا فیصلہ کرنا کہ فلاں بیان واقعہ کی ابتدا ہے یا انتہا یا درمیان؛ اس کے لیے ناممکن ہے" [1]

دوسری طرف مفسر کے لیے عربی زبان کے علاوہ دیگر علوم میں مہارت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"......... اگر کسی نے ظاہری عربی دانی کی بناء پر کسی سورت کی ایک تفسیر کر دی لیکن قوی حدیث اس کے خلاف ہے تو کیا صحیح حدیث مفید رہے گی یا اس کی ذاتی رائے؟ بعض مقامات پر حضورؐ سے کوئی روایت دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آیات قرآنیہ کی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔ ایسے مقامات پر اقوال صحابہؓ اور اعمال صحابہؓ سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر

---

[1] مولانا وجیہ الدین احمد خاں: مقدمۃ القرآن یعنی تفسیری اصول، رامپور، ص ۲۷

صحابہؓ علیہم الرضوان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں، وہاں ایک قول کو ترجیح دینے کے لیے قوت اجتہاد اور ملکۂ استنباط کی ضرورت ہے جو ہر مسلمان میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر عالم میں بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اہم ضرورت ہے کہ مفسّر اصولِ تفسیر سے واقف ہو یا کسی کا مقلد ہو...."[1]

اسرائیلیات اور قرآن کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے تحریر کیا ہے:

"...... ہاں بنی اسرائیل میں سے ارباب علم جب اسلام میں داخل ہوگئے اور ان کی بات قابل پذیرائی ہوگئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

حدّثوا عن بنی اسرائیل	بنی اسرائیل سے واقعات نقل کرو
ولا حرج —	اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء اہل اسلام کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ پہلے قرآن و حدیث اور مسلّمہ کلیات و اصول پر نظر کی جائے اس کے بعد اسرائیلیات پر نظر کی جائے۔ اگر سابقہ یقینیات کے خلاف نہ ہوں تو مان لیا جائے ورنہ نظر انداز کر دینا ضروری ہے"[2]

مولانا دیگر مستند اور جیّد مفسّرین کی طرح اسرائیلیات میں سے ہر قسم کی روایات نقل کرنے کے مخالف تھے البتہ وہ قابل اعتبار روایات جو کہ کسی قرآنی واقعہ کی تاریخی تشریح کرتی ہیں بشرطیکہ شریعت کے اصول کے منافی نہ ہوں قبول کر لینے میں مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مزید تحریر کرتے ہیں!۔

---

[1] ایضاً۔ ص ۲۸

[2] ایضاً۔ ص ۵۰

"...... الغرض اسرائیلیات سے مفر بھی نہیں، اور ہر چیز کو معتبر سمجھ لینا بھی درست نہیں۔ اس امتیاز کے لیے استعداد علمی اور فراہمی معلومات دینیہ کی بے حد ضرورت ہے"۔ [1]

سائنس اور قرآن کے موضوع پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں اچھی بحث کی ہے فلسفیانہ خیالات اور سائنسی تحقیقات کو اسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ شریعت کے تحت ہوں۔ چونکہ انسانی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں اس لیے اگر کوئی تحقیق شریعت سے متضاد ہوگی تو اسلام میں وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"...... دوسری بات اسلام میں یہ ضروری ہے کہ علمی تحقیقات کو قطعی اور یقینی عقائد پر ترجیح نہ دی جائے۔ طریقۂ سلامتی یہ ہے کہ جہاں عقل پورا فیصلہ نہ کر سکے اور پورا علم نہ ہو سکے، وہاں خاموشی اختیار کر کے یہ کہہ دے کہ "اللہ جانے"، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے:
من العلم ان تقول لما لا تعلم "اللہ اعلم"۔ یہ علم کی بات ہے کہ جو نہ جانتا ہو اس کے متعلق یہ کہہ دے کہ "واللہ اعلم"

بڑے بڑے اکابر اسلام نے اسی حدیث پر نظر کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے سوال کیا گیا کہ "دہر کیا چیز ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "لا ادری" (میں نہیں جانتا) حضرت امام مالکؒ سے چالیس مسئلے دریافت کیے گئے۔ ۴ کا جواب دیا اور ۳۶ میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ حضرات اپنے زمانے میں دین کے

---

[1] ایضاً ص ۵۲

ایسے چراغ تھے جن کی روشنی اب تک باقی ہے۔ کیا ایسے حالات میں اس وقت کے کم مایہ مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر چیز کے فیصلہ کے لیے تیار رہو اور بعض اوقات قطعی اور یقینی امور کا اس لیے انکار کر دے کہ ماحول اور وقت اس کے خلاف ہے ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ساز

الغرض مدعا یہ ہے کہ عوام توسنی سنائی باتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے فلسفی تحقیقات پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کو غور کرنا چاہیئے۔ فلسفہ قدیم ہو یا جدید ہمارے یقینی مسائل کی کس قدر موافقت کرتا ہے اور کہاں کہاں مخالفت۔ موافق ہونے کی صورت میں تو "چشم ما روشن ودل ما شاد"۔ مخالفت کی صورت میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسانی علم بہت محدود ہے اور عقل کو ہر مقام پر دوڑانا عاقل کا کام نہیں۔

"نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن"[1]

مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب اور تصوف:

حضرت مولاناؒ سلسلہ قادریہ نقشبندیہ مجددیہ میں ایک صاحب نسبت شیخ تھے ویسے تو مولاناؒ کو بتوصل حضرت مجدد الف ثانی سلاسل اربعہ یعنی چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی لیکن آپ ذکر و اشغال قادریہ مجددیہ سلسلے کے کراتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ تک حضرت مولاناؒ کا شجرہ اس طرح ہے: حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب از شاہ ممتاز

---

[1] ایضاً، ص ۵۷

حسینیؒ از مولانا شاہ وزیر محمد خاں صاحبؒ از شاہ خواجہ خان محمد خاں صاحبؒ از شاہ احمد علی خاں صاحبؒ از شاہ سلطان امام الدین خاں صاحبؒ از شاہ درگاہی محبوب الٰہیؒ از حافظ شاہ سید جمال اللہ صاحبؒ از شاہ قطب الدین سید محمد اشرف حیدر حسینیؒ از خواجہ محمد زبیر مجددی سرہندیؒ از خواجہ محمد نقشبند مجددی سرہندیؒ از خواجہ محمد معصوم مجددی سرہندیؒ از امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ الخ (نوٹ: حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اوپر اس سلسلے و دیگر سلاسل کے شجرے معروف ہیں وہ کسی بھی ایسی کتاب سے دیکھے جا سکتے ہیں جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلاسل کی تفصیل ہو۔ حضرت مولانا وحید الدین احمد خاں صاحبؒ نے بھی اپنی تصنیف "فیوضات وزیریہ" میں یہ تفاصیل لکھی ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۲۷۹ تا ص ۳۰۴)

تصوف کے موضوع پر حضرت مولاناؒ کی ایک کتاب "فیوضات وزیریہ" ہے اس میں آپ نے تصوف کی اصطلاحات و دیگر امور بہت سہل انداز میں سمجھائے ہیں۔ بیعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"ایک بیعت "علی الاسلام" ہے۔ غیر مسلم نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک اور مقدس ہاتھوں پر یا کسی اور بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔

دوسری "بیعت علی الہجرت" ہے۔ جو انصار نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک پر کی تھی، کہ ہم اپنے شہر مدینہ میں آپ کو لے جا کر آرام سے رکھیں گے، اور جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طریقہ سے آپ کی بھی حفاظت کریں گے، اور جو مہاجرین جائیں گے، ان کی جانی و مالی خدمت سے دریغ نہیں کریں گے۔

تیسری "بیعت علی الجہاد" ہے۔ مختلف مواقع پر جب غزوات اور جہاد کی ضرورت پیش آتی تھی تو حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لیا کرتے تھے، کہ ہم مرجائیں گے مگر راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

چوتھی "بیعت علی الخلافت" ہے۔ جو حضور سید الاولین والآخرین رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ، کے مبارک ہاتھوں پر بیعتیں کی گئیں۔ اور اسی طرح دوسرے حق پرست خلفاء کے ہاتھوں پر بھی بیعتیں ہوتی رہیں۔

پانچویں "بیعت علی الخیر" ہے۔ مسلم شریف میں حدیث مبارک ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے فرمایا، نہ جہاد تھا، نہ ہجرت تھی نہ اسلام میں داخلی تھی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لی اور ارشاد فرمایا، "دیکھو ہم خیر کے کام کریں گے۔"

مشائخ کرام میں جو بیعت رائج ہے وہ یہی "بیعت علی الخیر" ہے۔ بیعت ایک معاہدہ ہے بندہ اور خدائے تعالیٰ کے درمیان۔ - - - - - - -

- -

. . . . . . حضرات صوفیہ "بیعت علی الخیر" لے کر اپنے متوسلین کو انھیں

اوراد و وظائف کی تلقین فرماتے ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو تلقین فرمائے تھے۔۔۔۔۔۔۔" [1]

اپنی اس کتاب میں حضرت مولانا نے گاہ بگاہ متقدمین مشائخ کے کلام کو بطور سند پیش کیا ہے۔ سلوک اور اس کی اہمیت نیز سیر و سلوک کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی تحریر بطور تائید پیش کی ہے:

"۔۔۔۔۔ اور سیر آفاقی کے تمام ہونے کے بعد سیر انفسی میں جس سے مراد سفر در وطن ہے، آرام دیتے ہیں۔

هَنِيئًا لِاَرْبَابِ النَّعِيمِ نَعِيمُهَا

اس دولت عظمیٰ تک پہنچنا سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے وابستہ ہے۔ جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر شریعت میں گم نہ کر دیں، اور اوامر کے بجالانے اور نواہی کے رک جانے سے آراستہ نہ ہو جائیں، اس دولت کی بو جان و دماغ میں نہیں پہنچتی۔ باوجود شریعت کی مخالفت کے اگرچہ بال برابر ہی ہو، اگر بالفرض احوال و مواجید حاصل ہو جائیں وہ سب استدراج میں داخل ہیں، آخر اس کو رسوا و خوار کریں گے۔

محبوب رب العالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔" (مکتوب نمبر ۷، دفتر اول حصہ اول)" [2]

---

[1] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، فیوضات وزیدیہ، رامپور، ص ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱

[2] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، ایضاً، ص ۱۱۸، ۱۱۹

مولاناؒ نے تصوف کے دقیق مسائل کو بھی بڑے سہل انداز میں بیان فرمایا ہے
س سے ایک عام فہم مسلمان بھی استفادہ کر سکتا ہے۔ لطائف کی تشریح کرتے
ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"لطائف خمسہ کی اصلاح کے لیے حضرات نقشبند یہ تدریجی طور پر ہرایک لطیفہ کا ذکر اور اس کی اصلاح کراتے ہیں۔

غوث زماں قطب عالم مروج شریعت مصطفےٰ قیم طریقہ مجتبےٰ سلطان الاولیاء قطب ارشاد حضرت حافظ شاہ جمال اللہ قدس سرہٗ الاقدس کے یہاں لطیفہ قلب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ باقی تمام لطائف کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور یہی حدیث شریف کے مطابق ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے
إنّ فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کلّه
واذا فسدت فسد الجسد کلّه الا وهی القلب"

فرمان گرامی کا مطلب یہ ہے کہ: جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو جائے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جائے، آگاہ ہو جاؤ وہ دل ہے"......[۱]

موضوع سماع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی شخص کا اشعار سننا جس سے ذوق وشوق میں اضافہ ہو سماع کہلاتا ہے۔ اشعار پڑھنے کے طریقے کبھی متعدد ہوتے ہیں، اور کبھی ایک کبھی یہ پڑھنے والے مزامیر کا استعمال کرتے ہیں اور کبھی بلا مزامیر۔

---

[۱] ایضاً، ص ۱۲۳

عام طور پر متعدد افراد مع مزامیر یہ کام کرتے ہیں (اس) اسی کو سماع اور قوالی کہتے ہیں۔ ایک شخص اچھی آواز اور اچھے ترنم سے اشعار پڑھے اور وہ پوری طرح باشرع ہو، اشعار بھی لغو اور بیہودہ نہ ہوں، نیز اس کے ساتھ مزامیر بھی نہ ہوں تو اس میں کسی کے نزدیک کوئی حرج نہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اشعار مسجد میں پڑھوائے ہیں، بلکہ ان کے لیے منبر بھی بچھوایا ہے، خود بھی حضورؐ نے سنے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی سنوائے ہیں۔ حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار میں ثنائے باری تعالیٰ، نعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تعریف اسلام اور مدح قرآن ہوتی تھی ....

....

....

ہاں ایک یا چند افراد مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھیں تو جمہور علمائے کرامؒ کے نزدیک یہ ممنوع ہے ....

....

حنفیہ کا منصب ہے کہ وہ جمہور احنافؒ کا قول دیکھیں۔ جمہور احنافؒ نے مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

حضرات صوفیہ کرام میں بھی اختلاف ہے۔ حضرات چشتیہ اس کے جواز کی طرف عموماً رجحان رکھتے ہیں، لیکن جواز کے لیے جو شرائط مشائخ چشت کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ اس زمانے میں عموماً مفقود ہیں۔

اس لیے تصوف اور چشتیت کی آڑ پکڑ کر قوالی کے نام کے ساتھ گانا سننا مزامیر کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں......“ لہ

”وحدۃ الوجود“ اور ”وحدۃ الشہود“ تصوف کے دقیق ترین مسائل میں سے ہیں۔ عوام تو عوام بعض علماء کی بھی رسائی ان تک نہیں ہو پاتی۔ اس لیے اکابر صوفیا کا مسلک یہ ہے کہ ان مسائل کی تفصیلات میں عقل نہیں لڑائی جائے بلکہ سالک اگر کسی واصل باللہ شیخ کی رہنمائی میں سلوک طے کر رہا ہے تو اس حال پر پہنچنے پر اس کو خود بخود اس کی حقیقت کھل جائے گی۔ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رح بھی اسی مسلک پر تھے۔ چنانچہ ”وحدۃ الوجود“ اور ”وحدۃ الشہود“ پر مختصراً تعارفی سطور تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

”ہم لوگ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مبارک سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تحقیق اس مسئلہ میں یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کی مخلوق میں تباین ہے۔ بندہ خدا رسیدہ ہو سکتا ہے، حقیقۃً خدا نہیں ہو سکتا اور یہی قول جمہور حضرات علمائے کرام کا بھی ہے۔ عام طور پر حضراتِ علمائے کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ بندہ نہ ذاتِ خداوند قدوس کے ساتھ متحد ہے، اور نہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے متحد ہے، بلکہ اس کی حقیقت اور وجود اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے حضرات مرشدین طریقہ عالیہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ جب کسی پر حال طاری ہو گا تو وہ خود سمجھ لے گا اور حال طاری نہ ہو تو بندہ کو

لہ ایضاً، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲۔

ہمیشہ یہی اقرار کرنا چاہیئے کہ میں بندہ عاجز ہوں اور اللہ تعالیٰ قادر مطلق۔ میں جاہل ہوں اور اللہ تعالیٰ عَالِمُ الغیب وَالشہادۃ میں فانی ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا میری ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ اللہ تعالیٰ کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ اللہ تعالیٰ ازلی ہے اور ابدی کسی چیز میں کسی وقت بھی کسی کا اللہ تعالیٰ محتاج نہیں۔ اور ہم بندگان قدم قدم پر ہر وقت اور ہر چیز میں اس کے محتاج ہیں۔

اور جو شخص عاجزی اور انکساری اختیار کرے گا اور تواضع سے کام لے گا تو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ وعم نوالہٗ اسے عروج اور بلندیاں مرحمت فرمائے گا۔ دنیا کی بلندیاں کسی شکل میں بھی ہوں، پانی کے بلبلے کی طرح ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

لہٰذا اہل سلسلہ اس مسئلہ میں جو کہ انتہائی دقیق و عمیق مسئلہ ہے، ہرگز نہ الجھیں اور نہ بحث و مباحثہ کریں۔ ورنہ ایمان کا خطرہ ہے۔[۵]

مولاناؒ نے اس کتاب میں تصوف اور صوفیا کے متعلق اکابر مشائخ کے اقوال اور خیالات نقل کیے ہیں بعد میں بطور محاکمہ اپنی رائے درج کرتے ہیں:

"ان الفاظ کی تشریح و توضیح میں تفاوت بظاہر معلوم ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ مقصد و مدعا سب حضرات صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کا ایک ہی ہے۔ یعنی تصوف نام ہے، قولاً، فعلاً، حالاً ہر حال میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر ہمیشہ کاربند رہنے کا۔ جب حضرات

---

[۵] ایضاً، ص ۱۳۴، ۱۳۵

صوفیہ برحق رحمۃ اللہ علیہم کے نفوس مقدس و منور ہو جاتے ہیں، حجابات دور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اتباع کرنے لگتے ہیں تو ایسی حالت میں اللہ جل شانہ وعم نوالہٗ کا ان پر خاص کرم ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

(اے رسول) کہہ دیجیے کہ اگر خدا کو دوست رکھو گے، تو میری اتباع کرو، خدا تم سے محبت کرنے لگے گا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت حقیقت میں محبت الٰہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا صلہ ہی محبت خداوندی قرار دیا گیا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے:

فَاَوْفَرَ النَّاسِ حَظًّا مِّنْ مُتَابَعَةِ الرَّسُوْلِ اَوْفَرُهُمْ حَظًّا مِّنْ مَحَبَّةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالصُّوْفِيَةِ مِنْ بَيْنِ طَوَائِفِ الْاِسْلَامِ ظَفَرُوْا بِحُسْنِ الْمُتَابَعَةِ۔

ترجمہ: "پس جو شخص جتنا زائد متبع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی قدر زائد وہ محبت الٰہی کا بھی حصہ دار ہے، اور تمام اسلامی گروہوں میں صوفیہ ہی نے سب سے زیادہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے۔" (عوارف المعارف ص ۲۶)[1]

---

[1] ایضاً، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

اس طرح حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے اپنی کتاب "فیوضاتِ وزیریہ" میں اکابر مشائخ و صوفیاء کے طرز پر تصوف اور اس کے متعلقات کی وضاحت کی ہے اور اُسی تصوف کو راجح قرار دیا ہے جو شریعت کی پابندی کے ساتھ اور شریعت کے تحت ہو۔ غیر شرعی امور کو تصوف سے خارج قرار دیا ہے۔

حضرت مولاناؒ وجیہ الدین احمد خاں صاحب نے زیادہ تصانیف نہیں چھوڑی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنا وقت درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں زیادہ گزارا۔ اگر حضرت مولاناؒ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دیتے تو یقیناً اس دور کے ایک بڑے مصنف ہوتے۔ مندرجہ بالا سطور سے مولانا کی علمی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولاناؒ نے اس دور میں رامپور کے مسلمانوں کی بالخصوص اور عامۃ المسلمین کی بالعموم جس طرح خدمت کی اور دینی امور میں رہنمائی کی وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

علّامہ ابن تیمیہ کے فقہی مناہج پر ایک نظر[1]

ڈاکٹر ظفر الاسلام، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

اسلام کے مفکرین اور مصلحین میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کا شمار بجا طور پر ان ممتاز علماء و دانشوروں میں ہے جن کے افکار و خیالات نے پوری مسلم دنیا بالخصوص اہلِ دانش و بینش پر گہرے اثرات مرتب کیے اور جن کی تالیفات و تصنیفات نے علمی دنیا میں تحقیق و جستجو کی نئی راہیں ہموار کیں۔ علامہ کی شخصیت انتہائی جامع و ہمہ گیر تھی اور ان کی علمی خدمات، فکری دینی اور مصلحانہ مساعی زندگی کی گوناگوں جہات میں جاری ہوئیں۔ تفسیر و حدیث، فقہ و علم کلام، سماجیات و سیاسیات یہ تمام علوم ان کے مباحث کا موضوع بنے اور اس سے اہم یہ کہ انھوں نے ہر ایک میدان میں سوچنے و سمجھنے اور غور و فکر کرنے کا ایک نیا رُخ دیا۔ اُن کے تمام مباحث میں خواہ وہ علم کی کسی شاخ سے متعلق ہوں اگر کوئی بنیادی نکتہ یا مرکزی خیال ملتا ہے تو وہ قرآن و سنت سے رہنمائی کی طلب اور سلفِ صالحین کے طریقہ کی اتباع ہے۔ اسی بنیادی فکر کی روشنی میں انھوں نے مختلف علوم و فنون بالخصوص اسلام کے اساسی علوم (تفسیر و حدیث و فقہ) کی توسیع و ترقی کے اصول متعین کیے اور ساتھ ہی ساتھ قرآن و سنت کی رہنمائی میں علوم اسلامیہ کی تطہیر کی کوشش کی۔ فقہ اسلامی کی تجدید و ترقی کے لیے

لہ یہ مضمون شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر جامعہ سلفیہ بنارس کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار (۲۲ر-۲۶ر نومبر ۱۹۸۶ء) میں پیش کیا گیا تھا کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ یہاں دیا جا رہا ہے۔

انھوں نے جو فکری وعملی بنیادیں فراہم کیں وہ اس کوشش کا ایک حصہ تھا۔

علامہ ابن تیمیہ کے یہاں فقہ اسلامی کی توسیع وترقی کے جو اصول ومناہج ملتے ہیں ان میں اجتہادی فکر کی آبیاری، دلیل وحجت کی پابندی مسلکی وسعت پسندی اور فقہی موشگافیوں کے ذریعہ حیلہ جوئی وحیلہ تراشی کا سدباب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ابن تیمیہ کے خیال میں فقہ اسلامی کے ارتقاء میں جو چیز سب سے زیادہ موثر ثابت ہوئی ہے اور ہوسکتی ہے وہ اجتہادی فکر ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی نگارشات میں مختلف انداز میں اسے زندہ کرنے اور پروان چڑھانے پر زور دیا اور یہ حقیقت ذہن نشین کرائی کہ مسلکی شدت پسندی اور تقلید شخصی کی تنگنائیوں سے نکل کر اجتہاد کی شاہراہ پر چل کر ہی فقہ اسلامی کو ترقی سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے۔ ان کے خیال میں اس کے لیے ضروری ہے کہ مسائل کے استنباط میں براہ راست کتاب وسنت سے رجوع کیا جائے اور آثار صحابہ وتابعین سے استفادہ کیا جائے۔ علامہ ابن تیمیہ نے یہ آواز اس وقت بلند کی یا اس کی جانب علماء وفقہاء کی توجہ اس دور میں مبذول کرائی جب فقہ کے میدان میں تقلید شخصی کا عام رواج تھا اور مسلکی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ ہر فقیہ ومفتی اپنے امام کے مسلک یا اس کے نقطۂ نظر پر عمل آوری اپنے لیے لازم تصور کرتا تھا اور کسی بھی صورت میں اس کی خلاف ورزی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اسی وجہ سے فقہاء کے یہاں عام دستور یہ تھا کہ پیش آمدہ مسائل کے استنباط میں براہ راست نصوص شرعیہ سے استدلال کرنے کے بجائے وہ فقہی کتابوں کو بنیاد بناتے تھے یا محض اپنے پیش رو فقہاء کی رائیں نقل کرنے پر اکتفا کرتے تھے[۱]۔ اس کے برخلاف ابن تیمیہ نے استنباط مسائل کا جو طریقہ اختیار کیا اور رائج کیا وہ یہ تھا کہ پیش آمدہ مسئلہ میں شرعی نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے وہ پہلے کتاب اللہ وسنت رسول میں غور کرتے اور پھر متعلقہ مسئلہ کی بابت صحابہ وتابعین کے آثار (اگر دستیاب

ہوتے) نقل کرتے اور آخر میں اس ضمن میں ائمہ فقہ کی رایوں کو بھی پیش کرتے کسی مسئلہ میں کتاب وسنت سے صراحت نہ ملنے کی صورت میں اگر صحابہ وتابعین کے آثار واقوال یا فقہا کی آرا میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کا سوال آتا تو وہ لازمی طور پر اسی رائے کو قبول کرتے جو ان کی نظر میں قرآن وحدیث سے زیادہ قریب معلوم ہوتی خواہ وہ ان کے فقہی اسکول کے مسلک کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ نئے مسائل میں اظہار خیال کرتے وقت بھی وہ اسی طرز استدلال کو اختیار کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس زمانہ کے فقہاء کے یہاں مسائل کی تشریح وتوضیح یا تفریع میں قرآن وسنت کا حوالہ نہیں ملتا۔ یقیناً نصوص شرعیہ سے استشہاد ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن ضمناً یا بالواسطہ وہ براہ راست ان نصوص سے استفادہ کرنے کے بجائے اپنے امام یا اپنے مسلک کے دیگر فقہاء مجتہدین کے مباحث اور دلائل پیش کرتے تھے اور ان میں نصوص کی نقل پر اکتفا کرتے تھے جو ان ائمہ کی کتابوں میں مذکور ہوتے تھے جبکہ ابن تیمیہ نے فقہی مسائل پر قرآن وسنت کی روشنی میں نئے سرے سے غور کرنے کی دعوت دی اور خود بھی اس کی عملی مثالیں پیش کیں علامہ ابن تیمیہ کے فقہی منہاج میں نصوص شرعیہ کو جو اولیت واہمیت حاصل تھی اس کا مزید ثبوت ان کے اس موقف سے ملتا ہے کہ اگر کوئی فقیہہ یا عالم کسی معاملہ میں اپنی فقہی بصیرت کی وجہ سے اپنے امام کے مسلک کے برخلاف کسی دوسرے امام کی رائے کو معمول بہ سمجھتا ہے اور اسے اختیار کرتا ہے اور ایسا نص سے کسی دلیل کے فراہم ہو جانے کی وجہ سے ہو تو گویا وہ اپنے ہی امام کے منشاء کو پورا کر رہا ہے اس لیے کہ ائمہ فقہ میں سے ہر ایک کا یہی قول تھا کہ جب کسی مسئلہ میں نصوص سے کوئی وضاحت مل جائے تو اس کے قول کو اگر وہ نص سے معارض ہو ترک کر دیا جائے[۲]

یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ فقہ اور دوسرے معاملات میں اشخاص ورجال کی پیروی

اپنے اوپر لازم نہیں کرتے تھے بلکہ قرآن وسنت اور آثار صحابہ کو اپنا مقتدی تسلیم کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی تعلیم وتربیت حنبلی خاندان میں ہوئی تھی اور وہ مسلکاً حنبلی فقہ کے پیرو تھے لیکن دوسرے مذاہب پر اسے ترجیح دینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اسے نص سے قریب تر سمجھتے تھے جیسا کہ انھوں نے مجموعہ فتاویٰ میں اس کی وضاحت کی ہے[۱]

علامہ ابن تیمیہ کا دوسرا فقہی منہج جس کی وجہ سے فقہ اسلامی کو نئی آب و تاب ملی اور اس کی بنیادیں مضبوط ہوئیں وہ دلیل وحجت کا التزام تھا۔ ان کے فقہی مباحث کو موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جس میں وہ حنبلی مسلک کی مکمل اتباع کرتے ہیں۔ دوسرا وہ حصہ جس میں وہ دیگر مذاہب میں سے کسی ایک امام یا فقیہہ کے قول کو اختیار کرتے ہیں۔ تیسرا وہ حصہ جس میں ان کی اپنی منفرد رائے ہوتی ہے۔ ان تمام مباحث میں اگر کوئی چیز مشترک نظر آتی ہے تو وہ دلیل وحجت کی پابندی ہے وہ بغیر دلیل کے نہ تو کسی سے اتفاق کرتے ہیں اور نہ اختلاف۔ انھوں نے جملہ فقہی مذاہب کی تفصیلات کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ان سب کے طریق استنباط طرز استدلال اور امتیازی خصوصیات پر گہری نظر ڈالی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف مسائل میں ان مذاہب کے جداگانہ نقطہ نظر اور ان کے دلائل کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھے اور اس طرح اختلاف کی صورت میں راجح ومرجوع کے امتیاز میں انھیں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ کسی بھی مسئلہ میں کسی موقف کے ترک واختیار میں دلیل وحجت کی پابندی کو وہ اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ حنبلی فقہائے کے نقطۂ نظر کو بھی بغیر دلیل کے قبول نہیں کرتے تھے جن مسائل میں انھوں نے حنبلی مسلک سے اختلاف کیا ہے اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ وہ ان مسائل میں حنبلی فقہاء کے دلائل سے مطمئن نہ ہوسکے اس لیے

اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابن تیمیہ شخصی تقلید کے مخالف ہوتے ہوئے ہر اس شخص کی اتباع کے لیے تیار رہتے تھے جس نے اپنی رائے کی تائید میں قوی تر دلیل پیش کی ہو۔ اس ضمن میں وہ حنبلی و غیر حنبلی فقہاء میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت وہ فقہ کے میدان میں رجال کی پیروی سے زیادہ دلائل کی نوعیت پر نظر رکھتے تھے اور اسی اعتبار سے اپنا موقف اختیار کرتے تھے۔ مسائل کے استنباط میں انھوں نے اپنے اوپر جو کچھ پابندی عاید کی تھی وہ دلیل کی تھی ان کے پیش نظر ہمیشہ یہ اصول رہا کہ اس کا سر رشتہ نہ چھوٹنے پائے۔ ابن تیمیہ کے اس منہج کو اختیار کرنے سے نہ صرف فقہ اسلامی کی بنیادیں مزید مستحکم ہوتی ہیں بلکہ اس سے وسعت نظر بھی پیدا ہوتی ہے۔

ابن تیمیہ کے فقہی اصول و مناہج کا تیسرا اہم پہلو توسیع پسندی اور تعصب و تنگ نظری سے دوری ہے۔ انھوں نے مسلکی شدت پسندی کے خلاف سخت جدوجہد کی اور مختلف پیرایہ میں اس نکتہ پر زور دیا کہ تمام ائمہ فقہ قابل عزت و احترام ہیں اور ان میں سے کسی کی تنقیص یا مخالفت صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے فقہاء کے اس عام انداز فکر پر بھی ضرب کاری لگائی کہ حق یا صواب صرف انھیں کے مسلک کے ساتھ مخصوص ہے۔ فقہ حنبلی سے منسلک ہونے کے باوجود انھوں نے دوسرے مذاہب فقہ کے دروازے اپنے اوپر بند نہیں کیے۔ ان تمام کے فقہی لٹریچر کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے فائدہ بھی اٹھایا۔ اس میں شبہ کہ انھوں نے بیشتر مسائل میں غیر حنبلی فقہاء سے اختلاف کیا ہے لیکن ان میں سے کسی کو ہدفِ ملامت و تنقید نہیں بنایا۔ ان کی وسیع المشربی کا یہ عالم تھا کہ وہ ائمہ فقہ میں سے ہر ایک کو حق کا متلاشی اور فقہی میدان کا مجاہد تصور کرتے تھے اور ان کی فروگذاشتوں و لغزشوں کو علم و قصد پر محمول کرنے کے بجائے مجتہدانہ عمل سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ یقیناً مذہب حنبلی کو

دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے تھے لیکن ایسا کسی مسلکی تعصب کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ اس رائے کی بنا پر کہ حنبلی مسلک میں نص سے زیادہ قربت اور سلف صالحین کے طریقہ سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے۔[۳] ان کی وسیع النظری اور متعصبانہ طرز عمل کی مخالفت اس سے بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے خود ان ائمہ فقہ کی جانب سے دفاع کیا جو مسائل کے استنباط میں حدیث سے بے توجہی کے لیے مورد الزام ٹھہرائے جا رہے تھے۔ انھوں نے ان ائمہ فقہ کے اقوال کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان میں سے ہر ایک نے نص کے تقابل اپنے قول کو ترک کر دینے کی تلقین کی۔[۴] انھوں نے اس ضمن میں یہ مزید وضاحت کی کہ اگر کسی امام کا قول حدیث سے معارض معلوم ہو تو اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں یا تو اس امام کو متعلقہ حدیث کا علم نہ تھا یا اس کی صحت پر یقین نہ تھا یا علم کے باوجود اس نے اپنے فتویٰ پر اس حدیث کو منطبق نہ سمجھا ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے نزدیک وہ حدیث منسوخ ہو چکی ہو۔[۵] خاص طور سے انہی نکات کی وضاحت اور ائمہ فقہ کی جانب سے مدافعت کے لیے ابن تیمیہ نے ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا جو "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" کے نام سے معروف ہوا۔ اہم بات یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے ان خیالات و نگارشات کو اس زمانہ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جب مختلف فقہی مذاہب کے ترجمان اپنے اپنے مسلک کے احاطہ میں محدود و مقید تھے اور دیگر مذاہب فقہ سے استفادہ اور ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جانب وہ کم توجہ دیتے تھے۔ ابن تیمیہ کا یہ منہج یقینی طور پر فقہ کے میدان میں وسعت نظر اور کشادہ قلبی پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اس طرز فکر سے مختلف مذاہب فقہ کے تقابلی مطالعہ کو فروغ ملا۔ بلاشبہ آج بھی مسلکی شدت پسندی کے اس دور میں اس طرزِ فکر کو اپنا کر فقہی تعصب و تنگ نظری کی فضا کو دور کیا جا سکتا ہے اور

مختلف فیہ مسائل میں اختلاف کی شدت کو کم کیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کے فقہی اصولوں میں وسعتِ نظر اور مسلکی رواداری کو جو اہمیت و وقعت حاصل تھی اس کی مزید وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ وہ استنباطِ مسائل کی صلاحیت رکھنے والوں کے لیے یہ ضروری تصور کرتے تھے کہ جب کسی مسئلہ میں کوئی ایسی رائے ان کے سامنے آئے جو نصوص سے زیادہ قریب معلوم ہو تو وہ اپنی سابق رائے میں تبدیلی پیدا کرلیں خواہ یہ تبدیلی ان کے اپنے امام کے موقف کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ابن تیمیہ کے خیال میں قوی شہادت کی روشنی میں رائے یا موقف کی تبدیلی تذبذب یا غیر استقلالیت کی علامت نہیں بلکہ علم و یقین کی راہ میں سرگرداں رہنے کا ایک مظہر ہے[8]۔ انھوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں قولِ رسول ﷺ کی اہمیت و عظمت کو واضح کیا اور فقیہانِ امت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ قولِ رسول ﷺ کے بالمقابل کسی بھی امام یا فقیہ کے قول کو ترک کیا جاسکتا ہے[9]۔ ابن تیمیہ نے نہ صرف یہ کہ اس احوال کی تبلیغ کی بلکہ اسے عملی طور پر بھی برتا۔ حنبلی مسلک کے پیرو ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ و ہر حال میں اپنے آپ کو امام احمد بن حنبل کا پابند نہیں گردانا بلکہ بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی کیا اور اس اختلاف کی بنیاد یہی تھی کہ وہ ان مسائل میں دوسرے کسی امام کے قول یا اپنی منفرد رائے کو نص سے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابن تیمیہ کے نزدیک ہر کس و ناکس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ... یک مسلک کی تقلید چھوڑ کر مختلف مسائل میں مختلف مذاہبِ فقہ کے نقطہ نظر ... کرتا رہے۔ وہ فقہی مسائل میں موقف یا مسلک کی تبدیلی صرف انھیں لوگوں ... روا تصور کرتے تھے جو استنباطِ مسائل کی صلاحیت رکھتے ہوں، مختلف ... میں موازنہ کرسکتے ہوں اور راجح و مرجوح میں امتیاز کے اہل ہوں۔ وہ اس طرز ... کے سخت مخالف تھے کہ محض سہل پسندی کے نقطۂ نظر سے یا ذاتی فائدہ کی خاطر

ایک مسلک کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کیا جائے۔ مثلاً کوئی حق شفعہ کے حصول کے لیے امام ابو حنیفہ رض کے مسلک پر عمل پیرا ہو لیکن جب خود اس کا پڑوسی اس سے حق شفعہ کا طالب ہو تو وہ کہے کہ یہ نص سے ثابت نہیں ہے[۱] ابن تیمیہ کی نظر میں فقہی مسلک کی وہ تبدیلی انتہائی مذموم و سخت ناپسندیدہ ہے جو شریعت کو کھیل بنا دینے کے مترادف ہو یا جس سے شرعی حدود و قیود کی عدم اہمیت ظاہر ہو۔

جہاں تک فقہ اسلامی کی تطہیر و تنقیح کا تعلق ہے ابن تیمیہ نے اس ضمن میں تشریع اسلامی کی غرض و غایت سمجھنے پر زور دیا اور یہ حقیقت بے نقاب کی کہ علم فقہ سے مقصود محض ضابطہ بندی یا قانونی خانہ پری کی سہولت بہم پہونچانا نہیں بلکہ شریعت مطہرہ کے اصل منشا کی سمجھ پیدا کرنا اور اس کی تکمیل کے لیے قانونی رہنمائی فراہم کرنا ہے اسی لیے انھوں نے ان حیلوں کے خاتمہ کے لیے زبردست جدو جہد کی جن سے مقصود شریعت کی پابندیوں سے بچنا اور اس کی مقرر کردہ حدود و قیود سے پہلوتہی کرنا تھا تاکہ کوئی آسانی یا فائدہ حاصل ہو سکے۔ ابن تیمیہ نے ان فقہی حیلوں کو شریعت کے منشا کے خلاف قرار دیا اور یہ واضح کیا کہ شریعت کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی سے مطلوب ایک ایسی زندگی کی تعمیر ہے جو قرآن و سنت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہو اور ایک ایسے معاشرہ کو پروان چڑھانا ہے جہاں حق و عدل کا بول و بالا ہو۔ لیکن اگر فقہی موشگافیوں کے ذریعہ ایسی تدبیریں یا صورتیں ایجاد میں لائی جائیں جن کی وجہ سے کسی شرعی حکم کی تعمیل سے بچا جا سکے یا خود شریعت کی کسی پابندی کو توڑ کر منہی عنہ تک پہونچانے والی ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ اس سے شرعی حکم کا تقدس بھی مجروح ہوا اور وہ منشا بھی پورا نہیں ہوا جو اس حکم شریعت میں مضمر تھا۔ مثال کے طور پر حکم زکوٰۃ سے مقصود محض کسی ظاہری رسم کی ادائیگی نہیں بلکہ نادار و فقراء، مساکین و بے سہارا لوگوں کی اعانت و حاجت روائی ہے اگر کوئی شخص

محض اپنے اوپر سے اس حکم کو ساقط کرنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کرے کہ سال کے اختتام یا حولان حول سے پہلے اپنے مال کو کسی کے نام ہبہ کر دیا کرے تو ایسی صورت میں حکم زکوٰۃ کی تشریع کا مقصد کہاں پورا ہوا۔ علامہ ابن تیمیہ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے فقہی مباحث کے ذریعہ حیلہ سازی کی اس ذہنیت پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اسی موضوع سے متعلق انھوں نے "اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل" کے نام سے ایک رسالہ بھی تحریر کیا جو ان کے مجموعہ فتاوی کی چوتھی جلد کا ایک حصہ ہے۔ اگرچہ اس رسالہ سے اصل مقصود اس حیلہ کا بطلان ہے جو طلاق ثلاثہ کے بعد مطلقہ کو دوبارہ عقد زوجیت میں لانے کے لیے اختیار کیا جاتا تھا لیکن انھوں نے اسی کے ذریعہ دوسرے بہت سے حیلوں کے تئیں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی جو اس وقت متعدد فقہی کتابوں کا حصہ بن چکے تھے اور عوام میں رائج تھے۔ ابن تیمیہ نے ان تمام فقہی حیلوں کو اس دلیل کے تحت بھی رد کیا ہے کہ اسلام نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کے ذرائع کو بھی ممنوع گردانا ہے تاکہ محرکات کا سد باب ہو سکے اس ضمن میں انھوں نے اس حقیقت کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ اسلام میں مقصد کی بلندی و بہتری اور اس کے ذرائع حصول کی پاکیزگی دونوں ہی مطلوب ہے اس لیے اگر کسی فعل کا مقصد حرام چیز کا حصول ہو تو اس کے لیے ظاہری صورت خواہ کیسی ہی اختیار کی جائے اس پر فیصلہ نیت ہی کے اعتبار سے ہوگا۔[11]

ان نکات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ نے دیگر علوم کے ساتھ فقہ کی تطہیر کے اصول بھی واضح کیے اور اس علم کو اس نہج پر ترقی دینے کی کوشش کی کہ یہ شریعت [illegible] کی حقیقی غرض و غایت کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہو سکے اور قرآن و [illegible] کے مقتضیات کا ترجمان بن سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انداز فکر کی روشنی میں فقہ کے قدیم ماخذ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر فقہ اسلامی کے میدان میں

کوئی اصلاحی یا تجدیدی کوشش بار آور نہیں ہوسکتی۔

علامہ ابن تیمیہ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی تجدید و ترقی کے لیے انھوں نے نہ صرف اصول و مناہج کی وضاحت کی بلکہ اپنے فتووں اور فقہی تالیفات کے ذریعہ انھیں عملی صورت میں بھی پیش کیا اور علمی انداز میں انسانی زندگی کے گوناگوں مسائل پر فقہی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا۔ فتاویٰ کی مبسوط جلدوں اور مختلف رسائل میں جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں عقاید و عبادات کے علاوہ معاشرتی و معاشی زندگی کے بہت سے پہلو شامل ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ ابن تیمیہ نے فقہ اسلامی کو معاشرتی و سماجی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی اور عصری مسائل کی فقہی تشریح و توضیح میں مجتہدانہ بصیرت سے کام لیا۔[۱۲]

آخر میں یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ ابن تیمیہ کے فقہی اصول و مناہج کی اہمیت و معنویت آج بھی اپنی جگہ پر قایم ہے۔ ان کی روشنی میں نہ صرف معاشرت و معیشت سے متعلق بہت سے عصری مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کی مدد سے عہد حاضر میں فقہ اسلامی کو جمود کی راہ سے ہٹا کر مجتہدانہ فکر کا عکاس بنایا جاسکتا ہے۔ آج مسلم معاشرہ کو متعدد ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے بارے میں عوام علماء وقت کی اجتہادی کوششوں اور اجتماعی رایوں کے طالب ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کی یہ طلب اجتہادی فکر کو زندہ کیے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح فقہی مسائل میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے اختلافات کی شدت میں تخفیف لانا بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے بھی ابن تیمیہ کے مذکورہ اصول بہترین مشعل راہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ میری اپنی ناقص رائے میں فقہ اسلامی کے میدان میں اجتہادی کوششوں کا سلسلہ کسی بھی دور میں منقطع نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ

ان کوششوں کا دائرہ اور ان کا نہج ہمیشہ یکساں نہیں رہا بلکہ حالات کے تقاضے فقہا کی استعداد اور علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے ان میں اختلاف و تنوع ہوتا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نئے مسائل کے حل کے لیے آج بھی کسی نہ کسی حد تک انفرادی کوششیں جاری ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام دلچسپی کے مسائل اور اجتماعی معاملات کے لیے یہ کوششیں بہت زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوئی ہیں اور نہ ہی عوام کو پوری طرح مطمئن کر پا رہی ہیں۔ اس لیے ان انفرادی کوششوں کو مزید موثر بنانے اور ان میں یگانگت و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے علماء امت کی اجتماعی توجہ اور مشترکہ مساعی درکار ہیں۔ ان کے لیے ابن تیمیہ کے ذہنی مناہج بلاشبہ رہنما اصول کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اسلام کا نظام قانون جسے فقہ اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک متحرک نظام ہے جو ہر زمانے میں مختلف النوع مسائل کا حل فراہم کرتا رہا ہے یہ کوئی ساکن و جامد نظام قانون نہیں جو ایک بار مرتب ہو جانے کے بعد حالات کی تبدیلی اور نئے مسائل کے وقوع کی صورت میں توسیع و ترقی اور وقت کے تقاضے کے مطابق نئی تشریح و ترجمانی کی گنجائش نہ رکھتا ہو۔ آج بھی فقہ اسلامی کی اس روح کو تازگی بخشنے اور عصری مسائل کے حل میں اجتہادی فکر کو اجاگر کرنے کی اشد ضرورت ہے جس کا احساس ہر صاحب بصیرت ذی فہم کو ہے، خدا کرے یہ احساس عملی اقدام کا قالب اختیار کر لے۔

(مراجع)

ـہ ابن قیم، اعلام الموقعین، مطبعہ منیریہ، مصر، ۲۲۵/۴

ـہ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، کردستان، مصر، ۱۳۲۶ھ، ۳۸۴/۲، اعلام الموقعین ۲۰۰/۴

ـہ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۱۹۹/۲۔

(مراجع)

۴ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/۳۸۴
۵ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/۱۹۹
۶ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/۳۸۴
۷ ابن تیمیہ، رفع الملام عن الائمۃ الاعلام، مکتبۃ القاہرہ (بدون تاریخ) ص ۴۲-۵
۸ مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/۳۷۸
۹ مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/۳۷۶-۳۷۷
۱۰ مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/۲۰۰-۲۰۲
۱۱ فقہی جملوں کے موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ابن تیمیہ کے مذکورہ رسالہ کے علاوہ ملاحظہ کریں اعلام الموقعین، ۳/۳۹۳-۳۹۵، تذکرہ ابوالکلام آزاد، نئی دہلی، ۱۹۶۸ء ص ۸۵-۱۰۲
۱۲ اس مسئلہ پر تفصیل کے لیے دیکھیے محمد ابوزہرہ، ابن تیمیہ۔ حیاتہ، عصرہ و آرارہ، اردو ترجمہ حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ از رئیس احمد جعفری مکتبہ سلفیہ لاہور، ۱۹۷۱ء ص ۵۳۹-۵۵۵، ۶۵۰-۶۶۶-

ابوحیان توحیدی

حیات و خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۳)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شخصیت کے خد وخال التوحیدی نے ایک طویل عرصے تک اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا، زندگی کے آخری لمحات تک علم و ادب کی خدمت میں لگا رہا۔ وہ تمام ہی جسمانی عیوب و کمزوریوں سے پاک قدرے وجیہ شخصیت کا حامل ایک کامل انسان تھا۔ اس کے ارادوں میں جان، نیتوں میں اخلاص، حوصلوں میں پختگی اور عزائم میں غیر معمولی بلندی تھی۔ وہ جس کام کو کرنے کا ارادہ کرلیتا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑتا۔ وہ اپنی لاغری و ناتوانی اور ضعف و کمزوری کے باوجود صوفیہ کی جماعت کے ساتھ عراق سے حجاز پیدل حج کے ارادہ سے نکلا۔ مقام "ادبہ" پہنچتے پہنچتے سارا کھانا ختم ہوگیا، چنانچہ فاقہ کے سبب ان کا برا حال تھا۔ لیکن اس بھوک کی کیفیت میں بھی ان لوگوں نے چار دنوں تک مسلسل سفر کیا یہاں تک کہ قادسیہ پہنچ کر ان کو کھانا نصیب ہوا۔ اس واقعے سے اس کی صبر و عزیمت اور قوت برداشت

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[۲۴]

جہاں تک آپ کی ظاہری شکل و صورت اور وضع قطع کا تعلق ہے تو آپ ایک صوفی صفت انسان تھے، چہرے کے اندر کوئی ایسی خوبصورتی و دلکشی نہ تھی کہ وہ لوگوں کی توجہ اور عنایتوں کا مرکز بن سکے۔ آپ کی ہر چیز میں سادگی، تواضع و انکساری کا عنصر نمایاں تھا۔ آپ کپڑے بھی نہایت معمولی اور بسا اوقات پیوند لگا ہوا استعمال کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ امراء و وزراء سے ملاقات کے وقت ان کو اپنی شخصیت سے مرعوب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کے اوقات کا زیادہ تر حصہ صوفیاء کی مجلسوں میں گذرتا یا پھر حکماء و علماء کے ساتھ علمی مذاکروں میں صرف ہوتا۔

حرفت و پیشہ ابوحیان توحیدی ایک خوشخط کاتب اور کتابت کے مختلف فنون سے واقف تھے۔ فن خطاطی میں بھی مہارت تھی۔ ایک عرصہ تک ابوحیان بغداد میں کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بہت سارے قدیم رسالوں کی از سرنو کتابت کی، ان رسائل کا شمار عربی زبان و ادب کے قدیم اور اہم ترین سرمائے میں ہوتا ہے۔ اس نے عربی خط کے اندر طرح طرح کی آرائش و زیبائش کے ذریعہ مزید حسن، خوبصورتی، کشش، جاذبیت اور زینت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ ابتدا میں کتابت ہی کے ذریعہ اپنی روزی کمایا کرتا تھا اور اسی فن کی بدولت وقت کے وزراء و حکام تک اس کی رسائی ممکن ہوئی۔ آپ ان کے رسائل و خطوط کی عمدہ کتابت کرتے تھے جس کی آپ کو اچھی خاصی اجرت ملتی تھی۔ انھوں نے "زین بن رفاعہ" کے خطوط لکھے۔ وزیر ابن العارض نے اس کے ذریعہ جاحظ کی کتاب "الحیوان" کی کتابت کروائی۔ لیکن ابوحیان

اپنے کتابت کے پیشے سے مطمئن نہ تھا۔ وہ کسی ایسے کام کی تلاش میں تھا جس میں محنت تو کم ہو مگر فائدہ زیادہ ہو۔ چنانچہ اس نے کچھ دنوں تک دیوان البرید میں بھی کام کیا۔ سبزی، غلہ جات اور دیگر اشیاء کی خرید و فروخت کی تجارت بھی شروع کی۔

اساتذہ ابوحیان کی تعلیمی زندگی کا آغاز بغداد میں ہوا۔ انھوں نے اپنے دور کے جید، نامور اور ماہر فضلاء اور صاحبانِ کمال ادباء سے اکتسابِ علم کیا۔ ان میں سے چند کے نام حسبِ ذیل ہیں:

ابوسعید سیرافی سیرافی ایک وسیع النظر عالم تھے، ان کو بیک وقت فلسفہ، ادب، تصوف، فقہ اور علم کلام میں کمال حاصل تھا، اس کے علم و معرفت کا چرچا پورے عالم اسلام میں تھا، وقت کے حکماء و فلاسفہ میں اس کا نمایاں مقام تھا، حکام و فرمانرواؤں کے نزدیک وہ ہر ممکن عزت و احترام کا مستحق تھا۔ یاقوت حموی اس کے بارے میں لکھتا ہے:

> "اس نے پچاس سال تک جامع رصافہ بغداد کے مسند افتاء کو زینت بخشی اور ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق فتوے دیتا اور اس طویل عرصہ میں نہ تو اس کا کوئی فتویٰ غلط پایا گیا اور نہ ہی مسترد ہوا، نحو کے میدان میں بھی اچھی دسترس رکھتا تھا۔ زہد و تقویٰ میں بھی منفرد و ممتاز تھا۔ اس کے محبوب ترین شاگرد ابوحیان توحیدی کا بیان ہے: "وہ بڑے عابد و زاہد تھے، اس کا دن قرآن کی تلاوت اور خشوع و خضوع میں گذرتا، رات اوراد و وظائف میں بسر ہوتی۔ اس نے چالیس سال تک مسلسل پورے سال کا روزہ رکھا۔" ۲۴

ابوسعید مدائنی کا بیان ہے کہ "سیرافی کی محفل میں جب حشر و نشر کا ذکر ہوتا تو میں نے دیکھا اس کے اوپر ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ روتے روتے صبح کر دیتا"[۲۵] وہ علم نحو کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس نے سیبویہ کی "الکتاب" کی شرح لکھی۔ اس شرح میں نحو کے دقیق مسائل بڑے دلنشیں انداز میں پیش کئے گئے ہیں[۲۶]۔ ابوحیان نے فلسفہ، تصوف کے اسرار و رموز سے پوری واقفیت سیرافی سے حاصل کی۔ وہ اپنے استاد کو روئے زمین کا سب سے بڑا عالم بتاتا ہے[۲۷]۔

علی بن عیسی الرمانی

ابوحیان توحیدی کی شخصیت کی تعمیر میں الرمانی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ الرمانی معتزلی طریقہ فکر کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ ابو توحیدی نے [illegible] سے علم کلام کی تعلیم حاصل کی۔ علم کلام کے ساتھ عربی زبان و ادب میں بھی وہ پوری مہارت رکھتا تھا، دیگر علوم و فنون کے علاوہ نحو اور منطق سے بھی خاص شغف تھا۔ نحو میں اس کا مرتبہ ابوعلی و سیرافی سے کم نہیں۔ الرمانی کی علمی حیثیت کا اندازہ ابن خلکان کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> "ایسا عالم سرزمین بغداد پھر پیدا نہ کر سکی جو بیک وقت فن نحو کا امام بھی تھا، علم کلام پر بھی عبور تھا، مخالفین اسلام کی کتابوں پر بھی اس کی نظر تھی، جو دقیق علمی مسئلوں کو حل کرنے میں غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اسی کے ساتھ دینی بصیرت، عقیدے کی پختگی، فقہی تبحر اور عقیدے پاکیزگی بھی رکھتا تھا"[۲۸]

قاضی ابوحامد المروزی

ابوحامد کا شمار چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر علماء میں ہوتا ہے۔ ابوحیان توحیدی قاضی صاحب کے [illegible] شاگردوں میں تھے۔ اس کی کتاب

البصائر والذخائر زیادہ تر ابوحامد کے افادات پر مشتمل ہے۔ ابوحیان بذاتِ خود اپنے استاد کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:

"میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ وضع دار اور
شریف آدمی نہیں دیکھا وہ علم ومعرفت کے سمندر،
سیرت وتاریخ میں ماہر اور معانی آفرینی میں کمال
رکھتے تھے۔"

چوتھی صدی عیسوی کے شافعی فقہاء میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ ابوتوحیدی نے فقہ شافعیہ کا درس انھیں سے حاصل کیا۔

ابوسلیمان محمد بن طاہر بن بہرام المنطقی السجستانی

ابوحیان توحیدی کے اساتذہ میں ابوسعید کے بعد سجستانی کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔ آپ نے کسی بلند دنیوی منصب کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی عیش و عشرت کی زندگی گذاری، ایک طویل عرصے تک سوکھی روٹی پر گذارا کیا۔ آپ اپنی صلاحیتوں اور قوتوں سے اتنا بھی نہ کما پاتے کہ مکان کا کرایہ ادا کرسکیں یا دو وقت کی روٹی کا انتظام۔ "صوان الحکمۃ" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ علم کلام وفلسفہ سے تعلق رکھنے والے باذوق طلبہ کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں برابر حاضر رہتی۔ ابوحیان نے آپ سے علم فلسفہ وکلام کے علاوہ صبر وقناعت اور دعوت و عزیمت کا درس بھی لیا۔ توحیدی نے "المقابسات" میں سجستانی کے ملفوظات کا معتدبہ حصہ جمع کردیا ہے۔ سجستانی کی جانشینی کا شرف بھی توحیدی کو حاصل ہے۔

ان کے علاوہ قاضی ابوالفرج معافی بن زکریا النہروانی اور ابوزکریا یحییٰ بن عدی

سے فلسفہ ومنطق کے دقیق مسائل میں استفادہ کیا۔ اسی طرح ابوالحسن عامری سے نحو و فلسفہ اور ابونفیس سے ریاضی وعلم ہیئت کی تعلیم حاصل کی۔ مختلف علوم وفنون میں ایسا ملکہ پیدا کر لیا یہاں تک کہ اپنے دور کے سب سے بڑے فلسفی سمجھے گئے۔[۲۹]

تلاشِ معاش

تعلیم سے فراغت کے بعد ابوحیان توحیدی نے تصنیف وتالیف کو اپنا مشغلہ اور امراء و حکام کی مدح و توصیف کو ذریعہ معاش بنالیا۔

مہلبی کے دربار میں

بنی بویہ کے وزراء میں مہلبی بڑا علم دوست وزیر تھا۔ اس کی کنیت ابومحمد اور نام حسن تھا۔ مشہور اموی جنرل مہلب بن ابی صفرہ کے خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے مہلبی کے نام سے مشہور ہوا۔ مہلبی نے ادب کا بڑا ہی صاف ستھرا مذاق پایا تھا۔ یاقوت نے صابی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مہلبی کے دربار میں فن کاروں، خصوصیت سے ادباء و شعراء کی بڑی قدر تھی۔[۳۰] اس نے اپنی چند سالہ وزارت ہی میں برامکہ کی یاد تازہ کردی تھی۔ اس کا عہد وزارت یادگار عہد تصور کیا جاتا ہے۔ علم کلام کی پیچ پیچ بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

ابوحیان توحیدی اس وقت کی علمی و ادبی دنیا میں اپنی تصنیفات وتالیفات کی بدولت مقبول ہوگیا۔ اس کا شمار عربی کے بلند پایہ ادیبوں میں ہونے لگا۔ ابوحیان کو توقع تھی کہ مہلبی کے دربار میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا لیکن علم وادب کی بدقسمتی کو کیا کہیے کہ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوپائی اور مہلبی کے دربار میں خلاف توقع اس کی وہ پذیرائی نہ ہوسکی جس کی اسے امید تھی۔ مہلبی اگرچہ ابوحیان کے علمی و دینی مرتبے سے بخوبی واقف تھا لیکن محض مذہبی و دینی تعصب کی بنا پر ابوحیان کو فوراً بغداد چھوڑ دینے کا حکم صادر کر دیا۔ امام شمس الدین ذہبی اس کی وجہ یہ بیان

کرتے ہیں کہ توحیدی کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ ملحد و زندیق ہے اس لئے مسلم معاشرے میں اس کا وجود مضر ہے۔ لیکن شاید اصل وجہ یہی کہ ابوحیان شیعیت کا مخالف اور مہلبی اپنی شیعیت نوازی کی بنا پر بدنام تھا۔

ابن العمید کے حضور مہلبی سے مایوس ہوکر ابوحیان نے کچھ دنوں تک گوشہ نشینی اختیار کرلی، ایک طویل عرصے تک گمنامی کی زندگی گذارتا رہا۔ اس زمانے میں وزیر ابن العمید کی ہر چہار جانب شہرت اور چرچا تھا۔ اس کا وجود سرزمین عجم کے لئے باعث فخر و ناز تھا۔ وہ عربی زبان کا اتنا بڑا صاحب طرز ادیب تھا کہ اس کا اسلوب نگارش بلا کسی رد و بدل کے دو سو سالوں تک باقی رہا۔ وہ فلسفہ وعلم کلام سے متعلق مناظروں اور مجادلوں میں حصہ لیتا۔ عقیدہ و مذہب کے اعتبار سے وہ مذہب اعتزال کا پیرو تھا۔ اس کے ساتھ فنون لطیفہ، مصوری و موسیقی کا دلدادہ تھا اس لئے اس کا دربار برابر مختلف قسم کے اہل کمال اور اہل فن حضرات سے بھرا ہوا رہتا تھا۔ کتابوں سے تو جیسے اسے عشق تھا۔ مشہور زمانہ مورخ ابن مسکویہ اس کے عظیم الشان کتب خانے کا ناظم ... عجمی شان و شوکت، غیر عربی ثقافت وکلچر کا جو سماں اس کے دربار میں نظر آتا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ابوحیان توحیدی سفر کی کلفتوں و صعوبتوں اور راستے میں پیش آنے والی دشواریوں پریشانیوں کو برداشت کرتا ہوا ابن العمید کے پایۂ تخت 'رے' پہنچا اور دربار رسائی حاصل کی لیکن بدقسمتی و محرومی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ گو کہ اس کے جسم پر معمولی لباس تھا لیکن اسے اپنی عزت و خودداری کا بہت خیال اور ... پر پورا اعتماد تھا۔ بھلا ابن العمید جیسے جلیل القدر وزیر اعظم کو اس کی کیا پروا، چنانچہ اس نے ابوحیان کو دیکھتے ہی غرور سے اپنے کندھے کو جھٹک دیا اور

بڑی حقارت سے پیش آیا اور لائق اعتناء نہ سمجھا[۳۶] اور اس [illegible] کو یہاں سے بھی خائب وخاسر لوٹنا پڑا۔

صاحب ابن عباد کے در دولت پر

تاریخ اسلام میں جن وزراء کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں ان میں برامکہ کے بعد صاحب بن عباد اور نظام الملک طوسی کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ صاحب ابن عباد کے رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ بعد از مرگ بھی لوگوں کے دلوں سے اس کی عظمت وہیبت کا سکہ نہ نکلنے پایا۔ ابن خلکان کا بیان ہے:

"عام طور سے انسان کی اقبال مندی اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے لیکن صاحب ابن عباد کی عظمت و اقبال مندی اس کی موت کے بعد بھی قائم رہی۔ اس کے انتقال کی خبر ملتے ہی پایۂ تخت کے بازار بند ہوگئے سوگواروں کا مجمع اس کے محل کے دروازے پر جنازے کے انتظار میں جمع ہونے لگا۔ خود بادشاہ وقت اور تمام فوجی افسران ماتمی لباس میں محل کے باہر جنازے کے منتظر تھے۔ جیسے ہی جنازہ محل سے نکلا تو فضا نالہ و شیون، آہ و بکا اور ماتم و گریہ زاری کے شور سے لرز اٹھی۔ جنازے کے اٹھتے ہی لوگ زمین بوس ہوگئے۔ اکثر و [illegible] نے شدت غم [illegible] گریہ وزاری کا شور بڑھتا ہی گیا [illegible] فخر الدولہ جنازے کے [illegible] آگے [illegible]"

صاحب ابن عباد [illegible] ابن الاثیر کے [illegible]
[illegible] فخر الدولہ کا وزیر اعظم [illegible]

سلطنت کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔ اس نے معتزلہ کے وقار رفتہ کو از سرنو قائم کیا۔ حکومت کے سارے وسائل و ذرائع کو اعتزال کے نشأۃ ثانیہ کے لئے استعمال کیا۔ اس کے دربار میں جس قدر اہل کمال جمع ہوئے شاید ہی کسی دربار میں جمع ہوئے ہوں۔ ابوحیان توحیدی اگرچہ دو بار وزیروں کی بے توجہی اور عدم التفاتی کا مزہ چکھ چکا تھا، مگر صاحب ابن عباد کے اوصاف و محاسن سن کر اسے اس سے یک گونہ عقیدت ہوئی تمناؤں نے ایک بار پھر دل میں انگڑائی لی، امید کی ایک موہوم سی کرن بیدار ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر اپنے بکھرے ہوئے حوصلوں، ٹوٹتے ہوئے اور پریشان حال خواہشات کو جمع کیا اور رَے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ تاکہ اس کے ندیم اور مصاحب کا مقام حاصل کرلے۔ لیکن وہ صاحب بن عباد کی نگاہ میں نہ جچ سکا۔ اس لئے یہاں بھی اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی قسمت اس سے روٹھ گئی ہو۔

اس طرح اس کو زندگی کے تلخ حقائق کا عملی تجربہ تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی فقر و فاقہ، محنت و مشقت اور کلفت و مصیبت میں گذار دی اور لاکھ [illegible]شوں اور تدبیروں کے باوجود بھی کبھی اس کی آمدنی اتنی نہ ہوسکی کہ وہ [illegible]ل اور فارغ البال زندگی گذارے۔ یہ حسرت دل کی دل میں رہ گئی جبکہ [illegible]تر درجے کے معاصر ادباء و مصنفین کا حال یہ تھا کہ ان کے پاس زندگی [illegible]حشرت اور آرام و تعیش کی جملہ سہولیات موجود تھیں۔ ان کے پاس [illegible]، جاہ و رتبہ، دولت و ثروت اور اقتدار و حکومت سب کچھ [illegible]تعلق بھی ابن عمید، ابن عباد، ابو اسحاق صابی، ابن سعدان، عبدالعزیز [illegible] کے طبقے سے تھا۔ ان کی اکثریت وزارت کے عہدوں تک پہونچنے میں [illegible]ب ہوگئی لیکن ابوحیان اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود دیوان انشا میں

سرکاری کاتب کے عہدے تک پہنچ سکا اور نہ ہی حکومت کے کسی چھوٹے بڑے عہدے تک رسائی ممکن ہو سکی۔

وہ کسی حد تک بزدل اور مصلحت پسند تھا خطرات سے کھیل کر، مشقت کو گلے لگا کر اور پریشانیوں میں کود کر عزت و شہرت اور مال و دولت حاصل کرنے پر گمنامی و غربت میں رہتے ہوئے امن و سلامتی اور سکون و اطمینان کی زندگی کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کی غربت و ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نہایت صاف گو، خود دار اور غیرت مند انسان تھا، اس کا احساس زندہ اور ضمیر بیدار تھا، کسی منکر یا غلط کام کو ہوتے دیکھ کر وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتا تھا، اس کی زبان میں تیزی و حق گوئی تھی، اپنی اس صاف گوئی کے سبب وہ بہت سارے لوگوں کے لئے مشکلات و پریشانیوں کا سبب ثابت ہوا جس کے ردعمل میں اسے بھی ان کی طرف سے سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر امراء و سلاطین سے دشمنی نے اس کی ناکامیوں و محرومیوں میں مزید اضافہ کیا۔

ابو الوفا مہندس سے ملاقات

صاحب ابن عباد کے دربار سے واپسی کے بعد توحیدی نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ صاحب ابن عباد کی سرد مہری اور بے توجہی سے اس کا دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا اور وہ اب اپنے حالات کو بہتر بنانے سہولیات زندگی کو فراہم کرنے کے سلسلے میں مزید ہاتھ پیر مارنے کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ لیکن اسی یاس و ناامیدی کے دور میں ابو الوفا مہندس امید کی ایک کرن بن کر اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ اس نے توحیدی کے اندر چھپے ہوئے جوہروں کو پہچانا، اسے زندہ رہنے کی ترغیب دی۔ اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی اور اطمینان دلایا، ہر ممکن امداد کا وعدہ بھی کیا۔ ابو الوفا سے توحیدی کی پہلی ملاقات رمضان

کے سفر میں ہوئی ۔ اسی زمانے میں دونوں کے درمیان گہرے مراسم پیدا ہوگئے ۔ اور دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ توحیدی کچھ پریشان حال اور مایوسیوں کا شکار تھا ۔ پھر جب اسے صاحب ابن عباد کی سرد مہری اور لاپرواہی کا علم ہوا تو اس نے اسے ہر طرح سے تسلی دی ۔ ابوالوفا المہندس ، وزیر ابن العارض (ابن سعدان) کا خاص آدمی تھا اور ابو حیان کا ایک طرح سے کفیل تھا ۔ التوحیدی نے اس کو جو خطوط روانہ کئے ان میں زمانے کی تنگی ، حالات کی ناسازگاری کا شکوہ ہے ، فقر و فاقہ کی کیفیت کو دور کرنے اور دنیوی عیش و عشرت کے مواقع فراہم کرنے کی درخواست ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ آخر کب تک روٹی کے چند خشک ٹکڑوں اور بوسیدہ قسم کے کپڑوں پر گذارا کیا جا سکتا ہے ۔ بغداد کا عظیم شفاخانہ "البیمارستان" اس زمانے میں نہایت عروج پر تھا فوری طور پر ابو الوفا نے اسے اس شفاخانے میں ایک اچھا سا عہدہ دلا دیا ۔

(باقی آئندہ)

برہان

جلد ۱۰۱ | رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق مئی ۱۹۸۸ء | شمارہ ۵

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس، چھتہ شیخ منگلو میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

حضرت مفکرِ ملت کی یاد
اور
اربابِ اخلاص سے ایک گذارش

آج سے چار سال قبل مئی کے اسی مہینے میں قضا و قدر کے فیصلے کے مطابق حضرت مفکرِ ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی دانشمندانہ، مخلصانہ، بے لوث اور گراں قیمت رہنمائی، سرپرستی اور مضبوط قیادت سے ہندوستانی مسلمانوں کی محرومی تاریخِ ملی کا ایک ایسا واقعہ اور عظیم حادثہ تھا جس پر ہر دردمند دل تڑپ اٹھا تھا اور ہر آنکھ اشکبار ہوگئی تھی — جن شدید، پرسوز اور گہرے جذباتِ رنج والم کا اظہار اس وقت اہلِ فکر و بصیرت، اربابِ ادب و صحافت اور اہلِ سیاستِ حکومت کے حلقوں میں کیا گیا تھا۔ ان گذرے ہوئے چار سالوں میں نہ جانے کتنے موقع آئے ہیں جب حضرت مفتی صاحب کی جدائی شدت سے محسوس کی گئی، بار بار ایسے مسائل ابھرے ہیں جن کے حل کی تلاش میں بہت سے مخلصین کی آنکھیں حضرت مفتی صاحب کی بصیرت افروز اور دانشمندانہ قیادت کو ڈھونڈنے پر مجبور ہوجاتی ہیں ——— اور خلوص، سچائی، ہمدردی، فہم و فراست سے لبریز ایک روشنی کو آنکھیں تلاش کرنے لگتی ہیں ——— حال کی تاریکیوں اور مسائل کے اندھیروں میں اس روشنی کی تلاش قدرتی ہے جو محبت، انسانیت، شرافت و وضعداری تحمل، برداشت اور انسانیت نوازی

کے گراں قیمت جذبات اور جوہروں سے عبارت تھی اور حضرت مفتی صاحبؒ کی باوقار شخصیت کے ساتھ مخصوص تھی۔

گذشتہ دسمبر کے آخری دنوں میں عظیم و ضخیم "مفکرِ ملت نمبر" کی رسم اجرا کے سلسلے میں جو تقریب ایوان غالب میں حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر کل ہند پرسنل لا بورڈ منعقد ہوئی اس میں جس طرح ملک بھر کے ارباب علم و دانش، ارباب صحافت و سیاست اور ہندوستان کے باوقار علماء، صلحاء، ملی و سماجی رہنما، اسکالرس، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرس اور سعودی عرب کے قائمقام سفیر ہزایکسی لینسی حافظ الموفق، مصری سفارت خانہ کے افسر اعلیٰ اور دوسرے حضرات نے شرکت کی اور وقت کی تنگی کے باوجود جس طرح حضرت مفتی صاحبؒ کی حیات، کارناموں، جذباتِ اخلاص اور خصوصیات پر اظہار خیال کیا، اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ حضرت مفکر ملت کی ساٹھ سالہ علمی، ملی، ملکی، دینی، سماجی، تعلیمی، اور دیگر میدانوں میں ان کی خدمات لوگوں کے قلب و روح میں آج بھی سمائی ہوئی ہے اور فکر و عمل کی وہ روشنی آج بھی ان کی رہنمائی کر رہی ہے جس کو حضرت مفکر ملتؒ سچ مچ اپنے خونِ دل اور سوز جگر سے قائم کر گئے ہیں۔

اس عظیم اور تاریخی اہمیت کے حامل نمبر کی تیاری، اعلیٰ کتابت، معیاری طباعت خوشنما گٹ اپ وغیرہ پر ادارہ ندوۃ المصنفین نے کثیر سرمایہ صرف کیا ہے جس کی وجہ سے اور حق تعالیٰ کے فضل و کرم کی بدولت یہ عظیم نمبر علمی و دینی، ادبی و تاریخی حلقوں میں اور خاص طور پر تمام اہل علم و ادب لوگوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور بہت سے حضرات نے اس کے مواد، اسلوب ترتیب اور طباعت و کتابت وغیرہ کی تعریف و تحسین کی ہے۔ یہ بات ادارہ کے لئے باعث مسرت

ہے اور بلا شبہ حق تعالیٰ شانہ کا خاص کرم اور حضرت مفتی صاحب سے تعلق رکھنے والے بے شمار ارباب اخلاص کے تعاون کا نتیجہ ہے۔

اس موقع پر یقیناً نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ارباب علم و دانش اور حضرات خیر کی خدمت میں یہ درخواست بصد خلوص پیش کریں کہ وہ ادارہ کے جملہ تصنیفی تحقیقی اور طباعتی کاموں میں خصوصی تعاون فرمائیں۔ شدید اور ہولناک مہنگائی اور خاص طور پر کاغذ وطباعتی اشیاء کی غیر معمولی گرانی نے اس قسم کے طباعتی تحقیقی علمی اور دینی ومذہبی کاموں اور اداروں کے لئے اپنے مفید پروگراموں کا جاری رکھنا دشوار کر دیا ہے۔ ان حالات میں ہم بصد خلوص آپ حضرات خیر اور ارباب اخلاص سے یہ درخواست کرنے پر مجبور ہیں کہ براہ کرم ادارہ کے ساتھ بھرپور مالی تعاون فرمائیں۔ آپ ادارہ کی لائف ممبری اور دیگر زمروں کی رکنیت قبول فرماکر اس نازک وقت میں اس خالص علمی و دینی کام اور تعلیمات اسلامی قرآن وحدیث کے علوم ومعارف کے اس عظیم ادارہ کی مدد فرما سکتے ہیں۔

امید کہ ہماری یہ درخواست صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی۔

صوفی منش انسانیت دوست بزرگ

حضرت مفکر ملت

جناب خلیل محمد احمد ابن مخدوم صاحب

حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی علیہ الرحمہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان جلیل القدر رہنماؤں اور عالم اسلام کے ان اہم ترین مفکرین، علماء، اور دانشوروں میں سے تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنی فکر و دانش اور اپنے کردار و عمل سے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ دیوبند کی شہرۂ آفاق علمی بستی کے ایک ممتاز علمی خانوادے میں پیدا ہونے والی یہ عظیم ہستی علم و عمل، فکر و فہم، دانش و تدبر اور خدمت خلق کے میدانوں میں ساٹھ سال اس طرح سرگرم عمل رہی کہ ان کے خلوص عمل کی ایک دنیا قائل ہے۔ ان کی خدا ترسی، ان کی ذہانت، دور اندیشی اور ان کی سادگی، معاملہ فہمی اور مخالف سے مخالف عناصر کے نقطۂ نظر اور تلخ سے تلخ بات کو سننے سمجھنے اور برداشت کر لینے کا ان کا بلند و پختہ حوصلہ، ان کے وسیع قلب و ذہن اور ان کی اعلیٰ ظرفی کچھ ایسے اہم جوہر ہیں جن کی بنا پر بڑے بڑے مشائخ طریقت، علمائے کرام، مفتیان عظام اور رہنمایان ملت کے ہجوم میں مفتی صاحب کی شخصی عظمت، اخلاقی بلندی، طبیعت کی نفاست اور فکر و نظر اور قلب و دماغ کی کشادگی نے ان کو نہایت ممتاز اور باعظمت

مقام پر فائز کر دیا تھا گویا پر نور ستاروں کے ہجوم میں مفتی صاحب ماہ درخشاں نظر آتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب کی یاد مجھے بہت آتی ہے اور زندگی کے بہت سے مرحلے ایسے ہیں جب بے ساختہ مفتی صاحب کی شفقت بھری رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ان کی بے شمار کرم فرمائیاں یاد آتی ہیں۔ وہ شائستگی، قدیم تہذیب اور اعلیٰ اسلامی اخلاق کے پاکیزہ اور صاف ستھرا نمونہ تھے

اس ناچیز کو انؒ کی خدمت میں حاضری کا بار بار شرف حاصل رہا، پرانی دلی کی جامع مسجد کے علاقہ میں ایک چھوٹی سی گلی میں واقع ان کا دفتر صرف ان کی بزرگانہ عالمانہ اور باعظمت شخصیت کی وجہ سے دینی ملی علمی اور عملی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی ادبی، معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ملک کی اہم سے اہم شخصیت اور ہر میدان عمل کے سرکردہ ممتاز لوگ نیز ضرورت مندوں اور روزگار کے متلاشی نوجوانوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ یہ ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جہاں لوگ اپنی اپنی ضرورتیں، اپنے اپنے مسائل کی گتھیاں لے کر آتے اور مفتی صاحبؒ صبح سے رات تک ہر شخص کی رہنمائی اور امداد کی مقدور بھر کوشش فرماتے رہتے بغیر کسی لالچ کسی مفاد اور غرض کے اس قدر مستعدی، خلوص، للّٰہیت اور دل سوزی کے ساتھ لوگوں کی خدمت فرماتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ بعض اہم سرکردہ مسلم علماء اور رہنماؤں کا کہنا تھا کہ حضرت مفتی صاحب تنہا اس قدر خدمت و کام ملت کا، ملک کا اور انسانیت کی خدمت کا انجام دیتے ہیں کہ پوری پوری جماعتیں بھی نہیں کر سکتیں۔ خدمت کے معاملہ میں ان کے یہاں مذہب و ملت کا کبھی کوئی فرق و امتیاز نہ تھا، ہر انسان ان کے فیض کرم سے یکساں مستفید ہوتا تھا اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ ان سے والہانہ تعلق رکھتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب نے کسی سرکاری عہدہ یا منصب کو باوجود بار بار پیش کش کے کبھی قبول نہیں کیا بلکہ بڑے سے بڑے عہدہ اور منصب کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ حکومت کی پالیسیوں پر تعمیری انداز میں مگر سخت طریقہ پر تنقید بھی کرتے تھے لیکن اس کے باوجود مفتی صاحب کی قدر و عزت حکومت کے حلقہ میں بہت سے لیڈروں سے کہیں زیادہ تھی اور ان کی بات کا اثر کافی حد تک حکومت قبول کرتی تھی۔

ایشیا کا ممتاز علمی و تحقیقی ادارہ ـــــ ندوۃ المصنفین بھی حضرت مفتی صاحب کی ملی ہمدردی اور اخلاص و محنت، سلیقہ اور بلند و منفرد انتظامی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا مونہ اور کھلا ہوا ثبوت ہے، اس ادارہ کی خدمات کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا اور صدیوں تک اس کو یاد رکھا جائے گا۔ اسلام کی روشن، عالمگیر اور عظیم تعلیمات کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق زبان و بیان کی تمام تر دل آویزیوں اور دل نشینی کے ساتھ دلکش انداز میں پیش کر کے حضرت مفتی صاحب نے اپنے اس بنیادی عقیدہ کا کھلا ثبوت پیش کیا ہے کہ۔ اسلام امن عالم اور بقائے باہم، کائنات انسانی میں عدل و انصاف قائم کرنے اور انسانی مساوات کے حقیقی نظام کے قیام کے لئے ایک اہم بنیادی اور ناقابل انکار حقیقت اور کھلی سچائی کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا میں انقلابی تحریکوں کو غذا اسلام کی آفاقی، انسانیت پرور اور انصاف پسندانہ تعلیمات سے ہی ملی ہے ــ!

آل انڈیا مجلس مشاورت کے قیام میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ بڑی جانکاہی، دل سوزی، محنت اور جدوجہد اس تنظیم کو فعال و مضبوط بنانے کے سلسلہ میں انھوں نے کی۔ اگر حضرت مفتی صاحب کے بتائے ہوئے راستہ اور طریقوں پر تنظیم کو چلایا جاتا تو اس کی افادیت و اہمیت ہی کچھ اور ہوتی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو جب فالج کا حملہ ہوا اور ان کو لکھنؤ سے دہلی لایا گیا تو جیسے ہی معلوم ہوا تو بار بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ سلسلہ ان کی حیات کے

آخر تک قائم رہا، بار بار میں اپنی اہلیہ ۔ ڈاکٹر فہمیدہ صاحبہ کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ۔ آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں بھی کئی بار جانا ہوا جہاں ان کے داماد ـــــ جناب اظہر صدیقی اور صاحبزادگان سے بھی ملاقات ہوتی اور اس حالت میں بھی حضرت مفتی صاحب سے ملاقات کر کے دل میں روشنی اور ہمت پیدا ہوتی تھی ۔ ان کی صاحبزادی صاحبہ اور داماد صاحب اور صاحبزادوں نے بڑی خدمت کی، دور دور سے بڑے بڑے لوگ حضرت مفتی صاحب کی عیادت وزیارت کے لئے آتے رہتے اور اس طرح صبح سے شام تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ۔

دار العلوم دیوبند جیسے دینی ادارہ کے تنازعہ اور وہاں کے علمائے کرام کے مابین اختلافات کے مسئلہ پر مفتی صاحب کو شدید رنج وغم اور صدمہ تھا اور بستر علالت پر پڑے پڑے بھی اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح دار العلوم کی عظمت وشان کو دوبارہ بحال کرادیں ۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے بھی بہت مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کو ہر مرحلہ پر حضرات مفتی صاحب کی دانشمندانہ اور حوصلہ مندانہ رفاقت اور مشوروں سے بڑی تقویت ملتی تھی

میرا یہ مقام ہے نہ مرتبہ کہ میں حضرت مفتی صاحب جیسے عظیم عالم دین کے بارے میں لکھوں لیکن ارباب اخلاص کی محفل میں اپنے آپ کو شریک کرنے کے لئے یہ چند سطور پیش کر رہا ہوں جو حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادہ جناب عمید الرحمٰن عثمانی نے ترتیب دیا ہے اور مفکر ملت نمبر کی اشاعت پر مبارکباد دینے کے لئے یہ چند سطریں ارباب خلوص کی خدمت میں پیش ہیں میری دلی دعا ہے کہ حق تعالیٰ ادارہ برہان وندوۃ المصنفین کو قائم رکھے اور ترقیات سے نوازے اور بھائی عمید الرحمٰن عثمانی کو اس ادارہ کی ترقی کے لئے ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائے ۔ آمین ۔

نوٹ : یہ مضمون مفکر ملت نمبر کے لئے ہمیں ملا تھا لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے شائع نہیں ہوا اس لئے اس ماہ کے شمارے میں دے رہے ہیں ۔

(ادارہ)

نظریۂ ارتقا اور دانشوران اسلام

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق ممکن نہیں

اسلام کے علاوہ دیگر آسمانی مذاہب اس خاکدانِ عالم میں ایک خالق و مدبر ہستی کے وجود کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عالمِ انسانی کے اولین فردِ بشر حضرت آدم علیہ السلام تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تخلیق خصوصی کے طور پر پیدا فرمایا تھا۔ مگر چونکہ یہ عقیدہ نظریۂ ارتقاء سے میل نہیں کھاتا بلکہ اس کی ضد سمجھا جاتا ہے اس لئے بعض روشن خیال "مفکرین" نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش اس طرح کی کہ نظریۂ ارتقاء کو توجوں کا توں قبول کر لیا تاکہ نام نہاد اہلِ علم کی مخالفت نہ ہو، مگر مذہبی عقائد کی تاویل کرنی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کے واضح نصوص تک کو اپنی من مانی تاویلات کے ذریعہ بدل ڈالنے میں بھی کسی قسم کی قباحت محسوس نہیں کی، کیونکہ یہی ایک سستا کام ہے۔ گویا کہ ان کی نظر میں قرآن تک میں دور از کار تاویل بلکہ تحریف ہو سکتی ہے مگر نام نہاد دانشورانِ علم کے اقوال یا ان کے نظریات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ بات اچھی طرح

معلوم ہے کہ نظریۂ ارتقاء اور اس قسم کے دیگر نظریات محض مذہب دشمنی کی خاطر فروغ دیئے گئے ہیں اور ان میں سائنسٹسٹوں سے زیادہ ملحدین اور مادہ پرستوں (اشتراکیوں، یہودیوں اور ان کی خفیہ تنظیموں صیہونیت اور ماسونیت) وغیرہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے دنیا میں تراج پھیلانے اور اپنے قومی اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کی غرض سے نہایت درجہ منظم طور پر اس نظریہ کی تبلیغ کی ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

اس لحاظ سے یہ ایک حیرت انگیز ہے کہ وہ نظریہ —— بلکہ ایک مفروضہ —— جو مذہب دشمنی کو فروغ دینے کی غرض سے اختیار کیا گیا تھا، اسی کو بعض نادان دوست —— عین اسلام اور عین قرآن قرار دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے۔

عقل بسوز د زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء دونوں بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے البتہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا پڑے گا۔ قرآن مجید میں جس اولین بشر یعنی حضرت آدمؑ کی تخلیق خصوصی کا ذکر جس انداز میں —— صاف اور صریح بیّنات کے ساتھ —— کیا گیا ہے اور صحیح احادیث میں جس طرح اس واقعہ کی شرح و تفسیر کی گئی ہے اس کے پیش نظر نظریۂ ارتقا ایک غلط اور خود ساختہ نظریہ قرار پاتا ہے، جو آج محض ایک نظریہ نہیں رہا بلکہ ایک اچھے خاصے "عقیدے" کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء کو صحیح ماننے کا مطلب صراحتاً قرآن اور اسلام کا انکار ہے۔ ان دونوں میں جمع و تطبیق نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہر شخص کو فکری اعتبار سے آزادی حاصل ہے کہ وہ دلائل و براہین کی رو سے جو بھی نظریہ اختیار کرے ان دونوں

میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرے۔ دونوں کو بیک وقت صحیح ماننا علمی اعتبار سے ایک زبردست قسم کا تعارض و تضاد بلکہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ خدا اور صنم دونوں کو بیک وقت خوش نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو خوش کرنا پڑے گا۔

مگر واقعہ کے لحاظ سے تو یہاں پر خود ارتقا بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ پچھلے ابواب کے مباحث سے بخوبی واضح ہو گیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ علمی و شرعی دونوں حیثیتوں سے غلط اور باطل ہے۔ قرآن اور حدیث کے تمام بیانات دلیل ناطق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ بشری کے جس اولین فرد کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا تھا وہ ابوالبشر آدم تھا، جیسا کہ تفصیل اگلے ابواب میں آ رہی ہے۔

قرآن کے تمثیل ہونے کا قصہ

واقعہ یہ ہے کہ بعض مسلم علماء اور دانشوروں نے جو عموماً فکرِ مغرب کے خوشہ چیں یا اس سے مرعوب و متاثر تھے، دانستہ یا نادانستہ طور پر وقت کے تمام "مقبول نظریات" کو اسلامی اور خالص قرآنی نظریات ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا، خواہ وہ نظریات حقیقتاً اس سے ٹکراتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اس باب میں بعض راسخ العقیدہ علماء بھی مغرب کے فن پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ روشن خیالوں کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ جو قرآنی آیات و نصوص (واضح بیانات) صاف صاف جدید نظریات کے خلاف ہوں، ان کے متعلق صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ یہ قرآن کا محض ایک "تمثیلی" انداز بیان ہے ورنہ اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً قرآن کا منشا بالکل وہی ہے جس کا آج کل "علمی حلقوں" میں چرچا ہو رہا ہے۔ اگرچہ کہ قرآنی منشاء و مفہوم —— صحیح قرآن فہمی کی رو سے —— جدید رجحانات سے کتنا ہی مختلف کیوں

نہ ہو۔ یہ گویا کہ ایک ایسی "چابی" ہے جس کے ذریعہ تجدد پسندوں کے سارے مسائل اور تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلام یا قرآن کی کوئی خدمت نہیں بلکہ چند وقتی اغراض کی خاطر اسلام کو بدنام کرنا اور مذہبی حلقوں میں انتشار برپا کرنا ہے۔ قرآن فہمی کے لئے پہلے صحیح اصول تفسیر سے واقفیت ضروری ہے ورنہ فکری انتشار اور گمراہی سے چھٹکارا کبھی نہیں مل سکتا۔

غرض عصر جدید کے بعض ایسے ہی روشن فکر اہل علم نے آدم اور تخلیق آدم کے سلسلے میں یہی روش اختیار کی تاکہ نظریہ ارتقاء کو ایک خالص اسلامی نظریہ ثابت کیا جا سکے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کئے جانے کا تذکرہ بالکل صاف اور صریح لفظوں میں قرآن مجید میں مذکور ہے جو نظریۂ ارتقاء کے بالکل خلاف ہے) اس لئے انھوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ قرآن تو یہ بات محض ایک تمثیلی روپ میں کہہ رہا ہے، ورنہ حقیقتاً کسی انسان کا مٹی سے پیدا کیا جانا ایک غیر واقعی اور غیر حقیقی بات ہے۔ بلکہ انھوں نے یہاں تک کہنے کی جسارت کر ڈالی کہ آدم نام کا کوئی شخص ـــــ اولین انسانی فرد کی حیثیت سے ـــــ سرے سے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ تو نوع بشری کا محض ایک تمثیلی نمائندہ تھا اور بس۔ بالفاظ دیگر نوع انسانی کی پوری جماعت کو آدم کے نام سے پکارا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور منکر حدیث غلام احمد پرویز صاحب تحریر کرتے ہیں:

"ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ "آدم" جن کے جنت سے نکلنے کا قصہ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں آیا ہے (مثلاً $\frac{۲}{۲}$) نہیں تھے۔ قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قصۂ آدم کی جو تفاصیل بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔ بالفاظ دیگر

قصۂ آدم کسی خاص فرد (یا جوڑے) کا قصہ نہیں بلکہ خود "آدمی" کی داستان ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔"[1]

"آدم ایک فرد نہیں ہے۔ یہ فطرت انسانی کی سرگزشت ہے قصہ، کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اس تمثیل میں آدم کا لفظ غالباً اس رعایت سے لایا گیا ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے اولین مراحل میں جن کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے، آدم نامی کسی شخصیت کو ممتاز حیثیت حاصل تھی لیکن اس تمثیل میں اس شخص کی ذات مراد نہیں ہے۔"[2]

لیکن جہاں پر کسی قسم کی تاویل ممکن نہیں تھی وہاں پر جھٹ سے کہدیا کہ یہاں آدم سے مراد ابوالبشر نہیں بلکہ کوئی دوسرا آدم ہوگا۔ گویا کہ قرآن حکیم میں بیان ایک آدم کا نہیں بلکہ کئی "آدموں" کا ہوا ہے:

"بہرحال جس آدم کا ذکر سورۂ آل عمران کی مندرجہ بالا آیت (۳/۳۳) میں آیا ہے وہ "جنت سے نکلنے والے آدم" سے مختلف تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نبی ہوں (اور ان کا نام آدم ہو) قرآن نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔"[3]

"لیکن سورۂ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت (۳/۳۳) میں چونکہ آدم کا ذکر نوح کے ساتھ آیا ہے اور دونوں کے لئے اصطفیٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے

---

[1] لغات القرآن، مصنفہ غلام احمد پرویز، ۱/۲۱۴، ادارہ طلوع اسلام لاہور، ۱۹۶۰ء۔

[2] معارف القرآن، مصنفہ غلام احمد پرویز، ۲/۵۳، مطبوعہ دہلی، تاریخ اشاعت غیر مذکور۔

[3] لغات القرآن: ۱/۲۰۵، حوالہ مذکور۔

گمان غالب ہے کہ یہ آدم نبی تھے۔ اگرچہ قرآن کریم میں اس کی تائید میں کوئی نص صریح موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدم کسی نبی کا نام بھی ہو۔"[له]

یہ ایک مکابرہ نہیں تو پھر کیا ہے، جس کی تاویل میں متجدد قسم کے لوگ اس قدر تذبذب کا شکار نظر آرہے ہیں؟ اس کو تو قرآن حکیم کے سامنے اپنی حیرانی و سرگردانی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم میں ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے سوا کسی دوسرے آدم کا تذکرہ ہرگز موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ احادیث رسول کا تو پہلے ہی انکار کر چکے ہیں اور اب اس قسم کی اوٹ پٹانگ تاویلات کے ذریعہ قرآن کریم کا بھی انکار کرنے والے بن جائیں گے۔ گویا اس قسم کے لوگوں کا ایمان نہ تو قرآن پر ہے اور نہ حدیث رسول پر۔

یہ ہے عصر جدید کے تجدد پسندوں کا حال جو قرآن کریم کی اتباع کرنے کے بجائے قرآن کو اپنی خواہشات نفس کا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی باب میں دورِ حاضر کے مسلم "مفکرین" کی اکثر و بیشتر روش یہی رہی ہے جو نظریۂ ارتقا کو ایک مرغوب اور دل پسند نظریہ تصور کر کے اس کے مطابق قرآن ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس باب میں سرسید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ نے نیچریت کی جو ابتدا کی تھی تو اس میں اچھے اچھے اہل علم بشمول علامہ اقبال، اور ڈاکٹر رفیع الدین وغیرہ سب بہہ گئے ہیں، عنایت اللہ خاں مشرقی[مله] اور پرویز وغیرہ کا ذکر ہی کیا۔ تجدد یا انحراف کی یہ داستان بڑی ہی عبرتناک ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل ناگزیر معلوم ہوتی ہے، تاکہ ہماری

له معارف القرآن: ۵۲/۲، حوالۂ مذکور

مله دیکھئے موصوف کی کتاب "تذکرہ" مطبع وکیل امرتسر، ۱۹۲۴ء

مت کے سامنے اس کا ایک خاکہ آجائے ۔

سرسید اور اعتزال جدید

واقعہ یہ ہے کہ عصر جدید میں تجدد و انحراف کا آغاز غالباً سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء ۔ ۱۸۹۸ء) کے ذریعہ ہوا ہے، جنھوں نے علوم جدیدہ سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ہندستان میں مسلمانوں کا پہلا کالج قائم کرکے یقیناً ایک کارنامہ انجام دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی شدت کے ساتھ احساس تھا کہ ان علوم کی ترویج و اشاعت کے نتیجے میں اسلامی عقائد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا اس کے تدارک کے لئے اسلامی تعلیمات کی نئے انداز میں تشریح ضروری ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں اس کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے) لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے خود ہی انھوں نے "تفسیر القرآن" کے نام سے اردو میں ایک ناتمام تفسیر لکھی، جس میں اسلامی عقائد اور معجزات انبیاء وغیرہ کو "قانون فطرت" کے مطابق ثابت کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے بہت سے حقائق و واقعات کا انکار کر ڈالا۔

قصہ مختصر موصوف اپنی تفسیر میں حضرت آدمؑ سے متعلق سارے قصے کو ایک تمثیل قرار دیتے ہوئے اس قصے میں مذکور الفاظ اور کرداروں کی طرح طرح تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً فرشتوں کو قوائے ملکوتی اور شیطان کو قوائے بہیمی قرار دیا ہے[۶]

"ابلیس اور ملائکہ سے کوئی خارجی وجود مراد نہیں لیا" [۷]

---

[۶] دیکھئے مقالات سرسید: ۸/۱۴، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء۔

[۷] موج کوثر، از شیخ محمد اکرام، ص ۱۵۹، لاہور، ۱۹۷۹ء

"آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اس کے جذبات اور قوت بہیمیہ جو اس میں ودیعت کی گئی اس کی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی مانند بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔" ۸

"شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے۔ بلکہ خود انسان میں جو نفس امّارہ یا قوت بہیمیہ ہے وہ مراد ہے۔" ۹

مولانا حالی جو سرسید کے بہت بڑے ہمنوا اور طرفدار تھے، سرسید کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ

"وہ ملائکہ سے قوائے عالم اور شیطان سے انسان کی قوت بہیمیہ مراد لیتے ہیں۔ جن کے وجود سے جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، انکار کرتے ہیں۔" ۱۰

" ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے۔ بلکہ خدائے تعالیٰ نے جو مختلف قویٰ اپنی قدرت کاملہ سے مادّے میں ودیعت کئے ہیں، جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوت جذب و

---

۸ حیات جاوید، مصنفہ مولانا الطاف حسین حالی، ص ۵۲۴، ترقی اردو بورڈ نئی دلی، ۱۹۷۹ء

۹ ایضاً، ص ۵۲۵۔

۱۰ ایضاً، ص ۵۳۰۔

مع وامثال ذالک، انھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔" [11]

"قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں ...... ثابت نہیں ہوتا۔" [12]

"خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال سے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے۔ اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، جیسے بعث و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔" [13]

بقول شیخ محمد اکرام، سرسید نے آیاتِ قرآنی کی تاویل میں معتزلہ کا طرز اختیار کیا ہے۔ چنانچہ موصوف تحریر کرتے ہیں:

"اس تفسیر میں سرسید نے قرآن کے تمام اندراجات کو عقل اور سائنس کے مطابق ثابت کیا ہے اور جہاں کہیں سائنس کی معلومات اور کلام مجید کے درمیان اختلاف معلوم ہوتا ہے وہاں معتزلہ طریقے کے مطابق آیات کی نئی تاویل اور تشریح کر کے اس اختلاف کو دور کیا ہے۔"

یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ سرسید کی تفسیر عقل اور سائنس کے مطابق ہے۔ جبکہ

---

[11] ایضاً، ص ۵۲۶۔

[12] ایضاً، ص ۵۲۹۔

[13] ایضاً، ص ۵۲۷۔

[14] موجِ کوثر، ص ۱۵۹۔

دنیائے سائنس کو مافوق الطبیعی مظاہر کے اثبات یا نفی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ عقلی اعتبار سے ان مظاہر کا وجود ناممکن نہیں ہے۔ انسان کے سا تو ابھی تک حقائق کی ایک دنیا باقی ہے جس کا اسے کھوج لگانا ہے اور خود ما کی دنیا میں ایسے بہت سے "اسرار" جن کی کنہ و حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہو ہے مگر یہ ایک الگ بحث ہے۔

سرسید کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنی یہ ساری مہم ایک جدید علم کلام کی ضرورت کے تحت چلا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ۱۸۷۶ء میں "مدرستہ العلوم" کے طلبہ سے مخاطب ہو اپنی ایک تقریر کے دوران فرماتے ہیں:

"اس لئے اس زمانے میں ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کردیں، یا مشتبہ ٹھہرادیں، یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں۔" [۵]

مگر افسوس کہ موصوف اپنے دعوے کے مطابق علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل یا مشتبہ تو نہیں ٹھہرا سکے، مگر ہاں قرآن کو توڑ مروڑ کر افکار جدیدہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ضرور کر ڈالی۔ حالانکہ کرنے کا کام اس کے برعکس یہ تھا کہ نصوص قرآن پر راسخ العقیدگی کے ساتھ ایمان رکھتے ہوئے افکار جدیدہ کو باطل یا مشتبہ ٹھہرا دیا جاتا اور یہ ضرورت آج بھی باقی ہے۔ اور اس اعتبار سے آج ایک نئے غزالی، ایک نئے رازی اور ایک نئے ابن تیمیہ کی ضرورت ہے۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانے کے سلسلے میں بلاشبہ زبردست اور تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں، جن سے کسی کو انکار

---

[۵] حیات جاوید، ص ۷۱۶۔

نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ موصوف نے مشنریوں کے مقابلے اور بعض مستشرقین کے سیرت نبوی پر رکیک اعتراضات کے جواب میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور اس اعتبار سے انھیں ایک مخلص مسلمان ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اپنے حد درجہ اخلاص کے باوجود موصوف نے تفسیر قرآن کے سلسلے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اور جدید علم کلام کے نام سے "اعتزال جدید" کی بنیاد ڈالی ہے، جس کا اثر بعد والوں پر بہت دور رس واقع ہوا ہے۔ درحقیقت وہ اس منصب بلند کے اہل ہی نہیں تھے۔ چنانچہ موصوف کے معتقد اور ان کے سیرت نگار مولانا حالی تک نے صاف الفاظ میں اعتراف کر لیا ہے کہ "سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔"[۱۶]

سرسید کی "تفسیر القرآن" کی اشاعت کا آغاز ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) سے ہوا ہے[۱۷] اور یہ غالباً عصر جدید کی پہلی "انحرافی" تفسیر تھی جس نے خصوصیت کے ساتھ برصغیر ہند و پاک کے اہل علم کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اور بقول شیخ محمد اکرام "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کئی اہم مسائل میں سرسید کی رائے اختیار کر لی ہے۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کی تفسیر قرآن بیشتر سرسید ہی کی ترجمان ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سرسید کے جو عقائد تھے وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لئے اور جیسا کہ نظام المشائخ میں ڈاکٹر محمد اسماعیل کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور بھی کئی مسلمان ان سے متفق ہو گئے ہیں۔"[۱۸]

۱۶۔ حیات جاوید، ص ۲۲۰۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۴۸۷۔
۱۸۔ موج کوثر، ص ۱۶۰۔

شیخ محمد عبدہ اور نظریۂ ارتقا

مصر کے مشہور عالم اور علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ء — ۱۹۰۵ء) بھی سرسید سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ اور جیسا کہ اگلی سطور سے ظاہر ہوگا محمد عبدہ بھی سرسید کے خیالات سے واقف تھے۔ چنانچہ عددی اعتبار سے شیخ صاحب نہ صرف متاثر تھے بلکہ قصۂ آدم کے سلسلے میں تقریباً سرسید ہی کے خوشہ چیں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ شیخ صاحب عربی زبان کے عالم ہونے کی بنا پر "تاویل" اور "تمثیل" ذرا "باقاعدگی" کے ساتھ کرتے ہیں۔ غرض موصوف نے پہلے تو تخلیق آدم سے متعلق آیات کو خواہ مخواہ متشابہات میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے (وقد ذهب الأستاذ الى أن هذه الآيات من المتشابهات التي لا يمكن حملها على ظاهرها)[۱۹] پھر انھوں نے قصۂ آدم کو تمثیلی قرار دے کر اس کی دور از کار تاویلیں کی ہیں (والقصة على مذاهبهم وردت مورد التمثيل لتقرب من أفهام الخلق ما تفيده هم معرفته من حال النشأة الآدمية)[۲۰]

عصر جدید کے انھی دو "پیشروان علم" کے خیالات کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرتبین نے پوری طرح اپنالیا ہے۔ چنانچہ "آدم" کے عنوان پر اس میں جو مقالہ سپرد قلم کیا گیا ہے وہ انھی دو بزرگوں کی تاویلات و تمثیلات سے بھرا ہوا ہے۔[۲۱]

---

[۱۹] تفسیر المنار، مرتبہ شیخ رشید رضا: ۱/۲۵۱، مطبوعہ بیروت، طبع دوم۔

[۲۰] ایضاً: ۱/۲۵۵

[۲۱] دیکھئے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: ۱/۲۴۔ ۲۵، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۴ء۔

مگر اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد عبدہ نے سرسید کے خیالات سے آگاہ ہو کر انھیں نیچری اور دہریہ قرار دیا تھا۔ اور اپنے رسالہ میں جو "العروۃ الوثقی" کے نام سے ۱۳۰۱ھ میں پیرس سے نکلنا شروع ہوا تھا، ایک مقالہ خاص اس موضوع پر "الدھریون فی الھند" کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا جس میں سرسید پر نہایت درجہ سخت اور تند لہجے میں تنقید کی تھی۔[۲۳] مگر امر واقعہ یہ ہے کہ وہ خود بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں۔ بلکہ بعض مواقع پر تو سرسید سے زیادہ نیچری دکھائی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شیخ صاحب کا سرسید پر الزام ایک عجوبہ سا لگتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے سرسید نے قصۂ آدم کو ایک تمثیل قرار دے کر اس کے بعض الفاظ کی اجمالی طور پر تاویل کی ہے۔ جبکہ شیخ صاحب نے اس کی تمثیلی تفسیر میں پورے چار صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔[۲۴] اس اعتبار سے ان دونوں میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب کی اس تمثیلی تفسیر کے بعض اقتباسات اردو دائرۂ معارف اسلامیہ سے نقل کیے جاتے ہیں:

جنت سے مراد آرام و راحت کی حالت مراد لینا صحیح ہے کیونکہ نعمتوں سے پر باغات میں انسان کو راحت و سکون ملنا یقینی ہے۔ یا اس سے مراد بے فکری اور خوشی کی کیفیت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آدم سے ایک شخص نہیں تمام نوع انسانی مراد لی جائے۔ جیسے قبیلے کے باپ کے نام سے سارا قبیلہ مراد ہوتا ہے۔ شجرۂ ممنوعہ سے مراد بُرائی اور ہٹ دھرمی کی جا سکتی ہے ...... جنت [illegible] اور وہاں سے نکل جانے کے حکم سے مراد امر تکوینی ہو سکتا ہے۔

---

[۲۳] [illegible] العروۃ الوثقی (مجموعۂ مقالات) ص [illegible] مطبوعہ [illegible] ۱۹۲۸ء

[۲۴] [illegible] ص ۲۸۱ — ۲۸۵۔

یعنی ایسی بات جس کا ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ اس بنا پر جنت میں رہنے کا اور پھر وہاں سے نکل جانے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی پیدائش میں بہت سی حالتوں، زمانوں اور کیفیتوں میں سے گزرتا ہے جن میں سے پہلا زمانہ بچپن کا ہے، اس عمر میں رنج و غم پاس نہیں پھٹکتا اور کھیل کود کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ بچہ گویا ایک ایسے باغ میں ہے جہاں گھنے درخت، پختہ میوے سے لدے ہوئے، موجود ہیں، نہریں بہہ رہی ہیں، پرندے گا رہے ہیں۔ زوجہ کا ذکر اس لئے کیا کہ تمام نوع انسان اس حکم میں آجائے اور معلوم ہو جائے کہ بشریت کے اندر مذکر اور مؤنث سب برابر ہیں۔ آدم و حوا کو جنت میں رہنے کے حکم کا مطلب یہ ہوا کہ نوع انسان میں مذکر و مؤنث سب ایک حالت میں ہیں .... شیطان کے وسوسے اور اُس کے بہکانے کا مطلب یہ ہے کہ خبیث روح جو انسان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اسے برائی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان بالطبع خیر کی طرف مائل ہے، بُرائی کی طرف جاتا ہے تو دوسروں کے بہکانے سے جاتا ہے۔ جنت سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کے قاعدے توڑ کر مشقت اور محنت میں پھنس جاتا ہے۔ آدم کی توبہ اور استغفار سے اشارہ اس طرف ہے کہ انسان اپنی فطرتِ سلیمہ کی بابت بُرے کاموں سے بُرے نتیجے پیدا ہونے کا خوف رکھتا ہے۔ اس لئے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے کہ وہ ان بُرے نتائج سے اُسے بچالے .... خلاصۂ کلام یہ کہ انسان کی فطری حالتیں تین ہیں: اول، بچپن کا زمانہ اور یہ خوشی اور راحت اور بے فکری کا زمانہ ہے۔ دوسرے بھلے اور بُرے میں کسی قدر تمیز کا زمانہ۔ اس زمانے میں وہ شیطان کے وسوسے سے خواہشوں کے جنجال میں

پھنس سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک زمانہ عقل اور ہوش کے کامل ہونے کا آتا ہے۔ اس میں وہ اپنے افعال کے نتائج کا خیال کرتا ہے اور بُرے کاموں سے بچنا چاہتا ہے اور جب اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو عالم الغیب والشہادۃ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہی حالتیں ہیں جو فرد پر گزرتی ہیں......" [۲۴]

اس طرح دونوں نے دور از کار تاویلات کے سلسلے میں یکساں قسم کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جس طرح سرسید نے فرشتوں کو "قوائے ملکوتی" اور "قوائے مادی" کہا ہے بالکل اسی طرح شیخ صاحب نے بھی انہیں "قوائے طبیعی" یعنی NATURAL FORCES کے نام سے موسوم کرنے کی جسارت کر ڈالی ہے۔[۲۵]

اب نہیں معلوم کہ شیخ صاحب کے نزدیک "نیچریت" کا مفہوم آخر کیا تھا؟ محمد عبدہ کا دعویٰ تھا کہ وہ سلف و خلف دونوں کے مذاق کے مطابق تفسیر کرنا پسند کرتے ہیں۔[۲۶] چنانچہ اس مذاق کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ وہ کبھی اِس طرف ہو جاتے ہیں اور کبھی اُس طرف۔ تاکہ دونوں طبقوں کو مطمئن اور راضی رکھا جا سکے۔ بالفاظ دیگر ع

باسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام

غرض ان دونوں کی تفسیر اور ان کے خیالات نے امت اسلامیہ میں "تاویل"

۲۴۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: ۱/۲۴۔ ۲۵، ۱۹۶۴ء

۲۵۔ دیکھئے تفسیر المنار: ۱/۲۶۷۔ ۲۶۸۔

۲۶۔ ایضاً: ۱/۲۵۲۔

اور "ارتیابیت" کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے۔ اور اس بنا پر اب جس کے جی میں جو آیا وہ لکھنے لگا ہے۔ خصوصاً مصری علمار شیخ محمد عبدہ کے خیالات سے بُری طرح متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ خاص کر ان کے اس موقف سے کہ تخلیق آدم سے متعلق قرآن کی ظاہری آیات علم انسانی پر صرف اسی وقت تک مقدم رہیں گی جب تک کہ علم انسانی قطعیت کا درجہ حاصل نہ کرلے۔ اُن کی اصل عبارت یہ ہے:

فظواهر الآيات فی خلق آدم مثلاً مقدم فی الاعتقاد علی النظريات المخالفة لها من اقوال الباحثين فی أسرار الخلق وتعليل أطواره و نظامه ما دامت ظنية لم تبلغ درجة القطع" [۲۷]

(باقی)

---

[۲۷] تفسیر المنار: ۱/۲۵۲

ڈاکٹر ابو شادی

حیات اور شاعری

جناب ابوسفیان اصلاحی ۔ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

فرانسیسی حملے سے قبل مصر دن بدن ہلاکت سے قریب ہوتا گیا۔ تہذیب و تمدن اور علم و ثقافت کے میدان میں بہت پیچھے رہ گیا۔ اسے اپنی اس تباہی کا احساس بھی نہ تھا۔ لیکن اپنے وقار اور عزت نفس کا خیال اس وقت ہوا جب فرانسیسیوں نے مصر پر حملہ کیا۔ اس ضرب کاری نے انھیں خواب غفلت سے بیدار کیا، اب انھیں اپنے انحطاط کا احساس ہوا، اور ان اسباب کی طرف متوجہ ہوئے جن کی وجہ سے ان کے قدم متزلزل ہو رہے تھے، اب انھیں اپنی علمی گراوٹ کا بھی اندازہ ہوا چنانچہ ہندسہ اور علم طب کی طرف خصوصی توجہ دی، یورپین تہذیب سے بہت کچھ حاصل کیا، اسی زمانے میں ترجمہ پر دھیان دیا گیا۔ چنانچہ تنہا رفاعۃ الطہطاوی نے تاریخ، جغرافیہ، طب، نحو اور قانون میں بیسوں کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون پر بھی بارہ رسائل کا ترجمہ کیا۔[1]

ترجمہ کی یہ تحریک شعر و ادب میں بھی پیدا ہوئی۔ اس میں حصہ لینے والے لطفی السید

محمد السباعی، عادل زعیتر، خلیل مطران ، طٰہٰ حسین ، المازنی، حسن صادق، سامی الجریدنی، طانیوس عبدہ، فرح انطون، فتحی زغلول اور ان کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں۔ ان لوگوں کی انگریزی شعروادب پر بڑی گہری نظر تھی۔ ایک تو ترجمہ شدہ کتابوں کو پڑھا اور دوسرے براہ راست انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح عربی ادب کا دامن وسیع کرنے میں ان لوگوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان لوگوں کو جدید خیالات اور نئے احساسات کا علم تھا۔[۱]

یہی وہ دور ہے جس میں ڈاکٹر ابوشادی نے آنکھ کھولی، انیسویں صدی کے آخر ۹ فروری ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوا، اس کا تعلق قاہرہ کے قبیلہ "عابدین" سے تھا۔ اس کے والد ابوشادی بک وکیلوں کے صدر تھے جن کا شمار ممتاز لوگوں میں تھا۔[۲]

ابوشادی نے اپنی تعلیم کا آغاز قبیلہ "حنفی" کے اسکول "الہیاتم الاولیہ" سے کیا۔ اس کے بعد "عابدین" کے نرسری اسکول میں داخلہ لیا۔ ثانوی تعلیم مدرسہ "توفیقیہ" میں مکمل کی جو ایک Rasidencial School تھا اس میں داخلہ شاید اس لئے لیا تھا کہ اس کے والدین چل بسے تھے۔

والدین کے انتقال سے اسے مایوسیوں اور ناامیدیوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ بچپن میں ہی والد کے پیار اور ماں کی ممتا سے محروم ہوگیا۔ ان مایوسیوں کا اظہار جا بجا وہ اپنے اشعار میں کرتا ہے۔ ابوشادی کی شاعری کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ایام حیات بڑی دشواریوں سے گذارے۔

ڈاکٹر ابوشادی نے عربی کے ساتھ انگریزی ادب پر بھی بھرپور توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عربی و انگریزی دونوں ہی میں عبور پیدا کر لیا۔ جس کا ذکر اس نے "قطرۃ من یراع فی الادب والاجتماع" میں کیا ہے کہ میں نے دونوں زبانوں کا جم کر مطالعہ کیا اور بے شمار مترجمہ کتب پر بھی گہری نظر ڈالی۔ مطالعہ کے دوران جو

افکار و آرا میں انھیں منظوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔[۵]

ابو شادی نے انگلینڈ کا سفر کیا اور وہاں پر ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی۔ اب اسے ایک نئی تہذیب کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ خود اپنی بیوی سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔ وہاں کے عالم و فاضل لوگوں سے دوبدو گفتگو کرنے کے مواقع بھی ملے۔ "حرکۃ التجدید" کے مصنف نے اس کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

انگلینڈ کے بیس سالہ قیام کے دوران وہاں کی تہذیب و تمدن اور بود و باش کا بڑا گہرا جائزہ لیا اور ایک انگریز لڑکی سے شادی کر کے بھی اس نے بہت کچھ سیکھا لیکن جب ۱۹۴۶ء میں امریکہ کا سفر کیا تو وہ مر چکی تھی۔ اس سفر کی وجہ سے اس کے یہاں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ عالم و فاضل لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور براہ راست انگریزی کے مصادر و مخارج سے مستفیض ہوا۔[۶]

ڈاکٹر ابو شادی کے والد محترم برابر شعر و ادب کی طرف توجہ دلاتے رہتے جس کی وجہ سے اس کی بعض قدیم عربی کی نوادرات تک رسائی ہوئی۔ والد محترم کے ساتھ علمی مجالس میں بھی شریک ہوتا۔ انھیں مجلسوں میں حافظ اور شوقی بھی ہوتے، حافظ اور شوقی سے ابو شادی کے گھریلو تعلقات تھے۔ ابو شادی کے والد نے حافظ کی وکالت میں رہنمائی کی۔ اس حیثیت سے حافظ ان کا شاگرد ہوا۔

ابو شادی نے ان مجالس کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے: "میرے استاذ مطران نے حافظ سے کہیں زیادہ متأثر کیا۔ میرے گھر پر اکثر اہل علم و ادب کا اجتماع ہوتا، میں بڑے شوق سے ان لوگوں کی باتیں سنتا۔ ان مجالس نے مجھے بہت کچھ عطا کیا۔ ان میں السید محمد، رشید رضا، جرجی زیدان، ابراہیم الیازجی، شبلی شمیل، محمد لطفی جمعہ، محمد المویلحی، سعد زاغلول، یعقوب صروف، احمد زکی، السید محمد البیلاوی، مفتی ناصف، محمود واصف، حمزہ فتح اللہ، محمد فرید، محمد کرد علی، عبد القادر المغربی، عبد الفتاح اور ان کے علاوہ اور

بھی بہت سے دوسرے" ابوشادی نے اپنے ادبی فکر کی نشوونما میں ان تمام لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن دراصل اپنا خصوصی رہنما اور استاذ مطران کو تسلیم کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ استاذ مطران کی نظر ادب کے میدان میں بہت وسیع تھی اور جدید عربی ادب پر انھیں خاصا عبور تھا۔[۷]

انگلینڈ کے دس سالہ قیام کے دوران اس نے جراثیم میں تخصص کیا۔ ادب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کا مختلف تنظیموں سے گہرا ربط رہا۔ اسی دوران اس نے میگزین "عالم النحل" کی بنیاد ڈالی۔ اور "جمعیۃ آدب اللغۃ العربیۃ" کا سکریٹری رہا جسے ایک مستشرق مرجلیوث نے قائم کیا تھا۔ اس طرح مغربی ادب کا مطالعہ کیا اور مغربی تحریکوں سے واقف ہو گیا۔[۸]

اس کے علمی سفر کا آغاز اس طرح ہوا کہ مصر آنے کے بعد اس نے فروری ۱۹۲۳ء میں "نادی النحال المصری" کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کی طرف سے ایک جلسہ ہوا اور اس میں شوقی کا قصیدہ "مملکۃ النحل" پیش کیا گیا۔ مقررین میں محمد لطفی بھی تھے جنھوں نے مختلف علمی اور طبی و ادبی رسائل کا ذکر کیا۔ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر ابوشادی کے والد محترم کا انتقال ہو گیا، معاً بعد اس کی والدہ بھی رخصت ہو گئیں۔ وہ وقت دوسری جنگ عظیم کا تھا جب ابوشادی انگلینڈ میں تھا۔ اس نے ایک مرثیہ کہا جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

امكيك من قلبي الحزين طويلاً	واظل يحسبني الوفاء بخيلاً
وتفيض من غالي الرثاء جراحي	فبومن التاريخ فيك جليلاً
بل جيل انشاي سطعن على الجدى	شرفاً وحيرن الممات ضئيلاً

مصر واپس آنے کے بعد ابوشادی نے ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے بہت سے قصائد کتابی شکل میں یا مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔

کو، انجمنوں کی بنیاد بھی ڈالی ۔ اس کا پہلا دیوان "انداء الفجر" ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔
اس کے بعد دواوین پے بہ پے آتے رہے ۔ زینب (۱۹۲۴ء)، مصریات (۱۹۲۴ء)
انین ورنین (۱۹۲۵ء)، شعر الوجدان (۱۹۲۵ء)، الشفق الباکی (۱۹۲۶ء)، مختارات
وحی العام (۱۹۲۷ء)، اشعة و ظلال (۱۹۳۱ء)، الشعلة (۱۹۳۲ء)،
اطیاف الربیع (۱۹۳۳ء) اغانی ابی شادی (۱۹۳۳ء) الکائن الثانی (۱۹۳۴ء)
الینبوع (۱۹۳۴ء) شعر الریف (۱۹۳۵ء)، فوق العباب (۱۹۳۵ء)،
عودة الراعی (۱۹۴۲ء)، من السماء (۱۹۴۹ء)۔

ان کے علاوہ کچھ قصائد الگ سے شائع ہوئے مثلاً ذکری شکسپیر، مصطفی نعیم
نکبة نافارین، الیوم، وطن الفراعنة وغیرہ ۔ ابوشادی نے شکسپیر، عمر خیام اور
شیرازی سے بہت کچھ استفادہ کیا ۔ اب بھی اس کے کچھ دیوان غیر مطبوعہ ہیں
مثلاً ایزیس، النیر، ذوالحر، اناشید الحیاة اور انسان الجدید وغیرہ ۔ یہ دیوان
جدید عربی شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

یہ بات تو عربی ادب کے ناقدین کو تسلیم ہی ہے کہ ابوشادی نے جدید عربی شاعری
کو نئے اسالیب اور نئے افکار عطا کئے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی شاعری
کی اور اس کے انگریزی کے دونوں دیوان امریکہ سے شائع ہوئے ۔ ایک کا نام
Song of Joy and Sorrow اور دوسرے کا Song of Nothing Near
ہے۔

ابوشادی نے چھ ادبی و ثقافتی انجمنوں کی بنیاد ڈالی ۔ جماعة ابولو، جماعة الادب
...، مملکة النحل، رابطة الادب الجدید، الاتحاد المصری لتربیة الدجاج، جمعیة
صناعة الزراعیة[9]

۱۹۴۶ء میں ابوشادی ولایت متحدہ امریکہ پہنچا اور ۱۹۵۵ء میں وہیں اس کا

انتقال ہوگیا۔ جوانی اور بڑھاپے کے زمانے میں یکساں طور پر اس نے عربی اور غیر عربی اخبارات کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنائے رکھا۔ اس کے ماسوا ہر ہفتہ میں دوبار وائس آف امریکہ سے اس کی آواز کائنات کی فضائے بسیط میں سنائی دیتی۔ انسانی حقوق کی بین الاقوامی کونسل کا اسے ممبر چنا گیا۔ امریکہ کی ادبی انجمنوں اور ثقافتی اداروں نے عربی ادب پر تقریریں کرنے کے لئے اس کو مدعو کیا اور جس طرح اپنے وطن میں آفتاب کے دیوتا کے نام پر جماعت اپولو قائم کی تھی اور اس کے ادبی اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لئے اسی کے نام سے ایک ادبی رسالہ "اپولو" ۱۹۳۲ء میں جاری کیا تھا۔ امریکہ میں بھی اس نے یونان کی علم ودانش کی دیوی منیروا (Minerva) کے نام سے "منروا یونین" نامی ایک شعری اور ادبی انجمن کی بنیاد رکھی۔[۱]

شاعری

جدید ترین عربی شعراء میں ڈاکٹر ابو شادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس نے پوری زندگی شعر و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ وہ بے شمار دواوین کا مالک ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں ہر ممکن نئے احساسات اور جدید تقاضوں کا خیال رکھا ہے، اس کے یہاں عصری حسیات موجود ہیں۔ قدرت نے اسے زبردست قوت مشاہدہ (Keen observation) عطا کی تھی۔ جہاں وہ ایک ادیب و شاعر تھے وہیں ایک سائنس داں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غور وخوض میں گہرائی تک جا پہنچتا۔ دیکھا جائے تو جدید عربی شاعری کی پہلی قیادت و سیادت اسی کے حصہ میں آئی۔ محمد عبدالمنعم نے صحیح کہا ہے:

"بارودی نے جدید عربی شاعری کی فضا ہموار کی۔ بارودی کو جدید شاعری کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت جدید شاعری کی

قیادت وسیادت عقاد، مازنی اورشکری کے ہاتھوں آئی اور اس کو تیز سے تیز تر اور جدید شاعری کو زندہ و جاوید کرنے والا ڈاکٹر ابو شادی ہے۔ اس کی تحریک "اپولو" کا اس باب میں اہم رول ہے جس کی وجہ سے شعرا تنگنائیوں سے باہر آئے، انھیں حریت و آزادی ملی، اب وہ نہایت بے باکانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔"[۱۱]

ابو شادی کو بچپن ہی میں انگریزی سے کافی واقفیت ہو گئی تھی، بہت سی تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب وہ تیرہ سال کا تھا تو باقاعدہ ادبی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا، اپنے باپ کی وجہ سے اسے عظیم کتابوں اور عظیم لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے۔ والد محترم کی مجلسوں میں علمی موضوعات پر مباحثے بھی سنے۔ انھیں تمام چیزوں کے سبب اسے اوائل عمر ہی میں "امہات الکتب" سے واقفیت ہو چکی تھی۔ اس کے پہلے قصیدے کا عنوان "عہد الصبا وعصر الشباب" تھا۔ اس کے تین اشعار:

نشأت وقلبي يصبو لك — والى وبيت على حبك
ونضك ادري واد عالما — نجالج لبي لدى ذكرك
وكنت قديما وعهد الشباب — تخالينه ليس بالله الك[۱۲]

جدید شاعری اپنے واضح انداز میں ابو شادی کے یہاں آغاز ہی سے نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ذہن میں حریت و آزادی تھی۔ قدیم شاعری کے مطالعہ کے درمیان اسے جو چیزیں سودمند لگیں اسے اپنا لیا۔ لیکن اس کے اسلوب و منہج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جیسا کہ مطران اور شکری کے علاوہ معاصرین شعرا اپنائے ہوئے تھے، اس کے تمام قصائد جدید رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس کے اثرات شعرا کے دواوین اور محافظین شعرا کے یہاں نظر آتے ہیں۔[۱۳]

یہ بات حقیقت سے بہت قریب ہے کہ جدید شاعری کو آگے بڑھانے

میں تین حضرات کلیدی حیثیت کے حامل ہیں، یہی جدید شعراء کے امام ہیں۔ ان میں پہلا نام مطران، دوسرا عبدالرحمٰن شکری اور تیسرا ڈاکٹر ابوشادی کا ہے عقاد اور مازنی ان تینوں سے پیچھے رہے۔ ابوشادی کی جدت و ندرت کا اندازہ اس کے دواوین کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔ شوقی کے بعد گیارہ سال تک جدید شاعری لاپتہ رہی۔[۱۴]

ڈاکٹر ابوشادی کے نئے احساسات اس کے لئے باعث ضرر ثابت ہوئے۔ مصر کے اس حلقہ نے جو قدیم خیالات سے بری طرح چمٹا ہوا تھا اور اسی کو ادب کا قیمتی ذخیرہ سمجھتا تھا، ہر طرح سے ابوشادی کو ذہنی گزند پہنچائی۔ جس کا اظہار استاذ محترم ڈاکٹر اشفاق صاحب ندوی نے اس طرح کیا ہے:

"مصری شاعر ابوشادی کے امریکہ جانے کی کہانی خود اس کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے کہ اسکندریہ یونیورسٹی میں وہ ایک اچھی پوسٹ پر تھا۔ رجعت پسندوں اور اس سے جلنے والوں نے اس کو پریشان کرنا شروع کردیا اور ان رجعت پسندوں کی خوشنودی کی خاطر ناشرین اس کی تخلیقات سے اغراض کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ایک حساس انسان کے جذبات کچلنے کے لئے یہ بہت بڑی چیز تھی۔ ان حالات سے مجبور ہوکر ابوشادی کو امریکہ کے لئے رختِ سفر باندھنا پڑا۔"[۱۵]

ابوشادی کے اندر یہ سب تبدیلیاں کیسے آئیں؟ اسے نئے خیالات کا اندازہ کیسے ہوا۔ اس نے قدیم اور روایت پرستی سے بغاوت کیوں کی؟ بات یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں اس نے اپنے والد کی میگزین "الظاہر" میں لکھنا شروع کردیا تھا۔ بچپن ہی میں اسے عربی و انگریزی ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ بچپن ہی میں "اغانی" اور The international Library of famous literatu کا مطالعہ کرچکا تھا۔ وہ پابندی سے معروف کتب خانہ "خدیویہ" جایا کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ

اسے انگریزی کی مایۂ ناز کتاب Oxford Lectures on poetry بھی پڑھنے کو مل گئی۔[۱۷] ان تمام کتابوں نے اس کے ذہن وقلب پر گہرے اثرات ڈالے اور بہت تیزی سے اس کے اندر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت پسند حلقہ ابوشادی کے خلاف سینہ سپر ہوگیا۔

ان تبدیلیوں کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابوشادی کی زندگی کا بیشتر حصہ انگلینڈ اور امریکہ میں گزرا۔ اس کی زندگی کے چار مرحلے ہیں:

(۱) مصر میں ۱۸۹۲ء سے ۱۹۲۲ء تک
(۲) انگلینڈ میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک
(۳) دوبارہ مصر میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۶ء تک
(۴) امریکہ میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۵ء تک

ان مراحل کی وجہ سے اس کے اندر بڑے تغیرات آئے۔ ان مراحل اور نشیب فراز سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔

عباس محمود العقاد، مازنی اور شکری اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے راہیں ہموار کر چکے تھے۔ ابوشادی کا تعلق بھی اسی قبیل سے تھا۔ اس نے عربی ادب کی تمام تحریکوں سے استفادہ کیا۔ انگریزی ادب میں مہارت تامہ پیدا کرنے کی وجہ سے اس کی شاعری کا رنگ یکسر تبدیل ہوگیا۔ شاعری میں نئے تجربات کئے۔

اس کی شاعری میں درج ذیل چیزیں ملتی ہیں:

(۱) بحور وقوافی میں تنوع اور جدید اوزان کا اضافہ
(۲) اشعار کے ترجمے
(۳) آزاد اور نثری قصائد
(۴) ڈرامائی قصائد

(۵) جدید الفاظ کا اضافہ اور نئی تراکیب کا اختراع[۱۸]

ان تمام چیزوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ احساسات میں تبدیلیاں لایا وہیں اس نے عربی شاعری کے Structures کو بھی بدلا۔

عربی شاعری میں آزاد نظموں کی بنیاد احمد فارس الشدیاق نے ڈالی لیکن بہت ہی تھوڑے اشعار کہے۔ عبدالرحمن شکری نے بھی قافیہ سے بغاوت کی۔ اس طرح آزاد شاعری کی بنیاد پڑ گئی۔ بعد میں اسی نقش قدم پر مازنی اور فرید ابوحدید بھی چلے فرید کی آزاد نظم "مقتل عثمان" ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آئی۔

لیکن اس کو بحیثیت ایک صنف شاعری کے متعارف کرانے میں ابو شادی کا کارنامہ ہے۔ اس کا دیوان "الشفق الباکی" جو ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آیا جو اکثر آزاد شاعری پر مشتمل ہے۔ "صلوۃ اللیل" (ص ۷۲۱)، "نلبتة" (ص ۸۰۳) "مملکۃ ابلیس" (ص ۱۰۲۳) "ممنون الفیلسوف" (ص ۶۲۵) "الصرصرد" (ص ۱۱۰۰) "انا وغیری" (ص ۳۵) آزاد نظمیں ہیں۔ اور "مختارات وحی العام" جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا اس میں بھی بے شمار آزاد نظمیں ہیں۔ اس طرح آزاد شاعری کا کافی ذخیرہ اس کے یہاں موجود ہے۔[۱۹] اس طرح دیکھا جائے تو آزاد شاعری کا اصل بانی ڈاکٹر ابوشادی ہی ہے۔ اس نے آنے والے شاعروں سے آزاد شاعری کو منوالیا۔ شعراء آزاد شاعری سے مانوس ہو گئے۔

جدید شاعری میں رومانوی تحریک کا بانی بھی ڈاکٹر ابوشادی ہے۔ اس باب میں اس کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ "دراسات فی ادبنا الحدیث" کی یہ عبارت ملاحظہ کریں:

"دونوں عالمی جنگوں کے درمیان جو وقفہ ہے اسی میں رومانوی تحریک وجود میں آئی۔ سب سے پہلے مہجری ادباء نے اس کی طرف توجہ

مبذول کی۔ ایلیا ابو ماضی اور اپولو تحریک نے اس طرف پیش قدمی کی جس میں سر فہرست ابو شادی کا نام ہے، اب ہر طرف رومانوی تحریک کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ تقلیدی ادب کی دیواریں مسمار ہو گئیں۔ دوسری جنگ کے وقت یہ تحریک شباب پر تھی۔ اس میں ابو شادی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بڑے جتن کئے۔

ڈاکٹر ابو شادی عشق و محبت کا پتلا تھا۔ اس کی رگ و پے میں خون عشق موجزن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مصر اور دوسرے ممالک میں وہ حسن و جمال کا متلاشی رہا۔ یہ جذبہ اس کا آخر وقت تک قائم و دائم رہا۔ درج ذیل اشعار اس کے اسی خیال کے ترجمان ہیں:

الرعد صوتك أم حديث دفاق — قد بدلته برادة الاشراق

سادت طويلاً في جفاء طارة — وهنيهة منك في الاشراق

تهدا امواج بعثت كانها — للعاشقين مصارع العشاق

ابو شادی کے عشق و محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ اوائل عمر ہی سے وہ عورتوں کے تقدس اور احترام کا قائل تھا۔ یہاں تک کہ "وحدۃ الوجود" کے مسلک میں اس نے عورت کو الوہیت کا درجہ دیا۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں اس نے یہ اعلان کیا کہ عورتوں کا احترام کیا جائے کیونکہ روحانی اور جسمانی اعتبار سے وہ مقدس ہیں۔ انھیں حقیر، مبتذل اور گری ہوئی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اخلاق و عادات بگڑتے ہیں اور جنسیات کے امراض ہو جاتے ہیں۔

عورت بنی نوع انسان کا ایک اہم جزو ہے، وہ اس کے شعور میں بس جاتی ہے چنانچہ جب قاہرہ چھوڑ کر اسکندریہ آگیا تو اسے اپنی بیوی "زینب" بہت یاد

آرہی تھی۔ اس باب میں یہ اشعار ہ

ودعتنی تودیع حلم خاطف ودخلت للبلد الجمیل وداع
ومن حدث القلب الفیود فانہ ضرب الضلوع تطلعا وامباع
لم ادرمن اُرقی ولوعة وحشتی معنی الی فسر الابنساع
یاغربتی دانا المقیم بموئل کالسجن الفته تزید جفاء[۲۲]

ابوشادی کی زندگی کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کی زندگی رنج وغم اور آلام ومصائب سے پر ہے۔ ایک تو والدین کا انتقال، دوسرے رجعت پسندوں کے حملے اور تیسرے بیوی کا انتقال۔ اس طرح وہ زندگی سے بیزار ہوگیا۔ وہ اپنی بیزاری کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

ویلی من الدھر یبکینی ویبتسم ولا یرد عوادی جودہ القسم
قد عد شر ذنوبی مایفیض بہ قلبی الی الناس من حب ویزدھم
املل دمعی دماء العین مضطرم وھاج وجدی وسخط القلب محتدم
سخرت من بیئتی لما مرمت بھا ونحت لکن نواحی کلہ کرم[۲۳]

ابوشادی کی شاعری ان موضوعات پر مشتمل ہے وصف، وطن، قوم، تامل، وجدان اور ان کے علاوہ بعض خاص موضوعات پر۔[۲۴]

حواشی ومصادر

۱۔ ڈاکٹر کمال نشأت، احمد زکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث، وزارۃ الثقافۃ، دار الکاتب العربی الحدیث للطباعۃ والنشر بالقاہرہ سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۸ — ۹ -

۲۔ ایضاً ص ۱۲ -

ـ ایضاً ص ۱۶ـ

ـ ایضاً ص ۱۷ـ

ـ ایضاً ص ۲۱ـ

ـ ایضاً ص ۱۵۹ـ

ـ ایضاً ص ۲۵ـ

ـ عبدالعزیز الدسوقی، جماعۃ ابولو واثرہا فی الشعر الحدیث، معہد الدراسات العربیہ العالیہ ۱۹۶۰ء ص ۱۴۰ـ

ڈاکٹر کمال نشأت، احمد ذکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی، وزارۃ الثقافۃ دار الکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ ۱۹۶۷ء ص ۴۴ـ۴۵

ـ ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، امریکہ میں شعر وادب کا ارتقاء، نیشنل آرٹ پریس الہ آباد ۱۹۸۳ء ص ۲۵۵ـ

ـ عبدالعزیز الدسوقی، جماعۃ ابولو اثرہا فی الشعر الحدیث، معہد الدراسات العربیہ العالیہ ۱۹۶۰ء ص ۵۹۱ـ

ـ ڈاکٹر کمال نشأت، احمد زکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث، وزارۃ الثقافۃ دار الکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ ۱۹۶۷ء ص ۱۰۶

۱ـ ایضاً ص ۲۹۳

۱ـ ایضاً ص ۳۰۱

۱ـ ڈاکٹر اشفاق احمد، جدید عربی ادب کے ارتقاء میں مہجری ادباء کی خدمات، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۲۷۲ـ۲۷۳

۱ـ محمد یوسف کوکن، اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث، دار حافظۃ للطباعۃ والنشر مدراس، ج ۳ ص ۱۹۴ـ

۱۷۔ عبدالعزیز الدسوقی، جماعۃ ابولو واثرہا فی الشعر الحدیث، معہد الدراسات العربیہ العالیہ، سنہ ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۳۔

۱۸۔ محمد المنعم خفاجی، الشعر والتجدید، رابطۃ الادب الحدیث، ص ۳۹

۱۹۔ ڈاکٹر کمال نشأت، احمد زکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث وزارۃ الثقافۃ، دارالکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ سنہ ۱۹۶۷ء ص ۲۳۲

۲۰۔ یونس عوض، دراسات فی ادبنا الحدیث (المسرح، الشعر، القصۃ) دارالمعرفۃ شرکۃ ذات مسئولیۃ محدودۃ ۱۵ شارع صبری ابوعلم (جامع چرکسی) القاہرہ سنہ ۱۹۶۱ء ص ۲۰۹۔

۲۱۔ احمد الشائب، ابحاث ومقالات، مکتبۃ النہضۃ المصریہ ۹ شارع عدلی بالقاہرہ۔

۲۲۔ ڈاکٹر کمال نشأت، احمد زکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث وزارۃ الثقافۃ، دارالکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ سنہ ۱۹۶۷ء ص ۲۳۲۔

۲۳۔ ڈاکٹر ماہر حسن فہمی، تطور الشعر العربی الحدیث فی مصر ۱۹۰۰ — ۱۹۵۰، ملتزم الطبع والنشر مکتبۃ نہضۃ مصر بالفجالۃ، ۱۸ شارع کامل صدقی ص ۱۹۰

۲۴۔ احمد قیش، دارالجیل بیروت لبنان ۱/۶/۱۹۷۱ء تاریخ الشعر العربی الحدیث ص ۲۴۰۔

ابو جہاد کا قتل

صہیونی دہشت گردی کا ایک اور شرمناک مظاہرہ

جناب محمد اظہر صدیقی اینڈ وعرب پریس فیچرس انٹر نیشنل

یہ حقیقت اب کھل کر دنیا کے سامنے آ گئی ہے کہ تیونس میں فلسطینی لیڈر خلیل الوزیر ابو جہاد کا سفاکانہ قتل اسرائیلی حکومت کی معروف دہشت گردی، درندگی اور قانون و انصاف کے تقاضوں کو مسلسل پامال کرتے رہنے کی اس کی بے شرم اور ننگی جارحانہ ذہنیت کی بدولت ہوا ہے اور تل ابیب میں اسرائیلی کابینہ کے اہم وزیروں، فوجی کمانڈروں اور اہم شاطر یہودی دہشت گردوں کی ملی بھگت اور منصوبہ بند طریقہ سے تیار کی ہوئی سازش کے بعد ہی یہ جرم عظیم کیا گیا ہے جس نے ہر قلب و ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ آج کی نام نہاد ترقی یافتہ دنیا میں کسی بین الاقوامی ضابطہ، کسی آئین، کسی تمدن اور قانون کا وجود ہے یا نہیں؟

ساری دنیا چیخ اٹھی، بین الاقوامی ادارے دم بخود اور مختلف تنظیمیں ہکا بکا رہ گئیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ دہشت گردی، قانون شکنی، جارحانہ توسیع پسندی کی گھناؤنی ذہنیت کی کوکھ سے جنم لینے والی بدنام زمانہ اسرائیلی حکومت ساری دنیا کے ضابطوں، اصولوں اور روایات کو مسلسل پامال کرتی چلی جا رہی ہے لیکن وہ امریکہ ـــــ جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو جمہوریت کا جنم داتا، تہذیب و تمدن

کا امام اور دہشت گردی کا سب سے بڑا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسرائیل کے ہر قہر وستم، ہر جابرانہ حرکت اور ہر اس عمل کی پشت پناہی کرتا ہے جس کی بدولت بین الاقوامی قوانین، اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر اور دنیا میں امن وامان قائم کرنے کی غرض سے بنائے جانے والے ضابطے ایک بھونڈا مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔

بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھنے والا، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سکیورٹی کونسل کی کارروائیوں کی تفصیلات اخبارات میں غور سے مطالعہ کرنے والا ہر باشعور اور ذی ہوش انسان جانتا ہے کہ یہ امریکہ اور صرف امریکہ ہی ہے جس کی بے جا حمایت، ناجائز تائید اور غیر منصفانہ بلکہ بے شرمانہ سرپرستی و پشت پناہی کی بدولت اسرائیلی حکومت کی ڈھٹائی، فرعونیت، سفاکی اور بربریت اپنی حدود سے بہت آگے نکل آئی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ اسرائیل کے ہر جابرانہ عمل کے پیچھے بلکہ برابر میں امریکہ کھڑا نظر آتا ہے۔ اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ بین الاقوامی دہشت گردی، معصوم بچوں کے قتل عام، عورتوں اور ضعیفوں کی ہلاکت، عمارتوں کی تباہی وتاراجی کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کی ذمہ داری سے دنیا کی یہ بڑی طاقت اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کر سکے ——؟

سب سے بڑا دکھ اور افسوس تو خود اپنوں پر، اپنے حالات، اپنی صفوں میں پھیلے ہوئے انتشار پر ہوتا ہے، ساری دنیا کے عرب اور مسلمان ان ظالم وجابر درندوں کو سبق نہیں دے سکتے ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے کیونکہ ان کی صلاحیتیں ان کی توانائیاں سب کی سب آپس کی جنگ اور باہمی اختلافات کی نذر ہو کے رہ گئی ہیں۔

ہم اس کا یقین رکھتے ہیں کہ وحشت وبربریت و دہشت گردی اور قتل و

غارت گری کا یہ طوفان بلاخیز آگ اور خون کا یہ سمندر، یہ آتش و آہن کی بجلیاں اور آندھیاں آزادی، حریت اور انقلاب کی اس روشنی کو ختم نہیں کر سکتیں جو اس وقت فلسطین کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے جیالے اور بہادر انسانوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے اور نہ جذبات کا وہ طوفان اب کسی طرح رُک سکتا ہے جو آزادی کے حسین خواب دیکھنے والوں کے قلب و روح میں جگہ بنا چکا ہے۔ تاریخ کے اس اٹل فیصلے اور قدرت کے اس قانون کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ظلم و جبر اور قہر و ستم کی جو لہر اسرائیلی حکمرانوں نے اپنا رکھی ہے اس کا نتیجہ خود ان کی تباہی و بربادی کے سوا دوسرا نہیں نکل سکتا۔ یہ ظلمتیں، یہ اندھیرے یہ تاریکیاں ہی ایک دن ایک نئے سویرے اجالوں کے جنم دینے کا ذریعہ بنیں گی۔

رات کے ماتھے پہ "موہوم ستاروں" کا ہجوم
صرف "خورشید درخشاں" کے نکلنے تک ہے

ابو حیان توحیدی

حیات و خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۳)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ابن سعدان کے دربار میں ابن سعدان بویہی خاندان کے مشہور خلیفہ صمـ
کے وزیر تھے۔ ان کا دربار علمار و فضلار، فلاسفہ و حکمار اور اطبار و سائنسدا
کا عظیم مرکز بنا ہوا تھا اور وہ اپنے درباری فضلار و حکمار کی کثرت پر فخر کر
کہتے ہیں:

"خدا کی قسم مملکت عراق میں اس کی نظیر نہیں ہے۔ یہ اہل فضل کے اعیا
دانشوروں کے سردار ہیں[۴۴]" ابوالوفا مہندس بھی ابن سعدان کے دربار میں ا
قابل ذکر مشہور و معروف شخص تھے۔ ابن سعدان سے ان کے مراسم اچھے
ابوالوفا حساب و انجینئرنگ کے شعبہ میں سند تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھوں
اس میدان میں بہت ساری نئی چیزوں کا ایجاد و انکشاف کیا۔ ریاضی و علم
پر ان کی کئی قابل ذکر کتابیں بھی موجود ہیں۔

ابوالوفا مہندس کی سفارش پر ہی ابن سعدان نے توحیدی کو اپنے مـ

میں شامل کر لیا۔ ابن سعدان نے ابوحیان کی صلاحیتوں کی قدر کی، اسے
م اور انعام واکرام دونوں ہی چیزوں سے نوازا۔ ابوحیان کی زندگی میں
یسا شخص ملا جس نے اس کے فن کی قدر دانی کی، اس کی کاوشوں اور
راہا۔ چنانچہ ابوحیان بھی ابن سعدان کی سخاوت، خوش خلق، علم دوستی
ور بندہ پروری سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور دل کھول کر اس کی
یف کی۔[۴۵] ابوحیان نے ان کے لئے جاحظ کی "کتاب الحیوان" کی کتابت
ن کے موضوع پر "الصداقۃ والصدیق" نام کی ایک عمدہ کتاب تصنیف

عدان کی نوازشوں اور انعامات کے سائے میں پلتے ہوئے کچھ وقت بیتے
ر مصیبت کے بادل چھٹ گئے، پریشانیوں اور کلفتوں کے دن ختم ہو گئے
تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا چنانچہ محسن ابن سعدان بھی کسی وجہ سے ان سے
یا اور زمانے نے ایک بار پھر ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا، وہ ابن سعدان
، سے محروم ہو گئے۔ توحیدی نے ان کی خدمت میں جذبات واحساسات
موثر خط لکھا کہ شاید ان کی ناراضگی دور ہو جائے اور اس کی مالی مشکلات
ائیں۔ توحیدی نے اپنے محسن ابوالوفا کی خدمت میں بھی ایک خط
[۴۶]

اراضگی تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں ابن سعدان کی ابوحیان توحیدی
ا کا سبب دریافت کرنا مشکل ہے۔ اور یہ بات ہنوز تحقیق طلب ہے کہ
ن اس سے کیوں ناراض ہو گئے۔ مگر مورخین کا اندازہ یہ ہے کہ وجہ ناراضگی
ن کے ساتھ شبینہ محفلوں میں سیاسی سوالات و جوابات کے درمیان

وہ تنقیدی خیالات[۴۷] ہیں جو اس نے ابن سعدان کے سامنے مختلف درباری شخصیات کے متعلق ظاہر کئے تھے جو کس طرح ان متعدد شخصیات تک پہنچ گئے اور انھوں نے توحیدی کے خلاف ابن سعدان کے کان بھرنا شروع کئے، نتیجتاً توحیدی کو اس کی سرد مہری کا شکار ہونا پڑا۔[۴۸] ہوسکتا تھا کہ ابو الوفا کی کوششوں سے ایک بار پھر ابوحیان توحیدی اور ابن سعدان کے تعلقات استوار ہوجاتے، اور ان میں خوشگواری آجاتی مگر اسی اثنا میں ابن سعدان کو عبدالعزیز بن یوسف نے قتل کردیا اور خود کرسی وزارت پر قابض ہوگیا۔ اور برسر اقتدار آتے ہی ابن سعدان کے اصحاب و احباب کو پریشان کرنا شروع کیا اور توحیدی کا شمار بھی ابن سعدان کے قریبی اصحاب میں ہوتا تھا، انھوں نے ابن سعدان کی شبینہ محفلوں میں ابن یوسف کے اعمال و سرگرمیوں کو نقد و تنقید کا نشانہ بھی بنایا تھا لہٰذا اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ اگر ابن یوسف کو بغداد میں توحیدی کے قیام کی اطلاع مل جاتی تو وہ کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار ہوجاتا۔ چنانچہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ خاموشی سے بغداد سے فرار ہوگیا اور شیراز آکر باقی ماندہ زندگی گوشۂ عافیت میں گذاری۔

قیام شیراز کے دوران ابوحیان توحیدی نے اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ عرفان ذات اور ذکر الٰہی میں صرف کیا۔ اپنے زمانے میں رائج علوم فلسفہ اور تصوف کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور پھر اسی زمانے میں المقابسات، المحاضرات وغیرہ اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان تصانیف کا رنگ ان تالیفات سے بالکل علیحدہ ہے جو انھوں نے اس سے قبل جوانی کے زمانے میں لکھی تھیں۔

ناقدانہ ذہنیت ابوحیان توحیدی کی زندگی کا ایک نمایاں وصف عیب جوئی و تنقید نگاری تھا۔ توحیدی کو لوگوں کے عیوب نکالنے، ان کی کمزوریوں کا پتہ لگانے

ان پر تنقید کرنے پھران کے نقائص کو عوام میں پھیلانے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ یاقوت کہتا ہے "اللازم ستانه والتلب دکانه" مذمت کرنا تو اس کی فطرت میں داخل ہے اور مذمت کرنا اس کا خاص مشغلہ ہے[۳۰]۔ ابو حیان کو خود بھی اپنی اس کمزوری کا اچھی طرح احساس تھا۔ چنانچہ وہ معذرت کرتے ہوئے اپنے عیب کو تسلیم کرتا ہے۔ معاصرین کے درمیان ابو حیان کی یہ بری خصلت مشہور تھی۔ خود ابو حیان کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ اس کی تحریروں کے مطالعہ سے اس کا یہ نمایاں وصف کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ "مثالب الوزیرین" اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اس کے اندر ہجوگوئی، تنقیص، تنقید اور انتقام کی وہ انتہائی شکل ہے جس سے زیادہ عربی نثر نگاری میں توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر ابن العمید اور صاحب بن عباد کی شان میں کہے گئے تمام تر مدحیہ قصائد کو ایک طرف رکھ دیا جائے پھر بھی وہ ابو حیان توحیدی کے چند نقائص کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ نثری ہجوگوئی کے میدان میں ابو حیان سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ نثر کے اندر ہجوگوئی میں اس کا وہی مقام ہے جو شاعرانہ ہجوگوئی میں فرزدق و جریر کا۔

یہی وجہ ہے کہ ابو حیان توحیدی کے اپنے معاصر علماء کے ساتھ تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہ رہے بلکہ ان کے درمیان باہمی چپقلش اور عناد و مخالفت کی فضا برابر باقی رہی۔ ایسی بات نہیں کہ ابو حیان کے پاس ضمیر نہیں تھا یا وہ اخلاق کے اصولوں اور وقار و سنجیدگی سے ناواقف تھا، یا اسے مجد و شرافت اور عزت و کرامت کی قیمت کا اندازہ نہ تھا بلکہ زمانے کی ستم ظریفیوں اور ناکامیوں نے اسے ان پرخار وادیوں سے گذرنے پر مجبور کیا اور اس نے یہ راستہ اختیار کیا۔ اسے ایسے جاہل حکمران و سلاطین کی عنادت و دون عقلی پر رونا آتا تھا جن کے اندر خیر و شر کی تمیز، ہیرے اور پتھر کے فرق

اور شریف و رذیل کو پہچاننے کی صلاحیت نہ تھی ۔ اس نے انسان کی فطری کمزوریوں کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا ۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بظاہر ایک حریص اور لالچی انسان تھا ۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ دوسروں کے اندر جس عیب یا خرابی کی نشاندہی کرتا وہی خرابی اس کی اپنی ذات میں موجود ہوتی اور وہ اس کی اصلاح کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا ۔

(باقی آئندہ)

الکتاب ـــــ سیبویہ کا ایک عظیم کارنامہ

توقیر عالم فلاحی، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ عربی زبان و ادب کے سرمایہ میں جو قابل ذکر اضافہ عہد عباسی میں ہوا ہے اس کے مقابلے میں نہ تو پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد۔ چنانچہ یہ دور اسلام کا وہ زریں دور ہے جس میں مسلمان تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بام عروج پر پہنچ گئے اور انھوں نے تاریخ اسلامی کے ایوان کو کلچر و ثقافت اور علوم و فنون کے لحاظ سے درخشاں اور تابندہ بنا دیا۔

عروج و اقبال کے اس تابناک دور میں فتوحات کا سلسلہ بھی سیل رواں کی طرح بڑھ رہا تھا، ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ حکومت کی توسیع و استحکام کے لیے غیر عربوں کو عربی معاشرے میں ضم کر لیا جائے اور ان کے اندر سے احساس کہتری، مرعوبیت اور اجنبیت ختم ہو تاکہ مفتوحہ ممالک کے یہ غیر عرب لوگ عربوں کے شانہ بشانہ ہو کر عالم انسانیت کے قابل ذکر حصوں پر فتح و تسخیر کی کمندیں ڈال سکیں۔ یہی وہ غایت تھی جس کے حصول نے عربوں کو مہمیز کیا کہ کوئی ایسا فن وجود میں آئے جو زبان کی تعلیم و تعلّم میں معاون و مددگار ہو سکے۔ چنانچہ آٹھویں صدی عیسوی میں اس سمت میں عملی طور پر پیش قدمی ہوئی اور عربی گرامر کے دو مکتبۂ فکر وجود میں آئے۔ جنھوں نے بلا شک و تردید زبان عربی کی بقا و تحفظ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے اہم نمائندوں میں خلیل ابن احمد، ابو عبیدہ معمر بن المثنی، الاخفش، الاصمعی، الزجاج، کسائی، فراء، احمد ابو زکریا، المفضل الضبی اور ابن الانباری کا شمار ہوتا ہے۔

سیبویہ ــ میدان نحو کا شہسوار :

ان مکاتیب فکر کے ناموران نحو میں سیبویہ کا مقام بڑا ہی اعلیٰ اور ارفع ہے۔ خود اس وقت کا مشہور معاصر ادیب اور نحوی اس کی ذات سے اس قدر متاثر نظر آتا ہے کہ اس کی بلا کی ذہانت اور استعداد و صلاحیت نے اسے اس اعتراف حقیقت سے باز نہیں رکھا کہ نحو میں لوگوں نے اس جیسی کتاب نہیں لکھی۔ متقدمین اور متاخرین تمام کی نحوی کاوشوں پر الکتاب کی چھاپ نظر آتی ہے[۱] ابن خلکان لکھتے ہیں کہ سیبویہ متقدمین اور متاخرین دونوں سے نحو کے معاملے میں سبقت لے گیا[۲] ابو الطیب عبد الواحد اس کے علمی مقام کا تذکرہ اسی ایک جملے میں کرتے ہیں۔ " وھو اعلم الناس بالنحو بعد الخلیل "[۳]

شروع میں وہ حدیث و فقہ کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اسی سلسلے کی مشغولیت میں حماد بن سلمہ کے یہاں حاضر تھا اور اس کی املا کرائی ہوئی ایک حدیث رسول لکھ رہا تھا جس کی عبارت یہ تھی " لیس احدٌ من اصحابی الا و لو شئت لاخذت علیہ لیس ابا الدرداء " سیبویہ بول پڑا " لیس ابو الدرداء " ہونا چاہیے تو اس پر حماد نے کہا کہ دیکھو سیبویہ تم غلطی کر رہے ہو " لیس ابا الدرداء " ہی صحیح ہے۔ استاذ کی اس تلقین کا سیبویہ کی علمی زندگی پر بڑا اثر پڑا اور اس نے یہ عہد کر لیا کہ وہ ان قواعد و ضوابط کو سیکھے گا جن کی مدد سے غلطیاں درست ہو جائیں[۴] یہ واقعہ نحوی علم کی تحصیل میں سرگرم عمل ہونے کا محرک خاص بنا اور بصری مکتبہ فکر کے اہم ترین نمائندہ خلیل بن احمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مزید برآں یونس اور عیسیٰ بن عمر جیسے قابل نحویوں سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنے کشکول علمی کو بھرنے میں پیش پیش رہا۔

چونکہ خلیل بن احمد دبستان بصرہ کے ایک نامور استاذ اور اس دبستان کے

رکن رکین تھے اس لیے علم نحو کے شائقین موصوف کے پاس رہے اور بحیثیت تلامذہ رفاقت اختیار کرنے کو باعث اعزاز و افتخار سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ بے شمار علم کے پیاسوں نے علم و فکر کے اس ابلتے ہوئے چشمے سے سیرابی حاصل کی۔ نضر بن شمیل، علی بن نصر الجھضمی اور مورج السدوسی کا شمار وقت کے ان ممتاز علمار لغت و نحو میں ہوتا ہے جنھوں نے عربی زبان و ادب پر بڑا احسان کیا ہے لیکن ان تمام میں ممتاز اور نمایاں سیبویہ تھا جو میدان نحو کا عظیم شہسوار ثابت ہوا[۵]

الکتاب ۔ نحو کی ایک شاہکار تالیف :

یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ عرب علمار قابل قدر و احترام انھیں مصنفین کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے طویل عمر پائی ہو۔ سیبویہ کے فضل و کمال اور حذاقت و مہارت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی سنکافی ہے کہ کم عمر پانے کے باوجود اس کی تصنیف شرف قبولیت سے ہمکنار ہوئی۔ اس نے علوم عربیہ میں وسعت مطالعہ کا نچوڑ ایک ایسی تصنیف میں پیش کیا ہے جو قدیم تذکرہ نویسوں کے بقول ایک ہزار اوراق پر مشتمل ہے اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دبستان بصرہ کی جو علمی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اُسے ہمیشہ عربی نحو کے مطالعے میں بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے[۶]

درحقیقت بات یہ ہے کہ اس کتاب کا نام بذات خود سیبویہ نے نہیں رکھا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سیبویہ نے اپنے منظم ارادے کے تحت اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچایا ہو اور اس کی موت واقع ہو گئی ہو۔ علی نجدی نے بھی اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تزئین و آرائش سے متعلق دوسرے مباحث کا نقشہ ذہن میں رہا ہوگا اور اس نے یہ سوچا ہوگا کہ اس سے فراغت کے بعد ہی نام رکھا جائے گا۔ بس اس کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے کسی کو پڑھ کر

سنایا نہیں اور نہ ہی اس کے سامنے کسی نے پڑھا[۷]

بہرحال اس کی موت کے بعد ہی علماء کے اتفاق رائے سے اس کتاب کا "کتاب" رکھا گیا اور اس کے ساتھ کوئی صفت یا اضافت نہیں تھی۔ پھر بعد میں یہ علماً "الکتاب" کے نام سے معروف ہوگئی تاکہ دوسری کتابوں میں اور سیبویہ کی اس کتاب میں فرق و امتیاز روا رکھا جا سکے[۸] اس کتاب کے اندر نہ ہی مقدمہ ہے نہ ہی خاتمہ۔ یہاں تک کہ ترتیب وغیرہ کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز کلمہ کی وضاحت سے ہوا ہے اور اختتام "علماء بنو فلان" نامی باب پر[۹] مقدمہ، خاتمہ اور ترتیب نہ ہونے کے باوجود عربوں نے ہمیشہ اسے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا ہے کہ صاحب "الکامل" نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ علم میں کوئی کتاب جو اس کے مثل ہو اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دوسرے علوم کی تمام کتابیں دوسری کتابوں کی محتاج ہوتی ہیں اور سیبویہ کی کتاب دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز ہے[۱۰]۔ علی نجدی اس کتاب کا تعارف ان عبارتوں میں کرلیتے ہیں۔ کان کتاب سیبویہ فی النحو کان ھو وحدہ الحقیق فی — ایھم ان یسمیٰ بالکتاب اما غیرہ فلا ینبغی ان یسمّٰی بہ الّا علی ضربٍ من التجوز او المجاملۃ۔

ترجمہ: لوگوں کے خیال میں سیبویہ کی کتاب ہی حقیقی معنوں میں نحو کی کتاب ہے جو الکتاب سے موسوم ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی کتاب کو الکتاب کے نام سے موسوم نہیں کیا جانا چاہیے۔

الکتاب ہی صرف نحو کی کتاب ہے در اصل ایسا نہیں ہے۔ ہاں اس کے عمق و وسعت اور نحو کے باب میں ہمہ گیریت کو پیش نظر رکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس فن میں اس کے مثل کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ وسعت معلومات کے لیے ہر شخص مجبور ہے کہ وہ اس کتاب کی طرف رجوع کرے۔ یہاں ہم اس کتاب کے مقام و مرتبہ سے متعلق کوئی

تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ آگے چل کر موقعہ آئے گا کہ علماء عظام اور خود سیبویہ کے ہمعصر ساتھیوں کے بیانات کی روشنی میں اس کتاب کی دقعت واضح کی جائے یہاں تو اس کتاب کا ایک مختصر تعارف مقصود ہے کہ دراصل یہ کتاب وہی ہے جو سیبویہ کی وفات کے بعد اس کے استاد الاخفش کے ذریعہ نظرثانی شدہ ایڈیشن کی شکل میں منظر عام پر آئی اور الکتاب کے پروقار نام سے معروف ہوئی۔ اس کتاب میں بیشتر ابواب ہیں اور ہر باب ذیلی عناوین کے ذریعہ اس طرح شرح وبسط کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ طالب العلم اکتائے بغیر نحوی ذوق تجسس کی پیاس کو بجھاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور علم کے اس دریا میں غوطہ زنی کرتے ہوئے گوہر مراد حاصل کر لیتا ہے۔

خصوصیات - ایک نظر میں

اس شاہکار تصنیف کی متعدد خصوصیات ہیں جن کی بناء پر یہ کتاب پورے مشرق و مغرب میں شہرت و احترام کی شاہراہ پر آ کھڑی ہوئی۔ یہاں چند خوبیوں کا تذکرہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے تاکہ مخاطب یا قاری اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکے۔

۱:۔ سیبویہ اس امر کو قابل ترجیح سمجھتا ہے کہ اس کی گفتگو تفصیلی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر باب کی ہر شق پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے۔ اس کے مباحث مربوط ہوتے ہیں، ان کے اندر کسی طرح کا اضطراب نہیں پایا جاتا۔ فقرے اس حد تک ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں گویا کہ ایک دوسرے میں پیوست ہیں ان خوبیوں کی بناء پر سامع یا قاری کے سامنے کوئی گوشہ تشنہ توضیح نہیں رہتا اور پھر دوسرے مسئلے پر گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔

۲: کہیں وقفہ یا ٹھہراؤ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ قاری خاتمہ باب تک پہنچ جائے کسی نئے باب کو موضوع بحث بنانے کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

واعلم ان الامر کذا وکذا۔ کہہ کر صاحب کتاب باخبر اور ہوشیار کرنا چاہتے ہیں کہ گفتگو کے نئے مرحلے سے سابقہ پیش آرہا ہے۔

۳:۔ اس کی عبارتوں میں اس لحاظ سے تفاوت ہے کہ کہیں وہ صبح درخشاں کے مثل پیچ اور واضح ہیں اور کہیں وہ طلسماتی بن کر رہ جاتی ہیں جہاں عقل حیران ہو جاتی ہے اور قاری عاجز و درماندہ رہ جاتا ہے۔

۴:۔ بہتیرے الفاظ ایسے ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے دوسرے توضیحی الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مبرد کا شاگرد رشید ابن کیسان کہتا ہے سیبویہ کی کتاب پر غور وخوض کے بعد پایا کہ وہ شایان شان مقام پر ہے۔ نیز اس کے الفاظ دوسرے الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ کتاب اس وقت منظر عام پر آئی ہے جبکہ تصنیف وتالیف کے میدان میں الفاظ کے استعمال کا یہی طریقہ مروج تھا۔ سیبویہ نے بھی دوسروں کا خیال کر کے اپنی تالیف میں یہ نہج اختیار کیا۔

مذکورہ بالا چوتھی اور پانچویں باتیں بظاہر کسی بھی کتاب کی قدر وقیمت کے خلاف نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز تصنیف وتالیف کے نقص پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی کسی عیب یا خامی کی نشاندہی پر۔ بلکہ کہیں شرح و بسط اور کہیں ایجاز و اختصار سے کام لینا، کہیں غموض و ابہام اور کہیں وضاحت وتبیین کا طریقہ اختیار کرنا، مؤثر اور دلنشین پیرایۂ بیان کا ایک تقاضا ہے۔

ابن قتیبہ مختلف اسالیب بیان میں قرآن کے خطاب کرنے کو اس کی عظمت کی دلیل مانتے ہیں اور عرب خطیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب کا خطیب جب گھر میں یا بازار میں، نکاح کی مجلس میں یا جنگ کے میدان میں تحریض وترغیب کے لیے یا صلح ومصالحت کی خاطر تقریر کیا کرتا تھا۔ تو وہ ہر موقع پر ایک ہی وادی میں نہیں بھٹکتا تھا بلکہ مواقع کی مناسبت سے مختلف انداز خطاب

اختیار کرتا تھا۔ اگر وہ تخفیف کا ارادہ کرتا تو مختصر کہتا، افہام و تفہیم کا قصد کرتا تو طوالت سے کام لیتا، جب کسی بات کو مؤکد کرنا چاہتا تو تکرار سے کام لیتا، کبھی غموض و ابہام کا سہارا لیتا اور کبھی بالکل ہی کھول کھول کر بیان کر دیتا۔[۱]

علی بن سلیمان الاخفش کہتے ہیں۔

" عمل سیبویہ کتابہ علی لغۃ العرب وخطبھا وبلاغتھا فجعل فیہ بینًا مشروحًا، وجعل فیہ مستبھمًا، لیکون من استنبط ونظر فضل وعلی ھذا خاطبھم اللہ عز وجل بالقرآن"۔[۲]

ترجمہ: سیبویہ نے اپنی کتاب میں مباحث کے افہام و تفہیم کا کام زبان عرب، ان کے خطبوں اور ان کی بلاغت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ کہیں اس نے شرح و بسط سے کام لیا ہے تو کہیں غموض و ابہام سے۔ ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ نتائج کا استنباط کرنے والوں اور تدبر و تعمق کی نگاہ سے دیکھنے والوں کا فضل و برتری نمایاں ہو۔ اور اسی طریقے پر اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں ان کو خطاب کیا۔

چنانچہ ایضاح و ابہام، ایجاز و اختصار اور تقدیم و تاخیر وغیرہ ایسی صفات ہیں جو دوران تالیف و تصنیف مناسب ہی نہیں اتنا ہی ناگزیر ضرورت کے طور پر ہیں۔ یہ انداز مصلحت و حکمت کے تحت گفتگو کو دل نشیں بنانے کے لیے کسی بھی مؤلف اور مصنف کا سرمایہ ہے جس کی ضرورت کلام میں زیر و بم، اتار چڑھاؤ اور فصاحت و بلاغت پیدا کرنے کے لیے پڑتی ہے اور اس سے مطالعہ کرنے والوں کو بھی شیرینی کی لذت ملتی ہے۔

سیبویہ — الکتاب کے آئینے میں:

کسی بھی تصنیف و تالیف کی شہرت و مقبولیت میں جہاں معلومات کی وسعت و موضوعات کے تنوع کا رول ہوتا ہے وہاں دلنشین پیرایۂ بیان بھی اپنا نمایاں

مقام رکھتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک ناگزیر ضرورت یہ ہے کہ صاحب تصنیف کے سلسلے میں مطالعہ کے دوران یہ خیال دہے کہ وہ حرف نشیں ہوگیا ہے۔ مطالعہ کرنے والوں کا یہ احساس ایک طرف تو اس کے نقص پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ عدم موجودگی کا یہ تصور ان پر وہ اثر پیدا نہیں کرتا جو کسی کے ہمہ وقت موجود رہنے کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ سیبویہ اپنی اس عجوبۂ روزگار تصنیف میں ہر وقت نمایاں رہتا ہے۔ اس کتاب کے اندر سیبویہ کی شخصیت کی ترجمانی کن کن پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ یہاں مختصراً ان کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱:- وہ ایک لمحہ بھی اپنی کتاب میں گمنام نہیں ہے۔ ڈاکٹر علی نجدی ناصف کے بقول وہ شہد کی مکھی کے مثل نہیں ہے جو مختلف پھولوں، باغوں اور کھیتوں کے پھلوں سے رس چوس کر جمع کرتی ہے اور وہ نہیں جانتی کہ ایسا کیوں کرتی ہے بال اسے صرف جمع و اذخار سے مطلب ہوتا ہے[۱۳۱]

۲:- فی الحقیقت وہ ہر جگہ مطالعہ کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے حاضر رہتا ہے یہاں تک کہ آثار علماء کی آراء اور قاریوں کی قراءتوں کے ذکر کے وقت بھی روپوش نہیں ہوتا ہے۔ اگر چہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ نری روح موجود ہے اور ایک آواز ہے جو کہہ رہی ہے تاہم یہ مستحضر رہے کہ اس کی شخصیت ان آثار و آراء کے پشت میں موجود ہوتی ہے[۱۳۲] یہی وجہ ہے کہ کہیں بھی وحشت اور تنہائی کا احساس نہیں ہوتا[۱۳۳]

۳- اپنی کتاب میں وہ لائق اور محبوب استاذ نظر آتا ہے۔ ادعائیہ انداز سے احتراز کرتا ہے۔ اس کی طبیعت کبھی آمادہ نہیں ہوتی کہ محض وہ کہتا جائے اور سامعین سنتے چلے جائیں بلکہ وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ زیر بحث موضوع سے متعلق

تمام گوشوں کو واضح اور روشن کر دے۔ مختلف جہتوں سے وہ اپنی باتیں قاری کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی مقصد کے تحت وہ بسا اوقات اعادہ و تکرار سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ ایک قاری اسے شفیق استاذ محسوس کرتا ہے اور ہمہ تن گوش ہو کر اخذ و استفادہ کر کے اپنی جھولیوں کو بھر لیتا ہے۔

۴:۔ بیباک متکلم اور ناقد کی حیثیت سے بھی اس کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ کہیں پر بھی پس و پیش اور شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ افہام و تفہیم میں تصنع اور تکلف کا لبادہ زیب تن نہیں کرتا ہے بلکہ انتہائی دیانتداری کے ساتھ اور حقیقت بینی کو اپنا شیوہ و شعار بناتے ہوئے مسائل کی توضیح و تشریح کرتا ہے اور کسی سے متاثر ہوئے بغیر نقد و تنقید کا بیڑا اٹھاتا ہے مثلاً وہ اپنے استاذ خلیل کی ایک روایت نقل کرتا ہے۔

" زعم الخليل انه يجوز أن يقول الرجل: هٰذا رجل اخو زيد اذا اردت ان تشبهه بأخي زيد "[۵۵]

سیبویہ اپنے استاذ خلیل کی اس رائے سے شد و مد کے ساتھ اختلاف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس تعبیر کے اندر ضعف اور قباحت ہے۔ ایسا کرنا صرف حالت اضطرار ہی میں جائز ہو سکتا ہے۔

۵:۔ اپنے قاریوں کے لیے وہ ایک مفسر اور شارح ثابت ہوتا ہے۔ جب کبھی کبھی مسائل ایک دوسرے سے ملتبس ہو جایا کرتے ہیں فروق و امتیازات آپس میں متضاد ہو جاتے ہیں تو قاری کو الجھ کر حیرت و استعجاب کا شکار ہو جانا پڑتا ہے لیکن وہ خود ہی مسائل کو ایک دوسرے سے واضح طور پر الگ الگ کر دیتا ہے اور اس طرح قاری کے اضطراب اور حیرت و تعجب کو حذق و مہارت کے ساتھ دفع کرتا ہے اور جوابات دے کر مطمئن کرتا ہے۔

الکتاب کی شروح وتعلیقات :

جیوں ہی یہ کتاب تہذیب ونظرثانی کے بعد منظر عام پر آئی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس کی مقبولیت کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ وقت کے چوٹی کے جتنے علماء تھے تقریباً تمام ہی لوگوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے الکتاب سے رشتہ جوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ الکتاب کی بیشمار شرحیں لکھی گئیں اور دبستان بصرہ کا شاید ہی کوئی ایسا عالم ہوگا جس نے الکتاب پر حواشی نہ لکھے ہوں یا اس کے مضامین میں اضافہ نہ کیا ہو[۱۶] ذیل میں اس کتاب کے شارحین کی ایک فہرست دی جارہی ہے۔

(۱) ابوسعید حسن بن عبداللہ جو سیرافی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی شرح لکھی۔ انتقال ۳۶۸ھ میں ہوا۔

(۲) سیرافی کے صاحبزادے یوسف نے بھی شرح لکھی۔ اس کا انتقال ۳۸۵ھ میں ہوا۔

(۳) تیسری شرح ابوجعفر احمد بن محمد النحاس النحوی نے لکھی اور اس میں انھوں نے سیبویہ کی الکتاب کے نحوی شواہد پر بھی بحث کی۔ انتقال ۳۳۸ھ میں ہوا۔

(۴) چوتھی شرح ابوالعباس محمد بن یزید جو مبرد کے نام سے معروف ہیں، نے لکھی اور سیبویہ کے نحوی شواہد پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ۲۸۵ھ میں وفات ہوئی۔

(۵) احمد بن ابان اللغوی الاندلسی نے بھی اس کی ایک شرح لکھی ہے۔ انتقال ۳۸۲ھ میں ہوا۔

(۶) ابراہیم ابن سفیان الزیادی المتوفی ۲۴۹ھ کی شرح۔

(۷) علی ابن سلیمان کی شرح جو الاخفش الاصغر سے معروف ہیں۔

(۸) ابن السراج (ابوبکر) محمد بن السری (البغدادی) کی شرح۔ ان کا انتقال

۳۱۶ھ میں ہوا۔

(۹) ابوعمر عثمان بن عمر المالکی کی شرح۔ یہ ابن حاجب نحوی کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کی موت ۶۴۶ھ میں واقع ہوئی۔

(۱۰) علامہ جاراللہ ابوقاسم محمود بن عمر الزمخشری کی شرح جن کا انتقال ۵۳۸ھ میں ہوا۔[۱]

علی نجدی ناصف نے بھی شارحین "الکتاب" کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ علماء اندلس جنھوں نے اس کی شرح پر کام کیا ہے ان میں بلند پایہ شارحین مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ابوبکر محمد بن الحسن الزبیدی الاشبیلی المتوفی ۳۷۹ھ (۲) ابونصر ہارون بن موسیٰ القرطبی المتوفی ۴۰۱ھ (۳) یوسف بن سلیمان الشنتمری جو الاعلم کے نام سے معروف ہیں اور جن کا انتقال ۴۷۶ھ میں ہوا (۴) ابوالحسن علی بن احمد جو ابن باذش الغرناطی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وفات ۵۲۸ھ میں ہوئی۔ (۵) ابوبکر محمد بن مسعود الخشنی المتوفی ۵۴۴ھ (۶) محمد بن احمد ابن ہشام اللخمی السبتی المتوفی ۵۵۰ھ۔ (۷) ابوالحسن علی بن محمد جو ابن خروف کے نام سے معروف ہیں۔ ۶۰۶ھ میں انتقال ہوا۔

مشرقی ممالک میں جنھوں نے الکتاب کی شرح لکھی چند نام حسب ذیل ہیں:

(۱) ابوعثمان بکر بن محمد المازنی المتوفی ۲۴۸ھ (۲) ابواسحاق ابراہیم السری زجاج۔ متوفی ۳۱۱ھ (۳) ابوعلی الحسن بن احمد الفارسی المتوفی ۳۷۷ھ (۴) ابوالحسن علی بن عیسیٰ الرمانی المتوفی ۳۸۴ھ

مصری علماء جنھوں نے شرح لکھی یا کچھ اضافہ کیا۔

(۱) ابوعبدالغنی سلیمان بن بنین الدقیقی المتوفی ۶۱۴ھ (۲) ابن الحاجب عثمان

بن علی المتوفی ۶۴۶ھ

ان شرحوں کے علاوہ کچھ تعلیقات بھی ہیں جو علمار اندلس اور مشرق کی ہیں
(۱) ابوالحسن سلیمان بن محمد الاشبیلی جو ابن الضائع سے جانے جاتے ہیں۔
۶۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

(۲) سلیمان بن محمد المالقی جو ابن الطراوۃ سے معروف ہیں اور جن کا انتقال
۵۲۸ھ میں ہوا۔

مشرق میں ابو محمد عبیداللہ بن محمد بن ابی بردۃ نے بھی تقریظ لکھی نیز مصر کے
احمد بن محمد بن ولاد نے بھی "الکتاب" کی تقریظ لکھی ہے۔ ۳۳۲ھ میں انتقال کرگئے۔
تجرید و اختصار کی بھی کچھ لوگوں نے ذمہ داری انجام دی ہے۔ اس سلسلے میں ابوجابی
محمد بن یوسف کا نام آتا ہے جو اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کا انتقال ۵۴۷ھ
میں ہوا۔ اور ابراہیم بن محمد الیمینی نے اس کتاب کے احکام کو مختصر اور مختصر بناکر
پیش کیا ہے۔

جن لوگوں نے اسے یاد کرلیا اور اس میں تخصص کیا وہ علمار غرب اور علمار شرق
دونوں ہیں۔

علمار غرب میں ابوالقاسم ابراہیم بن عثمان القیروانی المتوفی ۳۴۶ھ۔
ابوالقاسم خلف بن یوسف الاندلسی الشنتریني المتوفی ۵۳۲ھ، ابوعامر بن
عبداللہ بن یحییٰ الاشبیلی المتوفی ۵۶۰ھ، محمد بن حجاج الاشبیلی (جو ابن المطرنی کے
نام سے مشہور ہیں) المتوفی ۶۰۷ھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور علمار مشرق میں ابوبکر
عبیداللہ الخباط الاصبہانی اور ابراہیم بن مسعود المتوفی ۵۹۰ھ کے نام ملتے ہیں۔
سیبویہ کی "الکتاب" سے متعلق لکھی گئی مندرجہ بالا تمام شرحیں، تقریظات
اور تجریدات اس امر کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ وقت کے مشہور ترین علمار اور

ادبار کا کسی نہ کسی جہت سے اس کتاب سے تعلق قائم رہا ہے۔ بلکہ اگر شرح و تعلیقات کے اس ذخیرہ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ طبقۂ علماء نے اس کتاب سے کسی طرح کا بھی تعلق قائم رکھنا باعث شرف و افتخار سمجھا اور نحوی معاملات میں مرجع کا مقام دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر خدیجہ الحدیثی نے اپنی کتاب کتاب سیبویہ و شروحہ (صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۵) میں ذکر کیا ہے "کتاب سیبویہ کے گیارہ قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی دو درجن سے زائد شروح لکھی گئیں، دو درجن تعلیقات و حواشی اور پانچ استدراکات تصنیف کیے گئے"۔ [۱۹]

علماء اور ادباء کے تاثرات قلبی

اگرچہ اس کتاب کی خصوصیات، اس میں سیبویہ کی شخصیت کی جھلکیاں اور اس کی شروح و تعلیقات کی روشنی میں اس کے مقام کی تعیین کرنا مشکل نہیں ہے۔ تاہم اس حقیقت کے اعتراف سے راہ فرار اختیار نہیں کی جا سکتی کہ اس کتاب سے متعلق ممتاز ترین علماء اور ادباء کے خیالات بھی اس کی اعلیٰ و ارفع پوزیشن کو تسلیم کرانے میں قابلِ ذکر محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا چند علماء و ادباء کے تاثرات قلبی کا اظہار کیا جانا مناسب ہے۔

سب سے پہلے امام جاحظ کی ایک روایت نقل کی جاتی ہے جس سے ایک طرف تو جاحظ کی نظر میں جو اس کی قدر و منزلت ہے وہ سامنے آتی ہے اور دوسری طرف محمد بن عبد الملک کا تاثر یہ بتاتا ہے کہ فی الحقیقت یہ ایک بیش قیمت سرمایہ ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ایک بار محمد بن عبد الملک کے یہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اس موقعہ پہ ہدیہ میں پیش کرنے کے لیے جو سب سے قیمتی چیز ملی وہ سیبویہ کی کتاب تھی تو میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسی چیز ہدیہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے مقابلے میں

اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اور وہ ہے ایک کتاب جسے فراء کی میراث میں سے خریدی ہے۔ تو اس پر محمد بن عبدالملک نے کہا" مجھے اس سے زیادہ قیمتی چیز ہدیہ نہیں کی گئی [۲۰]

کوئی شخص جو اس کتاب کے پڑھنے کا مشتاق ہوتا اور مبرد کی طرف رجوع کرتا تو وہ اس سے پوچھتا" کیا تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے ؟ یعنی یہ کتاب سمندر کی طرح وسیع پر ہول اور مشکل ہے [۲۱]

ابوسعید الحسن بن عبداللہ کہتے ہیں " وعمل کتابہ الذی لم یسبقہ الی مثلہ أحد قبلہ ولم یلحق بہ من بعدہ" [۲۲]

امام زمحشری نے سیبویہ اور اس کی کتاب کی اہمیت یوں ذہن نشین کرائی

الا صلّی الالہ صلاۃ صدق ۔ علی عمرو بن عثمان بن قنبر

فان کتابہ لم یغن عنہ ۔ بنو قلم ولا ابناء منبر۔ [۲۳]

ابن خلکان کی وفیات میں ہے کہ سیبویہ کی کتاب اس کی شہرت اور فضیلت کی وجہ سے علم کے طور پر جانی گئی۔ بصرہ میں جب بھی کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب پڑھی تو بس جان لیا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے۔ اور اسی طرح اگر یہ کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب کی قرأت کی تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے [۲۴]

فہرست ابن ندیم میں المازنی کا قول ہے" من اراد ان یعمل کتابا کبیراً فی النحو بعد کتاب سیبویہ فلیستحی [۲۵]

معجم الادباء میں صاعد بن احمد الجیانی کہتے ہیں کہ انھوں نے اہل اندلس کا اپنی کتاب میں ذکر کیا۔ مجھے کسی ایسی کتاب کا علم نہیں (خواہ قدیم علوم میں ہو یا جدید میں) جو تمام ہی علوم پر مشتمل ہو اور اس فن کے اجزاء کا پورے طور پر احاطہ کیا گیا ہو

لیکن تین ایسی کتابیں ضرور ہیں جو ان اوصاف کی حامل ہیں۔ علم ہیئت کے سلسلے میں (۱) بطلیموس کی کتاب المجسطی۔ (۲) علم منطق میں ارسطو کی کتاب (۳) اور نحو میں سیبویہ کی کتاب۔

جناب کلمنٹ ہارٹ اس کتاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

THIS KITAB WAS FAMOUS ALL OVER THE EAST AND HAS REMAINED THE GREAT AND FAVOURITE AUTHORITY. NO OTHER WORK HAS BEEN ACKNOWLEDGED ITS EQUAL 4 26

یہ کتاب پورے مشرق میں مشہور و معروف تھی۔ اور عظیم المرتبت اور منظور نظر سند کی حیثیت سے برقرار رہی۔ اس کے ہم پلہ کبھی بھی دوسرے کام کو نہیں جانا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی زبان میں لکنت تھی اس کا اعتراف ابوبکر الزبیدی نے بھی اپنی کتاب میں "وکان فی لسانہ حبسۃ" کے الفاظ سے کیا ہے۔ ۲۷ چنانچہ اس کے زبان کی اس معذوری کے پیش نظر اگر اس کے قلم کی تعریف کی جائے اور فصاحت و بلاغت سے پر اس کی شاہکار تصنیف کا دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف سے راہ گریز اختیار کرنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ الکتاب کا ایک ایک صفحہ نحوی فکر و نظر کی گیرائی و گہرائی کے ساتھ ساتھ اس کے زور بیان اور دلکش انداز تحریر کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اسی زور قلم کا ثمرہ ہے کہ وہ اول شخص ہے جس نے علم نحو کو پھیلا کر بیان کیا اور اس سے متعلق باریکیوں اور نزاکتوں کی شرح و بسط کے ساتھ عقدہ کشائی کی خدمت انجام دی۔ ۲۸

علی النوری ناصف جنھوں نے سیبویہ پر امام النحاۃ کی حیثیت سے ریسرچ کیا ہے

[redacted]

اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اور وہ ہے ایک کتاب جسے فرّاء کی میراث میں سے خریدی ہے۔ تو اس پر محمد بن عبدالملک نے کہا " مجھے اس سے زیادہ قیمتی چیز ہدیہ نہیں کی گئی [20]

کوئی شخص جو اس کتاب کے پڑھنے کا مشتاق ہوتا اور مبرد کی طرف رجوع کرتا تو وہ اس سے پوچھتا " کیا تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے ؟ یعنی یہ کتاب سمندر کی طرح وسیع پر ہول اور مشکل ہے [21]

ابو سعید الحسن بن عبداللہ کہتے ہیں " وَعَمِلَ کتابہ الّذی لم یسبقہ الیٰ مثلہ أحدٌ قبلہ ولم یلحق بہ من بعدہ " [22]

امام زمخشری نے سیبویہ اور اس کی کتاب کی اہمیت یوں ذہن نشیں کرائی

الا صلّی الالہ صلاۃ صدق ۔ علی عمرو بن عثمان بن قنبر
فان کتابہ لم یغن عنہ ۔ بنو قلم ولا ابناء منبر۔ [23]

ابن خلکان کی وفیات میں ہے کہ سیبویہ کی کتاب اس کی شہرت و فضیلت کی وجہ سے علم کے طور پر جانی گئی۔ بصرہ میں جب بھی کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب پڑھی تو بس جان لیا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے۔ اور اسی طرح اگر یہ کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب کی قرأت کی تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے [24]

فہرست ابن ندیم میں المازنی کا قول ہے " من اراد ان یعمل کتابا کبیراً فی النحو بعد کتاب سیبویہ فلیستحی " [25]

معجم الادباء میں صاعد بن احمد الجیانی کہتے ہیں کہ انھوں نے اہل اندلس کا اپنی کتاب میں ذکر کیا۔ مجھے کسی ایسی کتاب کا علم نہیں (خواہ قدیم علوم میں ہو یا جدید ہوں) جو تمام ہی علوم پر مشتمل ہو اور اس فن کے اجزاء کا پورے طور پر احاطہ کیا گیا ہو

لیکن تین ایسی کتابیں ضرور ہیں جو ان اوصاف کی حامل ہیں۔ علم ہیئت کے سلسلے میں (۱) بطلیموس کی کتاب المجسطی۔ (۲) علم منطق میں ارسطو کی کتاب (۳) اور نحو میں سیبویہ کی کتاب۔

جناب کلمنٹ ہارٹ اس کتاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

THIS KITAB WAS FAMOUS ALL OVER THE EAST AND HAS REMAINED THE GREAT AND FAVOURITE AUTHORITY. NO OTHER WORK HAS BEEN ACKNOWLEDGED ITS EQUAL 4 26

یہ کتاب پورے مشرق میں مشہور و معروف تھی۔ اور عظیم المرتبت اور منظور نظر سند کی حیثیت سے برقرار رہی۔ اس کے ہم پلہ کبھی بھی دوسرے کام کو نہیں جانا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی زبان میں لکنت تھی اس کا اعتراف ابوبکر الزبیدی نے بھی اپنی کتاب میں "وکان فی لسانہ حبستہ" کے الفاظ سے کیا ہے۔ [۲۷] چنانچہ اس کے زبان کی اس معذوری کے پیش نظر اگر اس کے قلم کی تعریف کی جائے اور فصاحت و بلاغت سے پر اس کی شاہکار تصنیف کا دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف سے راہ گریز اختیار کرنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ الکتاب کا ایک ایک صفحہ نحوی فکر و نظر کی گیرائی و گہرائی کے ساتھ ساتھ اس کے زور بیان اور دلکش انداز تحریر کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اسی زور قلم کا ثمرہ ہے کہ وہ اول شخص ہے جس نے علم نحو کو پھیلا کر بیان کیا اور اس سے متعلق باریکیوں اور نزاکتوں کی شرح و بسط کے ساتھ عقدہ کشائی کی خدمت انجام دی۔ [۲۸]

علی النجدی ناصف جنھوں نے سیبویہ پر امام النحاۃ کی حیثیت سے ریسرچ کیا ہے

وہ اپنی کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ سیبویہ نے نحو کے میدان میں ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ اس کے سامنے تمام نحوی کاوشیں عاجز و درماندہ نظر آتی ہیں۔ اس کی کتاب عربی زبان و ادب کا معیاری نمونہ ہے۔ چنانچہ یہ زبان کے قیمتی سرمایوں میں ایک سرمایہ ہے۔ ندمار نے اس کے فضل و برتری کے پیش نظر ائمہ لغۃ کے مقام پر فائز کر دیا ہے۔[۷]

ان چند صفحات میں سیبویہ اور اس کی کتاب کے متعدد مباحث کا مطالعہ اس کی لیاقت و استعداد، حذق و مہارت اور بالخصوص نحو کی دنیا میں اس کے اثر و رسوخ کو تشنۂ توضیح نہیں چھوڑتا۔ علوم و فنون کی مختلف شاہراہوں پر گامزن رہنے کے باوجود اس نے جس وسعت مطالعہ اور دقت نظری کا ثبوت دیا ہے اس سے انکار و انحراف کرنا ایک بڑی خیانت ہوگی۔ الکتاب اسی دبستان بصرہ کی چوٹی کی شخصیت کے عمیق مطالعہ اور وسعت فکر و نظر کا ایک شاہکار ترجمان ہے جو اپنے موضوع پر آپ ہی مثال ہے۔ جب تک زبان عربی کے سیکھنے سکھانے کا غلغلہ بلند رہے گا یہ کتاب حرز جاں بنائی جاتی رہے گی اور جب تک عربی زبان باقی رہے گی اس کے مؤلف امام النحویین سیبویہ کا نام روشن رہے گا اور دنیائے عربی کبھی بھی اپنے محسن کو فراموش نہیں کر سکے گی۔

مراجع و مصادر

(۱) وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان۔ ابن خلکان ج ۳ صفحہ ۴۳۲ طبع اول قاہرہ
(۲) ایضاً ایضاً ” ”
(۳) مراتب النحویین ابو الطیب عبدالواحد ص ۶۵ قاہرہ
(۴) نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء عبدالرحمان الانباری ص ۷۲ مصر
(۵) ایضاً ایضاً ”
(۶) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ص ۲۹۴ لاہور
(۷) سیبویہ امام النحاۃ علی نجدی ناصف ص ۱۲۳ مصر

(۸) کتاب سیبویہ للشنتمیری ج ا ص ۵ طبع ثانی ۱۹۶۷ء۔ بیروت۔ لبنان
(۹) کشف الظنون مصطفیٰ بن عبداللہ ج ۲ ص ۱۴۲۷ استنانبول
(۱۰) " " " " " "
(۱۱) تاویل مشکل القرآن ابن قتیبہ مقدمہ
(۱۲) بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ۔ جلال الدین عبدالرحمان السیوطی ص ۳۴۸۔ طبع اول قاہرہ
(۱۳) سیبویہ امام النحاۃ علی نجدی ناصف ص ۱۸۰ مصر
(۱۴) " " ص ۱۸۱ "
(۱۵) " " ص ۱۸۲ "
(۱۶) اردو دائرۂ معارف ص ۴۹۲ لاہور
(۱۷) شارحین کی یہ مختصر فہرست کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۲۷ سے ماخوذ ہے۔
(۱۸) یہ فہرست علی نجدی ناصف کی کتاب سیبویہ امام النحاۃ ص ۱۸۸۔۱۸۷ سے ماخوذ ہے۔
(۱۹) اردو دائرۂ معارف ص ۴۹۳ لاہور
(۲۰) تاریخ بغداد، ابوبکر احمد بن خطیب البغدادی ج ۱۲ صفحہ ۱۹۶ ۱۹۳۱ء مصر
نیز وفیات الاعیان ج ۳ صفحہ ۸۴ پر بھی ملاحظہ فرمائیں۔
(۲۱) تاریخ ادب عربی۔ احمد حسن زیارت (ترجمۂ اردو) صفحہ ۳۱۹ طبع اول لاہور
(۲۲) اخبار النحویین والبصریین۔ ابوسعید الحسن بن عبداللہ ص ۴۸ بیروت
(۲۳) کتاب سیبویہ للشنتمیری ج ۱ ص ۵ طبع ثانی ۱۹۶۷ء۔ بیروت، لبنان
(۲۴) وفیات الاعیان بحوالہ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۲۷
(۲۵) الفہرست۔ ابن الندیم ص ۸۶ مصر
(۲۶) A HISTORY OF ARABIC LITERATURE. BY. K. A. Fariq P. 1972 - DELHI
(۲۷) کتاب المختصر فی تاریخ النحویین۔ ابوبکر الزبیدی ص ۱۲۱
(۲۸) الاعلام۔ قاموس تراجم۔ ج ۵ ص ۸۱ بیروت۔ لبنان
(۲۹) سیبویہ امام النحاۃ۔ مقدمہ کا ص ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

برہان

جلد ۱۰۱	شوال المکرم ۱۴۰۸ھ مطابق جون ۱۹۸۸ء	شمارہ ۶

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگولیہ چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر کے اس پورے علاقے میں دین و شریعت کا جو کچھ چرچا دکھائی دیتا ہے اور اس کی جو کچھ چہل پہل دکھائی دیتی ہے یقیناً یہ سب کچھ اولیائے عظام، علمائے اسلام، مبلغین کرام، بزرگان دین، سلف صالحین، مدارس اسلامیہ اور مکاتب دینیہ کی مثبت کوششوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

خدانخواستہ ہمارے اکابر و اسلاف نے زمانے کی رفتار اور وقت کے نبض کو پہچان کر تحفظ دین و شریعت کے سلسلے میں مختلف جہات سے جد و جہد نہ کی ہوتی تو یہ حال نہ ہوتا کہ دنیا بھر کے ممالک دینی اور مذہبی اعتبار سے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے اور ان کی ملی و دینی خدمات کو سراہتے۔

ہمارے سامنے اندلس، بخارا، قرطبہ اور تاشقند کی تاریخ ہے کہ حکومتوں کے ختم ہونے کے بعد ان مسلمان ممالک اور علاقوں کا کیا حال ہوا؟ جہاں سینکڑوں برس سے مسلمان حکمرانی کرتے آرہے تھے۔

چنانچہ کمیونزم کا سیلاب جب وہاں آیا تو وہاں کے مسلمان اور نئی اسلامی نسل کس طرح الحاد اور دہریت کے بلاخیز طوفان میں بہہ گئی اور پورا خطہ کس طرح مذہب بیزار بن گیا۔

بڑی طاقتیں (SUPER POWERS) آج بھی اس کوشش میں لگی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ برصغیر سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے، شریعت اسلامی کی بنیادوں کو کمزور کیا جائے، دینی قیم کی چھاپ جو یہاں کے باشندوں کے دلوں پر پڑی ہے وہ ختم ہو جائے "قال اللہ وقال الرسولؐ" کا غلغلہ باقی نہ رہے اور مجموعی طور سے مسلمان اپنی اس قابل فخر وراثت سے محروم کر دیئے جائیں جو اقوام عالم کی صفوں میں انھیں ممتاز اور مشخص کرتی ہیں۔ آخر برصغیر کے علاقوں میں اندلس اور روس کی تاریخ کیوں دہرائی نہیں جاسکتی۔ اسلام دشمن قوتیں بڑی عیاری، چالاکی اور برق رفتاری کے ساتھ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں وہ دین اسلام، اسلامی تعلیمات، مسلمانوں کے مذہبی تشخص، ملی انفرادیت اور باہمی اتحاد و اتفاق کی عظیم قوت کو ڈائنامیٹ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں اور فی الواقع اس کے تجربات کا سلسلہ انھوں نے شروع کر دیا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان خطرات و خدشات کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ مشترکہ لائحہ عمل بنا کر سوچیں اور عملی جد و جہد میں لگ کر انفرادی اور اجتماعی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔

یہاں یہ بات بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اس کا اپنا ایک مخصوص مذہب، ایک مخصوص تہذیب

ایک مخصوص تمدن اور ایک انفرادی تشخص ہے۔ عقائد، اعمال اور اخلاق کی تطہیر اس کی بنیاد میں داخل ہیں۔ ملک کی تقسیم سے قبل اور اس کے بعد بھی مختلف ادوار اور اوقات میں مسلمانوں نے اپنی جان، املاک اور عزت سے زیادہ اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثے کی حفاظت کی ہے اور قانون شریعت کے تحفظ اور دفاع کے لئے قابل فخر اور قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ہمیں اس بات سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے کہ اب پھر قانون شریعت Muslim Personal Law میں مختلف طریقوں سے جارحانہ مداخلت کا سلسلہ جاری ہے۔

یکساں سول کوڈ (Common Civil code) کی تلوار ہر وقت مسلمانوں کی گردن پر لٹک رہی ہے۔ انکم ٹیکس کے نئے قانون کے تحت اوقاف اسلامیہ کی جائداد مقصدیت کے اعتبار سے ختم کرنے سے متعلق ایکٹ پاس ہو چکا ہے۔ نئے قوانین اور عدالتی فیصلے ہو رہے ہیں اس لئے مسلمانوں کو اپنے ملی تشخص کی بقا اور انفرادیت کو بحال رکھنے کے لئے عملی، ذہنی اور فکری اعتبار سے ہمہ دم تیار رہنا چاہئے۔

جہاں تک "مشترکہ سول کوڈ" کے نفاذ کا تعلق ہے تو حکومت ہند کو ہمارا یہی مشورہ ہے کہ وہ اس مسئلہ کے مالہٗ و ما علیہ کا اچھی طرح جائزہ لے کر اس کے مختلف پہلوؤں پر ہزار مرتبہ غور کرے۔ اس لئے کہ متحدہ ہندستان کی تقسیم کے بعد بھی موجودہ ملک کا رقبہ جو بے حد وسیع و عریض ہے۔ جس میں روز اول سے اکثریتی فرقے کے ساتھ ساتھ اقلیتی فرقے آباد ہیں۔ سب کے مذہبی جذبات و احساسات کا خیال رکھے۔ ہمارے خیال میں ملک کے مخلوط سماجی نظام اور معاشرے میں یکجہتی، ہم آہنگی اور امن کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ باہمی اکرام و احترام کے جذبات کو بڑھاوا دینے کی ایک ہمہ گیر تحریک چلائی جائے مختلف فرقوں کے درمیان اعتماد و اعتبار کی فضا بڑھاوا دیا جائے۔ ذہنوں

سے سلوک وشبہات دور کئے جائیں۔ جن سے تعصب، تنگ نظری اور منافرت کے رجحانات کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔ ایسے مخلوط سماج میں اگرچہ امن وامان سے رہنا ایک مشکل فن ہے لیکن اب یہ ہم سب کو سیکھنا ہے اور جو جاننے والے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو سکھائیں۔

ملک کے موجودہ سیاسی اور سماجی حالات کے پس منظر میں مسلمانوں کی دوہری ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مذہب، تہذیب اور تشخص پر جہاں ضرور اصرار کریں وہاں اسے اپنا حصار نہ بنا ڈالیں۔ بلکہ حفاظتِ اسلام کے ساتھ ساتھ دعوتِ اسلام اور اشاعتِ اسلام کے اولین کام کو سب سے زیادہ اہمیت اور فوقیت دے کر اپنے "فرضِ منصبی" کو پورا کریں۔ اگرچہ مجموعی طور پر مسلم قوم کا مزاج بھی ہنگامی اور جذباتی بنتا جارہا ہے۔ تاہم ابھی ایسے لوگ ہیں جو اگرچہ کم ہیں، جو اپنے اپنے دائرہ کار میں کام کر رہے ہیں اور بقول شاعرِ مشرقؒ ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

---

۱۰ اپریل کا دن اسلام آباد اور راولپنڈی کے باشندوں کے لئے کس قدر بھیانک اور منحوس دن تھا جبکہ اوجڑی کیمپ کے اسلحہ ڈپو میں اچانک آگ بھڑک اٹھی جس نے آناً فاناً سینکڑوں مکانوں کو زمین بوس اور سینکڑوں کی تعداد میں شہریوں کو ہلاک، مفلوج

اور ناکارہ بنا دیا۔ یہ منظر قیامت کا سماں پیش کر رہا تھا ہزاروں کی تعداد میں راکٹ، میزائیل اور بم اڑ اڑ کر فضا میں دور دور تک آبادیوں میں گر کر انسانوں کو ہلاک کرتے رہے۔ ہر شخص اس آفتِ ناگہانی اور قیامتِ صغریٰ پر غم و الم اور حیرت و استعجاب کی تصویر بنا ہوا تھا۔ یہ ناقابل تصور واقعہ کیونکر رونما ہوا اس کی تحقیقات کا سلسلہ حکومت پاکستان کی طرف سے جاری ہے۔ اس افسوسناک واقعہ کے اسباب وعلل کو تلاش کرنا حکومت کا فرض ہے۔ ہم پاکستان میں رونما ہوئے اس درد ناک سانحہ پر وہاں کے متاثرہ کنبوں اور عوام سے اپنی بھرپور ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے ہلوکین کے لئے دعائے مغفرت اور مجروحین کے لئے دعائے صحت کر رہے ہیں۔

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل

ایک جائزہ

از جناب محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱)

مولانا حمید الدین فراہیؒ عہد حاضر کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جنھوں نے قرآن اور علوم قرآن پر عظیم الشان کام انجام دیا ہے اور تدبر قرآن کا نیا راستہ نکالا ہے۔ علوم قرآنی سے متعلق ان کے رسالے اور تفسیر نظام القرآن کے مختلف اجزاء شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ اس امتیازی خصوصیت کے باوجود ان کی تحریروں میں بعض خیالات ایسے ملتے ہیں جو قرآن کے طالب علم کو کھٹکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سلسلے میں وہ امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں منفرد ہیں۔ انھیں میں ایک وہ رائے بھی ہے جس کا اظہار انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں کیا ہے۔ وہ یہ کہ لشکر ابرہہ کا مقابلہ اہل مکہ نے کیا تھا اور پرندے ان پر سنگباری کرنے نہیں بلکہ ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے آئے تھے۔ اگرچہ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں بعینہ یہی خیالات اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں لیکن علماء و مفسرین کے درمیان اس نظریہ کو مقبولیت

حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن[1] میں اصحاب الفیل پر بحث کرتے ہوئے مشہور رعام روایت ذکر کرنے کے بعد اس نظریہ کا سرسری تذکرہ کر دیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی[2] اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پر متعدد اعتراضات کئے ہیں اور دلائل کے ساتھ اس کی غلطی واضح کی ہے۔ مولانا ضمیر احمد صاحب اظہر میرٹھی مدرس جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ نے بھی اپنے ایک مضمون "تفسیر سورۂ فیل" (شائع شدہ ماہنامہ الرشاد اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء) میں جو ان کی زیر تالیف تفسیر مفتاح القرآن کا حصہ ہے۔ اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ خیال تھا کہ ان بحثوں کے نتیجے میں مذکورہ رائے کی غلطی واضح ہو گئی ہے لیکن سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ کے شمارہ اپریل تا جون ۱۹۸۷ء میں جناب نسیم ظہیر اصلاحی کا ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں مولانا میرٹھی کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مولانا فراہی کی رائے کی تائید کی گئی ہے۔ ان کا جائزہ جیسا کچھ ہے اس پر بحث مقالہ میں آئے گی۔ لیکن چونکہ ان تمام مناقشات و مباحثات کی بنیاد مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل ہے اس لئے ہم براہ راست اسی کا جائزہ لیں گے اور اس کے ساتھ ہی مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب نسیم ظہیر اصلاحی کے استدلالات پر بھی گفتگو کریں گے۔

مولانا فراہی کا طریقۂ تفسیر:

مولانا فراہی کے نزدیک بنیادی ماخذ صرف قرآن ہے۔ حدیث کو فرع کی حیثیت حاصل ہے اس لئے ان کے نزدیک تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن میں

---

[1] ارض القرآن اول ص ۳۱۵ دار المصنفین اعظم گڈھ طبع چہارم ۱۹۵۵ء

[2] قصص القرآن سوم بحث اصحاب الفیل ندوۃ المصنفین دہلی۔

تدبر کیا جائے اور قرآن کے الفاظ سیاق وسباق اور نظم سے اس کا مفہوم سمجھا جائے پھر جو مفہوم سمجھ میں آیا ہو اس پر حدیث کو پرکھا جائے۔ اگر حدیث سے بھی وہ مفہوم معلوم ہوتا ہو تو حدیث کو قبول کر لیا جائے ورنہ وہ مفہوم اختیار کر لیا جائے اور حدیث کے معاملہ میں توقف اختیار کیا جائے:

> "شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کریں، پھر سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ شان نزول ہے جو نظم قرآن سے مترشح ہورہی ہو۔"[1]

یہی طریقہ انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں بھی اپنایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

> "مفسرین عموماً قصہ کی تمام تفصیلات روایات سے اخذ کرتے ہیں اور ضعیف وقوی روایات میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ شکل مضمون صحیح تاویل تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ واقعہ کی اصلی شکل روایات سے بالکل الگ کر کے دیکھی جائے۔ اس کے بعد روایات پر نظر ڈالی جائے اور کمزور روایات کو صحیح روایات سے چھانٹ کر الگ کیا جائے۔"[2]

قرآن میں تدبر ضروری ہے لیکن روایات کو پس پشت ڈال کر صرف عقل کا

---

1. تدبر نظام القرآن از مولانا حمید الدین فراہی ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی ص ۲۶-۲۷ طبع اول دائرہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڑھ
2. تفسیر سورۂ فیل ص ۴۳

سہارا لینا اور روایات کو عقلی طور پر سمجھ میں آنے والے مفہوم پر پرکھنا بھی حدِ اعتدال سے تجاوز ہے۔ ایک تاریخی واقعہ کے بیان کرنے میں روایات رطب و یابس شامل ہو سکتی ہیں اور کچھ مبالغہ آرائی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے پوری روایت کو بے بنیاد اور خود ساختہ قرار دینا صحیح نہیں۔

مشہور عام روایات پر شبہات:

۱۔ روایت کی سند کے بارے میں مولانا فراہی نے لکھا ہے:

"جو حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں سب یک قلم بے بنیاد ہیں۔ از روئے سند ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق پر ختم ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔"[1]

نسیم اصلاحی صاحب نے بھی ابن حجر کی تہذیب التہذیب سے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جیسے امام مالک کا قول "محمد بن اسحاق دجال ہے" امام بخاری کا قول "محمد بن اسحاق ایک ہزار حدیثوں میں منفرد ہے" ابن نمیر کا قول "وہ مجہول لوگوں سے بے بنیاد روایت نقل کرتے ہیں" احمد بن حنبل کا قول "محمد بن اسحاق تدلیس کرتے ہیں" وغیرہ۔ پھر حاشیہ میں لکھا ہے کہ "امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث انھیں بالکل ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں"[2] لیکن ان تمام اقوال کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے امام مالک کے قول کا ایک خاص پس منظر ہے۔ مدینہ میں ابن اسحاق سے بڑھ کر

---

[1] ایضاً ص۴۵

[2] سہ ماہی تحقیقات اسلامی شمارہ اپریل تا جون ۸۷ء ص ۶۲-۶۳

علم الانساب جاننے والا کوئی نہ تھا۔ ابن اسحاق کا خیال تھا کہ امام مالک ذی اصبح کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہیں جبکہ امام مالک اپنے آپ کو حمیر کی شاخ اصبح میں سے سمجھتے تھے اسی وجہ سے دونوں میں منافرت تھی۔ جب امام مالک نے موطا تصنیف کی تو ابن اسحاق نے کہا: "أئتونی بہ فأنا بیطارہ" (اسے میرے پاس لاؤ، اس کا ناقد تو میں ہوں) یہ بات امام مالک کو معلوم ہوئی تو انھوں نے فرمایا: "ھذا دجال من الدجاجلۃ، یروی عن الیھود (یہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے، یہودیوں سے روایات نقل کرتا ہے)

"امام مالک حدیث کی وجہ سے ابن اسحاق پر عیب نہیں لگاتے تھے بلکہ اس لئے ان کا انکار کرتے تھے کہ وہ غزوات نبوی سے متعلق یہودیوں کی ان اولادوں کی روایات نقل کرتے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے، اور جنھیں خیبر، قریظہ اور نضیر کی جنگوں کے حالات اور اپنے آباء و اجداد کے متعلق اس طرح کے عجیب و غریب واقعات یاد تھے۔ ابن اسحاق یہ روایات معلوم کرنے کے لئے ان کا تتبع کرتے تھے، اور ان روایات کا التزام نہ کرتے تھے کہ وہ قابل اعتماد بھی ہیں۔"[1]

ان پر ایک بڑا اعتراض تدلیس کا بھی ہے۔ لیکن کسی کا مدلس ہونا اس کی تضعیف کے لئے کافی نہیں ہے۔ خود امام احمد بن حنبل نے تدلیس کے باوجود عروہ کی روایات قبول کی ہیں۔ دراصل "یہ اسلوب اس فرق سے متعلق ہے جو حدیث اور تاریخ کے درمیان موجود ہے۔ حدیث میں مربوط قصہ مطلوب نہیں ہوتا

---

[1] نقوش رسول نمبر لاہور جلد ۱۱ مقدمہ بر سیرت ابن اسحاق از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ ۳۸۔

بلکہ بیان کردہ واقعات کی معرفت کے بارے میں ہر گواہ کی گواہی مطلوب ہوتی ہے جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اس کا انحصار تو حدیث پر ہے لیکن اس کی غرض یہ ہے کہ تاریخی حکایت کے متعلق ایک مکمل اور مربوط قصہ کے طور پر خبر بہم پہنچائی جائے بغیر اس کے کہ کلام کو اسانید اور بیانات کے تکرار سے بوجھل کیا جائے۔[۱]

ابن اسحاق کو مطعون کرنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے توثیق کی ہے۔ شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید، حماد بن زید، حماد بن سلمہ جیسے عظیم محدثین نے ان سے روایت کی ہے[۲] بخاری نے صحیح کے علاوہ دوسری کتابوں میں ان سے روایت لی ہے۔ مسلم نے بھی روایت لی ہے اور ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ان کی روایات موجود ہیں۔[۳]

جس شخص کو متعدد ائمہ حدیث نے ثقہ قرار دیا ہو اور جس کی روایات (صحیح بخاری کے علاوہ) صحاح تک میں موجود ہیں۔ اس کی روایت کو محض چند لوگوں کی تضعیف کی وجہ سے (وہ بھی ایک مخصوص پس منظر میں) ناقابل اعتبار قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یوں ہی ہم ایک دو اقوال کی روشنی میں راویوں کو مطعون اور ناقابل اعتبار قرار دینا شروع کر دیں تو امام ابو حنیفہ اور امام شافعی جیسے بزرگ فقہاء بھی اس کی زد میں آنے سے نہ بچ سکیں گے اس لئے کہ متعدد لوگوں نے ان پر بھی نقد و طعن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عہد حاضر کے مشہور محقق علامہ شبلی نعمانی کی رائے ملاحظہ ہو:

۱؎ ایضاً ص ۲۸۵۔

۲؎ ایضاً ص ۲۸۶ بحوالہ جماعیلی، الکمال فی معرفۃ الرجال، مخطوط برلن

۳؎ مقدمہ بر سیرت ابن ہشام از محققین، دار احیاء التراث العربی، لبنان ص ۔

"محمد بن اسحاق تابعی ہیں۔ ایک صحابی حضرت انسؓ کو دیکھا تھا علم حدیث میں کمال تھا ..... ان کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں لی لیکن جزء القرارۃ میں ان سے روایت لی ہے۔ تاریخ میں تو اکثر واقعات ان ہی سے لئے ہیں۔ ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے جو مسلمان ہوگئے تھے اور چونکہ یہ واقعات انھوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے اس لئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہوسکتا"۔[1]

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ روایت صرف محمد بن اسحاق کے واسطے سے مروی ہے اس لئے کہ روایت کے بعض اجزاء دوسرے راویوں جیسے قتادہ، عکرمہ بن عمر، ابن عباس اور سعید بن جبیر وغیرہ سے بھی مروی ہیں اور ان میں چڑیوں کے بصراحت سنگباری کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ ایک طرف مولانا فراہی روایت کو محض ابن اسحاق کی وجہ سے ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں دوسری طرف خود اس روایت میں موجود اشعار پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ حالانکہ ابن اسحاق کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

---

[1] سیرت النبی اول ص۲۳-۲۴، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

انھیں اشعار گڑھ کر پیش کئے جاتے تھے۔

ب۔ مولانا فراہی کے واقعۂ فیل کے سلسلے میں مشہور عام روایت پر مختلف عقلی شبہات عائد کر کے اسے "بے بنیاد، لغو اور غلط" قرار دیا ہے۔ ذیل میں ان شبہات کا جائزہ لیا جائے گا۔

(۱) پہلا شبہ یہ ہے کہ "روایت میں ہے کہ قریش کے سردار عبدالمطلب خدا کے گھر کی حفاظت کے لئے مقابلہ آرائی کے بجائے پہاڑوں میں جا چھپے۔ حالانکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو بغیر مدافعت کے اپنا معبد دشمنوں کے حوالے کر کے پہاڑوں میں جا چھپے۔"

(۲) دوسرا شبہ یہ ہے کہ "روایت میں ہے کہ عبدالمطلب ابرہہ سے ملنے گئے تو وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ اس سے پوری امید بندھتی ہے کہ اگر وہ اس سے خانہ کعبہ کے بارے میں کوئی خواہش کرتے تو وہ اس کو آسانی سے رد نہ کرتا۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ چند اونٹوں کے لئے تو اس سے درخواست کرتے اور اصل معاملہ کو بالکل ٹال جاتے۔"

روایت کا مطالعہ کرنے سے یہ دونوں شبہے بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ ابن اسحاق ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابرہہ سے ملنے عبدالمطلب کے ساتھ بنو بکر کے سردار یعمر بن نفاثہ اور ہذیل کے سردار خویلد بن واثلہ بھی گئے تھے۔ انھوں نے ابرہہ سے کہا کہ وہ تہامہ کا ایک تہائی مال لے لے اور خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ ترک کر کے واپس چلا جائے، لیکن اس نے انکار کیا"[۱] خود ابن اسحاق نے اپنی سیرت[۲] میں

---

[۱] سیرت ابن ہشام اول صـ۵۲۔

[۲] ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے سیرت ابن اسحاق تحقیق کر کے شائع کی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ نقوش لاہور رسول نمبر کی گیارہویں جلد میں شامل ہے۔

عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے ابرہہ کو اس کے ارادے سے باز رکھنے اور واپس کرنے کی کوشش کی تھی:

منعت ابرهة الأشرم التی حمیت ... من اللئام فلم تخلق لهم دارا
منعت مکة منهم، اننی رجل ... ذو اثرة لم یکن فی الحب غدارا
إذ قلت یا صاحب الحبشان، ان لنا ... من دون أن یهدم المعمور أخطارا
فصار فی جیشه بالفیل مقتدرا ... وسرت مستبسلا للموت صبارا
فی فتیة من قریش لیس مثلهم ... بموردث جبههم سنینا ولو عارا[1]

[تونے ابرہہ کو اس سرزمین سے روک دیا جو ایسے کمینوں کی دست برد سے محفوظ ہے جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں، تونے ان حملہ آوروں سے اہل مکہ کی حفاظت فرمائی۔ بے شک میں صاحب قبیلہ ہوں اور محبت میں غداری (بدعہدی) کرنے والا نہیں ہوں۔ جب میں نے اس سے کہا اے حبشیوں کے سردار، اگر خانۂ کعبہ منہدم ہو جائے تو ہمارے لئے اس میں خطرات ہیں۔ وہ اپنے لشکر میں ہاتھی کے ساتھ صاحب اقتدار تھا۔ اور میں صبر کے ساتھ مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میرے ساتھ قریش کے ایسے نوجوان تھے جو جان کی قربانی دے کر زندہ رہنے والوں کے لئے ذلت اور عار نہیں چھوڑتے]

ان اشعار سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے ابرہہ کو باز رکھنے کی کوشش کی تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انکار کر دینے پر مقابلہ آرائی کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے۔ لیکن نتائج ان کے سامنے تھے

---

[1] نقوش، رسول نمبر جلد ۱۱ ص ۵۹

ابرہہ کے لشکر جرار سے مقابلہ ناممکن تھا۔ راستہ میں جن قبائل نے مقابلہ کی کوشش کی تھی وہ ہزیمت کھا کر قتل اور قید کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے اہل مکہ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ابرہہ کے لشکر کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہیں۔ سیرت ابن ہشام میں ہے:

"فهمت قريش وكنانة وهذيل ومن كان بذلك الحرم من سائر الناس لقتاله ثم عرفوا أنهم لا طاقة لهم به فتركوا ذلك" [1]

[قریش، کنانہ، ہذیل اور جو لوگ اس وقت حرم میں موجود تھے انھوں نے ابرہہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر انھیں اندازہ ہو گیا کہ ان میں لڑنے کی طاقت نہیں ہے اس لئے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا]

اس صورت میں صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش کر لشکر ابرہہ کو تباہ و برباد کر دیا۔

اس سے ملتی جلتی کیفیت ہمیں غزوۂ احزاب میں ملتی ہے۔ مشرکین کے عظیم لشکر سے مقابلہ کرنے کے بجائے رسول کریمؐ نے یہ بہتر خیال کیا کہ اپنے بچاؤ کے لئے خندق کھود لی جائے۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ایک موقع پر رسول اللہؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا تھا کہ کھجوروں کی پیداوار کا ایک حصہ ادا کرنے پر صلح کر لی جائے۔ لیکن صحابہ اپنی ایمانی حمیت کی بنا پر تیار نہ ہوئے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے تیز ہوا اور غیر مرئی فوج بھیج کر مشرکین کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام اول صفحہ ۵۰

(۳) تیسرا شبہ یہ ہے کہ اہل سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کے حملہ کے پہلے دن سے قبائل عرب اس کی فوج پر تاخت کرتے رہتے تھے۔ ذوالرمہ کہتا ہے:

وابرهة اصطادت صدور رماحنا
جهارا و عثنون العجاجة اكدر
نحی له عمرو فشك ضلوعه
بنافذة نجلاء والخيل تضبر

[ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا۔ عمرو نے اس کی طرف لپک کر نیزے کے کاری زخم سے اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم رہے]

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش اس قدر مرعوب ہو جائیں کہ بالکل مقابلہ نہ کریں۔"

مولانا فراہی نے ان اشعار کی تشریح میں لکھا ہے کہ ان شعروں میں صاف تصریح ہے کہ ذوالرمہ کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس پیش آیا کثیف غبار آسمان تک بلند تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ نے ہوا بھیج کر ان پر سنگریزوں سے بارش کی۔"[۵۵] اس تشریح میں نا سے تسامح ہو گیا ہے۔ مولانا کے نزدیک جس دن یہ یہ واقعہ پیش آیا دن اللہ تعالیٰ نے سنگباری کے ذریعہ لشکر ابرہہ کو ہلاک کر دیا۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ شاعر نے ان اشعار میں لشکر ابرہہ سے پہلے

---

[۵۵] تفسیر سورۂ فیل ص۴۸۔

ہونے والی جھڑپوں میں سے کسی جھڑپ کا تذکرہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر یمامہ کا رہنے والا ہے۔ دوسرے یہ کہ خود ان کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ اہل مکہ نے لشکر ابرہہ سے نیزوں کے ذریعے آمنے سامنے مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں پر جاکر مقابلہ کیا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر قریش پہاڑوں پر چلے گئے تھے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ مدافعت سے کلیۃً دست بردار ہو کر پہاڑوں پر جا چھپے تھے بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابل میں مدافعت کی واحد ممکن شکل جو وہ اختیار کر سکتے تھے یہی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہی اختیار کی.... ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ میدان میں نکل کر اور صف بندی اور تلواروں کے ذریعے سے کرنا قریش کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ اگر اپنا پورا زور واثر استعمال کرتے تو بھی شاید دس بیس ہزار سے زیادہ آدمی اکٹھے نہ کر پاتے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے لئے بہترین جنگی پالیسی یہی خیال کی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں میں محفوظ ہو جائیں اور وہاں سے گوریلوں کے طریقے پر جس حد تک ان کے اقدام میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہوں، کریں۔" [1]

قریش کے مقابلہ نہ کرنے کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہونے والی جھڑپوں کے نتائج سے واقف تھے انھیں سوائے اللہ کے غیبی مدد کے کسی سہارے کی امید نہیں تھی اس لئے مقابلہ کی تیاریوں کے بجائے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا ومناجات

---

[1] تدبر قرآن جلد ہشتم ص ۵۶۱-۲-۵۶۲

اور تفریح و استعمال کرتے ہوئے پہاڑیوں میں چلے گئے۔

دبی مولانا فراہی نے لکھا ہے کہ "علمائے سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کا حملہ موسم حج میں ہوا تھا" اور دلیل میں عکرمہ بن ہاشم کا یہ شعر نقل کیا ہے:

لاھم أخزالاسود بن مقصود الآخذ الهجمة فیها التقلید

[خداوندا، اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جن کی گردنوں میں قلادے تھے ہنکا لے گیا]

جہاں تک علمائے سیر کا تعلق ہے ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ انھوں نے ابرہہ کے حملے کا وقت موسم حج بتایا ہے تلاش بسیار کے باوجود ہمیں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے موسم حج میں ابرہہ کے حملے کا اشارہ ملتا ہو، اس کا اعتراف نسیم اصلاحی صاحب نے بھی کیا ہے۔[1] تاریخ وسیر کی متداول کتابوں میں جب ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی جس سے موسم حج میں حملۂ ابرہہ کا پتہ چلتا ہو تو محض خوش گمانی علمی تحقیقات میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔ واقعۂ فیل کے زمانے کے بارے میں بہت سے اقوال ملتے ہیں۔ لیکن مشہور قول یہ ہے کہ اسی سال حضورؐ کی ولادت ہوئی اور اور مشہور قول کے مطابق حضورؐ کی ولادت سے پچاس دن قبل یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ نسیم اصلاحی صاحب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جن روایتوں میں واقعۂ فیل کا زمانہ محرم بتلایا گیا ہے ان کا مأخذ صرف محمد بن اسحاق کی بیان کردہ روایت ہے اس لئے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے راویوں کی تصریحات ملتی ہیں، چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابو جعفر باقر سے بھی یہی خیال نقل کیا ہے کہ

---

[1] تحقیقات اسلامی شمارہ مذکور ص ۶۲-۶۴۔

یہ واقعہ محرم کا ہے[1] اور اگر ان روایتوں کا ماخذ صرف محمد بن اسحاق ہی ہوتے تو اسے ناقابل اعتبار قرار نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ پچھلے گزر چکا کہ تاریخ وسیر میں تمام علماء کے نزدیک محمد بن اسحاق معتبر ہیں۔

نسیم اصلاحی صاحب نے ایک انوکھا استدلال ابن اسحاق کی روایت "وهمت قريش وكنانة ومن كان معهم بالحرم من سائر الناس" میں "من سائر الناس" کے الفاظ سے یہ کیا ہے کہ جب حج ختم ہوچکا تھا تو حرم میں پھر کون لوگ رہ گئے تھے؟ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حجاج ہی تھے[2] لیکن یہ انتہائی مہمل اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ حرم کبھی لوگوں سے خالی نہیں ہوتا۔ ہمہ وقت لوگ طواف وعبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ محض "من سائر الناس" کے الفاظ سے یہ استدلال کہ یہ حج کا زمانہ تھا مضحکہ خیز ہے۔ مزید حیرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ایک طرف نسیم صاحب اس روایت کو ابن اسحاق کی قرار دے کر ناقابل استشہاد قرار دیتے ہیں۔ دوسری جانب خود اس سے استدلال کرتے ہیں اور اس سے آگے کی عبارت "ثم عرفوا انهم لا طاقة لهم به فتركوا ذلك" چونکہ ان کے خلاف پڑتی ہے اس لئے اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔

مولانا فراہی کا استدلال صرف عکرمہ کے مذکورہ شعر سے ہے جبکہ اس شعر سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسود بن مقصود جو اونٹ ہنکا لے گیا تھا۔ ان کے گلوں میں قلادے تھے۔ قلادہ صرف اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ اونٹ کو قربانی کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ تمام اونٹوں کو ایک ہی سال قربان کر دیا جائے

---

[1] البدایہ والنہایہ دوم ص۲۶۱-۲۶۲ دار الفکر العربی۔

[2] تحقیقات اسلامی ص۶۴۔

تاریخ طبری میں ہمیں ابن عباس سے مروی ایک روایت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ابرہہ نے جب عبد المطلب کے اونٹ واپس کردئے تو انھوں نے ان کی گردنوں میں جوتے کے قلادے پہنا کر اور ان کا شعار کر کے ہدی بنا دیا اور حرم میں منتشر کر دیا تاکہ انھیں کوئی گزند پہنچے تو رب حرم کا غضب بھڑک اٹھے۔"

"فأمر بردّ إبله عليه، فلما قبضها قلّدها النعال وأشعرها وجعلها هدياً، وبثّها في الحرم لكي يصاب منها شيء فيغضب الحرم" [۱] ممکن ہے شاعر نے اسی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہو۔

(۵) مولانا نے لکھا ہے کہ "عرب شعراء نے قبیلۂ ثقیف کی ہجو کی ہے کیونکہ انھوں نے کعبہ کی حمایت کے وقت بزدلی دکھائی۔ اہل عرب ابو رغال ثقفی کی قبر پر سنگساری کرتے رہے کیونکہ اس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا۔ اگر ثقیف کی طرح عرب بھی بھاگ گئے تھے تو ثقیف ہی کا کیا قصور تھا کہ ان کی ہجو کی گئی۔"

لیکن دونوں صورتوں میں بیّن فرق ہے۔ قبیلۂ ثقیف کو جب ابرہہ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے بتکدے کو بچانے کے لئے اس کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ لات کا یہ بتکدہ وہ نہیں جسے ڈھانے کے لئے آپ آئے ہیں بلکہ وہ مکہ میں ہے۔ انھوں نے صرف راستہ بتانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ابو رغال نامی ایک شخص کو ان کی رہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا۔ اس کے برخلاف اہل مکہ نے ابرہہ کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ انھوں نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا تو چونکہ وہ اس کے دفاع کی طاقت نہ رکھتے تھے اس لئے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔

---

[۱] تاریخ الامم والملوک جلد دوم صفحہ ۱۱۴۔

(۴) مولانا فراہی نے کید کی یہ تشریح کی ہے :

"قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب الفیل نے ایک مخفی چال چلی تھی ۔ لیکن روایات میں اس کے حملے کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں مخفی چال کا کوئی پہلو نہیں ہے ۔ وہ اس کے برعکس قوت نمائش اور عربوں کی تذلیل کی ایک نہایت کھلی ہوئی کاروائی ہے ۔ البتہ قابل اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی چال) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں ۔ مثلاً :

۱۔ اس نے احترام کے مہینوں میں حملہ کیا ۔ کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ وخوں ریزی سے احتراز کرتے ہیں ۔

۲۔ اس نے مکہ میں .... ایسے وقت میں داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرنے میں مشغول ہونے ہیں ۔

۳۔ اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں قربانی میں مصروف ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آرہے ہوں گے ۔" [۱]

کید کا ترجمہ مخفی چال کرنا محل نظر ہے ۔ لغت میں اس کے ایک معنی مطلق تدبیر بھی بیان کئے گئے ہیں ۔ لسان العرب میں ہے : "الکید التدبیر بباطل او حق" (کید تدبیر کو کہتے ہیں خواہ حق ہو یا ناحق) قرآن میں بھی کید کا استعمال خفیہ چال کے لئے

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل ص۱۵

[۲] لسان العرب ابن منظور ۴/۳۸۹ مادۂ کید

خاص نہیں ہے بلکہ کبھی مطلق تدبیر کے معنی میں آتا ہے جیسے درج ذیل آیت میں:

"من كان يظن أن لن ينصره الله في الدنيا والآخرة فليمدد بسبب إلى السماء ثم ليقطع فلينظر هل يذهبن كيده ما يغيظ" (الحج ۔ ۱۵)

[جو شخص گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا اسے چاہئے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگا دے پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے]

... ری تدبیر کے معنی میں آتا ہے خواہ علانیہ ہی کیوں نہ ہو ۔ حضرت ابراہیم کے ... ی قوم کی کھلی سازشیں ڈھکی چھپی نہ تھیں ۔ انھوں نے علانیہ معبودوں کی دہائی ... حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں جھونک دینے کا منصوبہ بنایا ... ن نے اس کے لئے بھی 'کید' کا لفظ استعمال کیا:

"قالوا ابنوا له بنيانا فألقوه في الجحيم ، فأرادوا به كيدا فجعلناهم الأسفلين" (الصافات : ۹۷ ۔ ۹۸)

"قالوا حرقوه وانصروا آلهتكم إن كنتم فاعلين ، قلنا يا نار كوني بردا وسلاما على ابراهيم ، وأرادوا به كيدا فجعلناهم الأخسرين" (الانبیاء ـــــ ۶۸ ۔ ۷۰)

... کے معنی خفیہ چال کے مان بھی لیں تب بھی مولانا فراہی کی مذکورہ تشریح ... اس لئے کہ اوپر گزرا کہ ابرہہ کا حملہ موسم حج میں نہیں بلکہ محرم کے مہینے ... ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے قلیس نامی

گرجا گھر تیار کرایا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس گرجے کا حج کریں۔ اس اثنا میں کسی عرب نے گرجا گھر کو گندا کر دیا یا ممکن ہے خود اس نے سازش کر کے گندا کروا دیا ہو اور عربوں کی جانب منسوب کر دیا ہو۔ بہرحال اس طرح اس نے ظاہر میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ ورنہ وہ دل میں بہرصورت اسے ڈھانے کا عزم رکھتا تھا۔ فخرالرازی نے بھی کید کی یہی تشریح کی ہے۔[1]

کلام عرب سے استشہاد:

(۱) مولانا فراہی نے دسویں فصل کا عنوان یہ قائم کیا ہے "کلام عرب کی شہادت کہ سنگباری آسمان اور ہوا سے ہوئی" اور اس میں سات آٹھ شعرار کے اشعار نقل کئے ہیں۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ بیشتر اشعار میں سنگباری کا کوئی تذکرہ نہیں جن اشعار سے کسی نہ کسی صورت استدلال کیا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہیں:

فأرسل من ربهم حاصب يلفهم مثل لف القزم

(ابوقیس)

فلما أجازوا بطن نعمان ردّهم جنود الإله بين ساف وحاصب

(ابوقیس)

حمدت الله إذ عاينت طيرا وحصب حجارة تلقى علينا

(نفیل خثعمی)

پہلے دو اشعار میں 'حاصب' اور 'سافی' کے الفاظ ہیں۔ ان سے انھوں نے

---

[1] تفسیر کبیر رازی ۳۲/۹۹ دار احیاء التراث الاسلامی

یہ استدلال کیا ہے کہ عربی میں حاصب اس تند ہوا کو کہتے ہیں جو کنکریاں اور سنگریزے لا کر پاٹ دیتی ہے اور سافی اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد و غبار، خس و خاشاک اور درختوں کی پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے۔" دوسرے شعر کا ترجمہ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے یہ کیا ہے: جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کی شکل میں نمودار ہو کر انھیں پسپا کر دیا"[سے] یہ ترجمہ صحیح نہیں خود انھوں نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اس شعر کا جو ترجمہ کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے: "جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کے درمیان نمودار ہو کر انھیں پسپا کر دیا"[ھ] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی فوج جس نے لشکر ابرہہ کو پسپا کیا وہ ساف اور حاصب کے علاوہ کچھ اور ہے۔ ان فوجوں نے لشکر کو اس حال میں پسپا کیا جب تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ وہ خدائی فوج کیا تھی روایتوں سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ شعر مختلف کتابوں میں کچھ الفاظ کے اختلاف سے مذکور ہے۔ جیسے سیرت ابن ہشام میں ہے:

حمدت اللہ لما رایت طیرًا — وقذف حجارۃ ترمی علینا

[میں نے اللہ سے ڈرا جب میں نے پرندوں کو دیکھا۔ اس وقت ہمارے اوپر پتھر پھینکے جا رہے تھے]

سیرت ابن ہشام میں ہے:

حمدت اللہ اذ ابصرت طیرا — وخفت حجارۃ تلقی علینا

[میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب پرندوں کو دیکھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پتھر ہمارے اوپر نہ آپڑیں]

سے سورۂ فیل صـ ۶۳ ھ تدبر قرآن ہشتم صـ ۵۶۱

تمام اشعار نقل کرنے کے بعد مولانا فراہی نے لکھا ہے:

"ان اشعار کو غور سے پڑھو، یہ لوگ جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے بلکہ اس سنگباری کو حاصب اور ساف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں"[1]

پہلے دو شعروں کے بارے میں وضاحت گذری کہ شاعر نے لشکر کو پسپا کرنے کی نسبت ساف اور حاصب کی طرف نہیں بلکہ "جنود الالٰہ" کی طرف کی ہے۔ تیسرے شعر میں شاعر چڑیوں اور سنگباری کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ چڑیاں ہی سنگباری کر رہی تھیں۔ شعر کا جو انداز ہے وہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے۔ مولانا فراہی نے خود لکھا ہے کہ "شعراء کا عام انداز اجمال اور کنایہ کا ہوتا ہے وہ زیادہ تصریح و تفصیل نہیں کیا کرتے" شاعر کہتا ہے میں نے چڑیوں کو دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور اس وقت مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں پتھر ہمارے اوپر نہ آ گریں۔ چڑیوں کو دیکھتے ہی اللہ کا شکر ادا کرنے اور اپنے اوپر پتھر گرنے کا خوف کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ شاعر نے چڑیوں کو سنگباری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ کسی شاعر نے بصراحت چڑیوں کے پتھر پھینکنے کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ ابن ہشام نے عبداللہ بن قیس الرقیات کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں بصراحت چڑیوں کی سنگباری کا تذکرہ ہے:

کادہ الأشرم الذی جاء بالفیل   فولی وجیشہ مھزوم
واستھلت علیھم الطیر بالجندل   حتی کانہ مرجوم

---

[1] تفسیر سورۂ فیل ص ۶۶

ذاك من يغزه من الناس يرجع وهو فل من الجيوش ذميم[۱]

[اس کے خلاف (ابرہہ) اشرم نے سازش کی جو ہاتھی لے کر آیا تھا لیکن اسے منہ پھیر کر بھاگنا پڑا اور اس کا لشکر پسپا ہو گیا اور چڑیوں نے اس پر کنکریاں پھینکیں یہاں تک کہ اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے اس پر سنگ ساری کی گئی ہو۔ ہر اس شخص کا یہی حشر ہو گا جو خدا سے آمادۂ جنگ ہو گا۔ اسے شکست خوردہ ہو کر واپس بھاگنا پڑے گا]

یہ اشعار سیرت ابن ہشام میں موجود ہیں جو مولانا فراہی کی نظر سے ضرور گزرے ہوں گے لیکن معلوم نہیں کیوں مولانا نے انھیں لائق اعتنا نہیں سمجھا۔

(جاری)

۱؎ سیرت ابن ہشام اول ص ۶۳

نظریۂ ارتقاء اور دانشورانِ اسلام

(۲)

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

شیخ محمد عبدہ کی تاویلات کا اثر

چنانچہ شیخ فرید وجدی نے اپنی کتاب "دائرۃ معارف القرن العشرین" میں اور شیخ عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اگر نظریۂ ارتقاء علمی اعتبار سے ثابت ہو جائے تو پھر قرآن میں مذکور قصۂ آدم کو اس کے ظاہری نصوص سے پھیر دینا ممکن ہو جائے گا۔[۱] جب کہ یہ دونوں حضرات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآنی نصوص قطعی ہیں اور اس کی ظاہری آیات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تو اس کا حاصل وہی قرآن کی قطعیت میں شک و شبہ پیدا کرنا اور ارتیابیت کی دعوت دینا ہے۔ ایک طرف قرآنی نصوص پر ایمان رکھنے کا بھی دعویٰ ہے اور دوسری طرف اس کی قطعیت کے بارے میں تردد کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے۔

---

[۱] دیکھئے دائرۃ معارف القرن العشرین: ۸/۱۲۷ اور قصص الانبیاء: ص ۱۴

اس قصے کے بارے میں عام طور پر مصری علماء کا موقف یہی ہے۔

یہ ہے وہ صورت حال جس میں اس وقت اُمت مسلمہ گرفتار اور حیران و سرگرداں ہے کہ وہ کس کی بات مانے اور قرآن حکیم پر کس طرح ایمان لائے؟ سرسید احمد خاں نے جب نیچریت کا دروازہ کھولا تو اس وقت کے بعض علماء نے ان پر کفر کے فتوے لگائے اور ان کے خلاف ایک اچھا خاصہ لٹریچر تیار کر دیا[۵] مگر اس کے برعکس شیخ محمد عبدہ کے خیالات کو قبول عام حاصل ہوگیا۔ محض اس لئے کہ وہ ایک عالم دین اور عالم عربیت تھے۔ لہذا کسی نے بھی ان کے خلاف زبان نہیں کھولی۔ گویا کہ اُن کے علم اور اُن کی عربیت کی عبا نے اُن کے سارے عیوب چھپا دئے۔

بہرحال عالم اسلام میں ان دونوں حضرات کے خیالات کی بازگشت اکثر و بیشتر سنائی دیتی ہے۔ اور ہندو پاک کے بہت سے اہل علم اور دانشور بھی ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر اس کا ایک مختصر سا تنقیدی جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اور نظریۂ ارتقاء

علامہ اقبال نے اپنے خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam (تیسرے خطبے میں) جہاں پر قصۂ آدم سے بحث کی ہے تو وہ اسی تمثیلی انداز میں ہے جو ان دو پیش رووں کا انداز ہے۔ مگر اقبال چونکہ ایک فلسفی ہیں اس لئے اس قصے کو بھی ایک مکمل فلسفے کی شکل دیتے ہوئے اس پر کئی صفحات سیاہ کر دئے ہیں۔ اور اس کا حاصل بھی ان کے نزدیک وہی ہے کہ

---

۵ دیکھئے "اسلامی علوم وفنون ہندستان میں" ازمولانا سید عبدالحیٔ، ص ۳۲۱، ۱۹۶۹ء۔

اس سے مراد کوئی مخصوص انسان نہیں (بلکہ بحیثیت مجموعی نوعِ بشری کا تذکرہ ہے)۔[1]

اقبال کے مجمل بیان کی تشریح کرتے ہوئے اقبال کے ایک شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب "فکر اقبال" میں تحریر کرتے ہیں: "قرآن جس آدم کو پیش کرتا ہے وہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ انسانیت کا ایک تصور ہے۔ قرآن نے آدم کے لفظ کو انسانیت یا نوعِ انسان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔"[2]

علامہ اقبال کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہے، مگر جہاں تک اسلامی عقائد کا معاملہ ہے تو اس میں اقبال تو کیا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بخشا نہیں جاسکتا خواہ وہ کتنی ہی قد آور کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں محمد عبدہ اور اقبال سے زیادہ اسلام اور قرآن عزیز ہیں۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اس موقع پر اپنے اس قیاس کے لئے ایک قرآنی آیت کو بطور ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہتر ہے کہ اس موقع پر خود موصوف ہی کی عبارت پیش کردی جائے جو یہ ہے:

"..... آدم کا لفظ بے شک حذف نہیں ہوا، لیکن یہاں اس کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصور کی ہے جس کی تائید قرآن پاک ہی سے ہو جاتی ہے اور جس کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ"[3]

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ از سید نذیر نیازی، ص ۱۲۶، طبع جدید دہلی، ۱۹۸۶ء۔

[2] فکر اقبال، ص ۵۹۴، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۷۷ء۔

[3] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۲۶۔

ترجمہ: اور ہم نے تمھیں پیدا کیا پھر تمھاری صورت گری کی پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ (اعراف: ۱۱)

اقبال کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس آیت کریمہ میں ضمیریں جمع مخاطب کی لائی گئی ہیں اس لئے یہ کسی ایک انسان کا تذکرہ نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا تذکرہ ہو سکتا ہے۔ تو یہ شبہ دراصل قرآنی اسلوب اور اس کی بلاغت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس واقعہ سے قرآن درحقیقت پوری نوع انسانی کا شرف بڑھانا چاہتا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ ابوالبشر حضرت آدمؑ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، وہ مجموعی طور پر تمھاری سب کی تکریم کی غرض سے تھا، گویا کہ یہ واقعہ صرف آدم کے ساتھ نہیں بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ پیش آیا ہے اور اس کی نظیر قوم یہود سے قوم یہود سے طرز تخاطب میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۴۰ تا ۴۷ میں مختلف آیات ملاحظہ فرمائیے، جن میں دور رسالت میں موجود یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے تاریخی واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا وہ واقعات انھیں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ ان واقعات میں اللہ کے احسانات کو بھی گنایا گیا ہے جو قوم یہود پر ہوئے تھے اور ان کی لغزشوں کا تذکرہ بھی اس انداز سے کیا گیا ہے گویا کہ ان کا ارتکاب خود نزول قرآن کے دور میں موجود یہودیوں نے کیا تھا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى: اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ (بقرہ: ۵۷)

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ: اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے (بقرہ: ۶۱)

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ : اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہ طور بلند کیا۔ (بقرہ : ۶۳)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ : پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے۔ (البقرہ : ۷۴)

دیکھئے یہ نادر اس قسم کی دیگر آیات میں کس طرح ماضی کے واقعات کے ذریعہ زمانۂ حال کے لوگوں سے خطاب کیا جا رہا ہے، گویا یہ سب کچھ حال والوں کے ساتھ پیش آیا ہے! یہ قرآن حکیم کا ایک معروف اور بہت بلیغ اسلوب ہے۔ امام رازی نے بھی تقریباً یہی توجیہ اختیار کی ہے[1] اور علامہ زمخشری فرماتے ہیں: (وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ) یعنی خلقنا أباكم آدم طيناً غير مصوّر ثم صوّرناه بعد ذلك[2]

ڈاکٹر رفیع الدین اور نظریۂ ارتقاء

علامہ اقبال کے بعد انہی کے ایک نام لیوا دوسرے فلسفی ڈاکٹر محمد رفیع الدین میدان میں آئے اور اس سلسلے میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کی بعض کلامی تحریریں اگرچہ بہت وقیع اور فکر انگیز ضرور ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی کتاب "قرآن اور علم جدید" تعارض و تضاد کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے۔ جس میں موصوف نے قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقاء پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ نظریۂ ارتقاء کو غلط، ایک خلاق ہستی کا منکر اور کافرانہ نظریہ

---

[1] دیکھئے تفسیر کبیر : ۲۹/۱۴ — ۳۰، طبع جدید۔

[2] تفسیر کشاف : ۶۸/۲، مطبوعہ طہران۔

وغیرہ وغیرہ بھی کہتے ہیں، مثلاً :

"ڈارون ارتقاء کے اسباب کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ ان کو درست تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم کائنات کی تخلیق میں کسی قادر مطلق ہستی کے دخل یا عمل کو یا خود کائنات ہی کے کسی مقصد یا مدعا کو ذہن میں لا سکیں۔"[1]

اور ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں :

"ڈارون کا نظریۂ ارتقا مغرب کے تمام کا فرانہ فلسفیانہ نظریات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے .... سچ بات تو یہ ہے کہ مغرب کے فلسفیوں میں لامذہبیت اور دہریت کا جس قدر مواد اس وقت موجود ہے وہ ڈارون ہی کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ کلیہ بالخصوص کارل مارکس، میکڈوگل، فرائڈ، ایڈلر اور میکیاولی کے نظریات پر حاوی ہے ..... یہ فلسفے ڈارون کے نظریہ سے براہ راست نہیں تو اس سے بالواسطہ طور پر گہری طرح سے متاثر ہیں۔ ان سب کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔"[2]

مگر اس کے باوجود اس کو قرآن سے صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنا سارا زور بھی صرف کر دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں بعض متشابہات یا مبہم آیتوں کا سہارا لے کر محکمات تک کو متشابہات کے تابع کرتے ہوئے من مانی اور رکیک قسم کی تاویلات کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم کو سمجھنے کا یہ الٹا رخ ہے۔ اور صحیح رخ یہ ہے کہ

---

[1] قرآن اور علم جدید، ص ۳۷، طبع چہارم، ۱۹۸۱ء، لاہور۔

[2] ایضاً ص ۱۳۷ — ۱۳۸

اُس کی متشابہات کو اس کی محکمات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ مگر مصنف چونکہ "ارتقا" کی عینک چڑھائے ہوئے ہیں اس لئے انھیں قرآن کے ہر ہر لفظ میں ارتقا ہی ارتقا نظر آرہا ہے۔ میری نظر میں قرآن حکیم پر اپنے نظریات زبردستی لادنے کی یہ ایک بدترین مثال ہے جس کے ذریعہ قرآن فہمی کے اصولوں کا خون ہوتا ہے اور عقل سلیم اس سے اِبا کرتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نظریات پر اس وقت تفصیلی بحث کی تو گنجائش نہیں ہے، مگر مجموعی طور پر عرض ہے کہ موصوف کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ارتقا اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، مگر وہ غیر شعوری طور پر نہیں بلکہ شعوری طور پر ہوتا ہے۔ بس یہی ایک فرق نظر آتا ہے ان کے اور ڈارون کے نظریہ میں۔ مگر وہ اتنا کہہ کر ڈارون کے نظریہ کو مسلمان نہیں بنا سکتے۔ اس کے لئے تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے وہ ارتقا کو علمی اعتبار سے صحیح ثابت کرتے۔ اس کو مسلمان بنانے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔ جب ارتقا ہی ثابت نہیں ہے تو پھر قرآن عظیم کو نہایت درجہ بھونڈے طریقے سے کھینچ تان کر مطابق ارتقا ثابت کرنے کا کیا مطلب ہے؟ بلکہ اب تو خود ماہرین حیاتیات ہی اس غلط اور نامعقول نظریہ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے نظر آرہے ہیں، جیسا کہ پہلے باب میں ہم دیکھ آئے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث راقم سطور نے اپنی کتاب "قرآن حکیم اور نظریۂ ارتقا" میں کی ہے، جو زیر تکمیل ہے۔

احمد باشمیل اور اُن کا اُصول باطل۔

اسی طرح احمد باشمیل نامی ایک عربی داں نے ایک کتاب "الاسلام و نظریۃ داروِن" کے نام سے لکھی ہے، جس میں حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں یہ

عجیب بات بھی مذکور ہے کہ اگر کسی کو نظریۂ ارتقا کی تردید کرنی ہو تو وہ اس کو صرف اپنی طرف سے کرے قرآن کو درمیان میں نہ لائے، مبادا کہ یہ نظریہ آئندہ چل کر صحیح ثابت ہو اور قرآن متہم ہو جائے۔ مگر موصوف نے دوسری طرف خود ہی قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق دیتے ہوئے قرآن کے اُن قطعی نصوص میں بھی جو ارتقا کے خلاف ہیں، تاویل کر کے ان کو مطابق ارتقا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اللہ اللہ! ایک طرف تو احتیاط کا یہ عالم، اور دوسری طرف مرعوبیت کی یہ انتہا!! مگر سوال یہ ہے کہ موصوف نے اس موقع پر یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر نظریۂ ارتقا غلط اور باطل ثابت ہو جائے تو پھر خود اپنی توجیہ و تعلیل کا کیا ہو گا؟ کیا اس صورت میں بھی قرآن متہم نہیں ہو جائے گا؟ آخر یہ "ون وے ٹرافک" کیوں اور کس لئے؟

غرض اس غلط اور باطل اصول کا مطلب یہ ہوا کہ قرآنِ حکیم سے اس غیر ثابت شدہ نظریہ کی تائید تو کی جا سکتی ہے مگر اس کی تردید نہیں۔ گویا کہ قرآن عظیم مادہ پرستانہ نظریات کی تائید کے لئے نازل ہوا ہے ان کی تردید کے لئے نہیں۔ گویا کہ قرآن عظیم انسانی نظریات و مفروضات کے تابع ہے اور انسانی نظریات جس طرف بھی جائیں گے قرآن کو بھی خواہی یا ناخواہی اسی طرف جانا پڑے گا۔ یہ عجیب و غریب قسم کی قرآن دانی ہے، جو قرآن حکیم جیسی باطل شکن کتاب کے ساتھ ایک مذاق ہے۔

واضح رہے کہ اس موقع پر بحث محض نظریات و مفروضات کے سلسلے میں ہے۔ اس کے برعکس علوم طبیعی (NATURAL SCIENCES) کے وہ ثابت شدہ حقائق جو مسلسل تجربے و مشاہدے کے باعث "قوانین فطرت" کا درجہ حاصل کر چکے ہوں، ان کا انکار مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے

حقائق کی قرآن حکیم تصدیق وتائید کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو خود علوم جدیدہ قرآن حکیم کی ابدی سچائیوں کی تصدیق وتائید کرتے ہیں۔ راقم سطور نے اس موضوع پر اپنی دیگر تصانیف میں تفصیلی بحث کی ہے۔

مولانا آزاد اور نظریۂ ارتقا

اس سلسلے میں دو اہم شخصیتوں کا تذکرہ کئے بغیر یہ جائزہ نامکمل رہے گا۔ ان میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی ہیں۔ چنانچہ اول الذکر نے اپنی تفسیر میں جہاں پر ربوبیت کی تفصیل کی ہے تو وہاں پر انھوں نے نظریۂ ارتقار کا تذکرہ اس حیثیت سے کیا ہے گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اگرچہ موصوف نے آدم کی شخصیت کو تمثیلی قرار دینے سے احتراز کیا ہے، مگر ارتقا کی تشریح بالکل اسی انداز میں کی ہے جس طرح کہ مادہ پرست کرتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا ایک اولین خلیہ یا بیج سے ہوئی جس کو پروٹوپلازم کہتے ہیں۔ پھر اس میں ایک مدت مدید کے ارتقا کے بعد ادنا سے اعلیٰ درجے کی کڑیاں ظہور میں آئیں یہاں کہ لاکھوں سال کے ارتقا کے بعد انسان کا ظہور ہوا۔ پھر یہی نہیں بلکہ موجودہ انسان کے بعد بھی موصوف کے نزدیک ارتقا ممکن ہے[1]

اور موصوف نے یہ سب دلیل آخرت کے ثبوت کے طور پر تحریر کیا ہے مگر علمی اعتبار سے اس سے آخرت کا ثبوت تو کجا خود ربوبیت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود بخود ترقی کرتے کرتے آپ سے آپ ظاہر ہوتی جائے اُس میں

---

[1] دیکھئے ترجمان القرآن: ۱/۴۳، مطبوعہ دفتر ترجمان دہلی، ۱۳۵۰ھ

ملا ربوبیت کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ اس اعتبار سے ارتقا ربوبیت کی نقیض ہے ورنہ ربوبیت ارتقا کی۔ مادہ پرست نظریۂ ارتقا سے اسی لئے چمٹے ہوئے ہیں کہ انھیں یک خالق یا برتر ہستی کے وجود کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ ارتقا علمی اعتبار سے بجائے خود ثابت نہیں ہے۔ مگر مادہ پرست اس نظریہ سے دست بردار ہونے کے لئے کسی بھی طرح تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ بصورت دیگر انھیں ایک خلّاق ہستی (CREATOR) کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر چونکہ انھیں خدا کے نام ہی سے ایک قسم کی چڑ سی ہوگئی ہے لہٰذا وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ لہٰذا ایک مادہ پرست کا اس نظریہ کو اپنانا اور اس سے چمٹے رہنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر ایک عالم دین کا اس سے اس حد تک متاثر ہو جانا گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، بالکل ناقابل فہم ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ اس سے خالق ارض وسما کی ربوبیت و خلّاقیت پر حرف بھی آتا ہو۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور نظریۂ ارتقا

اب رہا معاملہ علامہ سید سلیمان ندوی کا، تو مجھے ندوی برادری کا ایک فرد ہونے اور بیک واسطہ علامہ موصوف کا شاگرد ہونے بلکہ آپ کی متعدد تصنیفات سے تلمیذانہ طور پر مستفید ہونے کے باوجود اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے کہ موصوف سے بھی اس مسئلے میں کچھ لغزش اور بے احتیاطی ہوگئی ہے۔ چنانچہ موصوف کا ایک مضمون "مسئلہ ارتقا اور قرآن مجید" کے عنوان سے "الندوہ" کے جنوری ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، جس میں موصوف نے بعض قرآنی آیات کو "مطابق ارتقا" دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس سلسلے میں دیگر علماء کی طرح موصوف کے بیانات میں ادعائیت نہیں ہے،

بلکہ اس کو ایک ممکنہ تاویل قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے مضمون کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"علماء کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہم نے مذکورہ بالا آیتوں کے جو معنی قرار دیئے ہیں، ان کا مقصد صرف فلسفیانہ مذاق والوں کو خاموش کردینا ہے، گو مفسرین ان آیتوں کے اور معنی سمجھتے ہیں، اور مجھے ان کی بھی صحت سے انکار نہیں لیکن عقل و نقل کی تطبیق کی غرض سے ہم نے جو معنی لئے ہیں وہ بھی غلط نہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ دونوں معانی کے متحمل ہیں۔"[1]

اصل میں سید صاحب بھی ارتقائیوں کے پروپگنڈے سے متاثر نظر آتے ہیں اور تاویل کے سلسلے میں انھوں نے بھی تقریباً مصری علماء کا موقف اختیار کیا ہے۔

نظریہ ارتقا کے سلسلے میں یہ ساری غلط فہمی اس بنیاد پر ہے کہ یورپ کے تمام سائنس دانوں نے اس مسئلے کو گویا کہ اجماعی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی نے سید صاحب کے مذکورہ بالا مضمون سے سات ماہ پہلے "الندوہ" ہی کے جون ۱۹۰۷ء کے شمارے میں "مسئلہ ارتقا اور ڈارون" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اس میں اس کی طرف اشارہ اس طرح کیا تھا:

"لیکن ایسا مسئلہ جس کو تقریباً یورپ کے تمام حکماء تسلیم کرتے جاتے ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے۔"[2]

واضح رہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے یہ مضمون محض فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تحریر کرتے

---

[1] مقالات سلیمان: ۳/۱۷۴، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۹۷۱ء

[2] مقالات شبلی: ۷/۶۲، ۱۹۵۳ء

چھیڑے ہیں اس سلسلے میں بعض حکمائے اسلام کے نظریات بیان کئے ہیں۔ مگر اس میں قرآن مجید سے نفیاً یا اثباتاً کوئی استدلال نہیں کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی نوعیت کا مضمون ہے۔

غرض خود سید صاحب نے بھی اپنی حسب ذیل عبارت کے ذریعہ کچھ اس قسم کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ مسئلہ اجماعی طور پر طے شدہ ہے:

"مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو مسئلہ ارتقا کو نہ صرف صحیح سمجھتا ہے بلکہ اس مسئلہ کی صحت کا اس کو اس درجہ اعتقاد ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جب قرآن مجید مسئلہ ارتقا کا منکر ہے تو کون مانے گا کہ قرآن پاک جدید فلسفے کے بالکل مطابق ہے؟ یورپ کے کل علمائے طبیعیات بھی اس گروہ کے ہم زبان ہیں" [1]

یہ ہے وہ پس منظر جس میں یہ مضامین اضطراری طور پر سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ یورپ کے تمام حکماء اور کل علمائے طبیعیات اس نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے اور علمائے اسلام کی ایک خاص تعداد مغرب کے اس پروپیگنڈے سے متاثر نظر آتی ہے جب کہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ماہرین حیاتیات (BIOLOGISTS) کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو اس کو محض ایک مفروضہ (HYPOTHESIS) سمجھتی ہے حتیٰ کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس نظریہ کے حامی ہیں، جب کہ متعدد سائنس داں اور ماہرین معقول دلائل کی بناء پر اس کو غلط بھی قرار دیتے ہیں لہذا یہ کوئی اجماعی یا طے شدہ مسئلہ نہیں ہے۔

---

[1] مقالات سلیمان: ۳/۱۶۴

بہرحال سید سلیمان ندوی کے مضمون پر اگر علمی دیانت داری کے ساتھ تبصرہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ موصوف اس سلسلے میں مصری علماء ہی کی طرح تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ ارتقا بجائے خود ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس سلسلے میں جو دلائل بیان کئے جاتے ہیں ان سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا[1] مگر پھر خوشاہی یہ کہتے ہوئے کہ "اگر مسئلہ ارتقا صحیح بھی ہو تو قرآن اس کا منکر نہیں" بعض قرآنی آیات کی تشریح اس انداز سے کرتے ہیں گویا کہ قرآن ارتقا کی تائید کر رہا ہے۔ اور اس سلسلے امام راغب اصفہانی کی ایک مجمل عبارت کا حوالہ بھی دیا ہے[2]۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب جیسے صائب اور راسخ العقیدہ صاحب علم کی نگارشات میں یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحریر ہے جو ذرا "ڈھیلے ڈھالے" قسم کی ہے۔ مگر جیسا کہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے "مقالات سلیمان" کے دیباچے میں تصریح کی ہے کہ یہ مضمون سید صاحب کے ابتدائی دور کا ہے، جو بعد کے ذوق سے مختلف ہے۔

ارتقا کا جادو چل نہیں سکتا

واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے بعض علمی حلقوں ــــ خصوصاً مصری علماء کے نزدیک ــــ یہ ایک چلا ہوا فقرہ بلکہ ایک فیشن سا بن گیا تھا کہ "نظریۂ ارتقا اول تو ثابت نہیں ہے، اور اگر ثابت ہے تو قرآن اس کا منکر نہیں ہے۔" مگر سوال یہ ہے کہ جب ارتقا بجائے خود ثابت نہیں ہے تو پھر اس کو صحیح ثابت کرنے کا بیڑا ہی کیوں اٹھایا جائے اور اس کو مستقبل کے مفسر کے حوالے کیوں نہ کر دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ جو چیز

---

[1] و [2] مقالات سلیمان، ص ۱۶۷ ــ ۱۶۹

بجائے خود ثابت نہیں ہے اس کو ثابت کرنے کے آخر ہم خود مکلّف کیوں ہوں؟ اور وہ بھی قرآن عظیم جیسی کتاب میں تاویل کر کے! فرض کیجئے زمانۂ مستقبل میں اگر تمام سائنس داں اس نظریہ سے اپنی دست برداری کا اعلان کر بیٹھیں، تو کیا اس غلط تاویل کا برا اثر نہیں پڑے گا؟ اور اس کی وجہ سے گمراہ فرقوں اور طبقوں کو اپنی من مانی تاویلات کے لئے بڑھاوا نہیں ملے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک کمزور موقف ہے جس کی وجہ سے قرآن حکیم بجائے خود مشکوک ہو جائے گا اور اس کی قطعیت متاثر ہو جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک "لاریب فیہ" صحیفہ ہے جس میں اس قسم کی چناں وچنیں کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

قرآن سے کوئی بات ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بغیر کسی تاویل یا انحراف کے صرف اس کے ثابت شدہ نصوص یا واضح بیانات (جو اصول فقہ کی زبان میں عبارۃ النص اور اشارۃ النص وغیرہ کہلاتے ہیں) سے استدلال کیا جائے۔ اور مجمل ومبہم آیات (متشابہات) کو مفصل یا غیر مبہم آیات (محکمات) کی روشنی میں سمجھا جائے۔ ان اصولوں کی رو سے بغیر کسی تاویل کے جو مفہوم ثابت ہوگا وہ قابل استدلال ہوگا اور اس کو قرآن کا صحیح مفہوم ومنشا قرار دیا جائے گا۔ تمام علمائے حق کا طریقہ کار یہی رہا ہے اور اسی میں سلامتی ہے۔

غرض خدا کی شان دیکھئے جس نظریہ کے متعلق ایک "متفق علیہ" مسئلہ ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا وہ لگ بھگ ایک صدی گزر جانے کے باوجود اب تک نہ صرف ایک مفروضے سے آگے بڑھ نہیں سکا ہے، بلکہ اب تو محققین اور اہل بصیرت اس مفروضے سے اپنی بیزارگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ علمی حیثیت سے ثابت نہیں ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے جتنے بھی طریقے اپنائے جا رہے ہیں، ان سب میں مسلسل ناکامی ہو رہی ہے۔

اور اس بے بنیاد نظریہ کو محض مادہ پرست ہی، مذہب کی ضد میں، اب تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ورنہ اس میں اب کوئی جان باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں محققین کے اعتراضات کا ایک دفتر سامنے آچکا ہے۔ انشاءاللہ اس موضوع پر تفصیلی بحث اپنی زیر تکمیل کتاب "قرآن حکیم اور نظریۂ ارتقا" میں پیش کی جائے گی۔

مطبوعات ندوۃ المصنفین

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادارے کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے انبیاء (علیہم السلام) کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات قرآن کریم کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی کتاب کی چار ضخیم جلدیں ہیں۔

جلد اول میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علی نبینا وعلیہما السلام کے مکمل حالات آگئے ہیں۔ صفحات ۵۴۴

جلد دوم۔ حضرت یوشع علیہ السلام سے لیکر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک ان تمام پیغمبروں کے حالات سوانح حیات اور دعوتِ حق کا بیان ہے۔ صفحات ۲۸۰

جلد سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اور تاریخی واقعات کا عبرت آموز بیان ہے۔ صفحات ۴۱۲

جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک کی اور دعوت کا مفصل حال اور محققانہ بیان مع دیگر ضروری حالات و واقعات اور مباحث مہمہ۔ صفحات ۵۲۰ متوسط تقطیع ۲۰x۲۶/۸

قیمت جلد اول طبع آفسیٹ	قیمت -/۴۵	مجلد	=/۵۵
" جلد دوم "	" =/۳۵	"	=/۴۵
" جلد سوم "	" =/۴۵	"	=/۵۵
" جلد چہارم "	" =/۵۰	"	=/۶۰
کامل چار جلدیں	" =/۱۷۵	"	=/۲۱۵

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۱۷۸۴ مجموعی قیمت ۱۷۵/-) =/۲۱۵

ابوحیان توحیدی

حیات وخدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۴)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی ایم، اے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی
علی گڈھ

علمی کارنامے۔

علم نحو: "کان اماماً فی النحو واللغۃ والتصوف، فقیھاً مورخاً" [۴۶]
"وہ علم نحو، لغت اور تصوف کا امام تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ فقیہہ اور مؤرخ بھی تھا"

اس نے علم کے ہر میدان میں اپنا ایک منفرد اور مستقل مقام پیدا کیا۔ اور ہر میدان میں اپنی اعلیٰ صلاحیت، قابلیت اور قدرت کا لوہا تسلیم کروالیا۔ مختلف وقیع علوم میں اپنے فنی کمالات کے جوہر دکھائے۔

علم نحو ایک ایسا علم ہے جس کے بنیادی اصولوں اور فروعی اقسام سے پوری طرح واقف ہوئے بغیر کوئی شخص عربی زبان وادب میں پوری مہارت حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ہی ایک صاحب طرز ادیب اور ناقد بن سکتا ہے۔ لہٰذا ایک ادیب کے لیے سب سے پہلے نحوی اصول وضوابط اور صرفی قواعد واصطلاحات سے مکمل آگہی ناگزیر ہے۔ امام سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں ابوحیان توحیدی کو علم نحو کے اہم ستونوں میں سے ایک ستون قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ

توحیدی نے ابوسعید سیرافی جیسے یکتائے روزگار نحوی سے علم نحو کا درس لیا جو اپنے وقت کے امام نحو تھے۔ توحیدی نے ان کی تین ہزار صفحات پر مشتمل "الکتاب" کی شرح کا مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ یونس کی "کتاب اللغات" کا مطالعہ بھی کیا۔ علی بن عیسی الرمانی النحوی سے بھی مختلف نحوی مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے۔ ابوحیان کی تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سارے نحویوں سے واقف تھا اور نحو کے نہایت باریک اور دقیق مسائل پر بھی اس کی نظر تھی جو کسی نحوی کے لیے وجہ امتیاز ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مخالف و موافق دونوں ہی مکاتیب فکر کے نظریات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ابتدائی دور کی تصنیفات خاص طور سے "البصائر والذخائر" "الامتاع والمؤانسۃ" میں بہت سارے نحوی مسائل پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ نحو اور منطق کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ نحو کا تعلق فطرت و طبیعت سے ہے جب کہ منطق کا عقل و خرد سے "المقابسات" میں تین فصلوں کے اندر زمان و مکان کے اعتبار سے نحو و منطق کی ترقیات اور اس میں رونما ہونے والے تغیرات اور اسی طرح کے دیگر نحوی مسائل پر فلسفیانہ انداز میں مدلل گفتگو کی ہے اور اس نے تفصیل سے بتایا ہے کہ حرکتوں کی تبدیلی سے معانی کیونکر تبدیل ہو جایا کرتے ہیں اور نحوی اصول و قواعد سے عدم واقفیت کی صورت میں انسان کس طرح معانی و مفہوم کو سمجھنے میں غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس نے وقت کے بڑے ادیبوں پر نحو و صرف کی کمزوری کا الزام لگایا ہے۔ اس نے ابواسحاق صابی، ابن عباد اور ابن عمید پر علم نحو سے بخوبی واقف نہ ہونے پر لعن طعن کیا ہے۔ چنانچہ ابوحیان توحیدی کا شمار اس دور کے نحو و لغت کے علماء میں ہوتا تھا۔ اس نے الگ سے نحو پر کوئی کتاب تو نہیں تصنیف کی بلکہ زیادہ تر نحوی مسائل کا تذکرہ علم و فلسفہ اور کلام کے ضمن میں

ملتا ہے۔ اگر ان متفرق چیزوں کو ایک جگہ یکجا کر دیا جائے تو نحو کی ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ اس نے بصائر میں، فعل، اقسام فعل، علامت رفع، نصاب جر، اقسام اسم اور صفت وغیرہ سے بحث کی ہے۔

علم کلام و فلسفہ: یاقوت حموی، السبکی، ابن حجر العسقلانی اور دیگر مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ابوحیان توحیدی اپنے وقت کا ماہر متکلم و فلسفی تھا۔ اس کی تصنیفات میں نہ صرف یہ کہ علم کلام و فلسفہ کے مباحث کی تفصیل ملتی ہے بلکہ اس نے اپنے عہد کے بڑے متکلمین پر تنقید بھی کی ہے اور ان کا مذاق بھی اڑایا ہے جس سے علم فلسفہ و کلام میں اس کی بصارت و بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ علم کلام کے اندر لیاقت و مہارت کا پیدا ہونا فطری بات ہے کیونکہ اس نے ابوسلیمان المنطقی، ابواسحاق الصفیبی جیسے وقت کے بلند پایہ فلاسفہ کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ ابوحیان کا خیال تھا کہ ہر چیز کی اصل حقیقت و ماہیت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے پر فلسفیانہ و منطقیانہ انداز میں گفتگو کی جائے۔ مگر اس کے ساتھ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ دینی و مذہبی مسائل میں فلسفے کی بنیاد پر غور و فکر کا نتیجہ شک و شبہ میں مزید اضافہ، اور اختلاف و انتشار کو ہوا دینے کے بجائے اور کچھ نہیں نکلتا ہے۔ اس نے اشعری، معتزلی، امامی اور دیگر متکلمین کے گمراہ کن فلسفیانہ تاویلات کی تردید کی وہ ایسے لوگوں کا سخت مخالف تھا جو دین کے بنیادی اصول و کلیات کو علم کلام کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ علم کلام و فلسفہ کے مباحث الگ ہیں اور دینی اصول و کلیات اور مذہبی عقائد و تعلیمات علیحدہ۔ دین و شریعت کو فلسفے کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تحریک اخوان الصفا کا بھی مخالف تھا کیونکہ یہ لوگ فلسفہ و شریعت کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بتاتے تھے۔

اس فلسفہ وعلم کلام کے درمیان فرق کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ فلسفہ کا شریعت سے اور شریعت کا فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں دونوں کے مباحث و معانی اور موضوعات و مضامین جداگانہ ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا تھا کہ اگر علم کلام کی بنیادوں پر شریعت کی توضیح وتشریح کی گئی تو شریعت کا ایک تہائی حصہ ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ شریعت کی بنیاد تو حسن ظن، اخلاص ویقین اور غیب پر ایمان میں ہے۔ اور جس کسی نے شرعی امور کو عقل کی کسوٹی پر کسنا شروع کیا اور قیاس ورائے کو اصل بنیاد بنا لیا تو اس نے پریشانیوں اور مصیبتوں کو اپنے سر مول لے لیا۔ اس نے فرعی موضوعات کو چھوڑتے ہوئے علم کلام سے متعلق مسائل پر اظہار خیال کیا اپنے زمانے کے مشہور متکلمین سے مناظرے بھی کئے لیکن اس نے علم کلام کو کبھی صحیح راستہ اور ہدایت کی دلیل تصور نہیں کیا۔ ماہر متکلمین و فلاسفہ سے علمی مناظرے علم کلام میں اس کی مکمل دسترس کی دلیل ہیں۔

تصوف وطریقت: ابوحیان توحیدی کی سیرت اور ان کی ادبی خدمات کا مطالعہ کرنے والا شخص تصوف وطریقت کے میدان میں اس کی نمایاں سرگرمیوں سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی کے بیشتر حصوں پر تصوف کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اسی طرح اس کی ادبی خدمات، تحقیقی تصنیفات و علمی تالیفات میں بھی تصوف کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ بیشتر ترجمہ نگاروں نے اس کے وصف کو سب سے زیادہ نمایاں طور پر پیش کیا ہے اور بعض سوانح نگاروں نے تو اس کے مختلف صفات میں سے صرف اسی ایک صفت کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ یاقوت حموی نے "معجم الادباء" اور السبکی نے "طبقات الشافعیہ" میں اس کو شیخ طریقت اور امام صوفیاء کے نام سے پکارا ہے۔ "شیراز نامہ" اور "شد الازار" میں تو ابوحیان کو شیراز کے چند سرکردہ صوفیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے رفقاء کی اکثریت فقراء و

مساکین اور دنیوی لذات وتعیشات سے کنارہ کش رہنے والے افراد کی تھی۔
ابن سعدون، جعفر بن حنظلہ، ابن السراج، ابن الجلاء، ابوزید المروزی وغیرہ کا تعلق
وقت کو تصوف کے میدان سے تھا۔ اور یہ سب کے سب اس کے قریبی دوستوں
میں تھے۔ اس کے اساتذہ میں سے ابوسعید السیرافی، ابوسلیمان المنطقی اور یحییٰ
بن عدی وغیرہ کا شمار بھی کبار صوفیاء میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی
کے زیادہ حصے پر تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ اگر ابوحیان توحیدی نے زندگی کے
چند لمحات وزراء وحکام کے آستانوں پر دستک دینے، ان کے درباروں کا چکر
کاٹنے میں نہ گزارا ہوتا، عوام وخواص کو اپنی نقد وتنقید کا نشانہ نہ بنایا ہوتا۔
ان کی ہجو اور برائیاں بیان کرنے سے باز رہا ہوتا اور اپنی تالیفات وکتابوں
میں بعض فحش اور سوقیانہ چیزوں کو داخل نہ کیا ہوتا تو لوگ اسے بالاتفاق صوفیاء
کا امام تصور کرتے۔ یہی وہ چند چیزیں ہیں جو اس کے نفس کی صفائی، اخلاق کی
بلندی، طلب آخرت کے سلسلے میں اخلاص کو مشتبہ بناتی ہیں۔ تصوف کے
سلسلے میں اس کا کوئی خاص مکتبۂ فکر نہ تھا اور نہ ہی اس نے کسی جدید مکتبۂ فکر
کو ایجاد کیا۔ بلکہ اس نے تمام ہی طریقوں کا مطالعہ کیا اور ان میں بہتر طریقے کو
سراہا اور اس کی اتباع کی۔ ابوحیان نے تصوف کے مختلف موضوعات پر کتابیں
لکھیں اور زندگی کے آخری ایام تک فلسفیانہ اندازیوں کی تصنیفات کی جمع
ترتیب میں مشغول رہا۔

ادبی مقام: کوئی بھی بہترین ادب دو طرح کے جذبات سے خالی نہیں ہو سکتا یا تو اس کے اندر الفت ومحبت کے جذبات ہوں
گے یا پھر نفرت وحسد کے احساسات کی آمیزش ہوگی۔ عربی زبان وادب کی تاریخ
کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ کوئی ایک شاعر، خطیب، مصنف یا

انشار پرداز ایسا نہیں گذرا جس کے افکار و خیالات اور تصنیفات و تخلیقات میں دوستی والفت اور عشق و محبت کی گرمی یا کینہ وحسد اور بغض و نفرت کے شعلے موجود نہ رہے ہوں۔ کسی فنکار کے اندر اس طرح کے مثبت یا منفی جذبات تعمیری یا تخریبی خیالات کے رونما ہونے میں گردوپیش کے ماحول اور خود اس کے ذاتی حالات و کوائف کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اگر فنکار ذہنی اعتبار سے مطمئن و پرسکون، مالی اعتبار سے خوشحال و فارغ البال اور کسی طرح کے رنج و الم، فکر و غم یا اضطراب و بے چینی کا شکار نہیں ہے تو ظاہر ہے اس کی تخلیقات میں تعمیری رجحان اور خوشی و مسرت کے جذبات کا اظہار ہوگا لیکن اگر اس کے برخلاف اگر وہ ذہنی طور پر مضطرب و پریشان اور معاشی طور پر بد حال ہے تو اس ذہنی کرب اور معاشی بحران کی جھلک کا اس کی تخلیقات میں ظاہر ہونا ایک فطری امر ہے۔

ابوحیان توحیدی کا تعلق ادبار و انشار پردازوں کے اس دوسرے زمرے سے ہے کہ وہ سراپا فقر و فاقہ اور کلفت و مصیبت کی پیداوار تھا۔ اصحاب اقتدار اور اہل ثروت و دولت کی طرف سے مسلسل بے اعتنائیوں نے اس کے اندر باغیانہ ذہنیت پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ادبی تخلیقات کے اندر امرار و سلاطین کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و نفرت کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ اس کی تحریروں میں فقر و غنا، امارت و غربت اور نعمت و نقمت کی صحیح عکاسی ملتی ہے۔ ابوحیان توحیدی کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت دنیا و اہل دنیا کے خلاف بغض و کینے کا اظہار ہے۔ عہد شباب میں ابن عمید اور صاحب بن عباد وغیرہ کی سخاوتوں کی حکایات سن کر دنیوی عیش و آرام اور مزید مال و دولت کے حصول کی امید میں ان کے آستانے پر قسمت آزمائی کی۔ لیکن یہاں اس کے آرزوؤں کی تسکین اور تمناؤں کی تکمیل کے بجائے اس کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی، اس کی انا و خودداری کو

طرح مجروح ہوئی۔ اسی طرح بعد کی زندگی میں بھی مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا جس نے اس کے خیالات کو مضمحل اور افکار کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر زکی مبارک کا خیال ہے کہ ابوحیان توحیدی نے ادب کو حصول رزق کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ تصور کر لیا تھا[۱۴۲] اس نے پوری زندگی حصول رزق کے تگ و دو میں لگا دی۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کی قدر افزائی کی اور اسے مال و دولت سے نوازا۔ اس نے بھی اس احسان کے بدلے میں اُن کی خوب خوب تعریف کی، ان کی شان میں مدحیہ قصائد تحریر کیے۔ اور جن لوگوں نے اس کی عدم توقیری کی اور اسے انعام و اکرام سے نہیں نوازا تو پھر ان کے خلاف اپنے دل میں بغض و نفرت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو باہر نکلنے سے نہ روک سکا۔

وہ آرام زندگی سے کافی پریشان نظر آتا ہے تصنیفات میں زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکوہ کرتا ہے اور رسائل و خطوط میں اپنی محرومیوں کا رونا روتا ہے اس کی تمام ہی تحریروں میں یاس و قنوطیت اور شکوۂ زمانہ کا پہلو غالب ہے۔ اس کے مصائب و پریشانیوں کی داستان اس قدر طویل ہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی رہا ہوگا جب کہ وہ فارغ البال اور خوشحال رہا ہوگا دوستوں کی رفاقت ملی ہو اور اعزہ و اقربا کے خلوص و محبت سے لطف اندوز ہوا ہو۔ اسی طرح "کتاب المحاضرات" کے اندر ابوحیان نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ "میں اور نصیبی دونوں نے مل کر ایک صاحب ثروت سے ملاقات کا فیصلہ کیا جس کے جود و سخاوت کا شہرہ تھا کہ اُس نے آج تک کسی سائل کو اپنے در سے خالی ہاتھ واپس نہیں کیا۔ اور صاحب علم و فن حضرات کا قدردان اور ان پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے۔ ابوحیان کا کہنا ہے کہ مسلسل پندرہ مرتبہ گھر کا چکر لگانے کے بعد کہیں جا کر اس سے ملاقات کا نمبر آیا۔ لیکن نصیبی نے تھک کر میرا ساتھ

دینے سے انکار کر دیا۔

یہ تو اس کی ادبی سرگرمیوں کی معمولی جھلک تھی جس سے کسی حد تک اس کے بلند مقام اور مخصوص ادبی مقام کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ ابوحیان توحیدی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے علم و ادب کے مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں اور ان سب میں زبان و بیان کے فنی محاسن اور ادب کی اعلیٰ ترین خوبیوں کو بہت حد تک بڑی کامیابی کے ساتھ برتا۔ مثال کے طور پر ابوحیان کی یہ عبارت میں نے شاعر الخوارزمی کو کہتے ہوئے سنا۔

اللهم انفق مسوق الوفاء فقد كسدت واصلح قلوب الناس فقد فسدت، ولا تمتني حتى تبور الجهل كما بار العقل، ويموت النقص كما مات العلم، تو میں نے کہا "اللهم اسمع واستجب" فقد برح الخفاء وغلب الجفاء، وطال الانتظار، ودوقع الياس ومرض الامل، واستغنى الرجاء ۔[۱]

علم و ادب کے میدان میں اس کے بلندیِ مقام کو ثابت کرنے کے لیے اس امر کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ اس کا تعلق، اخوان الصفا سے بھی تھا جو چوتھی صدی ہجری کی سب سے بڑی علمی و ادبی تحریک تھی۔ لیکن چونکہ یہ تحریک امراء وسلاطین کی نظر میں نہایت معیوب و ناپسندیدہ تھی اس لیے اس کے تمام امور صیغۂ راز میں رکھے جاتے، وہ اور اسی طرح اس تحریک کے مبلغین و دعاۃ بھی عوام و خواص کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ رسائل اخوان الصفا کی علمی و ادبی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ رسائل عربی ادب و ثقافت، فلسفہ و کلام، تصوف و طریقت، طب و سائنس اور سیاست و حکومت کے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان رسائل کے مصنفین اور مؤلفین کے بارے میں

کوئی قطعی تاریخی ثبوت نہیں ملتا، لیکن مؤرخین کا خیال ہے کہ ابو حیان کا تعلق مصنفین کے اس زمرے سے تھا۔

چوتھی صدی ہجری کی نثری خصوصیات:

چوتھی صدی ہجری میں عربی نثر اپنے ابتدائی وارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے اندر وہ تمام اوصاف اور خوبیاں ابھر کر سامنے آگئی تھیں جو کسی نثر کے فنی نمونے کے لیے ناگزیر ہوا کرتی ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں عربی نثرنگاری کے اندر کچھ ایسی نمایاں خوبیاں پیدا ہوئیں جن کے بنا پر یہ عہد گذشتہ زمانوں سے ممتاز اور منفرد ہو جاتا ہے وہ تمام نثری خصائص اور فنی محاسن جن کی پہلی، دوسری، تیسری ہجری میں ایک جھلک ملتی ہے اس صدی میں پہنچتے پہنچتے کمالی صورت اختیار کرلیتی ہیں ابن عمید، خوارزمی، بدیع الزماں جیسے بلندپایہ صاحب طرز انشاء پرداز اسی دور کی پیداوار ہیں۔

اس دور کی نثرنگاری میں پہلی چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ صنائع وبدائع کی طرف بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ ان کے استعمال میں سابقہ حدود دپابندیوں کی رعایت نہ کرتے ہوئے اسراف اور مبالغہ کی سرحدوں سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کی گئی۔ بلاغت کے مختلف اصولوں توریہ، موازنہ، مطابقہ اور جناس وغیرہ کا لحاظ کیا گیا۔ محسنات لفظیہ اور محسنات معنویہ کے اصول وضع کیے گئے۔ ہر طرح کے رسائل اور تصنیفات میں مسجع بندی کے اصولوں کا پورا لحاظ کیا گیا۔ یہاں تک کہ مناظر اور دینی مسائل کے افہام وتفہیم کی غرض سے لکھے جانے والے خطوط کی عبارت بھی مسجع ہوتی۔ اس دور کے انشاء پرداز ہر قسم کے موضوعات میں مسجع کے اصولوں کی مکمل پابندی کی گئی۔ چنانچہ بدیع الزماں ہمدانی، ابوبکر خوارزمی اور شریف رضی کی

ابو حیان توحیدی کی تحریروں میں بھی یہ خصوصیت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اس دور میں دوسری اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ رسائل کی ابتداء عمدہ اشعار اور برگزیدہ امثال سے ہونے لگی، جس طرح کہ شروع کے ادوار میں لوگ رسائل کی ابتداء حمد و سلام سے کرتے تھے اور اختتام بھی السلام علیکم" پر کرتے تھے۔ لیکن اس دور میں بہترین اشعار نے اس کی جگہ لے لی۔ ابتداء اور انتہا دونوں ہی اشعار کے ذریعہ ہونے لگی۔ اشعار کے انتخاب میں اس بات کی رعایت رکھی جاتی کہ وہ خط کے اندر مذکورہ موضوع اور مفہوم سے متعلق ہوں۔

تیسری اہم تبدیلی یہ ابھر کر سامنے آئی کہ اس دور کے انشاء پردازوں نے شاعری کے اصناف سخن غزل، مدح، ہجو، فخر اور وصف نگاری کو نثری موضوعات میں تبدیل کر دیا۔ اور پھر اس طرح نثر کے اندر شاعری کی تمام تر خصوصیات استعارہ کنایہ، تشبیہ اور خیال آفرینی کے عناصر داخل ہوتے گئے۔ اس دور کے فنی ادب میں صرف نثر و شاعری کے موضوعات ہی نہیں بلکہ تمام ہی عقلی علوم فلسفہ، منطق، علم کلام، اور مذہبی علوم اور تصوف وغیرہ کے موضوعات بھی نثری ادب کا حصہ بننے لگے۔ اس دور کے منطقیوں اور فلاسفہ نے منطق و فلسفہ کے وقیع مسائل اور تصوف اور طریقت کے گنجلک اصولوں کو ادبی پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابو حیان کی نثر نگاری: ابو حیان توحیدی کے نثری نمونوں میں ان تمام تغیرات اور تبدیلیوں کا اثر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے مختلف عقلی و نقلی علوم کو خالص ادبی انداز میں پیش کیا۔ ابو حیان کو زبان و بیان پر قدرت کا ملہ حاصل تھی۔ اس کے پاس موقع و محل کے اعتبار سے مؤثر الفاظ اور دلنشیں ترکیبوں کا اتھاہ ذخیرہ تھا۔ اس کے دل میں جو کوئی خیال بھی

پیدا ہوتا، وہ اپنے اظہارِ بیان میں سہل، مؤثر اور ترقی یافتہ اسلوب کو اختیار کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کلام کے فنی حسن و جمال پر بھی گہری نظر ہوتی۔ وہ محبت و دوستی کے خیالات کو نہایت ہی جامع، مؤثر اور ادبی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وما من احد الا وله فى العذ العن حصة : لانه لا يخلو احدٌ من جارٍ او معاملٍ او حميم، او صاحب، او رفيق او مسكن او صديق او اليف او ولى او خليط كما لا تخلوا ايضا من عدو او كاشح، او مداج او مكاشف، او حاسد، او شامت او منافق، او متافن، او معاند، او معتزل او فصل، او فعل"[٥٨]

اس ادبی شہ پارے سے ابوحیان توحیدی کے زبان اور بیان پر غیر معمولی قدرت اور مترادفات کے استعمال میں کامل مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وجدانی قوت اور فطری صلاحیت ہے جس سے اکثر انشاء پرداز محروم رہتے ہیں۔ اسی طرح اس نے دوستی و عشق اور دوستی و رشتہ داری کے درمیان موجود لطیف فرق کو نہایت ہی ادبی انداز میں بیان کیا ہے:

"مناغاة الصديق اعيت بالمهدح وانداى على الفواد من مغازلة المعشوق، وذلك تفزع بحديث المعشوق الى الصديق ولا تفزع بحديث الصديق الى المعشوق"[٥٩]

زبان وادب کے طالب علم کو اس طرح کے فصیح و بلیغ عبارتوں، دل کش و حسین انداز بیان اور سہل و مؤثر اسلوب سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے۔ ابوحیان ہی ہے جو علم کے ہر موضوع میں عربی نثر نگاری کے فنی محاسن، تعبیرات کی جدت آفرینی اور مترادفات کی بوقلمونی کی سیر کراتا ہے۔ وہ الفاظ و معانی کے باہم حسن امتزاج سے کلام کے اندر ایسا جادو جگاتا ہے کہ قاری اس کی سحر انگیزی اور اثر آفرینی میں کھو

کھو جاتا ہے۔ اس کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کے اندر الفاظ و معانی کا ایک امنڈتا ہوا طوفان موجود ہو۔ اس نے فلسفہ، علم کلام، تصوف اور منطق جیسے خشک و دقیق موضوعات کو ایسے شیریں الفاظ اور سہل اسلوب میں بیان کردیا ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ فلسفہ و تصوف کا مطالعہ کررہا ہے یا کسی ادبی شہ پارے سے لطف اندوز ہورہا ہے۔

شعر و شاعری : چوتھی صدی ہجری کے انشا پردازوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان کی اکثریت نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری سے بھی واقف ہوتی تھی اور فنکار موقعہ و محل کے اعتبار سے جو چیز زیادہ موثر ہوتی اسی فن میں اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کرتا۔ شاعری و نثر نگاری باہم ایک دوسرے سے اس حد تک مل گئے تھے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر اس دور میں کسی حد تک نثر ہی کا ایک جز بن چکا تھا اس دور کے دیگر ادباء کی طرح ابو حیان کے اشعار بھی ملتے ہیں[۵] لیکن اس کی حیثیت نہیں کے برابر ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے اندر بیک وقت نظم و نثر کا یکساں ملکہ ہو، بلکہ فطری طور پر آدمی ایک میدان میں آگے بڑھا ہوا ہوگا۔ اسی طرح ابو حیان توحیدی اصلاً ادیب تھا اور یہ بات بھی تقریباً معروف و مشہور ہے کہ اس کے اساتذہ میں کوئی اچھا اور بلند پایہ شاعر نہ تھا۔ اس کے اساتذہ میں سے یحیٰی ابن عدی اور ابو سلیمان المنطقی کبھی کبھار ایک دو اشعار کہہ لیا کرتے تھے جن کا فنی و ادبی اعتبار سے کوئی مقام یا رتبہ نہ تھا[۵] اسی طرح معتبر تاریخی سیرتوں میں اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ شاعر تھا۔ " الامتاع " میں مذکور ہے کہ ابن العارض نے ان سے ایک یا دو شعر سنانے

کی درخواست کی تو اس نے یہ کہتے ہوئے سُنانے سے انکار کر دیا :

" لست کن الشعر و الشعر ادطی مستیئ و اکرہ ان اخطوعلی و حف و احتی غیر محض "

الصدقۃ و الصدیق میں کچھ ایسے اشعار کا ذکر ہے جن کا سیاق کلام اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ اشعار اسی کے ہیں :

أن کنت تطلب فضلا　　اذ ذکرت د مجدا

فکن بعدلک خِلاً　　وکن لخلیلک عبدا ۵۲

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر اس نے اپنے کسی دوست کو نصیحت کرتے ہوئے چند اشعار کہا ہے :

لا تجعلن بعد داری　　مخستا نصیبی

مغرب متخص بعید　　امی النوا و تحریب

ورب شخص تربت　　ما الیک غیر حبیب

ما البعد والقرب الا　　ماکان بین القلوب ۵۳

ڈاکٹر کرد علی نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابو حیان موسیقی و غنائیہ اشعار میں بھی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اور اس کی طرف چند غزلیہ اشعار کو بھی منسوب کیا ہے :

یا صاحبی وعا الملام واقصلا

ترک الرھوی یا صاحبتی حنشارۃ

کم لمت قلبی کی یفیق فقال لی

لجت یمین ما لھا کفارۃ

الا افیق ولا افتر لحظۃ

کھوجاتا ہے۔ اس کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کے اندر الفاظ و معانی کا ایک امنڈتا ہوا طوفان موجود ہو۔ اس نے فلسفہ، علم کلام، تصوف اور منطق جیسے خشک و دقیق موضوعات کو ایسے شیریں الفاظ اور سہل اسلوب میں بیان کردیا ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ فلسفہ و تصوف کا مطالعہ کررہا ہے یا کسی ادبی شہ پارے سے لطف اندوز ہورہا ہے۔

شعروشاعری: چوتھی صدی ہجری کے انشاپردازوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان کی اکثریت نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شعروشاعری سے بھی واقف ہوتی تھی اور فنکار موقعہ محل کے اعتبار سے جو چیز زیادہ موثر ہوتی اسی فن میں اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کرتا۔ شاعری و نثر نگاری باہم ایک دوسرے سے اس حد تک مل گئے تھے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر اس دور میں کسی حد تک نثر ہی کا ایک جز بن چکا تھا اس دور کے دیگر ادباء کی طرح ابوحیان کے اشعار بھی ملتے ہیں[۵۰] لیکن اس کی حیثیت نہیں کے برابر ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے اندر بیک وقت نظم و نثر کا یکساں ملکہ ہو، بلکہ فطری طور پر آدمی ایک میدان میں آگے بڑھا ہوا ہوگا۔ اسی طرح ابوحیان توحیدی اصلاً ادیب تھا اور یہ بات بھی تقریباً معروف و مشہور ہے کہ اس کے اساتذہ میں کوئی اچھا اور بلند پایہ شاعر نہ تھا۔ اس کے اساتذہ میں سے یحییٰ ابن عدی اور ابوسلیمان المنطقی کبھی کبھار ایک دو اشعار کہہ لیا کرتے تھے جن کا فنی و ادبی اعتبار سے کوئی مقام یا رتبہ نہ تھا[۵۱] اسی طرح معتبر تاریخی سیرتوں میں اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ شاعر تھا۔ "الامتاع" میں مذکور ہے کہ ابن العارض نے ان سے ایک یا دو شعر سنانے

کی درخواست کی تو اس نے یہ کہتے ہوئے سنانے سے انکار کردیا:

" لست كن الشعر والشعر اوطى مستئ واكره ان اخطو على واحف واحتى غير محفى "

الصدقة والصديق میں کچھ ایسے اشعار کا ذکر ہے جن کا سیاق کلام اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ اشعار اسی کے ہیں:

أن كنت تطلب فضلا   اذ ذكرت و مجدا
فكن بعدك خلا   وكن لخليلك عبدا [۵۲]

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر اس نے اپنے کسی دوست کو نصیحت کرتے ہوئے چند اشعار کہا ہے:

لا تجعلن بعد داری   مخستا نصیبی
مغرب متخص بعيد   امى النوا و تحر بيب
ورب شخص تربت   ما اليك غير حبيب
ما البعد والقرب الا   ما كان بين القلوب [۵۳]

ڈاکٹر کرد علی نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابو حیان موسیقی و غنائیہ اشعار میں بھی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اور اس کی طرف چند غزلیہ اشعار کو بھی منسوب کیا ہے:

يا صاحبى دعا الملام واقصرا
ترك الرهوى يا صاحبتى حنشارة
كم لمت قلبى كى يفيق فقال لى
لجت يمين ما لها كفارة
الا افيق ولا افتر لحظة

أن أفت لم تعتق فانت جارة
الحب أول ما يكون بنظرة
فكن الحقايق بعد أوه بغير امهات

لیکن یہ اشعار اس قدر سوقیانہ اور عوامی ہیں کہ ابوحیان جیسے بلند پایہ صاحب طرز ادیب کی طرف ان کا انتساب محل نظر ہے۔ چنانچہ عبدالرزاق محی الدین نے مختلف تاریخی شواہد کی روشنی میں ابوحیان کی طرف ان کے انتساب سے انکار کیا ہے۔

تصنیفات: ابوحیان توحیدی کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے مختلف علمی و تحقیقی موضوعات پر قلم اٹھایا اور اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔ ابوحیان توحیدی کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے جن میں سے بیشتر دستبرد زمانہ کے نذر ہو گئیں۔ اُن کی تصانیف میں سے بہت کم کا پتہ چل سکا ہے اور ان میں سے بھی اب تک صرف چند کتابیں ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو سکی ہیں۔ ذیل میں ان کی چند کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

الامتاع والموانسہ: یہ ایک ضخیم ادبی تصنیف ہے۔ سب سے پہلے اس کتاب کے قلمی نسخے کو مرحوم احمد ذکی پاشا نے مکتبہ "طوب قبوسائی" میں دیکھا۔ اور اس کی فوٹو کاپی لے کر قاہرہ آئے۔ اسے اپنے خاص لائبریری میں محفوظ رکھا، اس کے فہرست کو درست کیا، اسماء اعلام کو ترتیب دیا۔ شاید وہ اس کو ایڈیٹ کر کے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن یہ نسخہ ان کی لائبریری ہی میں تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ سید محمد کسفر جلانی نے اسے خرید کر دارالکتب مصریہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۴ء میں الجنۃ التالیف الترجمہ والنشر" کے تحت ڈاکٹر احمد امین اور مرحوم احمد الزین کی نگرانی میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

اور شروع دور کی تصنیف ہے جب کہ اس کے اوپر یاسں و قنوطیت کا غلبہ زیادہ نہ تھا۔

اس کتاب کا شمار ابوحیان توحیدی کی چند معرکۃ الآرا ادبی تصانیف میں ہوتا ہے۔ یہ ایسی تصنیف ہے جس پر وہ جتنا بھی فخر کرے کر سکتا ہے۔ اس کے اندر جدید معلومات اور غیر معمولی قوت یادداشت کی جھلک ملتی ہے۔ یہ ابن عارض کے ساتھ ہونے والے علمی و ادبی سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے۔

وجہ تالیف: اس کتاب کی تالیف کا سبب اس کا محاسن اور دوست ابوالوفا مہندس تھا۔ در در کی ٹھوکریں کھانے اور مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنے کے بعد ابوالوفا ہی کے ذریعہ مشہور تعلیمی وزیر ابن سعدان کی قربت ملی۔ وزیر نے اسے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ ابن سعدان ابوحیان کے ساتھ شبینہ محفل منعقد کیا کرتا تھا۔ ابن سعدان مختلف موضوعات پر سوالات کرتا اور ابوحیان ان کا علمی و تحقیقی جواب دیتا۔ پھر ابوالوفا کی خواہش پر اس نے ان تمام سوالات و جوابات کو ایک جگہ یکجا کر دیا۔

موضوع اور مضمون: "الامتاع والموانسۃ" بھی الف لیلیٰ کے طرز پر لکھی گئی ایک کتاب ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ الف لیلہ ایک ہزار راتوں پر مشتمل ہے اور "الامتاع" صرف چالیس راتوں پر۔ الف لیلہ میں زیادہ تر افسانوی واقعات اور عشق و محبت کی داستانیں ہیں جبکہ الامتاع کے مباحث سیاسی، عقلی، فکری اور واقعاتی ہیں۔ ابن سعدان، ابوحیان سے علم و ادب، فلسفہ و مذہب، تصوف و طریقت، سیاست و حکومت اور مختلف مشہور تاریخی و علمی شخصیات کے متعلق سوالات کرتا ہے توحیدی ان سوالات پر غور کر کے اپنے خیالات کو پیش کرتا ہے۔ ابوحیان کے

یہ جوابات انتہائی عالمانہ اور بڑے ہی سنجیدہ ہیں جس سے ابن سعدان اور ابو حیان توحیدی دونوں ہی کی ذہانت اور عبقریت کا پتہ چلتا ہے۔ بالعموم گفتگو کی ابتداء ابن سعدان کی طرف سے ہوتی ہے اور گفتگو کے خاتمے پر وہ ابو حیان سے کوئی اچھا سا شعر یا اس گفتگو کے حسب حال کوئی لطیفہ سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ اس کے زیادہ تر مباحث بغداد اور وہاں کی شخصیات سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ عہد بویہی کے ثقافت و کلچر، اس زمانے کی عقلی و علمی سرگرمیوں، فلسفہ وعلم کے میدان میں ہونے والی ترقیوں کا علم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں اس دور میں ہونے والے علمی مناظروں کی بھی ایک جھلک ہے۔ اخوان الصفا کے بارے میں کچھ اہم انکشافات ہیں۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد توحیدی کے علم وفضل اور ادب و انشار کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

ترجمہ نگاروں کے درمیان یہ امر مختلف فیہ ہے کہ "الامتاع" کس کی فرمائش پر لکھی گئی، عام رجحان یہی ہے کہ یہ کتاب ابوالوفار کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اور یہ خیال بہت حد تک درست ہے۔ لیکن ڈاکٹر کرد علی اور صاحب "اخبار العلماء باخبار الحکماء" نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ کتاب "ابوالوفار" کے لیے نہیں بلکہ ابو سلیمان منطقی کے لیے لکھی گئی۔ ان کا خیال ہے کہ:

"ابو سلیمان ایک چشمہ تھے، ان کے جسم پر سفید داغ تھے، وہ زیادہ تر سوسائٹی سے الگ تھلگ اپنے گھر میں گوشہ گیر رہتے۔ اس کے پاس صرف وہی لوگ آتے جو اس چشمہ علم وعرفاں سے سیراب ہونا چاہتے۔ ابو سلیمان کو حکومت کے حالات و حوادث سے دلچسپی تھی اور وہ ان سے باخبر رہنا چاہتے تھے اور ابو حیان

توحیدی اس کے خاص شاگردوں میں تھا۔ اور وہ امراء کی محفلوں میں جاتا رہتا۔ اس لیے اسے ہر قسم کے حالات سے واقفیت ہوتی رہتی اور جب کوئی نئی خبر معلوم ہوتی اپنے استاد تک پہنچا دیتا اور اس مقصد کے تحت اس نے "الامتاع والموانسۃ" لکھی۔

لیکن مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب ابوالوفا ہی کے لیے لکھی گئی۔

۱۔ الامتاع والموانسۃ میں ابوسلیمان پر چند سخت تنقیدیں موجود ہیں۔ اگر سلیمان کے لیے لکھی گئی ہوتی تو اس میں یہ تنقیدیں نہ ہوتیں یا ان کا لب ولہجہ نرم ہوتا۔

۲۔ الامتاع میں کثرت سے ابوسلیمان کے اقوال درج کیے گئے ہیں۔ اگر وہ خود اس کے لیے تحریر کی گئی ہوتی تو خود سلیمان کو اس کے اقوال سنانے کی کیا ضرورت۔

۳۔ الامتاع میں ابوحیان اس شخص سے صلہ کا بھی طالب ہے جس کے لیے اس نے کتاب لکھی جب کہ ابوسلیمان کے افلاس کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے مکان کا کرایہ بھی بمشکل ادا کر پاتے تھے۔ ایسے شخص سے اسے کسی صلہ کی کیا امید ہوسکتی تھی۔ اس کے بالمقابل ابوالوفا نہایت بلند پایہ شخص تھا، وزیراعظم سے بہت قریب تھا بڑے بڑے امراء سے اس کے تعلقات تھے۔ اس طرح ابوالوفا اس پوزیشن میں تھا کہ اس سے صلہ کی امید کی جاسکتی تھی۔

الصداقۃ والصدیق: جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے یہ کتاب دوستی اور دوست کے موضوع پر ہے۔ دوست اور دوستی کے مختلف اقسام وانواع پر جس قدر مواد فراہم ہوسکتا ہے اس میں

موجود ہے۔ اخوانیات اور الفت و محبت کے موضوع پر اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ دوستی کے مختلف معیار و نظریات کے سلسلے میں احادیث رسولؐ اقوال صحابہؓ اور قدیم علمی و تاریخی شخصیات کے زریں اقوال سے مدد لی گئی ہے۔

اس کتاب میں توحیدی نے حقیقی دوستی اور مطلب پرست دوستی پر کھل کر بحث کی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے شائع ہوئی تھی جہاں یہ کتاب بہت ساری خوبیوں کی حامل ہے وہاں ایک نقص بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ کتاب نظم و ترتیب سے محروم ہے۔ اس کتاب میں ان اسباب و علل کی طرف تفصیل سے اشارہ کیا گیا ہے جن سے مودت و اخوت کی جڑیں کٹتی ہیں اس طرح ان اسباب کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن سے محبت و دوستی کا پودا پروان چڑھتا ہے۔

اس کتاب کا مخطوطہ "آستانہ" کے مکتبہ "یا صوفیا" میں غیر ضروری کتابوں کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ ایک طویل عرصے تک کسی مستشرق نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر محمد بن تادیت الطنجی جامعہ عربیہ کی جانب سے "آستانہ" کچھ قیمتی کتابوں کی تصویریں لینے لگے۔ وہاں انھوں نے یہ کتاب دیکھی اور اس کی تصویر لے لی۔ پھر قاہرہ واپس آنے کے بعد اس کتاب کا مطالعہ کیا۔ پھر اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب سے ابوحیان توحیدی اور مسکویہ کی زندگیوں کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی تھی۔ چنانچہ پہلی بار یہ کتاب ڈاکٹر احمد امین اور احمد الصقر کے حواشی و تعلیقات کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔

الہوامل والشوامل: یہ کتاب دراصل دو جلیل القدر مؤلفوں کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ ابوحیان توحیدی کے سوالات ہیں جن کو "الہوامل" کا نام دیا گیا ہے۔ ابن مسکویہ کے جوابات ہیں

جس کو "الشوامل" کہا گیا ہے۔ "الہوامل" اس نوجوان اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا مالک اسے ہر طرح کے بندھن سے آزاد کر کے چرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ "الشوامل" ان جانوروں کو کہتے ہیں جو ان آزاد نوجوان اونٹنیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ چونکہ ابوحیان کے سوالات کسی خاص موضوع یا مسئلے سے متعلق نہ تھے بلکہ بالکل آزاد تھے اس لیے اس نے ان سوالوں کو "الہوامل" سے کنایہ کیا ہے اور مسکویہ نے چونکہ ان سوالات کے جواب دیے ہیں اور ان جوابوں کو "الشوامل" سے کنایہ کیا ہے۔

اس کتاب سے ابوحیان توحیدی کی فلسفیانہ شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس کے اعلیٰ ادبی مقام پر بھی روشنی پڑتی ہے اس نے علمی و ادبی، طبعی و ماورائی، اجتماعی و معاشرتی، اقتصادی و معاشرتی، فکری و سیاسی، فطری و نفسیاتی اور علم کلام، فلسفہ، منطق و تصوف سے متعلق بیشتر سوالات اٹھائے ہیں۔ اس نے اپنے سوالات کے ذریعہ ہر بڑے سے بڑا اور معمولی سے معمولی مسئلے کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سوالات کی تعداد کئی سو ہیں۔ اس کے بعد مسکویہ نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس کے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اس کے سوالات کا اسلوب مسکویہ کے مقابلہ میں زیادہ ادبی، فنی اور انشائی ہے مسکویہ کی عبارتوں میں فلسفیانہ غموض، ابہام اور اخفا ہے جب کہ ابوحیان کے سوالات میں وضاحت، ادبیت اور سلاست کا عنصر غالب ہے۔ اس نے ان سوالات میں اپنی محرومیوں اور ناکامیوں اور دنیا و اہلِ دنیا سے متعلق اپنی شکایتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان سوالات سے ابوحیان توحیدی کی ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فلسفیوں کے ساتھ عظیم فلسفی، متکلمین کے ساتھ ماہر متکلم، لغویوں کے ساتھ بلند پایہ ماہر لسانیات اور صوفیا کے ساتھ شیخ طریقت نظر آتا ہے۔

البصائر والذخائر: یہ کتاب ابوحیان توحیدی کی زندگی کا حاصل مطالعہ اور اس کی طویل محنت ومشقت کا نتیجہ ہے۔ یاقوت حموی کے بقول "البصائر والذخائر" دس جلدوں پر مشتمل تھی[۵۸] ہر جلد کا مقدمہ وخاتمہ الگ الگ تھا۔ یہ ابوحیان توحیدی کے پندرہ سالہ محنت ومشقت کا نتیجہ ہے سنہ ۳۵۰ھ میں اس نے اس یہ کتاب لکھنا شروع کیا اور ۳۶۵ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ابوحیان توحیدی کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے: "ثمرة العمر وزبد الایام وودیعة التجارب۔

بدقسمتی سے اب تک اس کتاب کے صرف دو ہی نسخے زیور طباعت سے آراستہ ہو سکے ہیں جس کو ڈاکٹر ابراہیم گیلانی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر احمد امین اور احمد السقر ۱۹۵۳ء میں اس کی پہلی جلد قاہرہ سے شائع کر چکے تھے۔ اس کی بقیہ جلدوں کے مخطوطات قسطنطنیہ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں موجود ہیں[۵۹]

اس کتاب میں ابوحیان توحیدی نے ادبی شہ پاروں، شاعری وضرب الامثال لطائف وبذلہ سنجیاں، احادیث رسول، صوفیاء، سخاۃ اور ماہرین لسانیات کے اقوال، قرآنی آیات کی تفسیر، اخلاقی پند ونصائح، تاریخی واقعات و حکایات وغیرہ کو جاحظ کے انداز پر جمع کر دیا ہے۔ کوئی بھی سنجیدہ بحث زیادہ طویل نہیں ہونے پاتی کہ درمیان میں کوئی مذاق کی بات یا لطیفہ پیش کر دیتا ہے تاکہ قاری ادبنے نہ پائے اور کسی طرح کی تکان محسوس نہ کرے۔

(باقی)

برہان

جلد ۱۰۲ | ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ مطابق جولائی ۱۹۸۸ء | شمارہ ۱

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جال پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

البصائر والذخائر: یہ کتاب ابوحیان توحیدی کی زندگی کا حاصل اور اس کی طویل محنت ومشقت کا نتیجہ ہے۔ یا حموی کے بقول "البصائر والذخائر" دس جلدوں پر مشتمل تھی[۵۸] ہر جلد کا مقد وخاتمہ الگ الگ تھا۔ یہ ابوحیان توحیدی کے پندرہ سالہ محنت ومشقت کا ہے ۳۵۰ھ میں اس نے اس نے یہ کتاب لکھنا شروع کیا اور ۳۶۵ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ابوحیان توحیدی کے ان الفاظ سے لگا ہے: "ثمرۃ العمر وزبدۃ الایام وودیعۃ التجارب۔

بدقسمتی سے اب تک اس کتاب کے صرف دو ہی نسخے زیور طباعت سے آر ہو سکے ہیں جن کو ڈاکٹر ابراہیم گیلانی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر احمد امین اور احمد السقر نے ۱۹۵۳ء میں اس کی پہلی جلد قاہرہ سے شائع تھے۔ اس کی بقیہ جلدوں کے مخطوطات قسطنطنیہ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں موجود ہیں[۵۹]

اس کتاب میں ابوحیان توحیدی نے ادبی شہ پاروں، شاعری وضرب الا لطائف وبذلہ سنجیاں، احادیث رسول، صوفیاء، سخاۃ اور ماہرین لسانی کے اقوال، قرآنی آیات کی تفسیر، اخلاقی پند ونصائح، تاریخی واقعات حکایات وغیرہ کو جاحظ کے انداز پر جمع کر دیا ہے۔ کوئی بھی سنجیدہ بحث زیا طویل نہیں ہونے پاتی کہ درمیان میں کوئی مذاق کی بات یا لطیفہ پیش کر دیتا۔ تاکہ قاری اوبنے نہ پائے اور کسی طرح کی تکان محسوس نہ کرے۔

(باقی)

برہان

جلد ۱۰۲	ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ مطابق جولائی ۱۹۸۸ء	شمارہ ۱

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جال پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

ایک ایسے وسیع وعریض ملک میں جہاں روز اوّل سے مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور مختلف ثقافتوں سے وابستہ مختلف زبانیں بولنے والے لوگ موجود ہوں ایک دوسرے فرقہ کے لوگوں کے مذہبی جذبات، تہذیبی قدروں اور لسانی احساسات کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے اور اس طرح کے مخلوط سماجی نظام میں باہمی رواداری کے زریں اصول کو اپنائے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ترقی ناممکن ہے۔

ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی جس قوت اور شدت کے ساتھ فرقہ واریت، تنگ نظری اور متعصبانہ ذہنیت کو بڑھاوا ملا ہے، حقیقت یہی ہے کہ ہم دوسرے میدانوں میں اس قدر ترقی نہیں کر پائے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ عدم تشدد کے جس اصول کی بنیاد پر ملک کو آزادی ملی، آزادی ملنے کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر ملک تشدد کی راہ پر چل پڑا۔

درحقیقت فرقہ واریت، تشدد، دہشت گردی، گروہی عصبیت اور لسانی جارحیت کو بڑھانے کے سلسلے میں ملک کی تہذیبی رنگا رنگی سے بہت سے لوگوں کی عدم واقفیت یا جان بوجھ کر انکار کر دینے کی عادت کو بھی زیادہ دخل ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ یہ ملک ایک خوبصورت گلدستہ کی طرح ہے جس میں

رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ ان پھولوں کو اپنے انداز میں مہکنے اور اپنے رنگ و روپ کو قائم رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی پھول یہ چاہے کہ دوسرے پھول اس کے رنگ اور خوشبو کو اختیار کرلیں تو شاید یہ ممکن نہیں ہے۔ نہ کوئی اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والا فرد اپنا مذہب ترک کر کے اکثریت کے خوف اور ڈر سے ان میں شامل ہونے پر آمادگی کا اظہار کرے گا۔ اور نہ کوئی اکثریتی مذہب کا پیروکار آسانی سے اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کرنے پر راضی ہوگا۔ ہر فرقہ کی اپنی ثقافت، اپنی شناخت، اپنی زبان، اپنی انفرادیت اور اپنی روایات ہیں۔

"قومی ایکتا (NATIONAL INTIGRETION) کی بات آج جس زوردار انداز سے کی جارہی ہے اور اس کے لئے تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ اور وسائل تشہیر اختیار کئے جارہے ہیں اس تناسب سے اس کے نتائج قطعاً سامنے نہیں آرہے ہیں۔ دراصل "قومی یکجہتی" کے کاز کو تقویت اس وقت مل سکتی ہے جب ملک میں بسنے والے تمام فرقے اور اکائیاں اپنی تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ملک کی سالمیت، وحدت اور اس کی مجموعی بہبود و فلاح کے لئے متحد ہوکر سرگرم عمل ہوں اور اس طرح اپنی وطن دوستی کا ثبوت پیش کریں۔ مذہب کا پابند ہونا بُری بات نہیں ہے۔ بُری بات یہ ہے کہ دوسروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارے رنگ میں رنگ جائیں۔ "قومی دھارے" کا مطلب اگر کسی سیاسی رہنما یا جماعت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اقلیتی فرقہ اکثریتی فرقہ میں ضم ہوجائے تو یہ بات اس پر واضح ہوجانی چاہیے کہ اول تو اس ملک کا غیر فرقہ وارانہ سیکولر دستور اس بات کی تائید نہیں کرتا اور اگر بفرضِ محال کوئی دوسرا دستور اس کی تائید بھی کرتا تو یہ چیز

یہاں کے عوام کے لئے کسی قیمت پر قابل قبول نہیں ہوتی ۔ اس لئے وہ فرقہ پرست اور تنگ نظر سیاسی تنظیمیں اور عناصر جو ہندوستان کی تہذیبی یگانگی سے انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہاں کے سبھی بسنے والے بلا امتیاز کسی خاص مذہبی اور معاشرتی رنگ کو اختیار کرلیں فی الحقیقت "قومی یکجہتی" اور مختلف اکائیوں کے مابین ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کی راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں ۔ وہ نہ تو ملک کے دستور کے وفادار ہیں اور نہ ملک کی وحدت و سالمیت کے طرفدار ۔

اگر اس طرح کی فرقہ پرست اور تنگ نظر جماعتوں پر قانونی طور پر پابندی نہ لگائی گئی تو یہ قوتیں کبھی مذہب کا نام لے کر، مذہب کے تقدس کا استحصال کرکے لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر، مذہب کی آڑ میں اور کبھی زبان کی بات کرکے جو حقیر مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں وہ تو حاصل نہ ہو سکے گا البتہ ہر طرف طوائف الملوکی انتشار اور افتراق پھیل جائے گا ۔

انسان دوستی، احترام آدمیت، خدمت خلق، خیر خواہی، ایثار و قربانی، اخلاق و شرافت، محبت و ہمدردی، وسیع القلبی و رواداری، اعلیٰ انسانی اصول اور اخلاقی اقدار ہیں ۔ موجودہ پُر آشوب اور خود غرضی و مفاد پرستی کے دور میں زندگی کے تمام شعبوں اور جملہ محاذوں پر یہ تعمیری جذبات، پاکیزہ خیالات اور صالح افکار و نظریات کو اجاگر کرکے ان کی افادیت، اہمیت اور ضرورت عام لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی شدید ضرورت ہے ۔

ہم اپنی ذاتی اور جماعتی زندگی کے طریق کار میں مثبت اور سنجیدہ تبدیلی لائیں، باہمی احترام و اکرام اور اعتماد و اعتبار کی فضا کو بڑھاوا دے کر ایک دوسرے کے جان و مال کا تحفظ اور واجبی حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داری کا

ہم میں سے ہر فرد کے اندر پیدا ہو ۔ جبھی ہم ایک مثالی اور فلاحی معاشرہ اور پاکیزہ سماجی نظام کے قیام کی بنیادوں کو استوار کر سکتے ہیں ۔

مذہب و عقیدہ انسانی رشتوں میں دوری پیدا کرنے، دراڑ ڈالنے، باہمی منافرت اور تنگ نظری پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ان رشتوں کو مزید مستحکم، پائدار اور انسانی وحدت کو مضبوط کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

کاش ملک و قوم کا دانشور طبقہ، ارباب اقتدار، صاحب منصب و اختیار اور مختلف سماجی، اصلاحی اور سیاسی ذمہ دار افراد و جماعت اس روشن حقیقت کو سمجھ کر اس کا پالن کریں ۔

کرپشن، مہنگائی، گرانی اور موقعہ پرستی نے اپنے تمام سابقہ ریکارڈ کو توڑ دیا ہے ۔ ملک کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ غربت، افلاس، بیکاری، بے روزگاری، جہالت و بیماری کے شکنجے میں گرفتار ہو کر کس مپرسی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے ۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے تمام تر تعمیر و ترقی کے دعووں کے باوجود اس کے فوائد اور ثمرات سماج کے پسماندہ اور نچلے طبقوں تک نہیں پہونچ رہے ہیں اور عام لوگ آج بھی اپنے آپ کو ذہنی و فکری اعتبار سے مفلس اور غلام ہی سمجھ رہے ہیں ۔ اگر ملک میں بسنے والی اقلیتوں میں جان و مال کے عدم تحفظ کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے تو دوسری طرف مذہبی، لسانی، تہذیبی اور سماجی تشخص و امتیاز کی طرف سے خطرات لاحق

ں ۔ عام لوگوں کی زندگی کا معیار بلند کرنے ، ان کے بنیادی آئین ،
نسانی اور جمہوری حقوق کا تحفظ وحصول اور مایوس کن رجحانات
ے احساسات کو کم کرنے کے لئے زوردار عوامی تحریک چلانے کے
اتھ ساتھ قوم خاص طور پر نئی نسل کی ذہنی و فکری تربیت کی طرف
ولین مرحلے میں توجہ دی جانی چاہئے ، جو ہمیں انسانیت، محبت اور
مہوریت کی راہ سے ہی حاصل ہوسکتی ہے ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل
ایک جائزہ
(۲)

از جناب محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اسی فصل میں آگے مولانا فراہیؒ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چڑیاں لاشیں کھانے کے لئے آئی تھیں۔ لکھتے ہیں:

"شعراء کا عام انداز کلام اجمال وکنایہ کا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تصریح وتفصیل نہیں کیا کرتے۔ بعض نے مجملاً چڑیوں کے دیکھنے کا ذکر کردیا اور اس قدر بس تھا۔ کیونکہ قتل گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں گوشت خور چڑیوں کا جمع ہونا عربوں میں ایک معلوم ومشہور بات تھی۔ وہ طیور کے ساتھ چڑیوں کے جھنڈ دیکھ کر فیصلہ کرلیتے تھے کہ لڑائی ضرور ہوگی۔ اصحاب رجیع کے قتل کی پیشین گوئی عمرو بن ربیعہ نے اسی دلیل سے کی تھی۔ بعض شعراء فوجوں کے ذکر کے ساتھ چڑیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ چڑیوں کو اندازہ ہوگیا ہے کہ میدان جنگ میں بے شمار لاشیں ملیں گی۔ اس وجہ سے وہ بھی ساتھ ہولی ہیں۔ مشہور شاعر نابغہ عمرو بن حارث غسانی اور اس کی قوم کا ذکر کرتا ہے:

إذا ما غزوا بالجيش حلق فوقهم عصائب طير تهتدي بعصائب
جوانح قد ايقن ان قبيله اذا ما التقى الجمعان أول غالب

[جب وہ فوج لے کر حملہ کرتے ہیں تو چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان کے اوپر منڈلاتے ہیں۔ وہ گراجانتی ہیں۔ کیونکہ ان کو یقین ہے کہ جب دو جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انہی کا قبیلہ غالب رہتا ہے]

اسی مضمون کو ابونواس نے لیا ہے :

تتأى الطير غدوته ثقة بالشبع من جزره

[جب میرا ممدوح جنگ کے لئے نکلتا ہے تو چڑیوں کے جھنڈ اس کے پیچھے اس یقین کے ساتھ چلتے ہیں کہ اس کے شکار سے اپنا پیٹ خوب بھریں گے] ؎١

مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا فراہی کے اس استدلال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"۳۶ھ میں بصرہ میں جنگ جمل واقع ہوئی تھی۔ حجاز میں اس لڑائی کا حال اسی دن معلوم ہوگیا تھا۔ کیونکہ غول در غول پرندے کٹے ہوئے اعضاء چنگلوں اور چونچوں میں لئے ہوئے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔" ؎٢

مذکورہ اشعار میں شاعرانہ مبالغہ آرائی ظاہر ہے۔ شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب وہ لشکر جنگ کے لئے چلتا ہے تو پرندوں کے جھنڈ اس یقین کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوگا تو

؎١ تفسیر سورۂ فیل صفحہ ۶۸-۶۹۔

؎٢ ارض القرآن سید سلیمان ندوی اول صفحہ ۳۱۵ بحوالہ تاریخ طبری ذکر واقعہ جمل

اس کے شکار سے اپنا پیٹ بھریں گے۔ پرندوں کا لشکر کی کامیابی کا یقین کرلینا حقیقۃً واقعہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ اس مبالغہ آرائی کو حقیقت واقعہ سمجھ کر استدلال کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔

واقعۂ فیل سے قبل بھی ایام جاہلیت میں بہت سی جنگیں ہوچکی تھیں جیسے جنگ بسوس، جنگ داحس و غبراء اور جنگ بعاث وغیرہ، جن میں ہزاروں جانیں ضائع ہوچکی تھیں۔ اس کے بعد بھی بے شمار جنگیں ہوئیں اور تاریخ میں ان جنگوں کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔ لیکن کسی جنگ کے بارے میں یہ نہیں ملتا کہ لوگوں نے اس موقع پر آنے والے مردار خور پرندوں کا تذکرہ کیا ہو اور ان کی شکل وصورت اور قد وغیرہ کا اتنی باریکی سے تذکرہ کیا ہو۔ اگر جنگ کے موقع پر چڑیوں کا آنا ایک معمول تھا اور واقعۃً تھا تو اسے اتنی اہمیت دینے اور ان کی شکل وصورت، رنگ، چونچ کی ہیئت اور قد وغیرہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ روایتوں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے موقع پر ضرور کوئی غیر معمولی اور خلاف معمول بات پیش آئی تھی اسی لئے راویوں نے اہمیت دے کر چڑیوں کا تذکرہ کیا۔

قرآنی الفاظ اور اسالیب سے استشہاد:

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے لفظ ترمی سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ترمی کا فاعل ہمارے نزدیک قریش ہیں جو الم تر کے مخاطب ہیں فعل ترمی چڑیوں کے لئے کسی طرح موزوں ہے ہی نہیں، چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگریزے تو گرا سکتی ہیں لیکن اس کو رمی نہیں کہہ سکتے۔ رمی صرف اسی صورت میں ہوگی جب پھینکنے میں بازو

یا ناخن کا زور استعمال ہو یا ہوائے تیز و تند تھپیڑے لمس کے ساتھ ہوں۔" لے

مولانا اصلاحی کے آخری جملے سے خود ان کے اعتراض کی تردید ہو رہی ہے۔ ابوقیس بن اسلت یثربی جاہلی کے جو اشعار اوپر گزرے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت خدائی فوجوں نے لشکر ابرہہ کو پسپا کیا اس وقت تیز و تند ہوا بھی چل رہی تھی، اس لئے چڑیاں جب اوپر سے پتھر گراتی تھیں تو تیز ہوا کی وجہ سے ان میں رمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مشہور محدث ابن ابی حاتم کی نقل کردہ روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے:

"عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر چھا گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے۔ انھوں نے اول تو آواز اور پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تیز و تند ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگباری کو لشکر کے مصیبت عظمیٰ بنا دیا۔" ٹے

سیرت ابن اسحاق میں نفیل خثعمی کا جو شعر ہے اس میں 'ترمی' کا لفظ موجود ہے:

خشیت اللہ لما ابصرت طیرًا وقذف حجارۃ ترمی علینا

اسی لئے قرآن نے ایجاز و اعجاز کا نمونہ پیش کرتے ہوئے 'ترمی' کا لفظ استعمال

لے تدبر قرآن ہشتم ص ۵۶۶۔
ٹے بحوالہ قصص القرآن سیوہاروی سوم ص ۳۶۸

کیا تاکہ اس ایک لفظ سے پوری صورت حال کی تصویر کشی ہو جائے۔

(۲) ترمیھم کا مخاطب کون ہے؟ اس سلسلے میں مولانا فراہی فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک اس سورہ کے مخاطب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا یا اس کو بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے۔ یہ زبان کا ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے گویا واحد کا لفظ ایک ایک فرد کے پوری جماعت کو مخاطب کرتا ہے کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ۔ (کبھی کلام واحد کے صیغے سے شروع ہوتا ہے اور پھر جمع کی ضمیر آتی ہے کیونکہ واحد سے مقصود جمع ہوتی ہے) کبھی اس کے برعکس جمع سے کلام شروع ہوتا ہے اور پھر واحد کی ضمیر آجاتی ہے لیکن اس سے مقصود بھی جمع ہوتی ہے۔" [۱]

"خطاب کبھی نبی سے بحیثیت امت کے امام اور ترجمان ہونے کے ہوتا ہے اور اس سے مراد جماعت ہوتی ہے خواہ تمام لوگ یا ان کی ایک جماعت اور کبھی خطاب بذات خود لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس صورت میں خطاب واحد کے صیغے سے ہوتا ہے اور اس سے مراد نبیؐ کے واسطے کے بغیر پوری امت ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نبیؐ کے بعد آیا ہے اور کبھی پہلے، یہ التفات کے طریقے پر ہوتا ہے۔" [۲]

پھر مولانا نے قرآن کے اس اسلوب کی متعدد مثالیں تفسیر سورۂ فیل اور اسالیب القرآن

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل صفحہ ۱۳-۱۴

[۲] اسالیب القرآن فراہی صفحہ ۱۵-۱۷ دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ

میں دیکھا ہیں، مثلاً:

ألم تر أن الفلك تجری فی البحر بنعمۃ اللہ لیریکم من
آیاتہ (لقمان - ۳۱)

ألم تر ان اللہ خلق السماوات والأرض بالحق، ان یشأ
یذھبکم ویأت بخلق جدید (ابراہیم - ۱۹)

إن تدعوھم الی الھدی لا یسمعوا وتراھم ینظرون إلیك
وھم لا یبصرون (الاعراف - ۱۹۸)

وقضی ربك ألا تعبدوا إلا ایاہ وبالوالدین إحسانا،
إما یبلغن عندك الکبر أحدھما أو کلاھما فلا تقل لھما
اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما (الاسراء)

مولانا نے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں دی ہیں لیکن ان تمام مثالوں کا استقراء کرنے سے ایک دوسرا ہی پہلو سامنے آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خطاب کبھی واحد کے صیغے سے ہوتا ہے اور اس سے مراد جماعت ہوتی ہے لیکن وہاں کوئی نہ کوئی قرینہ اور اشارہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ اس واحد کے صیغے کے بعد یا اس سے پہلے جمع کا صیغہ ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واحد کا صیغہ بھی جمع کے معنی میں ہے۔ غالباً قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں کوئی ایسا قرینہ نہ پایا جاتا ہو اس کے باوجود واحد کا صیغہ جمع کے معنی میں ہو۔

یہاں یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ چونکہ سورۂ فیل میں الم تر سے مراد جمع ہے اس لئے اس کے بعد ترمیھم بھی جمع (ترمونھم) کے معنی میں ہے اس لئے کہ ألم تر قرآن کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ الم تر کے الفاظ قرآن میں

اکتیس ۳۱ مرتبہ آئے ہیں۔ قرآن یہ اسلوب اس وقت اختیار کرتا ہے جب کسی اہم بات کی طرف اشارہ کرنا اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے:

کسی اہم اور مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرنا: عاد و ثمود (الفجر۔ ۶) نمرود (البقرہ۔ ۲۵۸) بنی اسرائیل (البقرہ۔ ۲۴۳، ۲۴۶) اصحاب الفیل (فیل۔ ۱)۔

یا اہل کتاب (آل عمران۔ ۲۳) منافقین (النساء: ۶۰، ۷۷، المجادلہ ۸، ۱۴) مشرکین (ابراہیم۔ ۲۸، مریم۔ ۸۳، مومن۔ ۶۹)

شعراء (الشعراء۔ ۲۲۵) کے رویہ کی طرف توجہ دلانا۔

یا اللہ کی صفات کی طرف متوجہ کرنا (ابراہیم: ۱۹، ۲۴ المجادلہ۔ ۷)

یا آثار کائنات کی طرف توجہ مبذول کرنا (الحج: ۱۸، ۶۳، ۶۵ النور: ۴۱، ۴۳ الفرقان۔ ۴۵ لقمان ۲۹۔ ۳۱ فاطر۔ ۲۷ الزمر۔ ۲۱)

فخر الرازی نے لکھا ہے:

"المراد من الرویۃ العلم والتذکیر وھو اشارۃ الی ان الخبر بہ متواتر، فکان العلم الحاصل بہ ضروریا مساویا فی القوۃ والجلاء للرویۃ۔"[۱]

[دیکھنے سے مراد جاننا یا یاد دہانی کرنا ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس چیز کی خبر دی جا رہی ہے وہ تواتر سے ثابت ہے اس لئے اس سے جو علم حاصل ہو رہا ہے وہ قوت و وضاحت میں رؤیت کے مساوی ہے]

۱؎ تفسیر کبیر رازی صفحہ ۹۷/۳۲۔

مولانا فراہی نے بھی یہی لکھا ہے کہ :

"کسی امر کا اقرار کرانے کے لئے بھی عربی زبان میں یہی اسلوب ہے جب یہ انداز کلام اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کسی مشہور و معروف ہی بات کا ذکر آتا ہے۔" ؎

معلوم ہوا کہ یہ قرآن کا ایک مخصوص اسلوب ہے اسے عام ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا۔

(۳) ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چڑیاں سنگباری کرنے کے لئے نہیں بلکہ لاشوں کو کھانے کے لئے آئی تھیں تو ترتیب کلام یوں ہونی چاہئے تھی۔ "ترمیھم بحجارۃ من سجیل فجعلھم کعصف مأکول وارسل علیھم طیراً ابابیل" اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں :

"یہ سوال جن لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا ہے ہمارے نزدیک وہ عربیت کے ایک خاص اسلوب بلاغت سے ناآشنا ہیں وہ یہ کہ بعض مرتبہ کسی نتیجۂ خیر یا شر کی مبادرت ظاہر کرنے کے لئے اس کو فعل کی پوری تفصیل سے پہلے ظاہر کر دیتے ہیں دعاؤں کی قبولیت ظاہر کرنے کے لئے .... قرآن نے یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آئے ہیں۔ یہاں سورۂ نوح سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ قال نوح رب إنھم عصونی واتبعوا من لم یزدہ مالہ وولدہ

؎ تفسیر سورۂ فیل صفحہ ۴۳

الا انصارا ..... مما خطیئاتھم اغرقوا فادخلوا نارًا، فلم یجدوا من دون اللہ انصارًا۔ و قال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارًا (نوح ۲۱-۲۶) ان آیات پر تدبر کی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت نوح کی دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد ان کی قوم کا انجام رکھ دیا گیا ہے اور ان کی دعا موخر کر دی گئی ہے حالانکہ انجام پوری دعا کے بعد ہی سامنے آیا ہوگا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ قبولیت دعا کی مبادرت ظاہر کرنے کے لئے ترتیب کلام میں تقدیم تاخیر کر دی گئی بالکل اسی طرح اس سورہ میں ابرہہ کی فوجوں کا انجام ظاہر کرنے کے لئے ان پر چڑیوں کے بھیجے جانے کا ذکر پہلے کیا اور ان کے پامال ہونے کا ذکر اس کے بعد کیا۔ سورہ کا مزاج چونکہ قریش پر امتنان واحسان کا تھا اس وجہ سے بلاغت کا تقاضا یہی تھا کہ دشمن کی بدانجامی کی تصویر پہلے سامنے آجائے۔"[1]

مولانا اصلاحی نے سطور بالا میں جس اسلوب بلاغت کی طرف اشارہ کیا ہے ہمارے نزدیک سورۂ فیل میں وہ اسلوب نہیں پایا جاتا بلکہ ایک دوسرا اسلوب "تفصیل بعد الاجمال" پایا جاتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ پہلے قرآن ایک واقعہ اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے اس کے بعد اسی کو تفصیل سے بیان کرتا ہے جیسے سورۂ کہف کی یہ آیات ملاحظہ ہوں:

"أم حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من ایاتنا عجبا، إذ أوى الفتية الى الكهف فقالوا ربنا آتنا من لدنك رحمة وهيئ لنا من أمرنا رشدا فضربنا على اذانهم في الكهف

---

[1] تدبر قرآن صفحہ ۵۶۵-۵۶۶

سنین عددًا، ثم بعثناهم لنعلم أي الحزبين احصى لما لبثوا
أمدًا، نحن نقص عليك نبأهم بالحق، إنهم فتية آمنوا بربهم
وزدناهم هدى ... الخ (الکہف ۹۔ ۲۶)

پہلے قرآن نے اجمال کے ساتھ بتلایا کہ اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی اور ہم نے انھیں سالوں سلائے رکھا۔ پھر انھیں بیدار کیا تاکہ وہ دیکھیں کہ وہ یہاں کے کتنے زیادہ دنوں زندہ رہا۔ اس کے بعد پھر سے اصحاب کہف کا قصہ تفصیل سے بیان کیا۔ یہی اسلوب سورۂ فیل میں بھی ہے۔ پہلے قرآن نے اجمال کے ساتھ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کے کید کو ناکام کر دیا پھر اس کی تفصیل یہ بیان کی کہ اس نے چڑیوں کو بھیج کر سنگباری کے ذریعہ تہس نہس کر کے کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا۔ اس طرح ان کا منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

غلط فہمی کے اسباب کا جائزہ:

مولانا فراہی نے ایک فصل میں تاویل میں غلط فہمی کے اسباب کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن وہ سراسر عقلی اور بے بنیاد ہے۔ ایک مثال یہاں ذکر کی جاتی ہے اسی پر مولانا کے ذکر کردہ دوسرے اسباب کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بعض لوگ جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں انھوں نے چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے اس سے بعض سننے والوں کو گمان ہوا کہ یہ پتھر چڑیوں ہی نے پھینکے۔ اور ممکن ہے کہ بعض دیکھنے والوں کو بھی یہ شبہ ہوا ہو اور انھوں نے اپنے خیال کے مطابق واقعہ کو بیان کر دیا ہو۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا عذر واضح ہے۔ سنگباری کے جو نتائج ظہور میں آئے وہ عربوں کی سنگباری کے اعتبار سے بہت زیادہ تھے۔ ابرہہ کی پوری فوج کا بھس کی طرح پامال ہوجانا قریش کی سنگ اندازی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو خیال ہوا ہوگا کہ یہ سنگ باری آسمان سے ہورہی ہے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو تمام فضا چڑیوں سے بھری ہوئی تھی اس وجہ سے خیال ہوا ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ ان ہی چڑیوں کا کرشمہ ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے یہ روایت سنی انھوں نے آیت کو بھی اسی پر محمول کر دیا۔ حالانکہ یہ سمجھنا زیادہ صحیح تھا کہ یہ آسمانی سنگباری عربوں کی سنگباری کے پردے میں ہوئی۔" [۱]

ایک دوسری جگہ بھی اسی قسم کی قیاس آرائی کی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

"جن لوگوں نے چڑیوں کی شکل وصورت، ان کا رنگ، ان کی چونچوں کی زرد گونی، ان کا لاشوں پر گرنا سب کچھ بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا بیان عینی شہادت پر مبنی ہوگا۔ باقی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چڑیاں چونچوں اور چنگلوں میں پتھر اٹھائے ہوئے تھیں تو یا تو انھوں نے اوپر سے پتھر برستے ہوئے دیکھے اور دور سے یہ گمان کرلیا کہ یہ چڑیاں پھینک رہی ہیں یا ترمیھم کی ضمیر کا مرجع انھوں نے طیرًا کو سمجھا اور پھر اصل واقعہ کی تحقیق کئے بغیر آیت کی جو تاویل ان کے ذہن میں آئی اسی سانچہ میں انھوں نے قصہ کو ڈھال دیا۔" [۲]

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل صفحہ ۸۱

[۲] ایضاً صفحہ ۹۱

مولانا کے اس طرز تحقیق پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ جب عینی شاہدوں کو نا قابل اعتبار قرار دیا جائے تب تو بڑی آسانی سے کسی بھی واقعہ کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیکھنے والوں نے صحیح دیکھا، بتانے والوں نے صحیح بتایا اور سننے والوں نے صحیح سنا کسی سے کوئی غلطی یا غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اس زمانے کے راویوں سے زیادہ تصریحات اس سلسلہ میں اس لئے نہیں ملتیں کیونکہ اس پر انھیں عین الیقین اور علم الیقین حاصل تھا۔ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ ہوگا کہ ایک زمانہ میں یہ چیز بھی معرض بحث بن جائے گی کہ چڑیاں سنگباری کرنے کے لئے آئی تھیں یا لشکر ابرہہ کی لاشوں کو کھانے۔

مولانا فراہی کی تاویل پر اعتراضات:

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ترمیھم کا مخاطب اہل مکہ کو مان کر یہ کہنا کہ چڑیاں لشکر ابرہہ پر سنگباری کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے آئی تھیں، صحیح نہیں۔ سورۂ فیل کے الفاظ اور اسلوب میں غور کرنے سے بھی اس تاویل کی غلطی واضح ہوتی ہے۔ ذیل میں اسے ہم اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

(۱) سورۂ فیل کی پہلی آیت ہے: أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ۔

اس میں 'فعل' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ قرآنی استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ جب 'فعل' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو وہاں عذاب اور سزا کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ عذاب انسانوں کے ذریعے یا ان کی معاونت میں نہیں ہوتا بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ آندھی طوفان بھیج کر اور اجرام سماوی کا

ارض مسلط کر کے ہلاک کرتا ہے ۔ چند آیات ملاحظہ ہوں :

الفجر ۔ ۶ : ألم تر كيف فعل ربك بعاد

ابراہیم ۔ ۴۵ : وتبين لكم كيف فعلنا بهم وضربنا لكم الأمثال

المرسلات ۔ ۱۸ : كذلك نفعل بالمجرمين ۔

الصافات ۔ ۳۴ : انا كذلك نفعل بالمجرمين ۔

شروع کی تین آیتوں میں گزشتہ قوموں کی ہلاکت کا تذکرہ ہے اور موخر الذکر آیت میں جہنم کے عذاب کا بیان ہے ۔ یہی معنی سورۂ فیل کی آیت میں بھی پایا جاتا ہے لیکن مولانا فراہی کی تاویل ماننے کی صورت میں عذاب میں انسانوں کی شرکت و معاونت لازم آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ نے لشکر ابرہہ پر سنگباری کی اور اس کے پردے میں اللہ نے ان کو ہلاک کیا ۔

(۲) سورۂ فیل کی تیسری آیت ہے : وأرسل عليهم طيرا أبابيل

قرآن میں جب ہم "أرسل علی" کے فعل کا استقرار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے یا تو نصب کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے یا انعام یا عذاب کے مفہوم میں ۔ اول الذکر مفہوم کی مثالیں :

مریم ۔ ۸۳ : ألم تر أنا أرسلنا الشياطين على الكافرين تؤزهم أزا

النساء ۔ ۸۰ : ومن تولى فما أرسلناك عليهم حفيظا مزید دیکھئے

الشوریٰ ۔ ۴۸ ۔

الاسراء ۔ ۵۴ : وما أرسلناك عليهم وكيلا

الانعام ۔ ۶۱ : وهو القاهر فوق عباده ويرسل عليكم حفظة

انعام کے مفہوم کی مثال :

ھود ۔ ۵۲ : يا قوم استغفروا ربكم ثم توبوا اليه يرسل السماء

علیکم مدرارًا

[مزید دیکھئے : نوح ۔ ۱۱ ، الانعام ۔ ۶]

ان کے علاوہ دیگر تمام آیتوں میں عذاب کے معنی میں آیا ہے جیسے :

الاعراف ۔ ۱۳۳ : فأرسلنا علیھم الطوفان والجراد ... الخ

" ۔ ۱۶۲ : فارسلنا علیھم رجزا من السماء

العنکبوت ۔ ۴۰ : فمنھم من ارسلنا علیہ حاصبا [مزید دیکھئے القمر ۳۴ الاسراء ۔ ۶۸ ، الملک ۔ ۱۷]

الاحزاب ۔ ۹ : فارسلنا علیھم ریحًا وجنودًا لم تروھا [مزید دیکھئے حم السجدہ ۱۶ ، الذاریات ۔ ۴۱ ، القمر ۔ ۱۹]

سبا ۔ ۱۶ : فارسلنا علیھم سیل العرم

القمر ۔ ۳۱ : انا ارسلنا علیھم صیحۃ واحدۃ

الذاریات ۔ ۳۳ : لنرسل حجارۃ من طین

الاسراء ۔ ۶۹ : فیرسل علیکم قاصفا من الریح

الکہف ۔ ۴۰ : فیرسل علیکم حسبانا من السماء

سورۂ فیل میں بھی "أرسل علی" عذاب کے معنی میں ہے جیسا کہ خود مولانا فراہی نے بھی لکھا ہے : "أرسل علیھم ، حرف علی میں یہاں غلبہ اور ضرر دونوں کا مفہوم پنہاں ہے"۔[۱] فخرالرازی نے بھی فعل 'ارسال' کے عذاب کے معنی میں ہونے کا اشارہ کیا ہے[۲] لیکن مولانا فراہی کی تاویل کی صورت میں عذاب کا مفہوم واضح نہیں ہو پاتا۔ مولانا نے

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل ص ۹ ۔

[۲] تفسیر کبیر رازی ۱۰۱/۳۲

ہیں کہ لشکر ابرہہ کو اللہ تعالیٰ نے حاصب کے ذریعہ ہلاک کیا۔ اس کے بعد ان کی لاشوں کو کھانے کے لیے چڑیاں بھیجیں۔ گویا چڑیاں عذاب کے لئے نہیں بلکہ دفع عفونت کے لئے بھیجی گئی تھیں تاکہ اہل مکہ کو پیش آنے والی تکالیف اور پریشانیاں دور ہوجائیں۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل مکہ کا جینا دوبھر ہوجاتا"۔ جبکہ قرآن ارسل علی کا لفظ استعمال کرتا ہے اور قرآنی استقراء سے معلوم ہوا کہ قرآن اسے عذاب کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔

(۳) سورۂ فیل کی چوتھی آیت ہے: ترمیھم بحجارۃ من سجیل [illegible] آیت سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ "ترمیھم" کے مخاطب [illegible] نہیں ہوسکتے اس [illegible] میں سجیل کی قسم کے پتھروں کا تذکرہ ہے۔ اگر سنگ [illegible] کرنے کی ہوتی [illegible] سجیل کی قید لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف "ترمیھم بحجارۃ" [illegible] کافی تھا۔ حضرت ابن عباس کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ سجیل فارسی الفاظ سنگ [illegible] کا معرب ہے۔ عربی زبان میں کنکر پتھر کے لئے متعدد الفاظ آتے ہیں لیکن ان [illegible] حرف سجیل کا استعمال خاص معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے [illegible] قسم کے پتھر [illegible] و نواح مکہ میں نہیں پائے جاتے تھے۔ پھر آخر اہل مکہ [illegible] کے لئے کہاں سے لے آئے تھے۔؟

[illegible] مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی نے بھی کیا ہے۔ اس پر جناب [illegible] صاحب نے بڑا مضحکہ خیز تبصرہ کیا ہے۔ جن آیتوں [illegible] سجیل اور حجارۃ من طین کے الفاظ آئے ہیں انھیں نقل [illegible]

[illegible] ہیں:

[illegible] ذکر ہے۔ جن کو ایسی شدید اور تیز و تند آندھی [illegible] ہلاک کیا گیا تھا جو اپنے ساتھ سجیل کے قسم کے پتھر لئے ہوئے

آئی تھی اور مسلسل کئی روز تک چلتی رہی۔ یہ قومیں عرب تھیں اور سرزمین حجاز میں آباد تھیں۔ انھیں ہلاک کرنے والی آندھی کہیں دور دراز سے کنکر پتھر لے کر نہیں آتی تھی بلکہ وہ جن راستوں سے گزرتی تھی انھیں میں پڑے ہوئے کنکر پتھر اپنے ساتھ اڑاتے ہوئے چلتی تھی اب اگر اس علاقے میں سجیل کی قسم کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آندھیاں بھی اپنے ساتھ سجیل کے پتھر کہاں سے لائی تھیں۔"[1]

یہ ایک فاش غلطی ہے۔ قرآن میں سورۂ فیل کے علاوہ دو جگہ اور حجارۃ من سجیل کے الفاظ آئے ہیں (ہود۔۸۲، الحجر۔۷۴) اور ایک جگہ حجارۃ من طین کے الفاظ ہیں (الذاریات۔۳۳) تینوں جگہ مراد قوم لوط ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ سے ادنیٰ سی بھی واقفیت رکھنے والا جانتا ہے کہ قوم لوط حجاز میں نہیں بلکہ حجاز سے سینکڑوں میل دور شام میں بحر مردار (DEAD SEA) کے کنارے آباد تھی۔ اس لئے قوم لوط کو قلم کے زور پر سرزمین حجاز میں آباد کردینا سخت غلطی ہے۔

نئی تاویل کا سبب:

مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل کا مطالعہ کرتے وقت بارہا یہ خیال ذہن میں آیا کہ آخر مولانا کے ذہن میں یہ عجیب وغریب تفسیر کیسے آئی۔ جبکہ کوئی روایت ساتھ نہیں دیتی۔ تفسیر کی کسی کتاب میں ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا اور

---

[1] تحقیقات اسلامی ص۵۵-۵۶۔

امت کی تاریخ میں کسی کی جانب سے یہ رائے سامنے نہیں آئی ۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اشعار عرب کے وسیع وعمیق مطالعہ کے نتیجہ میں مولانا کے ذہن میں عربوں کی اخلاقی عظمت، شجاعت وبہادری، شہسواری اور شمشیر زنی کی تصویر مرتسم ہوگئی تھی۔ اس لئے ان کو شبہ ہوا کہ انھوں نے لشکر ابرہہ سے ضرور مقابلہ آرائی کی ہوگی ۔ اسی کو بنیاد بناکر مولانا نے اشعار عرب میں سے مجمل اشعار لے لئے اور انھیں اپنے مدعا پر دلیل بنادیا، اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر سورۂ فیل پر نظر ڈالی اور جو جو اشکال آتے گئے انھیں قرآن کے مختلف اسالیب، قواعد نحو اور عربی اشعار سے حل کرتے گئے۔ اور جو روایتیں ان کے خلاف ملیں۔ انھیں "بے بنیاد، غلط اور لغو" قرار دے دیا۔ اور اس طرح تانے بانے بنتے بنتے سورۂ فیل کی ایک ایسی تفسیر وجود میں آئی جو حقیقت کے بالکل برعکس تھی۔ مولانا کے اس خیال کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

"دنیا کے پردے پر کوئی قوم ایسی نہیں جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر نہ سمجھتی ہو۔ پھر اس سے اس بے حمیتی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بغیر کسی مدافعت کے اپنا معبد دشمنوں کے حوالے کرکے پہاڑوں میں جا چھپے گی۔ اس طرح کی بے حمیتی کا گمان تو ہم دنیا کی ادنیٰ قوموں کی نسبت بھی نہیں کرسکتے تو قوم قریش دبنی اسماعیل کی نسبت کس طرح کرسکتے ہیں جن کا تمام تر سرمایہ فخر وناز ہمیشہ شہسواری، شمشیر زنی اور قدر اندازی ہی رہا ہے یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر آنچ آنے نہیں دی۔" [1]

---

[1] تفسیر سورۂ فیل ص۲۹ ۔

اہل مکہ کے لشکر ابرہہ سے مقابلہ نہ کرنے کی وجہ ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں۔ مولانا فراہی کا یہ استدلال سراسر عقلی اور قیاسی ہے۔ تاریخ کے کسی واقعہ کے ثبوت کے لئے محض قیاس کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے تاریخی شہادت مطلوب ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں اس سلسلہ میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بلکہ مولانا کی فرض کردہ صورت پر کئی اعتراضات پڑتے ہیں:

(۱) کلام عرب میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اہل مکہ نے ابرہہ سے اپنے مقابلہ کا ہلکا سا بھی تذکرہ کیا ہو۔ بعد میں بھی بہت سی جنگیں ہوئیں لیکن کبھی اہل مکہ نے فوج کو ابھارنے اور جوش دینے کے لئے یہ نہیں کہا کہ مقابلہ کرو جس طرح تم نے ابرہہ سے مقابلہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔ تمام اشعار میں لشکر ابرہہ کی تباہی کو صرف اللہ کا کرشمہ کہا گیا ہے۔ ذوالرمہ کے اشعار میں مقابلہ کا جو ذکر ہے اس کے سلسلے میں ہم بتلا چکے ہیں کہ اس میں پہلے ہونے والی جھڑپوں میں سے کسی جھڑپ کا تذکرہ ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

عبدالمطلب نے دعا کے وقت کہا تھا:

یا رب لا ارجو لهم سواك ویا رب فامنع منهم حماك[1]

[اے رب ان کے مقابلہ کے لئے مجھے تیرے سوا کسی سے امید نہیں ہے۔ اے رب ان سے اپنے گھر کی حفاظت فرما]

انھیں کا شعر ہے:

منعت أبرهة الأرض التي حميت من الأنام ثم تخلق لهم ود الدا[2]

---

[1] نقوش رسول نمبر۔ سیرت ابن اسحاق ص ۵۹

[2] ایضاً

مغیرہ مخزومی کہتا ہے :

انت حبست الفیل بالمغمس ۔۔۔ اھلکتنا یا یکسوم والمغلس

کر دستھم وانت غیر مکردس ۔۔۔ نذعسھم وانت غیر مذعس[۱]

[تو نے ہاتھی کو مغمس کے مقام پر روک دیا اور تو نے ابویکسوم اور مغلس کو ہلاک کر دیا۔ تو نے ان کی ہڈیاں اور جوڑ بند توڑ دیئے، تو نے انھیں پامال کر دیا اور روند ڈالا اور ان کا تخریبی منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا]

طالب بن ابی طالب بن عبد المطلب کا شعر ہے :

ألم تعلموا ما کان فی حرب داحس ۔۔۔ وجیش أبی یکسوم اذ ملئوا الشعبا

فلولا دفاع اللہ لا شیٔ غیرہ ۔۔۔ لاصبحتم لا تمنعون لکم سربا[۲]

[کیا تمھیں معلوم نہیں کہ داحس کی جنگ اور ابویکسوم کے لشکر کا کیا انجام ہوا۔ جب انھوں نے وادی کو بھر دیا تھا۔ اس وقت اگر اللہ تعالیٰ انھیں دفع نہ کرتا تو تم قوم کی حفاظت نہ کر سکتے تھے]

ابوامیہ بن ابی الصلت کا شعر ہے :

حبس الفیل بالمغمس حتی ۔۔۔ ظل یحبو کانہ معقور[۳]

[اس نے ہاتھی کو مغمس میں روک دیا یہاں تک کہ گھٹنوں کے بل اس طرح چلتا تھا جس طرح وہ اونٹنی چلتی ہے جس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہوں۔]

۱۔ سیرت ابن ہشام

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

یہ احسان کے علاوہ دیگر تمام اشعار میں صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا ہے۔ اور لشکر ابرہہ کی پسپائی کو اسی کا کرشمہ قرار دیا گیا ہے۔ اہل مکہ کے مقابلہ کا ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

(۲) بدویانہ سنگ اندازی کی جو صورت فرض کی گئی ہے تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر اہل حجاز اس طریقے کے عادی تھے تو اس سے پہلے ہونے والی جنگوں میں بھی اس طریقۂ جنگ کے اختیار کرنے کا تذکرہ کلام عرب میں ملنا چاہیئے۔ اور اگر انھوں نے پہلی مرتبہ یہ اختیار کیا تھا تو بھی اس کی صراحت ضروری ہے اور کلام عرب میں اس کا بھی حوالہ ملنا چاہیئے۔

(۳) عربوں کی شجاعت و بہادری، ہمت و دلیری، غیرت و حمیت، شہسواری و شمشیر زنی اور حریت پسندی کی داستانیں بجا۔ لیکن محض اس کی بنیاد پر تاریخ گڑھنا اور حقائق کے بر خلاف نئی تصویر پیش کرنا صحیح نہیں بلکہ اس کے لئے ٹھوس تاریخی حقائق مطلوب ہیں۔ تاریخ، سیرت اور حدیث کی کتابوں میں فتح مکہ کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہ کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے تو اہل مکہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ صرف حضرت خالد بن الولیدؓ کے دستہ سے بہت معمولی سی جھڑپ ہوئی۔ اب اگر کوئی اہل مکہ کی شجاعت و حمیت کی بنیاد پر یہ کہنے لگے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ ضرور ہوئی ہوگی تو اسے تاریخ بیانی نہیں، تاریخ سازی ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہی حال واقعۂ فیل کا بھی ہے۔ تاریخی ثبوت نہ ہونے کے باوجود محض اہل عرب کی شجاعت کی داستانوں کی بنیاد پر ان کی معرکہ آرائی ثابت کرنا بعید از صواب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل مکہ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مکہ پر کسی ناحق شخص کو مسلط نہیں کرے گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ پر فتح پائی تو فرمایا:

"ان اللہ حبس عن مکۃ الفیل، وسلّط علیہا رسولہ والمؤمنین وانہ قد عادت حرمتہا الیوم کحرمتہا بالامس"۔ [1]

[اللہ نے مکہ سے ہاتھی کو روک دیا اور اپنے رسول اور اہل ایمان کو اس پر تسلط بخش دیا ۔ آج مکہ کی حرمت اسی طرح ہوگئی ہے جیسے کل تھی]

فتح مکہ کے بعد لوگ جوق درجوق اسلام قبول کرنے لگے ۔ اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ حضور حق پر ہیں ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مکہ پر غلبہ بخش دیا ہے ۔ وہ کہا کرتے تھے :

"اترکوہ وقومہ فانہ ان ظہر علیہم فہو نبی صادق" [2]

[انھیں (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) اور ان کی قوم کو چھوڑ دو ۔ اگر وہ غلبہ پا جائیں گے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سچے نبی ہیں]

پیش نظر مقالہ میں مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل کے صرف متعلقہ مباحث پر گفتگو کی گئی ہے ۔ ورنہ واقعۂ فیل کے سلسلے میں دوسری رائیں اور بعض دوسری جزئیات بھی ہیں جن پر بحث کی ضرورت ہے ۔ لیکن طوالت کے خوف سے ہم انھیں قلم انداز کر رہے ہیں ۔

مولانا فراہی نے اپنے اسی رسالہ کے آخر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی

---

[1] صحیحین ۔

[2] صحیح بخاری ۔

ہے کہ مناسک حج میں "زبدی جملہ" کا اضافہ مع تعرفیل کے بعد اس کی یادگار کے طور پر کیا گیا
اور اس سے مقصد اسے ملحق کرنا تھا۔ اس پر راقم نے ایک دوسرے مقالہ میں بحث کی ہے جو
"مناسک حج کی تاریخ" کے عنوان سے ماہنامہ "حیات نو" اعظم گڑھ کے مئی و جون ۱۹۸۲ء
کے شماروں میں شائع ہو گیا ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

ختم شد

معذرت

مجھے اس بات کا بے حد دکھ اور احساس ہے کہ "برہان" کے سابق مرتب جناب مرحوم جمیل مہدی
کے انتقال کے بعد میں ذہنی طور پر انتشار کا شکار رہا چنانچہ ماہ مئی ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں جناب سید
شہاب الدین دسنوی کا جو مقالہ شائع ہوا ہے اسے بین السطور دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ
قبلہ قاضی صاحب پر اعتراض ہی ملاحظہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ مذکورہ شمارہ میں ہی محترم ڈاکٹر
جناب خلیل احمد صاحب کے مضمون میں بھی بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں جو بہر حال "برہان" کے
معیار اور مزاج کے مطابق نہیں "مثلاً" داماد، صاحبزادی اور صاحبزادوں نے حضرت مفتی صاحب
کی بڑی خدمت کی الخ"۔ مفتی صاحب کی اولاد کا یہ اولین فریضہ تھا یہ کوئی احسان نہیں۔
احسان تو قوم و ملت کے ان اکابر اور بزرگوں کا ہے جنھوں نے ملت کے تعلق سے بے لوث خدمات
انجام دیں، وغیرہ۔ نیز سابقہ سالوں میں جناب اطہر صدیقی یا مستشرق معاصر اخبارات "نئی دنیا"
وغیرہ میں غیر موزوں جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی غیر علمی چیزیں برہان میں
شائع ہونا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اس طرح کی تمام تحریروں کو کالعدم سمجھا جائے
اور ادارہ کی فروگذاشت کو نظر انداز کر کے معذرت قبول کی جائے۔

(عمید الرحمٰن عثمانی)

تاریخ اسلام

خلافت راشدہ و بنی امیہ

(آخری قسط)

از جناب عبدالرؤف خاں صاحب ایم۔اے، اودنی کلاں

پروفیسر خورشید احمد فارق صاحب نے اپنی معنون بالا تصنیف میں کئی مقامات پر "جہاد" کی خالص مادی و اقتصادی تفسیر و تعبیر کرتے ہوئے اس کے اعلیٰ و ارفع روحانی مقصد کو سرتاسر معکوس اور منقلب کر دیا ہے۔ خلافت ص ۱۳۵ پر عنوان "مسلمانوں کی اقتصادی حالت" کے تحت ارقام فرماتے ہیں:

" ابوبکر صدیق رض نے ردّہ بغاوتیں فرد کر کے جب عراقی و شامی سرحدوں پر فوج کشی کی اور کئی نئے محاذ کھل گئے تو سپاہیوں کا توڑ پڑ گیا۔ ان کی ترغیب پر حجاز و یمن کے دو حصوں مفلوک الحال عرب قبیلے جنگ میں شرکت کے لیے آگئے تھے اور وسائل سے بھرپور دونوں پڑوسی ملکوں کی سرحدیں جنگیں جیت کر فقر و ناداری سے نجات پا چکے تھے...... عمر فاروق کے عہد میں عراق، شام، فارس، میسوپوٹامیہ اور مصر میں بہت سے نئے محاذ کھلے اور بڑی بڑی جنگوں کی تیاریاں ہوئیں تو پھر سپاہیوں کا توڑ پڑ گیا...... (عمر فاروق کی پکار پر) ...... بہت سے عرب جو ناداری کا شکار تھے اور بہت سے قبائلی رئیس جن کے دل میں کارہائے نمایاں کر کے دولت، عزت اور مرتبے حاصل کرنے کی لگن تھی، عمر فاروق رض کی پکار پر اپنی ریگستانی بستیوں سے نکل آئے اور خلافت کی فوجوں میں ضم ہو گئے۔" اس سے پیشتر ص ۷۰

پیرا نمبر ۲ بھی بہ تغیر خفیف یہی بات سپردِ قلم فرما چکے ہیں۔

فاضل پروفیسر صاحب نے جہاد اور بدوی قبائل کے اسلامی افواج میں انضمام کا یہی مقصد قرار دیا ہے جو مشہور مستشرق سر ہملٹن الیگزینڈر گب حال ۱۹۷۱ء نے اپنے ایک مقالہ "اسلامی تاریخ کی تعبیر"

(An Interpretation of Islamic History)

میں واضح کیا ہے کہ "چونکہ ناگزیر معاشی محرکات نے عرب کے حالات میں استحکام کی کسی صورت کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا، اس لیے بادیہ نشین قبائل کی مخالفت کو فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دینا مسئلہ کا مناسب اور مستقل حل نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور پر داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام سے اپنے دنیوی مفاد کو وابستہ سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مکی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا، مقصود گویا یہ دیکھنا تھا کہ اگر قبائل کی توجہ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دی جائے تو اُن پر اس کا کیا ردِ عمل ہو گا۔ اس میں کامیابی ہوئی تو پھر جنگوں اور فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔"[۱]

بدوی قبائل کے خلافت کی فوجوں میں ضم ہونے اور اُن کے اسلام قبول کرنے نیز مقصد جہاد کی تعبیر و توضیح میں مذکورہ دونوں بیانات پڑھنے کے بعد قارئین پر یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیئے کہ مستشرقین کے صفِ اول کے اسکالر سر ہملٹن گب

---

[۱] مقالہ بعنوان "سر ہملٹن الیگزینڈر روسکین گب"، از پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، بابت ماہ اکتوبر ۸۲ء ص ۲۷۸۔

اور پروفیسر فاروقی صاحب کے طرزِ نگارش میں کتنی ہم آہنگی اور یکسانیت ہے۔ گویا: ؎ میری زباں میں رنگ تمہاری زباں کے ہیں

جہاد کے مبینہ مقصد پر خاکسار راقم الحروف اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے کے بجائے محترم پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے الفاظ مستعار میں عرض کرنا چاہے گا کہ "تعبیر کا یہ وہ انداز ہے جسے ہم سرتاسر معاشی و مادی اندازِ فکر کہتے ہیں، اس میں آپ کو دینِ اسلام کی انقلابی و اصلاحی تعلیمات کی تاریخ ساز کارفرمائی کہیں نظر نہیں آئے گی یعنی یہ کہ بدوی قبائل نے اسلام کو اُس کے اپنے انسانی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و معاشی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے انھیں تعلق پیدا ہوا .... ہمارے نزدیک یہ رویہ فنِ تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق بھی نہیں ہے اس لیے کہ اس رویہ سے اُسی تاریخی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے جس پر جدید محققین ناز کرتے ہیں[۵۲] مورخ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ اپنے پیشرو مورخین کے بیانات کو "بانداز دگر" پیش کر دے بلکہ اُسے تمام تر حالات کے تجزیے سے اسباب و علل اور اُن کے اثرات و مضمرات کی ایک ایسی تصویر پیش کرنی چاہیے جو واقعات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ بہرحال جہاد کے اقتصادی مقصد کی مزید توضیح فرماتے ہوئے ص ۶-۵۴۴ پر رقمطراز ہیں: "اسلامی معاشرے کو جس ضابطے سے اقتصادی توانائی اور سیاسی عروج حاصل ہوا وہ دربارِ خداوندی میں مورتیوں کے تقرب کے قائل یا رسول اللہؐ کی نبوت سے انکار کرنے والوں کے ساتھ جنگ و قتال کا ضابطہ تھا۔ اسے رسول اللہؐ کی زندگی میں بے حد اہمیت حاصل تھی وہ جب تک جیے

[۵۲] ایضاً ص ۲۷۹-

اس ضابطے پر بڑی تندہی سے عمل کرتے اور کراتے رہے اور اس کی ترغیب و تاکید برابر دی کے ندر بہ ہوتی رہی۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ۔ (بقرہ ۲۱۶) تم پر جنگ و قتال فرض کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے۔ وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (انفال ۳۹) مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہے۔) فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ (توبہ ۵) جہاں کہیں بھی مورتیوں کی تعظیم کرنے والے تمہیں ملیں انھیں قتل کر دو۔ وَقَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ۔ (توبہ ۱۲۳) اپنے پڑوسی غیر مسلموں سے لڑو۔ وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ (انفال ۶۰) مخالفین سے لڑنے کے لیے جس قدر ممکن ہو فوج اور جنگی گھوڑے تیار رکھو۔ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ (انفال ۶۵) اے نبی مسلمانوں کو غیر مسلموں سے لڑنے پر اکساؤ۔ مدینے کے دس سالہ قیام میں رسول اللہ کے فوجی اقدامات کا تناسب فی سال سات سے زیادہ رہا۔ انھوں نے بذات خود عربوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف تقریباً سوا دو درجن فوجی مہموں کی خود قیادت کی اور علی اقل التقدیر چار درجن مہمیں اپنے سالاروں کی کمان میں بھیجیں، وسائل خورد و نوش کی عام کمی اور قدرت کی طرف سے ملک میں اس غیر مساویانہ تقسیم کے باعث عربوں میں لوٹ مار اور جنگ و قتال کا رجحان پہلے ہی بڑھا ہوا تھا۔ اس ضابطے پر عمل اور اس کی پیہم تاکید اور غنیمت سے حاصل ہونے والے عظیم مالی فوائد کے لیے جنگ و قتال اور جارحانہ ترکتاز اسلامی معاشرے کے مزاج اور خمیر کا جزو لاینفک بن گیا تھا۔" ص ۶۹-۷۰ پر بھی بیشتر ازیں یہ ترمیم

۵۳ آیات شریفہ پر تمیر راقم الحروف نے تحریر کیے ہیں۔ اے. رؤف۔

خیف مولا با لا عبارت ارقام فرمائی جا چکی ہے۔ البتہ یہاں سورۂ براءت کی
آیت ۱۲۳ " قاتلوا الذین ..... معہم صاغرون "
کا اضافہ فرماتے ہوئے جنگ و قتال کا اصطلاحی نام " جہاد " بتلایا ہے۔ نیز ص
۱۳ - ۲۱۲ پر بھی جہاد کے اسی مفہوم کا اعادہ بزیرِ عنوان " جہاد " کیا گیا ہے مگر
جہاں یہ اضافہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ " جہاد ہر مسلمان کے لیے مذہبی فریضہ ہی
نہیں تھا جس سے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل ہوتی تھی بلکہ اقتصادی
خوشحالی اور دنیوی سربلندی کا زینہ بھی تھا۔ اسلامی معاشرے کی اقتصادی
عمارت کی تشکیل عہد نبوی ہی سے منہزم غیر مسلموں کی دولت اور ان کے بال
بچوں کی خدمت سے ہوئی تھی جو غلام بن کر غازیوں کے ہاتھ آئے تھے۔ اس دوطرفہ
فضیلت کے باعث جہاد اسلامی نفسیات کا جزء لاینفک اور رسول اللہ ؐ کے جانشینوں
کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا "

مذکورہ بالا عباراتِ زیرِ بحث میں فاضل پروفیسر صاحب نے آیاتِ جہاد
کو ان کے سیاق و سباق سے کاٹ کر مقصدِ جہاد کی توضیح اس انداز و اسلوب
میں پیش فرمائی ہے کہ قاری کے ذہن پر بقول اکبر الہ آبادی بالالتزام یہ تاثر قائم
ہوتا ہے کہ " بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے " ساتھ ہی محسوس
ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مستشرقین کے تتبع اور تاسی میں سپردِ قلم کیا گیا ہے یورپین
فضلاء کا کہنا ہی یہ ہے کہ غزوات و سرایا شوقِ شہادت اور اللہ کے دین کی
سربلندی جیسے پاکیزہ جذبات و اعلیٰ مقاصد کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب، نادار،
مفلوک الحال اور ننگے بھوکے مہاجرین و انصار کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور
ان کی پرانی خوئے التجاج کے تحت لوٹ مار کر کے عظیم مالی فوائد حاصل کرنے کا
وسیلہ تھے۔ علاوہ ازیں اقتباساتِ بالا میں بعض آیات کا ترجمہ بھی محلِ نظر ہے،

مثلاً سورۂ انفال کی آیت ۳۹ کا یہ ترجمہ " مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہے " اس کے بالمقابل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ " اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ اُن میں فسادِ عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے " ہماری رسائی کی حد تک دیگر مشاہیر مترجمین نے بھی تقریباً بہ تغیر خفیف حضرت تھانویؒ کے ترجمہ کے ہم معنی ہی ترجمہ کیا ہے۔ مزید برآں سورۂ براۃ کی آیت نمبر ۱۲۳ کے صرف درمیانی فقرہ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ (اپنے پڑوسی غیر مسلموں سے لڑو) پر اکتفاء کر لیا گیا ہے جو علمی وقار و متانت کے منافی ہے۔ موصوف کے بیان کردہ ترجمہ سے متبادر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ہمسایہ غیر مسلموں سے لڑنے کا جبری حکم دیا جا رہا ہے۔ جو پڑوسیوں سے متعلق قرآنی تعلیمات اور ہدایاتِ نبویؐ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس پوری آیتِ شریفہ کا ترجمہ یہ ہے، " اے لوگو جو ایمان لائے ہو جنگ کرو اُن منکرینِ حق سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے (ترجمہ مولانا مودودی علیہ الرحمۃ) اس کی تفسیر میں مولانا ئے مرحوم فرماتے ہیں کہ " یہاں قریب اور پاس پڑوس سے مراد غیر مسلموں کا وہ علاقہ ہے جو دارالاسلام سے نزدیک ہے یعنی پہلے اِن سے لڑا جائے اور پھر اُن سے جو دُور ہیں " اور منکرینِ حق اور کفار سے مراد وہ منافق لوگ ہیں جن کا انکارِ حق پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا اور جن کے اسلامی سوسائٹی میں خلط ملط رہنے سے سخت نقصانات پہنچ رہے تھے[1]۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی اُس آیت کو پیش کر دیا جائے جس میں صاف

[1] تلخیص تفہیم القرآن ص ۵۳۹ طبع نمبر ۳ ستمبر ۱۹۷۵ء ایڈیشن نیز تفہیم القرآن ۲: ۲۵۲ حواشی ۱۲۱ تا ۱۲۳ بھی دیکھے جائیں۔

جہاد کی اجازت دی گئی ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ غنیمت حاصل کرنے
ے" یا معاذ اللہ کفار کی اجازت فرما رہے ہیں یا صرف مدافعت کی ۔
قاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ
یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔ (بقرہ ۱۹۰) یعنی " اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں
ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلو، واقعی اللہ تعالیٰ
ے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے " یعنی یہ جو فرمایا کہ جو تم سے لڑیں ان سے لڑو
ر زیادتی نہ کرو اس کے معنی یہ کہ لڑائی میں لڑکے اور عورتیں اور بوڑھے قصداً
مارئیے لڑنے والوں کو مارئیے ۔" (موضح القرآن) قرآن مجید میں یہ اول آیت
ہ جس میں جہاد و قتال کا حکم دیا گیا[۵] (حقانی) اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے
ہجرت کے بعد جہاد کی پہلی آیت جو نازل ہوئی، وہ یہ ہے : اُذِنَ لِلَّذِیْنَ
یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا " (ان لوگوں کو اجازت دیدی گئی جن سے لڑائی کی
اتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا) یہ اور دیگر آیاتِ جہاد اس بات کی بخوبی
نشاندہی کر رہی ہیں کہ جہاد کوئی جارحانہ فعل یا مسلمانوں کی طرف سے زیادتی کے طور
نہیں تھا بلکہ وہ مدافعانہ اور تمام تر دفاعی تھا جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے[۶]
اصل پروفیسر فاروق صاحب نے مقاصدِ جہاد کے استنباط و استنتاج میں بجائے

• ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ۱ : ۱۵۰ ج ۱ ۲۰ مئی ۱۹۸۳ء ایڈیشن نیز ماہنامہ برہان دہلی
اپریل ۱۹۸۳ء ص ۹ تا ۱۲، حاشیہ ۳ مقالہ خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض
جناب مولوی شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور ۔ ۵
۶ ملاحظہ ہو " مقالہ " خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض از جناب مولوی محمد
شہاب الدین صاحب ندوی مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی بابت اپریل ۱۹۸۳ء ص
۱۲ تا ۱۳ نیز سیرۃ النبی ۱ : ۳۰۵ مطبوعہ ۱۹۸۳ء ۔

مورخانہ روایات کے بجائے ذاتی ذوق پر اعتماد فرمایا ہے اور صرف اُن باتوں کو قبول کیا جن سے اُن کے مخصوص موقف کی تائید ہوتی تھی۔ موضوعیت سے انحراف کے بعد ایسے ہی نتائج بر آمد ہوتے ہیں جو علمی معیار اور متانت و سنجیدگی اور حقائق و واقعات سے خالی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے تمام تر غزوات و سرایا کو بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے"[۵۳]

مذکورۃ الصدر اقتباسات میں فاضل پروفیسر صاحب نے جہاد کے خصوصی طور پر دو مقصد قرار دیے ہیں یعنی سیاسی بالادستی اور اقتصادی توانائی حاصل کرنا۔ لیکن اِن مقاصد کو اسلامی تعلیمات سے کوئی مناسبت نہیں کیونکہ جب کبھی نبیِ اکرم علی تحیۃ والسلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص غنیمت کے لیے دوسرا ناموری کے لیے اور کوئی اظہارِ شجاعت اور اپنے رتبہ کو بلند کرنے کے لیے جہاد و قتال کرتا ہے تو ان میں سے کس کا جہاد راہِ خداوندی میں خیال کیا جائے گا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ صرف اس شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں سمجھا جائے گا جس نے اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے جہاد کیا ہو[۵۴] چنانچہ آپؐ کی تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ مالِ غنیمت جو سب سے زیادہ محبوب و مرغوب شے تھی صحابۂ کرامؓ کے دلوں سے بالکل اتر گئی اور اُن کے اذہان میں مقصدِ جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ رہ گیا...... چنانچہ مجاہدین اولین کو جو چیز میدانِ جنگ میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ لے جاتی تھی وہ دوسروں کی دولت و محنت کے

---

۵۳ سیرت النبیؐ ۵: ۲۹۹ مطبوعہ ۱۹۸۳ء
۵۴ ماہنامہ برہان دہلی ۱۹۸۲ء ص ۲۱۳/۲۱ ۔ مقالہ مذکور نیز سیرۃ النبیؐ ۱: ۶۱۵ مطبوعہ ۱۹۸۳ء۔

ذریعہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا لالچ نہ تھا بلکہ اسلام کا سیاسی عروج و استحکام بھی دینِ حق کی سربلندی کے لیے تھا نہ کہ ذاتی اغراض و خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے۔ جہاد کے سلسلے میں لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم کی مصداق قارئین برہان کی سمع خراشی قدرے زیادہ ہو گئی ہے جس کے لیے راقم الحروف معذرت خواہ ہے۔ موصوف کی تصنیف میں نہ صرف جہاد بلکہ دیگر واقعات کے پس پردہ بھی صرف معاشی و مادی محرکات کو ہی نمایاں مقام حاصل ہے جس سے ذہن پر یہ تاثر پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اُس عہد میں "بے قید جنسی میل ملاپ" کے سبب معاشرے میں نفسانی شہوات اور نان و نوش و تن و توش کا غلبہ زائد از ضرورت تھا جس میں لوگ صرف اسیرِ مرغ و ماہی ہو کر رہ گئے تھے اور اُن کی زندگی کی تمام تگ و دو محض شکم پروری کی حد تک محصور تھی جس میں زندگی کے اعلیٰ روحانی مقاصد کا یکسر فقدان و بحران تھا۔

تاریخِ اسلام، خلافتِ راشدہ و بنی امیہ کے فاضل مصنف حضرت امام حسن رضی کی سراری کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ، "اُن کی چہیتی کنیزوں کے بارے میں بھی ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اُس زمانے میں سراری رکھنے کا عام رواج تھا اور خود اُن کے والد علی حیدر رضی کی سترہ سراری تھیں اس لیے غالب قرینہ ہے کہ امام حسن رضی کے بھی سراری رہی ہوں گی۔" (ص ۲۵۸) ہمارے انتہائی ناقص و محدود مطالعہ میں اب تک یہی آیا تھا کہ تاریخ واقعات و حقائق کے تحقیقی مطالعہ کا نام ہے نہ کہ قیاس و قرائن پر منحصر تحریر کا۔ مگر مذکورہ تحقیق پڑھ کر معلوم ہوا کہ تاریخ میں

له انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از حضرت علی میاں صاحب ادام اللہ فیضہم ص ۷۰ - ۱۶۹ نیز ۲۲ - ۱۲۱ و ۱۶۲

"غالب ترجیح کیوں؟ اور خلل جلد ملد وختم کی بیماری کا سہارا لے کر آسانی سے کسی بھی تاریخی کردار کی شکل و صورت آسانی سے مسخ کی جا سکتی ہے۔ عرض مدعا یہ کہ جب امام موصوف کی سرداری کے ضمن میں عصری تواریخ سے کسی قسم کی معلومات بہم نہیں ہوتیں تو پھر قطعی طور پر یہ فرمانا کہاں تک درست ہے کہ اُن کے والد کے ستر سرداری تھیں" اس لیے غالب قرینہ ہے کہ امام حسنؓ کے بھی سرداری رہی ہوں گی" یہ شاید اسی کا نام مضمون آفرینی ہے۔ ؎

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے   مضمونِ بلند لامکاں سے لائے

بہر حال ایک مؤرخ کے لیے آزادیٔ رائے کے باوجود حقائق مقدس ہونے چاہئیں۔

تبرا کی شروعات کے تحت فرماتے ہیں کہ " تبرا کی ابتدا خود علی حیدرؓ نے کی تھی جس کا جواب امیر معاویہؓ نے بھی تبرا سے دیا تھا......(۵۵۰) اس سے پیشتر ص ۳-۲۶۲ پر بھی اس سلسلہ کی یہ عبارت موجود ہے، "تحکیم کے بعد علی حیدرؓ نے نماز وتر میں دعائے قنوت کے بعد امیر معاویہؓ، اُن کے مشیرانِ خاص پر لعنت بھیجنا شروع کر دی تھی اور اس کے جواب میں امیر معاویہؓ نے بھی علی حیدرؓ اور اُن کے بعض ممتاز مقربوں پر مسجدوں میں لعنت بھیجنے کا حکم دیدیا تھا"

لیکن اس کے برعکس شاہ معین الدین احمد ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ "اموی خلفاء نے ایک بُری عادت یہ جاری کی تھی کہ وہ خود اور اُن کے تمام عمال خطبہ میں حضرت علیؓ پر لعن طعن کیا کرتے تھے اور اِسے خطبہ کا جز بنا دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اِسے بالکل بند کر دیا اور تمام عمال کے نام فرمان جاری کر دیا کہ حضرت علیؓ کے متعلق جو ناملائم الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ بند کر دیں اور اس کی جگہ کلام اللہ کی یہ آیت داخلِ خطبہ کریں، اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ جو آج تک جاری ہے"[له]

له تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۲۱۹، مطبوعہ ۱۹۲۳ء۔ تاریخ الخلفاء حصہ دوم ص ۱۱۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر دیکھیں)

علاوہ ازیں علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) صاحب البدایہ والنہایہ نے اس واقعہ کی تردید کی ہے اور بالصراحت لکھا ہے اِنَّ ھذا لم یصح۔ بالفرض یہ دعا کسی حد تک تسلیم بھی کر لی جائے تو بغیر لعن کی تھی۔ کیونکہ یہ بات حضرت علیؓ کی علو شان سے بعید تر ہے کہ عورتوں کی طرح بیٹھے ہوئے حریف کو کوسا کریں۔ ایک دفعہ جب آپؓ سے جمل اور حنین کے مقتولین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو جواباً فرمایا کہ دونوں فریقین کے مقتولین جنتی ہیں بشرطیکہ اُن کے دل صاف ہوں۔ پھر حیات اور زندہ لوگوں کے بارے میں نا ملائم الفاظ کہنے کی ابتداء وہ کیوں کر کر سکتے تھے اور واقعہ ہے کہ نہ تو حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ پر لعن کیا اور نہ حضرت معاویہؓ نے امیر المومنین حضرت علیؓ پر۔ ابو لولو کے قاتلانہ حملہ کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے ایک چھ رکنی پینل مقرر کر دیا تھا تاکہ یہ پینل بعد از مشاورت اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لے۔ چنانچہ بقول فاضل پروفیسر صاحب "پینل کے ارکان خلافت کے لیے اپنی اپنی فضیلت، جہادی خدمات اور اہلیت کا پُرزور اظہار کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جھگڑا ابھر رہا ہے۔" (ص ۱۴۵)

(حاشیہ بقیہ نمبر ۱۰) از علامہ سیوطیؒ۔ ناشر ادارہ درس اسلام دیوبند۔

۱۱ تاریخ ابن خلدون ۱: ۸۰۷ حاشیہ ۱ مطبوعہ دیوبند۔

۱۲ مقدمہ ابن خلدون (اردو) جلد اول ص ۳۸۳ بحوالہ طبری۔

عہ بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرات شیخینؓ اور حضرت عثمانؓ پر سب و شتم اور لعن و تشنیع کی مذموم رسم کا آغاز عبداللہ ابن وہب ابن سبا المعروف بہ ابن السوداء نے کیا تھا جو ایک یہودی الاصل غالی شیعی تھا۔ برائے حوالہ دیکھیے مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس صفحہ ۱۳۹۔

جب حضرت علی رض کو اپنے منتخب ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو وہ اپنے گھر گئے اور اپنے چچا عباس بن عبد المطلب اور دوسرے ہاشمی بزرگوں سے شکایت کی .... (اور کہا) عمر نے وصیت کر دی ہے کہ خلیفہ وہ فریق ہوگا جسے عبد الرحمن کی تائید حاصل ہو۔ بخدا اگر عمر جیتے رہے تو میں بتاؤں گا جیسی انھوں نے ہماری حق تلفی کی ہے اور اب اور پہلے جیسی جیسی ہمارے ساتھ بدسلوکیاں کرتے رہے ہیں اور اگر مر گئے جیسا کہ پورے آثار ہیں تو پینل کے باقی رکن یقیناً خلافت سے ہمیں محروم کر دیں گے اور اگر انھوں نے ایسا کیا اور یقیناً وہ ایسا کریں گے تو میں بھی انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔" (ص ۱۳۶)

بینہ مزاجی کیفیت کسی مغلوب الغضب اور بندۂ حرص و آز شخص کی تو ہو سکتی ہے مگر کاظم غیظ اور فاتح قموص اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب جیسے پروردۂ رسول ص کی نہیں۔ محولہ بالا اقتباس سے بلا ابہام و تردد یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت علی حیدر رض اپنے اندر نہ صرف یہ کہ خلافت پانے کی آرزو رکھتے تھے، بلکہ اس کی حرص و طمع کا جذبہ بھی ان کے دل و دماغ پر محیط تھا، جو کہ ارشاد نبوی ص "ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کریں گے جس نے اس کی فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے" کے یکسر منافی ہے اور یہ باور کرنے کا کوئی امکان نہیں کہ حضرت علی رض تک آپ ص کا یہ ارشاد گرامی نہ پہونچا ہو۔ رسول اکرم ص نے بشمول حضرت علی رض تمام صحابۂ کرام رض کی جس طرز پر برسہا برس اصلاح و تربیت فرمائی تھی اس کے پیش نظر یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرات "حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہیں گرتے تھے بلکہ وہ اس کے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہو جایا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائیکہ وہ اپنا نام

حکومت کے لیے پیش کریں، اپنے منہ سے اپنی تعریف کریں اور اپنی ذات کے لیے پروپیگنڈہ کریں[۱۴۲] اور اس کے دعویدار نہیں۔ جس شخص کی ساری تاریخ پر نظر ہوگی اور اس نے مختلف امتوں، قوموں اور ملتوں کے حالات پڑھے ہوں گے اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجربہ کیا ہوگا اس کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ صحابۂ کرام سے زیادہ متحد، حق کا پیرو، فتنہ اور افتراق سے نفور اور نفسانیت و دنیا داری سے دور کوئی جماعت نہیں گزری[۱۴۳] خلیفۂ ثانی اور حضرت علیؓ کے باہمی تعلقات بھی نہایت خوشگوار تھے اور وہ اہلِ بیت کا احترام بھی حد درجہ ملحوظ خاطر رکھا کرتے تھے یہاں تک کہ دیوانِ عطا کے رجسٹر میں ناموں کے اندراج کی ابتدا بھی حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے اسمائے گرامی سے ہی کرائی گئی۔ ۱۵ھ میں اپنے سفرِ شام کے وقت حضرت عمرؓ نے خلافت کا چارج بھی حضرت علیؓ کے ہی سپرد کر دیا تھا نیز مہماتِ ملکی میں وہ حضرت علی حیدرؓ سے برابر مشورہ لیتے رہتے تھے۔ اور ان دونوں حضرات کے اتحاد و یگانگت کا آخری مرتبہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے حضرت ام کلثومؓ کو جو فاطمہ زہراؓ کے بطن سے تھیں ان (حضرت عمرؓ) کے عقد میں دے دیا تھا[۱۴۴] پھر کیسے یقین کیا جائے کہ ان کے آپسی تعلقات میں کشیدگی تھی۔

---

[۱۴۲] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص۱۵۳۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مد ظلہ العالی۔

[۱۴۳] تاریخ دعوت و عزیمت ۲۸۱۲ – ۳۲۷۔ طبع چہارم از مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم۔

[۱۴۴] دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں ص۱۲۳۔ پہلا ایڈیشن۔ از مولانا محترم حضرت علی میاں صاحب ادام اللہ فیوضہم۔

حضرت عثمان غنی رضؓ کی حویلی کا محاصرہ کرنے اور اُن کی شہادت کے واقعہ میں مصری جتھے کے ساتھ محمد بن ابی بکر رضؓ بھی شامل تھے چنانچہ فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ اس مصری جتھے کو جو سب سے بڑا تھا (دو جتھے اور بھی تھے) علی حیدرؓ کی اخلاقی تائید حاصل تھی ......" (ملاحظہ ہو موصوف کا مضمون "اعتراضات کے جواب مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی صنف فروری ۱۹۸۲ء)۔

ہمیں یہ تسلیم کہ خلیفہ کے خونِ ناحق کے دھبوں سے محمد بن ابی بکر رضؓ کا دامن پاک نہ تھا کیونکہ اولاً یہی محمد بن ابی بکر رضؓ عقب سے عمرو بن حزم انصاری کے مکان سے چھلانگ لگا کر کاشانۂ خلافت میں گھسے تھے۔ لیکن محمد بن ابی بکر رضؓ اور مصری جتھے کو نہ تو حضرت علیؓ کی اخلاقی تائید ہی حاصل تھی اور نہ کسی قسم کا اشتراک، وتعاون ہی۔ اس کے برعکس حضرات حسنینؓ اور آپؓ کا آزاد کردہ غلام تنبرؓ عین دوران محاصرہ ایوانِ خلافت کے دروازہ پر بطور گارڈ متعین تھے، بہ ایں سبب محاصرین عقب سے کود کر داخل ہوئے۔ مغازی کے مشہور عالم عروۃ بن الزبیرؓ (پیدائش غالباً ۲۳ھ اور انتقال تقریباً ۹۴ھ) کے اس قول سے کہ "علی اس سے بہت زیادہ متقی تھے کہ وہ قاتلین عثمان کی مدد کرتے اور عثمان بھی اس سے کہیں زیادہ پرہیزگار تھے کہ علی ان کو قتل کرا دیتے"[۱۱] اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ باغیوں کو حضرت علیؓ کی اخلاقی تائید حاصل تھی۔ خود حضرت علیؓ کو جب اس حادثۂ فاجعہ کا علم ہوا تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولے! "خدایا! تو گواہ رہ کہ میں عثمان کے خون سے بری ہوں"[۱۲] اور یہ بھی فرمایا کہ

---

۱۱ سیرۃ نبوی کی اولین کتابیں اور اُن کے مؤلفین، مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب ص ۲۶۔

۱۲ عثمان ذوالنورینؓ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی ص ۲۶۱، تاریخ الخلفاء مع از علامہ سیوطی حصہ دوم قسط ۱ ص ۴۷ نیز تاریخ ابن خلدون جلد اول قسط ۵ ص ۱۲ھ۔

...کی عبادات سے میری کمر ٹوٹ گئی۔

...ی معاشرہ کی ایک خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے جرجی زیدان "خلافت
...بادت وریاضت" اہتمام فرماتے ہیں: جو لوگ خلافت و امارت کے امیدوار
...ہ عبادت وریاضت اور سادہ پابند مذہب زندگی کا مظاہرہ کرکے عوام
...ہ حاصل کیا کرتے تھے۔ اموی دور میں بہت سے لوگوں نے خلافت امارت
...ی و اقتصادی سربلندی کے لیے مہمیں چلائیں اور سب نے عبادت وریاضت
...بھی زندگی کا مظاہرہ کرکے عوام کی اخلاقی و عملی مدد حاصل کرکے مسلح بغاوتیں
ان میں ایک امیدوار خلافت عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔ وہ مسجد حرم میں پہروں
...نمازیں پڑھا کرتے تھے، مہینے میں اکثر دن روزے رکھتے تھے چاہے موسم
...کا ہوتا چاہے گرمی کا......۔ دوسرے آرزومند خلافت عبداللہ بن عباسؓ
...کے علی (م ۱۱۸ھ) تھے، وہ اپنی مسجد میں چوبیس گھنٹے کے دوران ہزار سجدے
...تھے اور بقول بعض ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے .... اموی حکومت کی
...الٹ کر عباسی حکومت قائم کرنا ان کا نصب العین تھا۔.... تیسرے امیدوار
...ن امام حسینؓ کے پوتے اور علی زین العابدین کے لڑکے زید (م ۱۲۲ھ) تھے انھوں نے
...ن وریاضت اور روکھی پھیکی زندگی کا مظاہرہ کرکے مدینے کے باشندوں کو اپنی
...ت کی مہم بازی کے لیے تیار کرلیا تھا...... زید کو مدینے میں مسلح بغاوت کا
...نہیں ملا تو وہ کوفے چلے گئے اور وہاں بہت سے لوگوں کو اپنی عبادت وریاضت
...ادہ زندگی سے متاثر کرکے حکومت کے خلاف بغاوت کردی اور ۱۲۲ھ میں بعمر
...تین سال اموی فوجوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے" (ص ۵۹۹-۶۰۰)

...اقتباس الامین عبادت وریاضت کی تعبیر و تشریح خالص مادی تناظر میں پیش
...ی ہے جس سے بالصراحت یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں استحقاق خلافت کے لیے

ظاہری پارسائی اور خشک زندگی کا مظاہرہ کرنا ضروری تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حضرات نے "نمائشی زہد و تقدس" کا سہارا لیا ان میں اول الذکر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (شہادت ۷۳ھ) نبیرۂ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حواری رسول حضرت زبیرؓ بن العوام کے صاحب زادے اور حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھانجے تھے آپ ہجرت کے بعد مدینۃ الرسول میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلے پیدا ہونے والے (۲ھ) شخص تھے جن کی ولادت سے مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی تھی آپؓ اکثر مؤرخین کے نزدیک خلیفۂ پنجم (۶۴ تا ۷۳) کہلاتے ہیں[۱] دوسرے تابعی اور تیسرے تبع تابعی تھے۔ جنھوں نے سیاست کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے طرز پر از سر نو ڈھالنے کی عملی جدو جہد اور سر فروشانہ خدمات انجام دیں اور جن کی طرز ماندو بود اسلام کے صحیح علم و عمل کا نمونہ تھی اور جو دنیوی اشیاء سے استغناء کو بہ نظر استحقار و استخفاف دیکھتے تھے۔ بالفرض محال اِن حضرات نے "خلافت، امارت اور سیاسی و اقتصادی سربلندی" حاصل کرنے کے لیے ہی "عبادت و ریاضت نیز روکھی پھیکی زندگی کا مظاہرہ" کیا تو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو امارت تو ورثہ میں حاصل تھی ہی جیسا کہ خود موصوف نے اپنی تصنیف کے ص ۱۹۶ پر حضرت زبیر بن العوام کی غیر منقولہ جائیداد کے علاوہ منقولہ جائداد کے جو تین اعداد و شمار دیئے ہیں انھیں صحیح تسلیم نہ کیا جائے اور صرف اُن کے اوسط کو قابل قبول سمجھا جائے تو وہ بھی تین کروڑ بائیس لاکھ ہوتا ہے۔ اس میں سے گیارہ لاکھ قرض منہا

---

[۱] آپؓ کی خلافت و شہادت کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ابن خلدون جلد دوم قسط ۳ ص ۱۳۷ تا ۱۸۴، تاریخ الخلفاء ص ۸۴ تا ۸۸ جلد دوم، تاریخ اسلام ۲: ۵۰۸ تا ۴۹۰۔ مصنفہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ نیز مقالات شبلی ۵: ۳۰ مطبوعہ ۱۹۵۵ء۔

کر دیا جائے تب بھی تین کروڑ گیارہ لاکھ میں سے جو کچھ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو ملا ہوگا وہ آسودگی و فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے بھی کافی تھا۔ باوجودیکہ انھوں نے روکھی پھیکی زندگی بسر کی تو اس کا مقصد سوا خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ افسوس کہ ان پاک نفوس کو بھی ہم نے اپنے ہی معیار سے جانچا اور پرکھا ہے

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

محولہ فوق اقتباس میں حضرت زید بن علی زین العابدینؒ کا سنہ شہادت (۱۲۱ھ) بھی شاید سہواً غلط درج ہوگیا ہے۔ کیونکہ آپ کی شہادت کا واقعہ ۱۲۲ھ میں رونما ہوا۔ آپ کی نعش کو چار سال تک دروازۂ دمشق پر مصلوب رکھا گیا اور جب ولید ثانی بن یزید بن عبدالملک خلیفہ (۱۲۵ تا ۱۲۶ھ) ہوا تو اُس نے حضرت زید کی لاش کو جلا دینے کا حکم دیا۔[۹ل] دوسری طرف عوام الناس کا عالم بھی کچھ بہتر نہ تھا جیسا کہ عنوان "پابندیٔ صوم و صلوٰۃ" ص ۵۵۹ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ بہرحال فاضل مصنف نے اُس دور کے اکابر و اصاغر کے زہد و تقشف اور عبادت و ریاضت کو جس تناظر میں پیش کیا ہے اُس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق   بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

جبکہ یہ حضرات دنیوی اشیاء سے استلذاذ حاصل کرنے کو بہ نظرِ استحقار و استخفاف دیکھتے تھے۔

دیگر متنازعہ فیہ اور محلِ نظر اقتباسات سے اندیشۂ تطویل کے سبب صرفِ نظر کرتے

۹ل دینِ اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں از حضرت علی میاں ص ۸۴ نیز تاریخ اسلام ج ۲ ص ۲۱۶۔ مصنفہ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔

ہوئے فرضِ خدمت ہے کہ موصوف نے اپنی تصنیف میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ تاریخ صرف بڑے لوگوں کے سوانحی حالات بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں معاشرتی زندگی کے تمام پہلو محتوی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ موصوف نے معاشرہ کے کسی پہلو کو روشن کرنے میں پہلو تہی سے کام نہیں لیا جس کے [illegible] کے مستحق ہیں۔ تصنیف میں "عنوان" عثمان غنیؓ پر اعتراضات اور اُن کا جائزہ" خاصہ کی چیز ہے۔ اندازِ بیان اور ایجازِ بیان کے اعتبار سے بھی پوری تصنیف نہایت شستہ و شگفتہ ہے۔ شروع میں اصلاحِ سہو و خطا (Errata) دینے کے باوجود تقریباً ننانوے دیگر مطبعی اغلاط ہنوز محتاجِ اصلاح ہیں جنہیں آئندہ ایڈیشن میں درست کرنے کا پروفیسر صاحب نے وعدہ فرمایا ہے۔ ص ۱۸ پر "پانی سرے اونچا ہونا" محاورہ تعقیدِ لفظی کے ساتھ اس طرح مستعمل ہوا ہے، "لیکن جب سرے اونچا پانی ہوگیا تو انھوں (حضرت عثمانؓ) نے ابوذرؓ کو شام جلا وطن کر دیا۔" اس محاورہ کو مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی نے جو اردو اور عربی زبان و ادب کے شہرۂ آفاق ادیب و فاضل بھی ہیں، اس طرح استعمال فرمایا ہے: "قریش جب حد سے بڑھ گئے اور پانی سرے اونچا ہو گیا تو اللہ نے اپنے رسولؐ کو اور آپؐ کے اصحاب کو ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔"[۲] بہرکیف اردو ادب میں ہمارے لیے دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانِ خیال قابلِ تقلید و سند ہیں۔ ص ۱۲- ۱۲۱ پر اصطلاح "نسل کشی" کا استعمال بھی ندرت لیے ہوئے ہے فرماتے ہیں (حضرت عمرؓ) نے گھوڑے پالنے اور اُن کی نسل کشی کے لیے ایک دوسری چراگاہ ریزرو کرالی جس کا نام شرف تھا۔" اس معنی میں اب تک افزائشِ نسل تو دیکھنے سننے میں آیا تھا مگر "نسل کشی" کا استعمال پہلی دفعہ باصرہ نواز ہوا ہے جو غالباً فارسی مصدر "کشتن" بمعنی

---

[۲] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۱۱۱

'بیٹا' سے مشتق معلوم پڑتا ہے۔ فارسی سے نابلد قاری کے لیے یہ اصطلاح قوبۂ
ہوتے ہوئے بھی بہرطور الفہم نہیں۔ ممکن ہے وہ اسے خودکشی، ضمیرکشی، دخترکشی
نفس کشی وغیرہ پر قیاس کرڈالے۔ بہرحال یہ سبقت قلمی ہے۔ ص ۵۵ پر یہ فقر
بھی قدرے گنجلک ہے، "ام فردہ کے چار لڑکے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑ
محمد بن اشعث کا فرزند نصف صدی بعد ہمعصر مذہبی اکابر کے تعاون سے عبدا
بن مروان اور حجاج کے خلاف ہولناک بغاوت کرکے مشہور ہوا۔" اس فقرہ
پہ معلوم نہیں ہوتا کہ محمد بن اشعث کا سب سے بڑا فرزند کون تھا لہذا "فرز
کے بعد عبدالرحمٰن ثبت ہونا چاہیے تھا جوکہ ابن اشعث کا سب سے بڑا فرز
تھا۔ ص ۴۱۹ پر یہ فقرہ بھی مبہم ہے، "خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سلیما
نے اپنے بھائی ولید کے اکثر گورنروں اور سالاری کے عہدوں پر فائز کیا۔" ص
پہ بیرونی بستیوں قبا پہنچیں" کی بجائے "بیرونی بستی قبا پہنچیں" ہونا چاہ
ص ۳۵۶ پر لفظ "صلح" بجائے اسم مؤنث اسم مذکر استعمال ہوا ہے۔
"عبدالملک کے صلح سے منحرف تین بڑے حریف تھے۔" حکیم مومن خاں مومن
اسے صیغۂ مؤنث میں استعمال کیا ہے۔

پھر کوئی ملنے کی طرح نہ ہوئی صلح اب کے کسی طرح نہ ہوئی

ص ۵۵۹ پر گاؤں (دیہہ، موضع) کا املا گانو، اور ص ۶۰۵ پر گاؤں تحریر کیا
گو دونوں املا درست ہیں تاہم کوئی ایک املا اختیار کرنا بہتر تھا۔ خاص طو
ایسی صورت میں جبکہ ص ۱۱۹ و ۱۳۲ پر علی الترتیب گاؤن (Gown) یعنی
جبہ یا جبہ اور بیل (Oxen) یا گائے (Kine) کا جمع بھی گاؤں ہی ثب
فرمایا ہے۔ ص ۶۱۴ پر "ہالے" کا املا ہائے حطی سے اختیار کیا ہے جبکہ اُر
فارسی شعراء نے ہائے ہوز سے تحریر فرمایا ہے۔ مثلاً ع قمرے دورہ رہتا جو ہالہ کیا کرتا
نیز

نجو نزدوے صوفہ حسن تو برباد کہ اعقب کشیدہ از بسط افزوہ عارفنی)

اں مس و تاریخ اسلام۔ خلافت راشدہ و بنی امیہ" کی بعض تصریحات پر احقر نے
جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ محض ایک طالب علمانہ کاوش ہے نقد و تبصرہ ولک جس پایہ
علمی معیار کی چیز ہوتی' اہل نظر علما و فضلا کا کام ہے خاکسار کے پاس نہ تو اس قسم
کی علمی استعداد و صلاحیت ہی ہے اور نہ مطلوبہ کتب کا ذخیرہ ہے چنانچہ جیسے اور جتنی
معاون کتب و رسائل و جرائد تک رسائی حاصل ہو سکی اُن سے ذلہ ربائی کر کے اس
خردہ گیری کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے جس میں امکانی حد تک اپنی ضعیف و ناقص
رائے زنی سے احتراز کیا ہے کیونکہ سطحی خواندگی کے بل پر جو رائے بھی دی جائے گی
وہ یقیناً ناقص ہی ہوگی بقول سعدیؒ۔ ع دہم ضعیف رائے فضول چرا کند۔
چنانچہ مجھے صدق دل سے اس امر کا اعتراف ہے کہ خورشید کجا ذرۂ آوارہ کجا۔
امید کہ پروفیسر خورشید احمد صاحب فارق اس آہو گیری میں جو کچھ درست ہو
اس کی پذیرائی[۱] کرتے ہوئے اِس ذرہ مایہ تہی علم کو اپنی آہِ سحر گاہی و دعائے نیم شبی میں
گاہے ماہے یاد فرماتے رہیں گے۔ ع

ورزبانِ تو تمنائے دعائے دارد

(ختم شد)

---

[۱] موصوف کے تبصرہ کے سلسلہ میں خاکسار کو دو تین الطاف نامے نظر نواز ہوئے
تھے جن میں مطبعی اغلاط کی درستی کا وعدہ فرماتے ہوئے ازراہِ لطف و کرم یہ بھی
ارشاد فرمایا تھا کہ تبصرہ کرنے کی اب ضرورت نہیں مصنف کی نظر میں اغلاط آگئی
ہیں۔ اے۔ رؤف۔

الواح الصناديد

پروفیسر محمد اسلم

۱۳ اپریل ۱۹۸۰ء کو راقم الحروف شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طلبہ کے ساتھ مطالعاتی دورے پر بالاکوٹ پہنچا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو سید احمد بریلویؒ اور شاہ محمد اسمٰعیل دہلویؒ شیر سنگھ کی فوج کے مقابلے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ بھارت کے نامور عالمِ دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس موضوع پر کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔

دریائے کنہار کے کنارے جامع مسجد کے قریب ایک چار دیواری کے اندر چند قبریں ہیں۔ ان میں ایک کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہاں سید احمد بریلوی کا دھڑ دفن ہے۔ ان کا سر دریائے کنہار میں بہتا ہوا گڑھی حبیب اللہ پہنچ گیا تھا۔ وہاں کسی شخص نے اُسے پہچان کر دریا کے کنارے دفن کر دیا۔ ان دونوں مقامات میں بارہ میل کا بُعد ہے۔

سید احمد بریلویؒ کے مزار کے سرہانے سنگِ مرمر کی لوح نصب ہے۔ اور اس پر عربی عبارت کے علاوہ اُردو زبان میں یہ الفاظ منقوش ہیں:

سیّد احمد شہید

نے ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعۃ المبارک گیارہ اور ۱۲ بجے کے درمیان سکھوں کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ میں

شہادت نوش فرمائی۔ سرزمین بالاکوٹ آپ کے خون کی امین ہے۔

سید صاحب کے مزار مبارک سے بافاصلہ پانچ چھ میٹر کے فاصلے پر امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی محو خواب ابدی ہیں۔ ان کا انتقال لاہور میں ہوا تھا لیکن ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت بالاکوٹ لے جائی گئی۔ راقم الحروف کی نگرانی میں ان کے بارے میں عرفان حنیف بٹ نے ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا ہے۔ راقم نے ان کا ایک اہم خط جو انہوں نے چمرکنڈ سے اقبال شیدائی کو پیرس بھیجا تھا، ماہنامہ المعارف لاہور میں شائع کرا دیا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مدفن

حضرت مولانا فضل الٰہی رحمہ اللہ وزیر آبادی

امیر المجاہدین چمرقند (یاغستان)

بسلسلہ حضرت سید احمد بریلوی شہید و شاہ اسمٰعیل شہید

تاریخ وفات ۵ رمئی ۱۹۵۱ء

سید احمد بریلوی رحمہ اللہ کے مزار مبارک سے تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے اوپر ایک چار دیواری کے اندر شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ صاحب تقویۃ الایمان محو خواب ابدی ہیں۔ ان کی قبر کے سرہانے سنگ مرمر کی ایک لوح پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدفن

حضرت مولوی شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی

بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی

رحمۃ اللہ علیہم

ولادت شنبہ ۲۸ شوال ۱۱۹۳ھ

شہادت جمعہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ

اے ذبیح اللہ اسمٰعیل ما — شد ندایت صور اسرافیل ما
خون خود را در کوہ و کہسار ریخت — لیک تخم حریت در ہند بیخت

احقر العباد سید اسد علی انوری فرید آبادی

ایں کتبہ را در ماہ محرم الحرام ۱۴۰۲ نصب کرد

بالاکوٹ سے ہمارا قافلہ مظفر آباد پہنچا۔ وہاں سپریم کورٹ آف آزاد جموں وکشمیر کے احاطے میں وادیٔ کشمیر کی معروف شخصیت اور آزاد کشمیر کے صدر میرواعظ محمد یوسف کا مقبرہ ہے۔ اس کے قریب ہی اب ایک اور سابق صدر خورشید حسن خورشید کو دفن کیا گیا ہے۔ میرواعظ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی دوست تھے۔ میرواعظ کے مزار پر ابھی باقاعدہ کتبہ تو نہیں لگا، البتہ ایک لوح پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا محمد یوسف میرواعظ کشمیر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کا سنگ بنیاد جناب بریگیڈیئر محمد حیات خاں صاحب صدر آزاد جموں وکشمیر نے بتاریخ ۱۷ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ مطابق ۸ جولائی ۱۹۸۲ء اپنے دست مبارک سے رکھا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور کو دارالعلوم کورنگی (کراچی)

میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے ذاتی احاطۂ قبور میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ ان کے لوحِ مزار کی عبارت راقم الحروف نے لکھی تھی جسے ان کے فرزند جنید احمد نے سنگ مرمر کی ایک سِل پر کندہ کرا کے قبر کے سرہانے لگا دیا ہے۔ وہ عبارت یوں ہے:

هو الباقی

إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

مدیر ماہنامہ برہان دہلی

پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈائریکٹر شیخ الہندؒ اکیڈمی

رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

ولادت آگرہ	وفات کراچی
۱۹۰۸ء	۳ رمضان ۱۴۰۵ھ / ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء

علامہ سیماب اکبر آبادی کی قبر کا ذکر الواح الصنادید میں آچکا ہے، لیکن اس وقت وہاں کتبہ نصب نہیں تھا اور ایک قریبی مکان کی دیوار پر ان کی تاریخ وفات لکھی ہوئی تھی۔ اب ان کا عالیشان مقبرہ تیار ہو گیا ہے۔ ایک بلند چبوترے پر ان کا مزار سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے

یا غفور یا حمید

۱۳۷۰ھ

مرقد منور منزل راحت جاودانی علامہ سیماب اکبر آبادی

۱۹۵۱ء

قد رحمه وذلک الفوز المبین

۱۳۷۰ھ

دے گیا داغِ جدائی آخر	وہ معظم وہ مکرم سیماب
فخرِ علم و ادب استادِ زماں	فن کے اسرار کا محرم سیماب
قادری لکھ دو یہ تاریخ وفات	نہ رہا شاعرِ اعظم سیماب

۱۹۵۱ء

پروفیسر حامد حسن قادری

پیدائش ۱۸۸۰ء	وفات ۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء
اکبرآباد (آگرہ)	کراچی (۱۲ بجے دن)

رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۸ء میں ملتان پر فوج کشی کی۔ حاکم ملتان مظفر خاں نے بڑی بے جگری کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کیا لیکن اُسے ہزیمت اُٹھانا پڑی اور وہ دادِ شجاعت دیتا ہوا شہید ہوا۔ مظفر خاں کو حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی درگاہ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ اس کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

آخری آرامگاہ

رکن الدولہ صفدر جنگ حاجی نواب مظفر خاں سدوزئی شہید

شجاع ابن شجاع حاجی	امیدِ ملتان زہے مظفر
بروزِ میدان بہ تیغ و بازو	چہ حملہ آورد چوں غضنفر
چوں سرخرو شد بسوئے جنّت	بگفت رضوان بیا مظفر

تاریخ شہادت ۲۳ رجب ۱۲۳۳ھ

مطابق ۲ جون ۱۸۱۸ء

اسی درگاہ کے احاطے میں مسجد کے عقب میں رنگین ٹائلوں سے مرصع ایک قبر ہے۔ صاحب قبر نواب شہنواز خاں، نواب زکریا خاں والئ لاہور کا فرزند ہے۔ یہ وہی ذات شریف ہے جس نے پہلی بار احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ شہنواز خاں نواب معین الملک ناظم لاہور کے مقابلے میں مارا گیا تھا۔ اس کے مزار کے سرہانے ایک ٹائل پر یہ عبارت درج ہے

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

چوں شہنواز خاں بملتان شہید شد

خمدار تیغ قتل برو ماہ عید شد

جستم چو سال مشہد آں غازی شہید

گفتا خرد کہ حاکم ملتان شہید شد

۱۱۶۳ھ

(باقی)

اعلان

۲۹ دسمبر ۱۹۸۷ء کو مفکر ملت کے تاریخی اور شاندار افتتاح کے دوران شرکاء نے اجتماعی طور پر یہ تجویز پاس کی تھی کہ آئندہ ہر سال اس موقع پر مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی رح کی یاد میں ایک روزہ علمی سمینار کا اہتمام کیا جائے۔

چنانچہ امسال حسب پروگرام سردیوں کے آغاز میں سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس مبارک اقدام اور نیک کام کی تکمیل کے لئے قارئین کرام دل سے دعا فرمائیں۔ سمینار میں حضرت مفتی صاحب مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں اور حیات و خدمات پر مقالہ نگار حضرات روشنی ڈالیں گے۔ چونکہ وقت کم ہوگا اور مقالات زیادہ ہوں گے اس لئے کوشش اس بات کی کی جائے کہ مقالات زیادہ سے زیادہ جامع اور علمی سطح کے ہوں۔

اس سلسلے میں مختلف عنوانات اور دعوت نامہ عنقریب ارسال کیا جائے گا۔ مقالات قبل از وقت دفتر برہان میں پہونچنا ضروری ہیں تاکہ انھیں چیک کیا جا سکے۔

(منیجر)

ابوحیان توحیدی

حیات وخدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۵)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مثالب الوزیرین: یہ رسالہ مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ ابن خلکان نے "مثالب الوزیرین"[۶۰] حاجی خلیفہ نے "ثلب الوزیرین"[۶۱] اور یاقوت نے "اخلاق الوزیرین" کے نام سے یاد کیا ہے[۶۲]

اس کا مخطوطہ قسطنطنیہ کے کتب خانے میں پایا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں محمد بن تاویت الطنجی نے ایڈیٹ کرکے مجمع العلمی دمشق سے شائع کیا۔ اس کتاب کی وجہ تالیف ان تین وزراء (ابوالفضل ابن العمید، ابوالفتح ابن العمید، صاحب بن عباد) کی بدسلوکی اور توحیدی کی ذات کے سلسلے میں ان کی ناقدرشناسی ہے۔ اس تصنیف میں ابوحیان توحیدی نے ان وزراء کی زندگیوں کے تاریک گوشوں کو بڑی جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان وزراء کے خلاف ابوحیان توحیدی نے نہ صرف یہ کہ اپنے خیالات کے اظہار پر اکتفا کیا ہے بلکہ ان کے بارے میں حق پسند جلیل القدر معاصر علماء کی رائے بھی نقل کی ہے۔ ابوحیان توحیدی نے صرف ان کی خامیوں ہی کو نہیں گنایا ہے بلکہ اگر ان میں کوئی اچھائی یا خوبی دیکھی تو اس کی بھی تعریف کی ہے۔ ابوحیان نے کتاب کے آغاز ہی میں غیبت کے موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اور کسی غلام کے علم کا پردہ چاک کرنے یا کسی منافق کے نفاق کو واضح کرنے کو نیت و عمل عوری کے دائرے سے الگ قرار دیا ہے۔ آخر میں قارئین سے اس کتاب کے مطالعہ کی اپیل کی ہے۔

رسالۃ الکتابۃ : اس رسالے میں توحیدی نے خوشخط لکھنے کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ ابوحیان توحیدی خود بھی اچھا خطاط تھا اس لیے اس نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ نہایت اہمیت کا حامل ہے اس میں عربی خط اور اس کے اقسام پر بڑی محققانہ بحثیں ہیں۔

المقابسات : ڈاکٹر زکی مبارک کہتے ہیں " المقابسات کا شمار دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے، پہلی بار ہندوستان میں شائع ہوئی۔ پھر مزید اصلاح و ترمیم کے بعد مصر سے شائع ہوئی۔ کتاب المقابسات عوام فہم لوگوں کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد نہیں۔ بلکہ اس سے حقیقی معنوں میں پورا فائدہ وہی اٹھا سکتے ہیں جو اسلامی فلسفہ کے بنیادی اصولوں سے واقف ہوں گے۔[۶۰]

یہ ابوحیان توحیدی کی مشہور ترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ پہلی بار ۱۳۰۵ھ میں مرزا محمد شیرازی کے اہتمام میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کا ایک اور ایڈیشن حسن السندوبی نے ۱۹۲۹ء میں مصر سے شائع کیا۔[۶۱] المقابسات کے بارے میں ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے حسب ذیل تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

" یہ کتاب چھوٹے بڑے ایک سو چھ مقابسات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالے مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ یہ چند فی البدیہہ لیکچر ہیں جو مختلف موقعوں پر ان علمی مجلسوں میں دیے گئے تھے جو یحییٰ بن عدی نصرانی اور ابو سلیمان منطقی سجستانی کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے۔ یہ علمی مجلسیں کبھی تو ابن عارض کے محل میں منعقد ہوتیں، کبھی وراقوں کے بازار میں یا پھر سجستانی کے کسی شاگرد کے یہاں۔

مجلسوں میں ہر طبقہ کے نمائندے اور ہر مذہب و ملت کے افراد خواہ وہ
عقیدے کے ماننے والے ہوں [illegible] ہونے شرکا میں فلسفی طبیب ریاضی
ہیئت داں، مورخ، شاعر، ادیب اور متکلم غرضیکہ ہر صنف کے اصحاب
نظر آتے ہیں جو اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے دنیا کے دور دراز کے علاقوں سے
تے تھے۔ عام طور پر ان مجلسوں میں فلسفہ و تصوف کی بحثیں زیادہ ہوتیں طالبان
اپنی بیاضیں کھول کر بیٹھتے اور صدر محفل جو جواب دیتا اسے نوٹ کر لیتے
مسئلے پر اتفاق نہ ہوتا تو صدر اپنی رائے دیتا جسے لوگ تسلیم کر لیتے تھے[۱۵]

فلسفہ و حکمت کے میدان میں یہ بہت ہی اہم کتاب ہے۔ بعد کے فلاسفہ
نے مختلف فلسفیانہ بحثوں میں ابوحیان توحیدی کی ذات کی طرف رجوع کیا ہے
اس کتاب کے ذریعہ اس دور میں فلسفہ کے میدان میں ہونے والی سرگرمیوں اور
ترقیوں کا بہت حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ
مسائل کیسے ابھرتے ہیں اور اختلافات کیونکر پیدا ہوتے ہیں۔

الاشارات الالٰہیہ: اس کتاب کا پورا نام "الاشارات الالٰہیۃ والانفاس الروحانیۃ" ہے۔ اس کتاب میں
روحانیت کی جلا اور درجات کی بلندی کے لیے غور و فکر کی گئی ہے۔ اس کتاب کا
نسخہ دمشق کے "مکتبہ ظاہریہ" میں تھا۔ اس کا شمار دنیا کے چند قدیم ترین باقی
ماندہ نسخوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں تھی۔ جلد اول کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن
بدوی نے دریافت کر کے ۱۹۵۰ء میں قاہرہ سے شائع کیا۔ الاشارات
میں ۵۴ رسائل ہیں جو مختلف قسم کے اوراد و وظائف اور مواعیظ و نصائح پر
مشتمل ہیں۔

اس کتاب کا اسلوب اس کی دوسری کتابوں کے اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی تحریر کافی عمدہ اور بہتر ہے۔ اس کے اندر ابو حیان نے انسانی نفسیات کی مختلف کیفیات اور روحانی تغیرات و تقلبات کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں ذاتی شخصیت سے متعلق احوال، زندگی کے تجربات، مختلف اوقات میں طاری ہونے والی الگ الگ کیفیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے اندر ابو حیان نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان جب دنیوی مشکلات و پریشانیوں سے گھبرا جاتا ہے تو از خود اپنے آپ کو ایمان و یقین کے دامن میں ڈال دیتا ہے۔ اس میں ایسے شخص کی مایوسی و ناامیدی کا بھی تذکرہ ہے جسے دنیا و اہل دنیا کی تلخیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اس شخص کی حالت زار کا تذکرہ ہے جو مسلسل ناکامیوں کی بدولت ٹوٹ چکا ہے۔ اور ان تمام چیزوں کی صحیح عکاسی وہی کر سکتا ہے جو ان حالات سے گذرا ہو۔ یہ ابو حیان کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ جب کہ اس کی عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی[۱۱۶]۔ اسی لیے اس نے دنیوی معاملات سے کنارہ کش ہوتے ہوئے روحانیت اور تصوف کی طرف رغبت دلائی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسان کو حقیقی عزّت و کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دے۔ اس نے مناجات و سرگوشی کا نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ ذکر و اذکار، اوراد و وظائف کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی تاکہ ان کی نیتیں حصولِ آخرت کے لیے خالص ہو سکیں۔

یہ کتاب چونسٹھ رسائل پر مشتمل ہے۔ ان میں سب سے بڑا رسالہ آٹھ صفحات کی ضخامت رکھتا ہے۔ ہر رسالہ دعائیہ کلام سے شروع ہوتا ہے، پھر اس کے اندر وعظ و نصیحت اور علائق سے کنارہ کشی کی تعلیم ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ بعض دوسرے رسائل بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں:

۱۔ رسالۃ فی علم الکتابۃ

رسالة الحیوان
رسالة العامة المعروفة بروایة سقیفة
المناظرة بین ابی سعید السیرافی ومتی بن یونس القنائی
کتاب النوادر
تقریظ الجاحظ

ان کے علاوہ ابوحیان توحیدی کی طرف منسوب کی جانے والی ایسی کتابوں کی فہرست بھی ہے جو غیر معروف ہیں اور جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔

رسالة الحنین الی الاوطان
رسالة فی ضلالات الفقهاء
کتاب المحاضرات والمناظرات
الامتناع
التذکرة والتوحید
کتاب الحج العقلی اذا ضاق الفضاء عن الحج الشرعی
ریاض العارفین
رسالة فی اخبار الصوفیة
الرسالة البغدادیة
رسالة الحیاة
رسالة فی بیان ثمرات العلوم
رسالة الی ابی الفضل ابی العمید
کتاب الرد علی ابن جنی فی شعر المتنبی
رسالة لابی بکر الطالقانی
الرسالة فی ضلالات الفقهاء فی المناظرة

حواشی و تعلیقات

١ العصر العباسی — الدکتور شوقی ضیف۔ دار المعارف بمصر چھٹا ایڈیشن۔ ١٩٧٣ء۔ ص ٢٦
٣ امراء البیان۔ ڈاکٹر کرد علی۔ قاہرہ۔ ١٩٣٧ء
ج۔ ٢۔ ص۔ ٤٩٠
٢ " " " ٤٩١
٤ معجم الادباء — یاقوت الحموی۔ دار المستشرق بیروت لبنان ١٩٢٢ء۔ ج۔ ١٥۔ ص ٥
٥ ابوحیان توحیدی۔ سیرتہ و اشارہ — ناشر مکتبہ الخانجی۔ عبدالرزاق محی الدین بمطبوعۃ العادۃ۔ مصر ١٩٦٩ء ص۔ ٧
٦ امراء البیان۔ کرد علی۔ ج ٢۔ ص۔ ٤٨٨
٧ لسان المیزان
٨ النثر الفنی (فی القرن الرابع) ڈاکٹر ذکی مبارک بیروت۔ دار الجیل ١٩٧٥ء۔ ج۔ ٢۔ ص ١٣٣
٩ امراء البیان — کرد علی۔ ج۔ ٢۔ ص
١ النثر الفنی (فی القرن الرابع) ذکی مبارک۔ ج۔ ٢۔ ص۔ ١٣٤
١ معجم البلدان۔
١ ابوحیان توحیدی — عبدالرزاق محی الدین — ص۔ ١١

۱۳ بغية الوعاة ـ جلال الدين عبد الرحمن السيوطي مطبعة السعادة مصر
۱۴ ۱۳۲۶ھ ـ ص ۱۲۶
۱۵ لسان الميزان ـ حافظ ابن حجر العسقلاني ـ حيدر آباد دکن ۱۳۳۱ھ
ج ۔ ۶ ۔ ص ۔ ۳۷۳
۱۶ طبقات الشافعية ـ المطبعة الحسينية ـ مصر
ج ۔ ۴ ۔ ص ۔ ۲ ۔ ۳
۱۷ " " " " ص ۔ ۳
۱۸ " " " " ص ۴
۱۹ لسان الميزان ۔ العسقلانی ۔ ج ۔ ۶ ۔ ص ۔ ۳۶۱
۲۰ طبقات الشافعية ۔ للسبکی ۔ ج ۶ ۔ ص ۔ ۳
لسان الميزان ۔ العسقلانی ۔ ج ۔ ۶ ۔ ص ۳۶۹
۲۱ معجم الادباء ۔ ج ۱۵ ۔ ص ۔
۲۲ التوحيدی ۔ عبد الرزاق محی الدين ۔ ص ۔ ۶۹
۲۳ لسان الميزان ۔ ج ۶ ۔ ص ۔ ۳۶۱ ـ ۳۶۳
۲۴ التوحيدی ۔ عبد الرزاق محی الدين ۔ ص ۔
معجم الادباء ۔ ج ۔ ۸ ۔ ص ۔ ۱۷۲
۲۵ " " " ص ۔ ۱۷۳
۲۶ بغية الوعاة ۔ السيوطی ۔ مصر ۔ ص ۔ ۱۲۲
۲۷ وفيات الاعيان ـ ابن خلکان ۔ ج ۔ ۱ ۔ ص ۔ ۱۳۰
مکتبة الميمنة ۔ مصر ۱۳۱۰ھ
۲۸ " " ابن خلکان ۔

۲ اسرار البیان ۔ ج ۔ ۲ ۔ ص ۲۹۲
۳ معجم الادباء ۔ ج ۔ ۹ ۔ ص ۳۳
۲ میزان الاعتدال ۔ ج ۲ ۔ ص ۔ ۳۰۵
۳ معجم الادباء ۔ ج ۔ ۱۵ ۔ ص ۔ ۵
۳ وفیات الاعیان ۔ ج ۔ ۱ ۔ ص ۔ ۴۵
۳ الصداقۃ والصدایق ۔ ص ۔ ۳۰ ۔ بحوالہ ۔ مطالعات
۳ الامتاع والموانسۃ ۔ ابوحیان توحیدی ۔ ایڈیٹ ڈاکٹر احمد امین
احمد الزین، لجنتہ التالیف والترجمہ ۔ مصر ۱۹۴۴ء ۔ ج ۱ ۔ ص ۲۲۳
۳ 〃 〃 ج ۱ ۔ ص ۔ ۲۹۶
۳ 〃 〃 ج ۱ ۔ ص ۔ ۱۲
۳ 〃 〃 ج ۱ ۔ ص ۔ ۱۲
۳ معجم الادباء یاقوت الحمدی ۔ ج ۔ ۱۵ ۔ ص ۔ ۱۰
۴۰ طبقات الشافعیہ ۔ تاج الدین ابونصر عبدالوہاب بن عامر بن عبدالکافی
السبکی ۔ ج ۔ ۴ ۔ ۱۹۶۴ء
۴ التوحیدی ۔ عبدالرزاق ۔ ص ۔ ۱۲۸
۴۱ البصائر والذخائر ۔ ابوحیان توحیدی ۔ تعلیق ۔ ڈاکٹر ابراہیم کیلانی
مطبعۃ الانشاء ۔ دمشق ۔ ج ۔ ۱ ۔ ص ۔ ۱۴۹
۴۳ المقابسات
۴۴ التوحیدی ۔ عبدالرزاق ۔ ص ۔ ۱۵۶
۴۵ 〃 〃 ص ۱۶۰
۴۶ النثر الفنی ۔ ڈاکٹر ذکی مبارک ۔ ج ۔ ۲ ۔ ص ۔ ۱۲۳

حوالہ جات

۴۷ الصداقۃ والصدیق مجلہ [illegible]
ص۔ ۲۳ ۔ النثر الفنی ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۲۷
۴۸ النثر الفنی ۔ ذکی مبارک ۔ دارالجیل بیروت ۱۹۷۵ء ج ۲ ۔ ص ۱۳۸
۴۹ " ج ۲ ص ۔ ۱۷۱ (۵۰) النثر الفنی ۔ ج ۱ ۔ ص ۔ ۴۹
۵۱ التوحیدی ۔ عبدالرزاق ۔ ص ۱۳۹ (۵۲) التوحیدی ۔ عبدالرزاق ص ۳۵
۵۳ ایضاً " ص ۱۴۳
۵۴ امراء البیان ۔ کرد علی ۔ ج ۲ ۔ ص —
۵۵ مقدمہ ۔ الامتاع والمؤانسہ ۔ التوحیدی ۔ قاہرہ ۱۹۴۴ء
۵۶ امراء البیان ۔ کرد علی ۔ ج ۲ ۔ ص —
۵۷ مقدمہ ۔ الصداقۃ والصدیق ۔ ابوحیان توحیدی
بحوالہ ۔ التوحیدی ۔ ص — ۳۶۱
۵۸ التوحیدی — عبدالرزاق ۔ ص ۱۸۴
معجم الادباء ۔ ج ۔ ۱۵ ۔ ص ۔ ۵
۵۹ التوحیدی ۔ عبدالرزاق ۔ ص ۱۸۴
۶۰ وفیات الاعیان ۔ ابن خلکان ۔ ج ۲ ص ۶۰
۶۱ معجم الادباء ۔ ج ۶ ۔ ص ۱۸۶ (۶۲) التوحیدی ۔ عبدالرزاق —
۶۳ النثر الفنی ۔ ذکی مبارک ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۴۷
۶۴ مطالعات ۔ ڈاکٹر بدرالدین بٹ ۔ کشمیر ۱۹۸۵ء ص ۶۸
۶۵ " " ص ۶۸
۶۶ مقدمہ ۔ الاشارات الالٰہیۃ ۔ التوحیدی ۔ ایڈیٹر عبدالرحمٰن
جامعۃ الفواد الاول ۔ قاہرہ ۱۹۵۰ء

برہان

جلد ۱۰۲ | ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ مطابق اگست ۱۹۸۸ء | شمارہ ۲

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جال پریس میں چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

یہ خبر دنیا بھر کے تمام امن پسند ممالک اور انسان دوست افراد جماعت کے لئے انتہائی خوش آئند اور باعث اطمینان ہے کہ آٹھ سالہ طویل ترین اور بے معنی خلیجی جنگ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد ۵۹۸ کے پیش نظر جو ۲۰ جولائی ۱۹۸۷ء کو پاس کی گئی تھی اب ایک سال کی مدت پوری ہونے کے بعد ایران نے اس قرارداد کو بلا شرط تسلیم کر لیا ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مذکورہ قرارداد میں سب سے پہلے ایران و عراق کو فوری جنگ بندی کرنے، بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحدوں تک دونوں ممالک کی فوجوں کی واپسی اور جنگ کے دوران قیدی بنائے گئے سپاہیوں کے تبادلے کی بات کہی گئی ہے۔ جنگ بندی کے نفاذ اور مقبوضہ علاقوں سے دونوں ممالک کی فوجوں کے انخلاء کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل جناب کویار ایک نگراں ٹیم مقرر کریں گے۔ اور دونوں ملکوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ تمام متنازعہ امور اور معاملات کا تصفیہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی مدد سے کریں۔

آٹھ سال تک مسلسل جنگ کے باوجود ایران و عراق دونوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس جنگ میں قطعی فتح یا شکست کسی بھی فریق کو نہ

نہیں ہو سکتی۔ یہ بات دونوں کے مفاد میں ہے کہ "جنگ بندی" سے اتفاق کر لیا جائے اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں "جنگ بندی" کی قرارداد کو قبول کر لیا جائے۔

اس جنگ کے آغاز سے اب تک اقوام متحدہ، ناوابستہ تحریک، اسلامی کانفرنس اور عرب لیگ کی جانب سے بھی اور بڑی طاقتوں کی طرف سے بھی ان دونوں ملکوں سے بارہا اپیل کی گئی تھی کہ وہ فوری "جنگ بندی" کو قبول کر لیں اور اس وسیع پیمانہ پر جو جانی و مالی نقصانات ہو رہے ہیں اسے روک دیں جس سے مجموعی طور پر کسی بھی ملک کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

ہمیں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا ہے کہ اس خونیں جنگ کا پس منظر کیا تھا، اسباب و عوامل کیا تھے اور کن حالات اور مجبوریوں کے پیش نظر دونوں اسلامی اور پڑوسی ممالک جارحیت پر اتر کر اپنے اپنوں ہی کے گلے کاٹ رہے تھے؟ اور دنیا بھر کے ممالک، ملکی، عالمی اور بین الاقوامی تنظیمات کی "جنگ بندی" کی مسلسل کوششوں کے باوجود کس طرح دونوں ملک باہم دست و گریباں، سامراجی قوتوں کے آلۂ کار اور اسرائیل کے ناپاک مقاصد اور مکروہ عزائم کی تکمیل کرتے رہے۔ ایران، عراق جنگ کی وجہ سے سامراجی اور صیہونی قوتوں اور اسلام دشمن عناصر کو یہ موقع ملا کہ وہ اس پورے خطہ میں اپنی عسکری قوت اور اسلحہ سازی میں اضافہ کرے۔ چنانچہ اس سے نہ صرف خلیجی ملکوں بلکہ برصغیر کے اس پورے علاقے کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ حال ہی میں بلا جواز ایران کے مسافر بردار جہاز پر امریکہ کا قاتلانہ اور سفاکانہ حملہ جس میں جہاز کے عملہ سمیت سو لوٹے مسافر ہلاک ہوئے سامراجی سازش کا ایک حصہ ہیں۔ جس [illegible] ہے کہ اس خطہ میں امریکہ کی موجودگی کس قدر نقصان دہ [illegible] ہے۔

غالباً اس دردناک انسانی المیہ سے متاثر ہوکر ہی ایران نے اب بلا شرط عراق سے جنگ بندی کے لئے اقوام متحدہ کی قرارداد پر از سر نو غور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بلا شبہ یہ جنگ دورِ حاضر کی تاریخ میں سب سے زیادہ بھیانک، تباہ کُن اور طویل ترین جنگ تھی جس میں ایک محتاط اندازہ کے مطابق دس لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے اور اس سے کہیں زیادہ زخمی اور مجروح ہوکر زندگی بھر کے لئے بیکار اور معذور ہوگئے۔ دونوں ملکوں کی معیشت اور اقتصادیات پوری طرح تباہ ہوکر رہ گئیں۔ شہر کے شہر ویران اور کارخانے تباہ ہوگئے۔ آٹھ سال کی اس بے معنیٰ جنگ میں جو تباہی اور نقصانات ہوئے اس کی پھر سے بحالی اور تعمیر کے لئے کئی دہائیاں درکار ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کی قرارداد میں "مناسب بین الاقوامی امداد" سے دونوں ملکوں کی معیشت کی بحالی اور تعمیر و ترقی کی بات بھی کہی گئی ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ بین الاقوامی امداد اور تعاون کے بغیر دونوں ملکوں کی تباہ شدہ معیشت کی بحالی کا تصور ممکن نہیں ہے۔

یو۔ این۔ آئی کی رپورٹ اور اخباری اطلاعات کے مطابق ایران و عراق کی معیشت کی بحالی پر کم از کم چارسو ارب ڈالر خرچ ہوں گے۔ اس لئے کہ جنگ کے دوران دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی اقتصادی تنصیبات کو تباہ کیا ہے دونوں فریق ایک دوسرے کے پیداواری مرکزوں پر مسلسل حملے کرتے رہے۔ تاکہ ایک دوسرے کو اقتصادی طور پر تباہ و برباد کرسکیں۔ ماہرین کا کہنا ہے

کہ یہ جنگ کا منصوبہ بنانے والوں کی ایسی حکمت عملی ہے جس کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ فوجی ساز و سامان کی مرمت بہت تیزی کے ساتھ ہو جاتی ہے مگر اقتصادی تنصیبات کی تباہی کا جنگ کی پوری کارروائی پر اثر پڑتا ہے کیونکہ ان تنصیبات کو دوبارہ کارآمد بنانے میں کافی دقت لگ جاتا ہے۔ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک جو ایک سو تہتّر بین ملکی جنگیں ہوئی ہیں ان میں یہ حکمت عملی کامیاب رہی ہے۔

ایک اندازہ کے مطابق دونوں ملکوں کی جنگ سے برباد معیشت کی بحالی میں کم از کم بیس سال لگ جائیں گے۔ جنگ سے قبل ایران روزانہ تقریباً تیس لاکھ بیرل تیل پیدا کرتا تھا، جزیرۂ خرگ میں اور اس کے اردگرد عراق کی پیداوار پچاس فیصد سے بھی کم ہو گئی۔ اسی طرح جنگ سے پہلے عراق دس لاکھ ستّر ہزار سے بیس لاکھ بیرل تک روزانہ تیل پیدا کرتا تھا۔ مگر شام سے گذرنے والی پائپ لائن کے بند ہونے اور ترکی سے گذرنے والی پائپ لائن کو شدید نقصان پہونچنے پر عراق کے تیل کی پیداوار تقریباً صفر ہو گئی۔ عراق نے ترکی سے گذرنے والی پائپ کی جلد مرمت کر کے پانچ سو سے سات سو بیرل روزانہ تیل کی پیداوار شروع کر دی اور پیداوار مستقل طور پر اب بحال ہونے کے امکانات ہیں۔

بہرحال اب جبکہ ایران نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا ہے تو امید کی جانی چاہیئے کہ فریقین اس بے فیض جنگ کے بھیانک نتائج کا بھرپور احساس کریں گے اور اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ کسی بھی طرف سے

مستقبل میں کوئی ایسا قدم ہرگز نہ اٹھایا جائے جس سے نہ صرف خلیجی ممالک اس سے متاثر ہوں بلکہ امن عالم اور سلامتی کو خطرات لاحق ہوں۔

خدا کرے دونوں ملکوں کے سربراہ پوری تندہی اور سنجیدگی سے اپنے ملک کے اندرونی مسائل ومشکلات کو حل کرنے اور متاثرین کو بحال کرنے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کریں اور امن عالم کے کاز کو آگے بڑھانے میں اپنا تعاون دیں۔ ع

شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات

مکتوباتِ عثمانیؒ

مفتیؒ بنام قاضی

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، بمبئی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (متوفی شنبہ ۱۰ شعبان ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء) رحمۃ اللہ علیہ میرے خاص علمی محسن ہیں، درحقیقت انھوں نے مجھے ملک کے مستند و معتبر محققین و مصنفین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر ندوۃ المصنفین سے وہ میری کتابیں شائع نہ کرتے تو شاید میری کتابوں کی اشاعت اتنے باوقار اور معیاری انداز پر نہ ہوتی، مفتی صاحب مرحوم سے میرا تعلق و تعارف زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، جب کہ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں آئے دن علماء کی آمد و رفت مختلف تقریبات میں رہا کرتی تھی، جہاں تک یاد پڑتا ہے مفتی صاحبؒ سے سب سے پہلی خط و کتابت تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی، لاہور چھوٹ گیا تھا۔ کسی علمی جگہ کی تلاش تھی میں نے مفتی صاحب کو لکھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں جگہ ہو تو مجھے رکھوا دیں، اس کے جواب میں مفتی صاحب نے لکھا کہ وہاں جگہیں پُر ہو چکی ہیں، پھر بھی آپ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کو لکھیں اور میرا حوالہ دیں، اس کے بعد خط و کتابت کی باری نہیں آئی۔ میں سنہ ۱۹۵۰ء میں بمبئی گیا۔ اس میں مفتی صاحب کی

شفقت اور خوردہ نوازی کو بڑا دخل ہے۔ اس زمانہ میں مجاہد ملت حضرت مولینا حفظ الرحمن صاحب اور حضرت مفتی صاحب اکثر بمبئی تشریف لایا کرتے تھے اور خان منزل کھانڈیا اسٹریٹ میں مرحوم عبداللہ احمد عرب سکری صاحب کے یہاں قیام کرتے تھے، ہم لوگ صبح و شام ان حضرات کی خدمت میں حاضری دیتے اور مختلف موضوعات پر کھل کر تبادلۂ خیال کرتے تھے، ۱۹۶۵ء میں مفتی صاحبؒ نے ندوۃ المصنفین سے میری کتاب "عرب و ہند رسالت میں" میں شائع کی، اسی زمانہ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ویسے مفتی صاحب زیادہ خط وکتابت کے عادی نہیں تھے اور نہ ہی ان کو اس کے لیے وقت ملتا تھا، ایک مرتبہ معذرت کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ خط وکتابت کے بارے میں میرا مزاج حضرت الاستاذ مولانا شاہ انور صاحبؒ کی طرح ہے۔ اس کے باوجود میرے ہر خط کا جواب دیر سویر دیا کرتے تھے۔ جس میں شفقت، محبت، خلوص، خوردہ نوازی اور تشجیع ہمّت افزائی ہوا کرتی تھی، اپنی کتابوں کے لیے دوسروں سے مقدمہ لکھوانے کا میرا ذوق نہیں ہے، ندوۃ المصنفین سے مفتی صاحبؒ نے میری آٹھ کتابیں شائع کیں اور کسی کتاب پر دوسرے کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ ہر کتاب کی ابتداء میں مفتی صاحب کی چند سطریں ہیں جو بہتر سے بہتر مقدمہ سے بڑھ کر ہیں، یقین ہے کہ اگر میں کسی دوسرے بزرگ سے مقدمہ لکھواتا تو اس میں وہ خلوص، خوردہ نوازی، اعتراف اور تشجیع کی وہ فراوانی نہ ہوتی جو مفتی صاحب کی چند سطروں میں موجود ہے۔ یہی حال ان کے خطوط کا ہے۔

حق تصنیف کے نام پر رائلٹی یا کتاب کی فروختگی میرے ذوق و مزاج کے خلاف ہے، میں نے کبھی کسی کتاب پر کوئی رقم نہیں لی ہے بلکہ خود میں نے رقم خرچ کی ہے حتی کہ قاہرہ میں جب میری کتابوں کے شائع ہونے کی باری آئی تو دار الانصار کے مالک مرحوم سید اسعد سید احمد نے رائلٹی کی بات کی تو میں نے اُن سے کہدیا کہ

آج تک میں نے اپنے ملک میں کسی سے حق تصنیف کے نام پر کوئی رقم نہیں لی ہے قاہرہ میں کیا لوں گا، آپ شائع کر کے فروخت کریں البتہ مجھے اتنے نسخے دے دیں۔
یہی صورت میں نے ندوۃ المصنفین سے کتابیں شائع ہونے کے وقت اختیار کی، اور جب پہلی کتاب "عرب و ہند عہد رسالت میں" شائع ہوئی اور مفتی صاحب نے ۲۵۰ روپئے عنایت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس کے عوض تاجرانہ نرخ پر اس کے نسخے لے لیے، اس کے بعد ہر کتاب کے پچیس تیس نسخے لیتا رہا، یہ صورت میں نے اپنے مزاج کے تقاضے پر اختیار کی اور اپنا علم فروخت کرنے کے بجائے اس کو فروغ دینے کی راہ نکالی۔ درمیان میں بعض اہم اور مشہور اداروں کے ذمہ داروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی کتابیں ہم کو دیں، اس میں آپ کا فائدہ ہوگا مگر میں نے کہا کہ یہ بات وضعداری اور مروّت و فتوّت کے خلاف ہے کہ مفتی صاحب نے میری کتابیں شائع کر کے اوساطِ علمیہ میں میرا تعارف کرایا ہے اس کے بعد میں دوسرے ادارے سے بات چیت کروں، پھر میں اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کی قیمت چند روپئے کی صورت میں وصول کرنا نہیں چاہتا۔

خوش قسمتی سے مفتی صاحب کے جو خطوط میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ان میں پہلا خط ۳ر فروری ۱۹۵۹ء کا اور آخری خط ۱۹ر جنوری ۱۹۸۲ء کا ہے لیکن اکیس بائیس سال میں یہ خطوط آئے اور تقریباً ایک سال میں ایک خط کا اوسط پڑتا ہے، حالانکہ اس سے زیادہ خطوط آئے مگر افسوس کہ وہ محفوظ نہیں رہ سکے، جو رہ گئے ہیں ان میں علم دوستی، فراخ دلی، خوردہ نوازی، شفقت، خلوص اور تعلق کی وہ قدریں ہیں جو ہمارے بزرگوں میں عام طور سے مفقود ہیں، مفتی صاحب کے غیر محفوظ خطوط میں وہ تعزیتی خط بہت ہی اہم تھا جسے آپ نے میرے والد ماجد رحمۃ اللہ کے وصال پر مجھے لکھا تھا، افسوس کہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔

(۱) مورخہ ۴؍فروری ۱۹۵۹ء محترم مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، "رجال السند والہند" مل گئی تھی، اکثر کتابوں پر تبصرے مولانا سعید احمد کرتے ہیں، چنانچہ کتاب ان کو بھیج دی گئی ہے، ان شاء اللہ جلد اظہار رائے کیا جائے گا، تبصروں کے لیے صرف تین چار صفحات ہوتے ہیں، کبھی اتنے بھی نہیں اس لیے تاخیر ہو جاتی ہے، مولانا سعید کو مزید تاکید لکھ دوں گا، کتاب جب آئی تھی میں نے بھی اس پر چلتی ہوئی نظر ڈالی تھی، اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب لکھ کر آپ نے ایک بڑے خلاء کو پُر کر دیا ہے، بکھرے ہوئے موتی یکجا ہو گئے ہیں، اور سندو ہند کے ارباب علم و حکمت کا ایک خوب صورت ہار تیار ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ گراں قدر خدمت قبول فرمائیں، آپ کے کام میں یوں بھی بڑی برکت ہے، کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، فقط والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی

(۲) مورخہ ۵؍مارچ ۱۹۶۴ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، مضمون بھی پہونچ گیا تھا۔ "برہان" میں جلد شائع ہو گا، کاموں کے ہجوم میں حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری خطوط کے جواب بھی رہ جاتے ہیں، آپ کبھی بھی اس کا خیال نہ فرمایا کریں۔ کتاب "ندوۃ المصنفین" سے ضرور شائع ہو گی، اس کو مکمل کر لیں[۱] ادارے کو اس سلسلہ میں آپ کی کیا خدمت کرنی ہو گی؟ اس کو صاف کر لیں، رائلٹی کا یہاں کوئی سلسلہ نہیں ہے، کسی زیادہ بہتر معاوضہ کی بھی توقع نہ رکھئے، کیونکہ ادارے کے حالات ایسے ہی ہیں۔ پھر بھی خدمت کی جائے گی میں سمجھتا ہوں آپ کے سامنے پوری صورت حال ہے۔ غالباً ۱۸؍کو بمبئی آنا ہو گا، حج کمیٹی کی میٹنگ ہے، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت

---

[۱] "عرب و ہند عہد رسالت میں" میری پہلی کتاب جو ندوۃ المصنفین سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

ہوں گے۔ فقط والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۳) مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۶۴ء، مخلصم و محترم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکرمت نامہ ملا۔ مجھے خود خیال تھا کہ اس دفعہ آپ سے اطمینان کی ملاقات نہ ہوسکے گی۔ سچ تو یہ ہے اس عرصے میں کئی دفعہ خط لکھنے کا ارادہ کیا مگر پورا نہ ہوسکا، کاموں کا ہجوم اور ماحول کی ناسازگاری کی نوعیت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں، بمبئی میں بارش کا اتنا زور تھا کہ کہیں آنا جانا مشکل ہوگیا تھا، افسوس آپ کو زحمت ہوئی، کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آپ تشریف لائے تھے، ورنہ فون پر ہی معذرت کرلیتا، کتاب کا آخری باب فوراً ارسال فرمائیں اور شروع کے صفحات بھی، کتابت فوراً ہو جائے گی، کتابت کی عمدگی اور باضابطگی کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا مسودہ سامنے ہو، مسودہ کاتب کو دے دیا گیا ہے، دونوں مضمون محفوظ ہیں، ان شاء اللہ "برہان" ہی میں شائع ہوں گے، بعض مضامین کی طوالت اور تسلسل کی وجہ سے یہ دشواری پیش آرہی ہے کہ متعدد اہم مضامین دو دو سال بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مدت سے رُکے ہوئے ہیں، آپ کے مضمون گرانقدر ہوتے ہیں، واپس کیسے ہوسکتے ہیں، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، والسلام صاحب[1] گاڑی لے آئے تو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تفریح کو چلا گیا تھا کیوں کہ بچہ تا لڑکا ساتھ تھا۔ عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔

(۴) مورخہ یکم ستمبر ۱۹۶۴ء برادرم و مخلصم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا گرامی نامہ ملا تھا، لفافہ بھی پہونچ

---

[1] جناب اے، اے خان صاحب بمبئی سکریٹری جمعیۃ علماء مہاراشٹر۔

گیا تھا، پورا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے، کاتب پختہ قلم ہے انشاءاللہ کتابت مناسب رہے گی، میرا دو چار سطریں لکھنا، بس یہی ایک مرحلہ ہے، تاہم کوشش کروں گا، فہرست اور ابتدائیہ وغیرہ کے ساتھ دو صفحے مزید محفوظ رکھے گئے ہیں، کتاب کا سائز بڑا ہی رکھا گیا ہے، علمی کتابوں کے لیے چھوٹا سائز ٹھیک نہیں رہتا، حالانکہ اس میں کافی کفایت ہوتی ہے۔ "ابن حزم" والا مضمون جلد شائع ہوگا، صدارت کا انتخاب ہوچکا ہوگا[1] ابھی یہاں خبر نہیں پہونچی، کتاب کے سلسلے میں کچھ خدمت آپ کی ہوگی، اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط، والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۵) ۶ر جون ۱۹۶۵ء مخلصم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، میں حج کے بعد مکہ مکرمہ ہی میں علیل ہوگیا تھا، سخت قسم کا فلو ہوگیا تھا، بالکل بے جان ہوگیا، یہاں پہونچ کر بھی اس کے اثرات رہے، کمزوری اب بھی باقی ہے، شکر ہے کتاب طبع ہوگئی۔ اور عمدہ طبع ہوگئی، آپ کے لیے بطور معاوضہ نہیں بطور ہدیہ ۲۵۰ طے شدہ ہیں، جیسے ہی گنجائش نکلے گی ارسال خدمت کردیے جائیں گے، ادارے کی حالت بس یوں ہی سی ہے[2] مجھے فرصت نہیں ملتی دوسروں کے بس کا کام نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ضروری مصارف میں بھی تنگی ہوتی ہے، جس کتاب کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، بمبئی میں ضرور دیکھوں گا، خدا کرے ادارے سے شائع ہوسکے، مدینہ منورہ میں عزیز مولوی خالد سلمہٗ[3]

---

[1] جمعیۃ علماء مہاراشٹر کی صدارت کا انتخاب۔ [2] میں نے اس کے بدلے تاجرانہ نرخ پر کتابیں لے لی تھیں، اس کے بعد بھی روایت قائم رہی کہ ہر کتاب کے پچیس تیس نسخے لے لیتا تھا۔

[3] عزیزم خالد کمال سلمہٗ، یہ اس زمانہ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔

سے ملاقات ہوئی تھی، وہاں قیام صرف تین روز رہا۔ یونیورسٹی بھی نہ دیکھ سکے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۶) مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۶۵ء مخلصم و محترم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا۔ جواب بینا اور بھوپال کے درمیان چلتی ٹرین سے لکھ رہا ہوں، پٹھان کوٹ زناٹے سے دوڑ رہی ہے اور قلم ہل رہا ہے، یہ معلوم ہو کر کہ قرعہ میں نام نہیں آسکا، افسوس ہوا، قرعہ ہی ٹھہرا، اس کی کشتی اکثر حالات میں ہواؤں کے خلاف چلتی ہے، صورت یہ ہے کہ گزشتہ سال کے تلخ تجربے کے بعد اس سال کمیٹی میں یہ طے ہو گیا تھا کہ میں اپنے پاس کوئی علیحدہ کوٹا نہیں رکھوں گا، چنانچہ میرے پاس ایک سیٹ بھی نہیں ہے، سفارش ضرور کر سکتا ہوں اگرچہ وہاں بھی چند ہی سیٹیں ہیں، کمیٹی میں تو زیادہ کی بات ہوئی تھی مگر حکومت نے اندازے سے بہت کم تعداد نشستوں کی کر دی ہے، اس لیے وہ صورت باقی نہیں رہی، بہرحال اگر آپ کا حج فرض ہے اور آپ پہلی دفعہ جا رہے ہیں تو مسٹر ڈی، اے قدوائی ڈپٹی سکریٹری اکسٹرنل افیرز نئی دہلی کے نام درخواست بھیجیں، اور اس کی کاپی مجھے بھیج دیں، درخواست ٹائپ شدہ انگریزی میں ہو، میں یہاں ممکن سعی کروں گا، کیوں کہ بحالت موجودہ میری حیثیت سفارشی ہی کی ہے، میرے پاس براہ راست کوئی کوٹہ نہیں ہے۔ قدوائی صاحب کے پاس بھی نہیں ہے، مگر اِکّا دُکّا درخواستوں پر ہم اور وہ مل کر غور کر سکتے ہیں، اور مجھ سے پوچھئے تو سیدھا راستہ یہ ہے کہ اس سال صبر سے بیٹھے رہیں، اور اگلے سال کا انتظار کریں، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، بھوپال سے غالباً پرسوں واپسی ہوگی۔ مدینہ منورہ سے مولوی خالد کمال سلمہ کا خط آیا تھا، جواب لکھوں گا،

علماء ہند کی عربی تصنیفات پر آپ کا مقالہ پاکر کتاب شائع ہوئی تھی، مولوی خالد سیف اللہ کو جدہ میں اس کی ضرورت ہے کیا کرنا چاہیئے۔ فقط والسلام

عتیق الرحمن عثمانی

(۷)......۱۹۶۵ء محترم مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ۔ گرامی نامہ ملا، ڈاکٹر صاحب[۵] موصوف کو ادارے کے قواعد و ضوابط کی کاپی بھیجی جارہی ہے ۔ میں ان کو خط بھی لکھنے کا ارادہ کررہا ہوں، لائف ممبر بن جائیں تو اس وقت ادارے کو بڑی مدد مل جائے، جنگ کے بعد سے حالات بہت نازک ہوگئے ہیں، یہاں کی مطبوعات کی اعلیٰ پیمانے پر کھپت پاکستان میں ہوتی تھی، وہاں کے تاجر لائسنس کے ذریعہ کتابیں منگاتے تھے اور اس طرح ادارہ کی اہم ضرورتیں پوری ہوجاتی تھیں، اب یہ سلسلہ تمام تر منقطع ہے اور مستقبل قریب میں بھی کوئی روشنی نظر نہیں آتی، ذی استطاعت صاحب خیر اور صاحب ذوق اگر توجہ سے کام لیں تو یہ نازک وقت ٹل سکتا ہے، بہتر ہوگا کہ آپ ہی ڈاکٹر صاحب موصوف کو تازہ مطبوعات کے بعد خط تحریر فرمادیں، ابھی تک آپ کی دوسری کتاب کی کتابت شروع نہیں ہوسکی ہے، اور اس کی وجہ یہی حالت کی ناسازگاری ہے، جیسے ہی موقعہ ملے گا کام شروع کرایا جائے گا، " عرب و ہند عہد رسالت میں " پر تبصرہ کا کٹنگ بھی مل گیا تھا، امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام ۔ عتیق الرحمن عثمانی

(۸) ۱۸ اگست ۱۹۶۶ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ۔ گرامی نامہ ملا، پہلا خط بھی پہونچ گیا تھا، تاخیر جواب کے لیے معذرت خواہ ہوں، سب سے پہلے تو زیارت حرمین شریفین سے بخیریت

---

۵ جناب ڈاکٹر عبداللطیف خاں صاحب مقیم کویت۔

تمام واپسی پر مبارکباد قبول فرمائیں، بہت خوب ہوا کہ مولوی خالد سلمہ کی موجودگی میں والدین کو یہ سعادت میسّر ہوگئی، ادارے کے حالات ناقابلِ بیان حد تک نازک ہیں، ہر مہینے یہی انتظار رہتا ہے کہ پاکستان سے سلسلہ کھلے اور کام جاری ہو، یہ پورا سال انتہائی پریشانی میں گذرا ہے، اور اب پانی سر سے اونچا ہے، افسوس دوستوں تک کو یہ احساس نہیں کہ ندوۃ المصنفین جیسے بہترین علمی اور مذہبی ادارے پر کیا بیت رہی ہے، جس روز بند ہو جائے گا دنیا حیرت کرے گی، بمبئی میں کام کی اچھی خاصی گنجائش ہے مگر کرے کون؟ غیر ضروری کاموں کے لیے روپیہ جمع ہو جائے گا مگر ندوۃ المصنفین کو "چند لائف ممبر" چند خاص ممبر" اور بہت سے عام ممبر نہیں ملیں گے، یاللعجب! آپ کی کتاب میں تاخیر کا سب سے زیادہ یہی سبب ہے، تمام ضروری کام روک دیے گئے ہیں، کیونکہ کچھ ہے ہی نہیں، اسٹاک سے جو پڑا ہوا ہے، کتاب کا مسودہ برائے کتابت بہرحال اسی عمدہ کاتب کو دیا جا رہا ہے، توقع ہے چند مہینوں میں کتاب طبع ہو کر سامنے آجائے، یہی فکر ہے کہ کاغذ کہاں سے آئے گا، طباعت کی رقم کا کیا ہوگا؟ میں حالات کی ناسازگاری سے گھبرانے والا نہیں ہوں، مگر عزم و ہمت کا بھی ایک پیمانہ ہوتا ہے، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام، عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۹) ۲۴؍ جولائی ۱۹۶۷ء۔ مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ اگرچہ مولوی محمد ظفر احمد خاں کے نام[۱] ہے لیکن میرے ذمّہ ہی جواب کا قرضہ ہے، وہ خط اس وقت سامنے نہیں ہے، کہیں دبا ہوا ہوگا، میری حالت ایسی ہی ہوگئی ہے، کتابت شکر ہے مکمل ہوگئی ہے، یہاں تک کہ

[۱] ندوۃ المصنفین کے قدیم خادم اور آفس انچارج چند سال ہوئے انتقال کر گئے، ضیق النفس کے دائمی مریض تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

پرسوں میں نے بھی چند منٹ نکال کر اپنے دو صفحے لکھ دیے ہیں، یہ چھوٹی سی بات تھی مگر بڑی بھی کہ میرے پاس ان کاموں کے کرنے کا وقت ہی نہیں، کتاب ان شاء اللہ "دیر آید درست آید" کا مصداق ہوگی، کوشش کی جائے گی کہ پروف آپ دیکھ سکیں، یہ اچھا ہوگا،

حاجی احمد غریب صاحب کی رحلت کا قلب پر غیر معمولی اثر ہے، بڑے صاحب خیر، اعلیٰ درجہ کے منتظم اور تعمیری صلاحیت کے شخص تھے، اجتماعی کاموں سے بھرپور دلچسپی لیتے تھے، افسوس کم عمر پائی، ان کی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی، میں نے آج ہی فینسی محل کے پتے پر حافظ محمد صدیق صاحب کو خط لکھا ہے، اندیشہ ہے کہ حافظ صاحب بمبئی نہ ہوں اور خط ضائع ہو جائے، اچھا ہو کہ خط محفوظ ہو جائے، امید ہے آپ بہ ہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، مولوی خالد صاحب سلمہٗ کی کامیابی سے قلبی مسرت ہوئی، صالح اور لائق نوجوان ہیں، یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی اولاد میسّر ہوئی۔ میں الحمد للہ بخیریت ہوں، دوسری جانب مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کے لیے چھوڑ دی ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، دفتر برہان جامع مسجد دہلی ۶

خوش قسمتی سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ تعزیتی خط بھی میرے پاس محفوظ ہے جس کو آپ نے الحاج احمد غریب صاحب میمنی مرحوم کی وفات کے سلسلہ میں ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد صدیق صاحب میمنی مرحوم کے نام لکھا تھا اور راقم خط میں جس کے محفوظ ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے، اس مکتوب کو بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء مخلصم و محترم جناب حافظ محمد صدیق صاحب دام مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ کن لفظوں میں حاجی احمد غریب صاحب مرحوم کی تعزیت کی جائے، آپ کے قلب پر تو جو کچھ گذر رہی ہوگی، ہم لوگ بھی اس المناک خبر کو سُن کر دم بخود رہ گئے، بہت سخت اور غیر معمولی حادثہ ہوا ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون،

صد افسوس ملّت کا ایک سچّا خادم اُٹھ گیا، مرحوم سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۴۹ء میں "محمدی جہاز" پر ہوئی تھی، مرحوم امیر الحج تھے، اور ہم لوگ ایک ڈیلی گیشن میں حجاز جا رہے تھے، اس کے بعد سے تعلقات میں اضافہ ہوتا رہا، اس وقت مرحوم کی ایک ایک خصوصیت رہ رہ کر یاد آرہی ہے، اعلیٰ درجہ کے منتظم، ملّت کے زبردست بہی خواہ، اجتماعی مصلحتوں کو سمجھ کر بہترین کام کرنے والے، بہت ذی اثر اور قوم کے معتمد، جس کام کو ہات میں لیتے انجام تک پہونچاتے، خاموشی کے ساتھ امور خیر میں حصّہ لینے والے، ہندوستان چھوڑنے سے کچھ ہی پہلے مرحوم سے اسی فینیسی محل میں بہت دیر تک ملاقات رہی تھی، افسوس ایسا مخلص خدمت گزار اور غیر معمولی کارکن اس قدر جلد ہم سے جدا ہو گیا، اس درجے کے کارکن جن میں اجتماعی اور اصلاحی کاموں کی اتنی اعلیٰ صلاحیت ہو کم ہی ہوتے ہیں، مرحوم آج دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کے تعمیری کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے، صابو صدیق مسافر خانہ کی آخری منزل، انجمن خدام النبی، اور دوسری جمعیتیں سب ہی ان کی خدمات کو یاد کریں گے، آپ کے لیے اور مرحوم کے بچّوں اور اہلیہ کے لیے یہ صدمہ خاص طور پر جاں کاہ ہے، اللہ تعالےٰ آپ سب کو صبر و رضا سے نوازیں، ازراہِ کرم ان کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادوں تک کلمات تعزیت پہونچا دیں۔

اصبر نکن صابرین فانّما — صبر الرعیۃ عند صبر الراس

خیر من العباس صبرك بعدہ — واللہ خیرٌ منك للعباس

عتیق الرحمٰن عثمانی

(۱۰) ۱۹ر جون ۱۹۶۸ء — مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کرم نامہ پہونچا، "عرب و ہند عہد رسالت" جتنے نسخے خدمت گرامی میں پیش کیے گئے تھے، اتنے ہی نسخے اس کتاب کے بھی پیش

کئے جائیں گے، میں نے مولوی محمد ظفر احمد خاں سے کہدیا ہے، آپ ان کو وہی پہلے کی تعداد تحریر فرمادیں، شاید ایسا ہوا تھا کہ نقد روپئے کے بجائے آپ نے کتابیں لی تھیں، اس کے بعد یہی صورت باقی رہے گی تو تاجرانہ رعایتی معاملہ ہوجائے گا، افسوس آپ کو زحمت انتظار اٹھانی پڑی، پہلا خط میرے سامنے نہیں ہے، امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔ والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۱۱) ۹ر ستمبر ۱۹۶۸ء مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ۔ تہنیت نامہ ملا تھا، مختلف سفر درپیش رہے، جواب میں تاخیر ہوگئی، آپ کے کلماتِ تہنیت سے قلب پر خاص اثر ہوا ہے، اور ان الفاظ سے تعلق خاص اور روحانی ربط کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا یہ بے طلب ایک چیز آئی ہے، جس کی نوعیت کسی رسمی خطاب کی نہیں بلکہ علمی اعزاز کی ہے، اس لیے لائقِ شکر ہے۔ بہت سے اصحاب علم مجھ سے کہیں زیادہ اس اعزاز کے مستحق ہیں، مجھے اس کا پوری طرح احساس ہے، آپ کا رسمی شکریہ کیا ادا کروں، اسلام اور ہندوستان کی ابتدائی تاریخ سے متعلق تمام مضامین کتاب کی صورت میں آنے چاہئیں، ان پر نظر ثانی فرمالیں، مناسب اضافے بھی ہوجائیں، مسوّدہ جلد آئے تو ۱۹۶۹ء کی مطبوعات میں اس کی اشاعت شامل کرلی جائے، "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" پر ارشاد کی تعمیل میں چند لائنیں لکھ دی تھیں، عزیزم مولوی خالد کمال سلمہٗ بہت انتظار کرکے گھر واپس چلے گئے، ان کے حالات سے تردّد ہے، خدا کرے ویزا وغیرہ جلد آجائے مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔ فقط، والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

(۱۲) ۷؍اکتوبر ۱۹۶۹ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا۔ عزیزم مولوی خالد کمال کے بخیریت تمام پہونچنے کی اطلاع ہوئی، نہایت سعادت منداور قابلِ قدر اور نوجوان عالم ہیں، ان کیلئے دعا کرتا ہوں، یہ معلوم ہوکر خوشی ہوئی کہ اسلامی ہند سے متعلق مضامین ایک مستقل تصنیف کے روپ میں مرتّب ہوگئے ہیں۔ ان کو جلد سے جلد ارسال فرمائیں کتابت فوراً شروع کرادی جائے گی، زندگی کی رفتار تیز تر ہوتی جارہی ہے، جو کام جس قدر جلد ہوجائے بہتر ہے، ان شاء اللہ ۱۹۶۹ء کی مطبوعات میں آجائے گی، کاتب رامپور میں ہیں، مسوّدہ رجسٹری سے رام پور بھیج دیا جائے گا، جس ٹکڑے میں مزید اضافے کا خیال ہو اس کو بعد میں بھیج دیجئے گا، گھانا اطمینان سے جانا چاہیئے مگر جانا چاہیئے۔ ایک ضروری کام تھا، آپ اس کو زیادہ بہتر اور سلیقے سے کرسکیں گے۔ ندوۃ المصنفین کے اغراض ومقاصد عربی میں عمدہ اور نفیس ٹائپ میں طبع ہونے چاہئیں، دس بارہ سال ہوئے لیتھو میں طبع ہوئے تھے، شاید مولانا عبدالحمید نعمانی نے ان کو عربی میں منتقل کیا تھا۔ رائے ہوگی تو عربی، اُردو دونوں کی کاپیاں بھیج دی جائیں گی، یہاں یہ کام ٹھیک نہیں ہوسکتا، ٹائپ کا دہلی میں کوئی اچھا پریس نہیں ہے، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب مستقل بیمار ہیں، کوئی نیا کام ان سے نہیں ہوتا، میری بے فرصتی اور ہجوم کار کا آپ کو اندازہ ہے، ضروری مصارف ادا کردیئے جائیں گے۔ والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۱۳) ۱۱؍مارچ ۱۹۷۰ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گرامی نامہ ملا تھا، جواب میں تاخیر ہی ہوجاتی ہے۔ اس درمیان میں متعدد سفر بھی رہے، کیا عرض کروں پاکستان سے کاروبار بند ہونے سے ادارہ کا ڈھانچہ بگڑ جارہا ہے، محض ساکھ ہے کہ گاڑی کھسک رہی ہے، مجموعۂ مقالات دو مہینے

قبل آجاتا تو ۱۹۶۹ء کی مطبوعات میں اس کتاب کو شامل کرلیا جاتا، اب ۱۹۷۰ء کی کتابوں میں شامل ہوگی، بہرحال فوراً بھیجدیں، کتابت میں بھی وقت لگتا ہے، ادھر ۱۹۷۰ء کے بھی تین مہینے گزرنے کو ہیں، ان شاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی، یعنی زیادہ سے زیادہ جولائی تک، اس کے بعد "العقد الثمین" کی کتابت ہوگی، بے شک اس طرح آپ کی کتب گرامی کا پورا سیٹ "ندوۃ المصنفین" سے شائع ہوجائے گا، "العقد الثمین" پر زیادہ توجہ دیں تو بہتر ہوگا۔[1] تحریر فرمائیں کہ اس کا حجم کتنا ہوگا، شاید مناسب ہو کہ مجموعۂ مقالات میں دو ایک مقالے غیر مطبوعہ بھی شامل ہو جائیں، بعد میں بھیج دیجئے گا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں برکت عطا فرمائی ہے اور خلوص بھی، امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے، پرسوں احمد آباد کا سفر ہے اور شروع اپریل میں شاید کیرالا کا، ایک بڑی مسجد کا افتتاح کرنا ہے، بمبئی سے گزرنا ہوگا، مگر غالباً صرف دو گھنٹے ہوائی اڈے پر ٹھہرنا ہو، بہت دنوں سے بمبئی آنا نہیں ہوا، آپ حضرات سوچ سمجھ کر ایسا پروگرام بنالیں کہ اس بڑے اور اہم شہر سے ادارے کو کچھ لائف ممبر، کچھ معاونین خاص، کچھ معاونین، کچھ محسن خاص مل جائیں تو ایک ہفتے کے لیے بمبئی آجاؤں، اس سفر میں ادارے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو۔

عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۱۴۲) ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء مطابق ۲۷ رجب ۱۳۹۰ھ۔ مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکرمت نامہ ملا، حالات معلوم ہوئے، قانون فطرت کی رنگینیاں بھی عجیب ہیں، جب قویٰ جاندار اور مضبوط ہوتے ہیں، فرصت ہی فرصت رہتی ہے، اور جس وقت بڑھاپا اپنی تمام ناتوانیوں اور برکتوں کے ساتھ آتا ہے، بے پناہ

[1] پہلے خیال تھا کہ العقد الثمین کا ترجمہ شائع کرایا جائے، اسی سلسلہ میں یہ بات ہے، بعد میں یہ ارادہ ترک کرکے خلافت راشدہ، خلافت امویہ اور خلافت عباسیہ کے اسلامی ہند پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

مشغولیتیں ہو جاتی ہیں، بہر حال جو کچھ بن پڑتا ہے ہو جاتا ہے، پوتے کے ورود مسعود پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے، اللہ تعالیٰ علم و عمر کی دولت سے نوازیں، مولوی خالد کمال سلمہٗ کو میری طرف سے تہنیت لکھدیں، "مآثر و معارف" کی کتابت غالباً نصف سے متجاوز ہو چکی ہے، جلد مکمل ہو جائے گی، ایک مہینے کے بعد مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب سے دریافت فرمالیں، آپ کا یہ خیال درست ہے کہ ایسے کام روز روز نہیں ہوا کرتے، بنا بریں نہایت مناسب ہے کہ "العقد الثمین" ہر حیثیت سے مکمل ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام میں برکت دی ہے، ان شاء اللہ جلد ہوگا، اور بہتر ہوگا، ظ انصاری صاحب کو کتابیں کس پتے پر روانہ کی جائیں۔ فقط، والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی

مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب سلام مسنون پہونچاتے ہیں، پاکستان سے کام بالکل بند ہے اس لیے ادارے کی حالت سقیم تر ہے۔ آپ جیسے دوست ہمت بڑھائیں تو بمبئی میں کم سے کم ادارے کے ایک صد معاون بن سکتے ہیں، کچھ ہزار کے، کچھ سو کے، اور بہت سے چالیس روپئے سالانہ کے، ندوۃ المصنفین جیسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوتے، یہ ملت کا قیمتی سرمایہ ہے، فقط والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، دفتر برہان، جامع مسجد دہلی۔

(۱۵) ۸ جولائی ۱۹۷۱ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، ۲۵ کتابیں تو شاید جا چکی ہیں، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب نے انہی کے متعلق لکھا ہوگا، یوں اُن سے کل دریافت کروں گا، اس وقت وہ یہاں نہیں ہیں، "خلافت راشدہ اور ہندوستان" کے مسودے کا انتظار ہے، آپ کی کتاب شائع کر کے مجھے مسرت ہوتی ہے، افسوس ہے کاروبار کی حالت سقیم تر ہے، ہمارے لٹریچر کا حلقہ پاکستان میں زیادہ ہے، اس حلقے کی

قوت خرید بھی زیادہ ہے لیکن برسوں سے یہ سلسلہ منقطع ہے، گفٹ کے نام پر کچھ پیکٹ چلے جایا کرتے تھے وہ بھی بند ہو گئے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے، بہت دنوں سے اس ارادے میں ہوں کہ بمبئی آکر ادارے کا حلقۂ معاونین بنایا جائے، اس مشکل وقت میں اس سے بھی مدد ملے گی، کچھ لائف ممبر، کچھ معاونین خاص، اور ایک تعداد معاونوں کی مل جائے گی، بشرطیکہ ایک ہفتے قیام ہو اور کوئی دوسرا کام ساتھ نہ ہو، اور احباب بھی بھرپور تعاون دیں، آپ کے حالات سے تعلق خاص رہتا ہے، خط لکھنے میں کوتاہ ہوں مکان سے واپس تشریف لے آئیں تو اس پروگرام پر غور فرمائیں، مولوی خالد سلمہٗ امید ہے بخیریت ہوں گے، "برہان" کے لیے کوئی نفیس مضمون بھی تحریر فرمائیے۔

عتیق الرحمن عثمانی

(۱۹) ۲۴ اپریل ۱۹۷۵ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ پہونچا، مبارکباد قبول فرمائیں، شکر ہے بخیریت تمام تشریف لے آئے، پچھلے دنوں بمبئی جانا ہوا تھا اور قیام بھی اندازے سے ہو گیا، مقصد وہی "ندوۃ المصنفین" کی اعانت کی جانب توجہ دلانا تھا، آپ کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا وطن تشریف لے گئے ہیں، آپ حضرات کو اب ادارے کی جانب خاص توجہ کرنی چاہیئے، نازک وقت آگیا ہے، ایسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوا کرتے، کتاب کی بات یہ ہے کہ اس کی کتابت بہت دنوں سے مکمل ہوئی رکھی ہے جیسے ہی کاغذ کا انتظام ہو گا طبع کرادی جائے گی، بنابریں اب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آخر میں کچھ اضافے ہو جائیں، مسوّدہ بھیج دیا جائے گا لیکن دشواری یہ ہے کہ پروف ریڈنگ کے وقت اس کی ضرورت ہو گی، یہ کام ہو جائے تو پھر آپ اطمینان سے اس پر نظر ثانی کر سکتے ہیں، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں، آپ حضرات کم سے کم

معاونین کے حلقوں کی توسیع کا کام کرسکتے ہیں، حکیم اصلاحی صاحب وغیرہ سے بھی ذکر ہوا تھا، عتیق الرحمٰن عثمانی، دفتر "برہان" جامع مسجد دہلی ۲

(۱۷) ۷ر اگست ۱۹۷۲ء مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکرمت نامہ ملا، گرامی نامے کا جواب یہاں سے بھیج رہا ہوں، ۲۷ر جولائی کو گیا ہے، تعجب ہے وہ خط آپ کو نہیں ملا، ملا ہوگا تو بہت تاخیر سے، اس خط کا خلاصہ یہ تھا کہ "خلافت امویہ اور ہندوستان" کا مسودہ فوراً روانہ فرمادیں، جس طرح بھی ہوسکے گا اس کتاب کو ۱۹۷۲ء کی مطبوعات میں شامل کیا جائے گا۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ فقط، والسلام، عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۱۸) ۲۴ر اگست ۱۹۷۲ء مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ۱۶ر اگست کو پہونچ گیا تھا، لیکن مسوّدہ پرسوں ۲۲ر اگست کو پہونچا ہے، پتے پر آپ نے "ندوۃ المصنفین" کے بجائے نیشنل مصنفین لکھا تھا، ہوسکتا ہے اسی وجہ سے تاخیر ہوئی ہو، ان شاء اللہ جلد کتابت شروع کرائی جائے گی، بڑا کام ہے، اللہ تعالیٰ آسان فرمائے، یقیناً آپ نے اس کتاب کی تیاری میں محنت شاقہ برداشت کی ہے، خدا کرے "ندوۃ المصنفین" کسی خدمت کے لائق ہوجائے، بہت دنوں سے بمبئی کے خیال میں ہوں، وہاں ادارے کا بہتر کام ہوسکتا ہے مگر آپ حضرات ہمت نہیں بڑھاتے ہیں، مئی میں "دارالمصنفین" کی وجہ سے رک گیا کہ اس قدر جلد دوسرا کام شاید نہ ہوسکے[1] امید ہے حالات کا جائزہ لے کر

---

[1] دارالمصنفین اعظم گڈھ کا ایک وفد اپنے ادارے کے تعاون کے لیے اپریل میں بمبئی گیا تھا۔

تحریر فرمائیں گے، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں اور خود بھی دعا کا محتاج ہوں، فقط والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

(۱۹) ۱۹ر مئی ۱۹۷۳ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بہت دنوں سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں کلکتہ جانا ہوا تھا، وہاں حکیم محمد زماں صاحب کے پاس آپ کا خط پہونچا تھا، جس سے معلوم ہوا تھا کہ ان دنوں مکان پر تشریف لائے ہوئے ہیں، اغلب یہ ہے کہ اب بمبئی واپس ہوگئے ہوں گے، کتاب کی کتابت مکمل ہوگئی ہے، غالباً ۶۵۰ صفحات پر کتابت ختم ہوئی ہے، اب اور کیا کرنا ہے؟ ان شاء اللہ جلد تمام کاپیاں پریس کو دے دی جائیں گی، بمبئی میں ادارے کا کچھ کام ہوجاتا تو اچھا ہوتا، یہ دن معمول سے زیادہ سخت گزر رہے ہیں، فقیہ صاحب، دسوی صاحب، اور حافظ کا صاحب وغیرہ مدد کے لیے تیار ہیں، دوسری اہم تر بات جس کی وجہ سے خاص طور پر یہ کارڈ لکھا ہے "برہان کے لیے مضمون کی ہے، آپ کے مقالات عام طور پر "معارف میں آتے ہیں، اور "برہان" اُن سے محروم رہتا ہے، کیا یہ علمی رسالہ آپ کے مقالات گرامی کے لائق نہیں ہے! براہ کرم ہو اگر کبھی اپنے اس رسالہ کے لیے کوئی نفیس مضمون ارسال فرمائیں، میں [illegible] ہے کہ اب آپ [illegible] منتقل ہوگئے ہیں [illegible] [illegible] رہے، مقالات اور خیریت سے مع مضمون کے مطلع فرمائیں۔ فقط وا[illegible]

عتیق الرحمٰن عثمانی

(۲۰) ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۶ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ ملا، صوبہ یا یورپ میں علم و علما[illegible] مسودہ بھی پہونچ گیا، کیا عرض کروں و صلہ تو بہت کچھ ہے لیکن مزاج کی افت[illegible]

وسائل کی کمی کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہوں، دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر ندوۃ المصنفین سی بے نوائی کے عالم میں ہے، ان دنوں میں اور بھی زیادہ دشواری ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ کارساز ہے، ان شاء اللہ آپ کی یہ کتاب بھی ادارے سے شائع ہوگی، جیسے ہی موقع ملے گا، اور یہ موقع جلد آئے گا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا جائے گا، یہ معلوم ہو کر کہ "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" پر توجہ سے نظر ثانی ہو رہی ہے خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی برکاتِ خاص سے نوازا ہے، قلب کو اس سے اطمینان ہوتا ہے کہ ایک مخلص عالم دین اور لائق مصنف کی محنت "ندوۃ المصنفین" جیسے ادارے کے سیلے سے ٹھکانے لگ گئی، امید ہے آپ ہر طرح بعافیت ہوں گے۔ فقط والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

(۲۱) ۱۹ر جنوری ۱۹۸۲ء ، مخلصم برادرم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ کئی ہفتے ہوئے موصول ہوا تھا، میری طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہو گئی تھی، کھانسی کی شدت کی وجہ سے نیند بھی نہیں آتی تھی، جواب میں تاخیر ہو گئی، معذرت خواہ ہوں، قاضی حیات النبی مرحوم[1] کے سانحۂ رحلت کی اطلاع سے بہت صدمہ ہوا، افسوس آپ اپنے دست و بازو سے محروم ہو گئے، مجھے معلوم تھا کہ وہ آپ کی علمی زندگی کے سکون کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسمی صلاحیتیں اپنی جگہ ہوتی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ باضابطہ مولوی نہ ہو کر بھی بہت سے رسمی علماء سے زیادہ معلومات رکھتے ہوں،

گرامی نامہ سے یہ معلوم ہو کر اور افسوس ہوا کہ مرحوم نہ صرف علمی معلومات رکھتے بلکہ بہت اچھے معاملہ فہم بھی تھے، مرحوم کی جو غیر معمولی صلاحیتیں آپ نے تحریر فرمائی، ان کا

[1] متوفی صبح جمعہ ۲۰ر صفر ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۱ء رحمۃ اللہ علیہ،

قدرتی تقاضا یہی ہونا چاہیئے تھا کہ اُن کی جدائی کا اعزہ واقرباء اور علاقہ کے تمام باشندوں پر غیر معمولی اثر ہو، میں نے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت بھی کی ہے اور ایصالِ ثواب بھی، بلاشبہ یہ صدمہ آپ کے لیے جانکاہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور آپ کو اور تمام متعلقین کو توفیق صبر سے نوازیں، آمین، آدمی چلا جاتا ہے مگر اس کی خصوصیتیں باقی رہ جاتی ہیں، جو دوسروں کے لیے باعثِ تقلید ہوتی ہیں۔

گرامی نامہ سے والد مرحوم کی جدائی کا صدمہ بھی تازہ ہونا ہی چاہیئے تھا، [1] آپ کی صحت وعافیت کے لیے بھی دعاء کرتا ہوں، اب آپ جیسے قناعت پسند علماء کم ہی رہ گئے ہیں، میں نے آپ کی زندگی کے مختلف دور دیکھے ہیں اور ہر حالت میں آپ کو مطمئن پایا ہے، فی الحقیقت یہ بہت بڑی نعمت ہے، باقی ضروری باتیں ان شاء اللہ کسی دوسرے وقت لکھوں گا۔ والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، دفتر برہان، اُردو بازار، دہلی ۶

[1] والد ماجد الحاج محمد حسن صاحب متوفی ۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۷۸ء رحمۃ اللہ علیہ۔

مفتی بنام قاضی

(۱) مورخہ ۴ر فروری ۱۹۵۹ء محترم مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، "رجال السند والہند" مل گئی تھی، اکثر کتابوں پر تبصرے مولانا سعید احمد کرتے ہیں، چنانچہ کتاب ان کو بھیج دی گئی ہے ان شاء اللہ جلد اظہار رائے کیا جائے گا، تبصروں کے لیے صرف تین چار صفحات ہوتے ہیں، کبھی اتنے بھی نہیں اس لیے تاخیر ہو جاتی ہے، مولانا سعید احمد کو مزید تاکید لکھدوں گا، کتاب جب آئی تھی میں نے بھی اس پر چلتی ہوئی نظر ڈالی تھی، اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب لکھ کر آپ نے ایک بڑے خلا کو پُر کر دیا ہے، بکھرے ہوئے موتی یکجا ہو گئے ہیں، اور سندو ہند کے ارباب علم و حکمت کا ایک خوبصورت ہار تیار ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ گراں قدر خدمت قبول فرمائیں، آپ کے کام میں یوں بھی بڑی برکت ہے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں،

فقط والسلام، عتیق الرحمن عثمانی

(۲) ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۰ء محترم مولانا دام مجدہم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکرمت نامہ ملا۔ مضمون گرامی بھی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کر دی گئی ہے، بہرحال معذرت خواہ ہوں، انشاء اللہ جنوری کے "برہان" میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون "برہان" کے معیار پر پورا نہ

اترے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علمار کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں نمایاں ہیں، مولوی خالد سلمہ کے بھی دو مضمون آئے ہوئے ہیں، "برہان" کے صفحات ۶۴ ہیں' اور مضامین کی کثرت ہے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی، برہان آفس، جامع مسجد دہلی۔

(۳) مورخہ ۵ مارچ ۱۹۶۴ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، مضمون بھی پہونچ گیا تھا، "برہان" میں جلد شائع ہوگا، کاموں کے ہجوم میں حالت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ضروری خطوط کے جواب بھی رہ جاتے ہیں، آپ کبھی بھی اس کا خیال نہ فرمائیں، کتاب "ندوۃ المصنفین" سے ضرور شائع ہوگی، اس کو مکمل کرلیں[۱] ادارے کو اس سلسلہ میں آپ کی کیا خدمت کرنی ہوگی، اس کو صاف کرلیں[۲] رائلٹی کا یہاں کوئی سلسلہ نہیں ہے، کسی زیادہ بہتر معاوضہ کی بھی توقع نہ رکھئے، کیونکہ ادارے کے حالات ایسے ہی ہیں، پھر بھی خدمت کی جائے گی، میں سمجھتا ہوں آپ کے سامنے پوری صورتِ حال ہے، غالباً ۸ ار کو بمبئی آنا ہوگا، حج کمیٹی کی میٹنگ ہے، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام، عتیق الرحمن عثمانی،

(۴) ۱۳ جولائی ۱۹۶۴ء مخلصم و محترم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکرمت نامہ ملا۔ مجھے خیال تھا کہ اس دفعہ آپ سے اطمینان کی ملاقات نہ ہوسکی، سچ تو یہ ہے اس عرصے میں کئی دفعہ خط لکھنے کا ارادہ کیا مگر پورا نہ ہوسکا، کاموں کے ہجوم اور ماحول کی ناسازگاری کی نوعیت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں، بمبئی میں بارش کا اتنا زور تھا کہ کہیں آنا جانا مشکل ہوگیا تھا، افسوس

[۱] عہد و ہند عہد رسالت میں، [۲] کچھ نہیں۔

آپ کو زحمت ہوئی، کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آپ تشریف لائے تھے، ورنہ فون پر ہی معذرت کر لیتا۔

کتاب کا آخری باب فوراً ارسال فرمائیں اور شروع کے صفحات بھی، کتابت فوراً ہو جائے گی، کتابت کی عمدگی اور باضابطگی کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا مسودہ سامنے ہو، مسودہ کاتب کو دے دیا گیا ہے، دونوں مضمون محفوظ ہیں، ان شاء "برہان" ہی میں شائع ہوں گے، بعض مضامین کی طوالت اور تسلسل کی وجہ سے یہ دشواری پیش آرہی ہے کہ متعدد اہم مضامین دو دو سال بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مدت سے رُکے ہوئے ہیں۔ آپ کے مضمون گرانقدر ہوتے ہیں، واپس کیسے ہو سکتے ہیں، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، خان صاحب[۱] گاڑی لے آئے تو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تفریح کو چلا گیا تھا، کیونکہ چھوٹا لڑکا ساتھ تھا۔

(۵) یکم ستمبر ۱۹۶۴ء   برادرم و مخلصم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا تھا، لفافہ بھی پہونچ گیا تھا، پورا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے، کاتب پختہ قلم ہے، ان شاء اللہ کتابت مناسب رہے گی، میرا دو چار سطریں لکھنا، بس یہی ایک مرحلہ ہے، تاہم کوشش کروں گا، فہرست اور ابتدائیہ وغیرہ کے ساتھ دو صفحے مزید محفوظ رکھے گئے ہیں، کتاب کا سائز بڑا ہی رکھا گیا ہے، علمی کتابوں کے لیے چھوٹا سائز ٹھیک نہیں رہتا، حالانکہ اس میں کافی کفایت ہوتی ہے "ابن حزم" والا مضمون جلد شائع ہوگا، صدارت کا انتخاب ہو چکا ہوگا، ابھی یہاں خبر نہیں پہونچی، کتاب کے سلسلے میں کچھ خدمت آپ کی بھی ہوگی، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام،   عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی۔

---

[۱] جناب اے، اے خان صاحب، بمبئی۔

آخری مکتوب

حضرت مفتی صاحب مرحوم بہت دنوں سے چاہتے تھے کہ میں بمبئی جیسے ہنگامی اور خالص کاروباری شہر سے نکل کر ندوۃ المصنفین دہلی کے علمی ماحول میں آجاؤں، جب بھی بمبئی تشریف لے جاتے یا ملاقات ہوتی تو کسی نہ کسی انداز میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے، چونکہ حالات کے پیشِ نظر میں ان کی خواہش پوری کرنے سے معذور تھا جس کا علم حضرت مفتی صاحب مرحوم کو بھی تھا، اس لیے آخر تک ان کی یہ خواہش افسوس کہ پوری نہ ہوسکی، اور وہ دنیا سے چلے گئے۔

مسلم پرسنل لا، بورڈ کے پہلے اجلاس کے موقع پر بمبئی میں مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور حضرت مفتی صاحب دونوں حضرات نے اس موضوع پر میری موجودگی میں طویل گفتگو کی، مگر بات کسی نتیجہ تک ختم نہیں ہوئی، مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط مرحوم بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ کی جگہ بمبئی نہیں دہلی ہے، وہ اخبار الجمعیۃ سے مجھے منسلک کرنا چاہتے تھے، مگر وہ بھی حالات کے پیش نظر خواہش اور افسوس ہی کرتے رہے

گذشتہ سال مارچ میں میرے پاکستان کے سفر کے موقع پر بھی حضرت مفتی صاحب نے اپنی اسی خواہش کا اظہار فرمایا تھا مگر افسوس کہ ان کی تمنا پوری نہ ہوسکی جس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا، ویسے تو کئی حضرات اس قسم کی خوش کن باتیں کیا کرتے ہیں اور آج بھی مجھے بظاہر دعوت دیتے ہیں مگر ان کی دعوت میں وہ جان نہیں ہوتی ہے، جو ان بزرگوں کی خواہش میں ہوا کرتی تھی۔ بہرحال حضرت مفتی صاحب کا یہ آخری خط خلوص، تعلق، علمی قدردانی اور خورد نوازی کی آخری سند ہے۔

ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔
۱۴ر فروری ۱۹۸۰ء۔

محبی و محترمی جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ مکرمت نامہ ۳۰ر جنوری ۱۹۸۰ء کو مل گیا تھا۔ دو روز کے بعد میاں حسان احمد اور کبیر احمد سلمہا برائے ملاقات آئے[1] اور گرامی نامہ بھی لائے، اس وقت ان سے سرسری بات ہوئی کہ اگلے دن جمعہ کے بعد آئیں گے، مگر نہیں آئے، غالباً موقع نہیں ملا، خیال تھا کہ ان دونوں کو یک وقت چائے ناشتہ پر مدعو کروں، ہمارا آپ کا تعلق رسمی نہیں حقیقی روحانی تعلق ہے، الجھنوں میں گرفتار رہتا ہوں اور صحت بھی ٹھیک نہیں ہے، ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۹ء سے عرق النساء کے عارضہ میں مبتلا ہوا تھا، یہ تکلیف کئی مہینے تک قائم رہی۔ بہت دنوں تک تو گھر سے دفتر تک آنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ بجلی کی سکائی کا بہانہ ہوا اور اس طرح کی معذوری جاتی رہی۔

مولوی محمد ظفر احمد صاحب مرحوم قریب کی مسجد میں جہاں چڑھنا نہ پڑے اپنے ساتھ رکشہ میں لے جایا کرتے تھے، افسوس وہ بھی ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے، آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے کہ تقریباً چالیس بیالیس سال سے ادارہ سے منسلک تھے، ان کی دیانت و امانت مسلّم تھی، متعلقہ کاموں سے بھی پورا شغف تھا، میرے مزاج سے بھی پوری طرح واقف ہو گئے تھے، واقعہ یہی ہے کہ ان کا بدل مشکل ہی سے ملے گا۔[2] میری صحت اور حالات بھی اب ایسے نہیں ہیں کہ ادارہ کے جزوی اور روزمرہ کے کاموں کو دیکھ سکوں، "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" کی کتابت بھی معلوم ہوا ہے کہ آخری مرحلہ میں ہے،

---

[1] حسان احمد بن قاضی اطہر، کبیر احمد بن قاضی حیات الٰہی مرحوم برادر قاضی اطہر

[2] مولوی حکیم محمد ظفر خاں شاہجہاں پوری مرحوم دفتر ندوۃ المصنفین کے انچارج اور حضرت مفتی صاحب مرحوم کے معتمد خاص۔

چاہتا تھا کہ صحیح صورت حال معلوم ہو جائے تو آپ کو اطلاع دوں، کتاب کی کتابت منشی وجیہ اللہ صاحب رامپوری کر رہے ہیں، ان کے لڑکے سے معلوم ہوا تھا کہ عربی کے کچھ ٹکڑوں کی کتابت باقی ہے، دارالعلوم جشن صدسالہ تک سفر کے لائق ہوا تو ضرور ملاقات ہوگی۔

اپنی بے توانی پر افسوس ورنہ میری دلی خواہش یہی ہے کہ آپ جیسا صاحب کمال جس کو اب فرصت بھی ہے اور فارغ البال بھی ہے دہلی میں قیام کرکے ادارے کی خدمات انجام دے،

ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذالك امرا۔

میاں عمید الرحمٰن کی طرف سے سلام مسنون، میاں حسّان احمد اور کبیر احمد کو دعائیں، آپ کی صحت وعافیت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ عتیق الرحمٰن عثمانی۔

مکتوب نمبر: ۲۲ دسمبر ۱۹۷۶ء

محترم مولانا دام مجدہ السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ۔ مکرمت نامہ ملا مضمون گرامی بھی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کردی گئی ہے، بہرحال معذرت خواہ ہوں۔ ان شاء اللہ جنوری کے "برہان" میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون "برہان" کے معیار پر پورا نہ اُترے ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علما کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں نمایاں ہیں، مولوی خالد سلمہٗ کے بھی دو مضمون آئے ہوئے ہیں، "برہان" کے صرف ۶۴ صفحات ہیں اور مضامین کی کثرت ہے، اُمید ہے کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، برہان آفس جامع مسجد دہلی۔

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

ڈاکٹر محمد یوسف خاں، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قرآن پاک کے بارے میں ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ وہ منزل من اللہ ہے یعنی خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ جس کی تقدس و پاکیزگی کی وجہ سے قسم کھائی جاتی ہے اور جس کے بارے میں وہ ایمان رکھتے ہیں کہ اس کے ہر حکم و ہدایت کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے ورنہ وہ مومن یا مسلم کہلانے کا حقدار نہیں ..یث وفقہ کے بعض پہلوؤں کے صحت و عدم صحت پر ہم بحث کر سکتے ہیں لیکن دنیائے اسلام کا ہر شخص اور ہر فرقہ جس چیز کے ہر حرف اور نقطے پر ایمان رکھتا ہے وہ کوئی ..ر کتاب نہیں صرف قرآن ہی ہے۔

اسلام کے سخت ترین مخالف بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ جو قرآن آج ..ے سامنے موجود ہے وہ بالکل حرف بہ حرف ویسا ہی ہے جیسا آج سے چودہ سو سال قبل تھا، اس میں ایک شوشہ و نقطہ کی کمی و بیشی نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ انسانی کوشش کا نتیجہ ہوتا تو آج اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی ہوتیں مگر پھر بھی انسانی ذہن قرآن کے آسمانی ہونے کا ثبوت کیوں مانگتا ہے؟

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کچھ لوگ اسلام سے کن وجوہات کی بنا پر بے بہرہ ہیں جو اس طرح کے سوال کرنے پر مجبور ہیں۔ کچھ لوگوں کا دین اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت کے کئی اسباب ہیں ان میں سب سے بڑا اور خراب موجودہ دور میں مسلمانوں کی خستہ حالت ہے۔ مسلم حکومتیں اور قومیں بگڑ کر گمراہ ہوگئیں۔ دین کی حقیقت کے ساتھ ساتھ دنیاوی مصلحتوں کی بھی جہل عام ہوگیا، یہاں تک کہ مسلمان خود اپنے دشمنوں کے لئے ایک زبردست حجت و دلیل بن گئے جو ان کی حالت کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ اسلام کی نہ دنیا ہی بھلی نہ دین ہی بھلا، اور اسی ایک بات پہ دشمنان اسلام نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنا ہم خیال بنالیا ہے اور بہت سے مسلم نوجوانوں کو جتلادیا ہے کہ انہی لوگوں کے ہاتھوں ہی اسلامی چیز کو خواہ عقیدہ ہو یا اخلاق، قانون ہو یا معاشرہ تباہ کرکے کام ہوا ہے اور ہوتا ہے۔

رشید رضا نے ایک معتبر راوی سے سید جمال الدین افغانی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر ہم یورپ کو اپنے دین کی طرف دعوت دینا چاہیں تو ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ یورپ کو یقین دلادیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں، یورپ والے قرآن کے اندر سے ہمیں یوں دیکھتے ہیں —— یہ کہکر آپ نے اپنی ہتھیلیاں منہ کے سامنے کیں اور انگلیوں کے شگافوں سے دیکھ کر فرمایا —— وہ اس طرح قرآن کے اندر سے ہمیں دیکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے پیچھے ایسی قومیں موجود ہیں جن میں جہل، نااتفاقی، کاہلی پھیلی ہوئی ہے......... اور کہتے ہیں کہ اگر واقعی یہ کتاب اصلاح کی ہوتی تو اس کے ماننے والے اس قدر ابتر و پراگندہ ہرگز نہ ہوتے۔" [1]

۱۔ وحی محمدی از سید رشید رضا مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی ص۱۳

سید موصوف کے اس قول سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنا مذہب ہی چھوڑ دیں یہ ایک طنز ہے جو انھوں نے مسلمانوں کے اس قول سے قرآنی تعلیم چھوڑ کر اس حال پر کیا ہے۔ بلکہ مسلمانوں کو سید صاحب موصوف کے اس قول سے سبق حاصل کر کے خود کو سدھارنا چاہئے کہ ہمیں تبلیغ کی بھی ضرورت نہ پڑے بلکہ لوگ خود بخود ہماری طرف آئیں۔

قرآن فصاحت و بلاغت کا ایک بڑا سرچشمہ ہے۔ مومنوں اور کافروں پر جس کی تاثیر حد اعجاز تک پہونچ گئی۔ قرآن نے اپنی معجزانہ بلاغت سے عرب میں ذہنی و فکری انقلاب برپا کر دیا تھا حالانکہ اہل عرب خود اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت پر اس قدر نازاں تھے کہ تمام غیر عرب کو عجمی کہتے تھے۔ علماء اسلام نے قرآن کے تمام معجزوں میں اسی معجزے کو لے کر تمام بنی نوع انسان کو چیلنج کیا تھا اور چونکہ عرب و غیر عرب مبلغ قرآن کے سامنے بے بس ہو گئے تو علماء نے اس کو حضورؐ کی سب سے بڑی حجت و دلیل قرار دیا لیکن اب جبکہ اس کو کئی صدیاں بیت گئیں تو چند متفرق افراد کے سوا کوئی بھی اس حجت یا دلیل کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے اور قرآن کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتے ہیں جس میں سب سے اہم یہی مباحثہ ہے کہ کیا ثبوت ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔

علماء فرنگ کے فہم قرآنی کا دارو مدار قرآن کے ترجموں پر ہے (کیونکہ اگر انھیں عربی زبان پر کافی عبور حاصل ہے مگر پھر بھی ان کا وہ ادراک و فہم اہل زبان ہونے کی وجہ سے عربوں کی انتہا کو نہیں پہونچ سکتا) اور کوئی بھی مترجم ان معانی کے ادا کرنے سے قاصر ہے جو قرآن پاک کی اعلیٰ عبارت اور اس کے اسلوب سے خود ظاہر ہوتا ہے۔ ہر مترجم دو کوتاہیوں کا شکار

شکار ہوتا ہے: اپنی سمجھ کی کوتاہی کا اور اپنی زبان کی کوتاہی کا[1]
اس بات کا اعتراف محمد رشید رضا سے مسٹر مارماڈیوک پکتھال نے کیا جو قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اسی چیز کا اعتراف فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر ملدریس نے بھی کیا ہے جنھیں فرانس کی وزارت خارجہ اور وزارت تعلیم نے ان باسٹھ لمبی سورتوں کے ترجمہ پر مامور کیا تھا جن میں مطلب کی تکرار نہیں ہے۔ موصوف نے اپنے ترجمہ کے دیباچہ (۱۹۲۶) میں لکھا ہے:

"قرآن کا پیرایۂ بیان خود اللہ کا پیرایۂ بیان ہے وہ پیرایہ جو اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کی حقیقت کا حامل ہے ضرور خدائی پیرایہ ہی ہو سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ سب سے زیادہ شک رکھنے والے اہل قلم بھی اس پیرائے کی ساحرانہ قوت کے آگے جھک جانے پر مجبور ہو چکے ہیں"[2]

قرآن پاک، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور دین اسلام پر غیر مسلموں نے بہت سے اعتراض کئے ہیں۔ یہ اعتراضات، اتہامات اور مغالطے کہیں آیتوں کے غلط ترجمے، کہیں احادیث کا غلط مفہوم، کہیں ظلم و ستم کی فرضی داستانیں بنا کر کئے جاتے ہیں مگر حق گو اور حق پسند انسانوں سے کوئی زمانہ، کوئی ملک اور کوئی قوم خالی نہیں۔ آخر انہی کے ہم مذہبوں نے ان کے اتہامات کی تردید کر دی ہے۔

جو الزام یورپ کے متعصب پادریوں اور سرگرم وقائع نگاروں نے اسلام اور داعی اسلام پر لگائے ہیں، آج ان کی تحقیق پر پتہ چل گیا کہ یہ الزام خود ہماری روسیاہی کا باعث ہیں۔[3]

۱۔ وحی محمدی از سید رشید رضا مترجم عبدالرزاق ص ۱۶
۲۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۷
۳ ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ ص ۶۱

پنڈت دیانند کے متعلق گاندھی جی نے تحریر کیا ہے کہ :

"انھوں نے جین دھرم ، اسلام اور مسیحیت اور خود ہندو دھرم کے متعلق بہت سی غلط بیانیاں کی ہیں۔"[1]

پنڈت ستیہ کیشو پرشاد پروفیسر تاریخ گروکل کانگڑی لکھتے ہیں :

بے شک دیگر مذاہب کی تردید کرنے میں سوامی جی نے ناانصافی کی ہے اور صحیح ترجمہ و مفہوم کو بگاڑ دیا ہے۔"[2]

ایک دوسرے ہندو فاضل لکھتے ہیں :

"بانیانِ مذاہب میں سے سب سے زیادہ ناانصافی ظلم اگر کسی پر کیا گیا ہے تو بانئ اسلامؐ پر اور کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کو ایک خونخوار اور بے رحم انسان دکھلایا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کو ان سے نفرت دلائی جائے اس کا بڑا سبب یہ ہوگا کہ محمدؐ کی لائف پر تنقید کرنے والوں نے اسلامی تاریخ اور بانئ اسلام کی سیرت کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں بلکہ سنی سنائی اور بے بنیاد باتوں کو سرمایہ بنا کر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ اگر وہ اسلامی روایات کو سمجھ لیتے اور سچائی کے اظہار کے لئے اپنے اندر کوئی ہمت وجرأت پاتے تو یقیناً وہ اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے۔"[3]

۱۔ قادیان ہند صفحہ ۱۵۱۔

۲۔ رسالہ بھارت متر ۲۶ ۱۹ء م

۳۔ رسالہ مولوی ۔ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ ، رسول نمبر صفحہ ۱۴۱

بہر حال جتنے بھی اعتراضات ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں۔ جس نے کوئی اعتراض کیا تو وہ صاف تعصب کی بنا پر۔ قرآن پاک کسی انسان کی لکھی ہوئی کتاب نہیں بلکہ منزل من اللہ جو نبی علیہ السلام پر بوقت ضرورت تھوڑا تھوڑا حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ آسمان دنیا پر سے نازل ہوتا رہا۔ خدا کے ساتھ قرآن پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن مغربی تعلیم نے ہمارے ذہنوں کو محسوسات کی چہار دیواری میں اس حد تک محبوس کر دیا ہے کہ مادہ سے زیادہ کسی اور دنیا پر ایمان بمشکل لاتے ہیں اسی وجہ سے قرآن پر اہل مغرب کے اعتراضات کی بنا صرف سائنس ہی کو سمجھا جاتا ہے جو کسی حد تک صحیح ہے۔ اس لئے کیوں نہ ہم قرآن پاک کی حقیقت کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھیں۔ پو: ے قرآن کا سائنسی تجربہ کرنے کے لئے ایک طویل مدت چاہیئے۔ مگر پھر بھی مثال کے طور پر حیوانات کو لیجئے ان کی دنیا میں سب کام میکانکی طور پر ہوتا ہے۔ کھانا پانی کے بعد ان کی زندگی کے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ....

مگر انسان ان سے مختلف ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس کا دائرۂ حیات کبھی بھی صرف کھانے پینے اور سونے تک محدود نہیں رہا۔ اگرچہ ابتدا میں انسان نیم حیوان ہی تھا مگر جیسے جیسے وہ ہوش سنبھالتا رہا اس کی دلی حالت بھی بدلتی رہی۔ کیا ہے ؟ کیوں ہے ؟ کیسے ہے ؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں رہ رہ کر کلبلاتے رہے۔ بنی نوع کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسان کسی نہ کسی لاینحل مسئلہ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے اور انسان کے ان تمام سوالات کا جواب علم نے دیا اور خدا نے یہ علم انسانوں کو حیوانات سے جدا کرنے کے لئے دیا ہے مگر یہ علم صرف کسی چیز کی جانکاری کے لئے نہیں بلکہ ان کے ساتھ قوت فکر و تمیز بھی عطا کی۔ تجارب و مشاہدات

کے متعین اصولوں کی روشنی میں دنیا کی چیزوں سے کام لینا اور پھر ان کے نتائج کو آگے منتقل کرنا اسی قوت کا مرہون منت ہے۔ یہ علم الاشیاء ہم کو قرآن کے ذریعہ ہی ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ[۱]

سورج و چاند کو تمہارے لئے مسخر کر دیا جو ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

قرآن پاک نے چاند اور سورج کے بارے میں ہمیں علم عطا کیا اور خدا کی عطا کردہ یہ انسانی قوت فکر و تمیز ہے جس کے سہارے انسانی ذہن نے ایک عرصہ دراز تک اس (علم) پر غور و خوض کیا اور اس غور و فکر کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج انسان نے چاند پر قدم جما لئے ہیں۔ سائنس کچھ اور نہیں انسانی عقل و غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ ایک غیر ملکی محقق لکھتا ہے:

"سائنس کو اپنے متعلق احساس ہو گیا ہے اس لئے اب اس میں فروتنی اور انکسار بھی آگیا ہے۔ اب ہمیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے (واحد طریقہ تو ایک طرف) اب تو دنیائے سائنس کے مشاہیر اس امر پر مصر ہیں اور بڑی شدت سے مصر کہ جہاں تک ادراک حقیقت کا تعلق ہے سائنس صرف جزوی سا علم بہم پہونچا سکتی ہے"[۲]

اسی بات کو قرآن پاک نے پہلے ہی فرما دیا ہے:

۱۔ سورۂ ابراہیم آیت ۳۳۔

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ و لما یاتہم تاویلہ ط کذالک کذب الذین من قبلہم فانظر کیف کان عاقبۃ الظلمین [1]

لیکن پھر بھی کچھ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ یہ سب پہلی نظر میں تو صحیح عقل کے مطابق معلوم ہوتا ہے حالانکہ ان کا انحصار صرف جذبات پر ہوتا ہے۔ دنیا میں آجکل جتنا فتنہ و فساد برپا ہے محض اس لئے کہ ہر شخص اور ہر قوم اپنے جذبات کی تسکین اور اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کے سامنے تسکین جذبات ہی مقصد حیات ہوتا ہے وہ علم و عقل کا مالک ہونے کے باوجود فلاح و سعادت کی راہ سے محروم رہتا ہے۔ اس کا علم اور اس کی عقل اس کی صحیح رہنمائی کرنے کے بجائے اس کی تکمیل خواہشات کے ذرائع پہونچاتا ہے اسی لئے قرآن کریم نے عقل و علم کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ہی اس کی حقیقت کو بھی عیاں کیا ہے کہ جب عقل جذبات کے تابع ہو تو انسان سعادت کی راہ سے محروم ہوجاتا ہے:

أفرءیت من اتخذ الٰھہ ھواہ واضلہ اللہ علی علم وختم علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشاوۃ فمن یھدیہ من بعد اللہ افلا تذکرون ٥ [2]

۱۔ سورۂ یونس آیت ۳۹۔

۲۔ سورہ جاثیہ

اس طرح ان لوگوں کا علم جو تکمیل خواہشات کو ہی مقصد حیات سمجھتے ہیں، جذبات کی چہار دیواری میں ہی سمٹ کررہ جاتا ہے اور وہ بات کی حقیقت تک نہیں پہونچ پاتے ان کی عقل انھیں حصول مقصد میں غلط راستہ پر بھٹکا دیتی ہے۔ مگر اپنی عقلمندی کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ وہ ٹھیک راہ پر گامزن ہے اگرچہ قرآن پاک نے خود عقل انسانی کے ساتھ ساتھ ادراک و فہم کو بھی مخاطب کیا ہے۔

سائنس عقل ہی کا دوسرا نام ہے مگر اس سائنس سے ادراک و فہم کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ علم و عقل کا سہارا لے کر سائنس دانوں نے ایک چیز بنائی مگر اس کے اثرات و نتائج نہ دیکھے۔ سائنسی ایجادات کو دیکھ کر ہم بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ علم و عقل آج کل اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے مگر جب ان کے نتائج پر ہم غور کرتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ انسان نے درندگی کی آخری حدود کو بھی چھو لیا ... ایک ساعت میں [illegible] انسان خاک و خون کے جہنم میں دھکیلے جا سکتے ہیں۔ پورے کے پورے ملک اس طرح ویران و برباد کیئے جا سکتے ہیں۔ کا [illegible] [illegible] شیشا مذکورہ ا۔ ہر ملک و قوم میں سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت اپنے علم و عقل کے سرمایہ کے ساتھ اس فکر میں لگی رہتی ہے کہ کوئی ایسی نئی ایجاد ہو جائے جس سے دوسرے ملک کے انسانوں کی بربادی جلد از جلد عمل میں لائی جا سکے۔ مغربی ممالک اپنے نظام تمدن سے جس کی بنیاد عقل پر تھی [illegible] ایسے نظام کی تلاش میں ہیں جس سے لوگوں کو روحانی تسکین [illegible] کہ آج کل ان ممالک میں ہر طرف سے اپنے کلچر اور اپنی سیاست [illegible] رہی ہے اور جگہ جگہ سدھار کمیٹیاں بن رہی ہیں۔ وقت کی [illegible] انھیں لوگوں کے سامنے ہے ہر چیز کو عقل کے ترازو پر پرکھنے

ہیں۔ اس فراموش حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ تنہا عقل حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی اسی لئے صرف عقل کی بنیاد پر قائم کیا ہوا نظام کبھی بھی انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا اور انسان اس کے خلاف کبھی نہ کبھی ضرور بغاوت کرے گا۔ عقل کی بنیاد پر قائم کردہ نظام حیات میں انسان مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر جوڈ کا بیان ہے:

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقل (یعنی اخلاقی عقل) ہم کیسے سیکھیں اور موجودہ اخلاقی روحانی مرد ... کو کیسے بدلیں؟ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں سے کچھ زیادہ اس کی امید نہیں نظر آتی اور آثار بھی کچھ ایسے ہیں کہ ناامید ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ مشینی طاقت کو قابو میں رکھنا اور نئے اخلاقی تدروں کو پیدا کرنا اس دور میں مشکل ہوگیا ہے[1]"

مغربی فلاسفر پسکال لکھتا ہے:

"خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العین سے دستکش ہو جائے تو اسے برے راستے خوش آتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے، بے راہ روی ختم ہو جائے

۱۔ معارف القرآن از غلام احمد پرویز (جلد دوم) ۲۰۸ – ۲۰۹

اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں
سے محبت پیدا کریں ۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی
ہو اور نہ اخلاقی ضابطوں کی کشش وہ زندگی موت سے
بدتر ہے۔ [1]

صرف یہی دلائل نہیں بلکہ اب مغرب کے تمام مفکرین کشاں کشاں اس مقام کی طرف کھنچے آ رہے ہیں جس کی طرف قرآن نے چودہ سو سال قبل ہی رہنمائی کی تھی۔ اس طرح یہ ثابت ہے کہ قرآن پاک کی تمام باتیں حرف بحرف صحیح و درست ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے قبول نہیں کرتے مگر وہ دن دور نہیں جب ایسی ہی ذہنیت کے لوگ بھی اس حقیقت کو جھٹلانے میں عار سمجھیں گے۔ یہ قرآن پاک ہی ہے جو علم انسانی کو بلندی کی انتہا تک پہونچاتا ہے جس کے بارے میں اللہ پاک نے خود اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

قال ربنا الذی أعطیٰ کل شیءٍ خلقہ ثم
ھدیٰ [2]

پروفیسر سی۔ ایل۔ مارگن نے بھی اپنے مقالہ بعنوان "ارتقاء نفس" میں خدا تعالیٰ کی قوت تخلیق و تہدیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ [3]

اللہ پاک دوسری جگہ فرماتا ہے:

۱۔ معارف القرآن از غلام احمد پرویز (جلد دوم) ۲۰۸ — ۲۰۹

۲۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۵۰

۳۔ Creative and directive power of God

الذی خلق فسوی ہ والذی قدر فہدی ہ [1]

ایک دوسری آیت کریمہ ہے:

الذی خلقنی فہو یہدین ہ [2]

اس طرح مارگن کے الفاظ صحیح طور پر قرآن کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن علم انسانی کو کتنی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ اگر زمانۂ قدیم میں مذہبی محققین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان کی راہیں زیادہ آسان ہوتیں، انھیں ہزاروں سال غلط راستے پر نہ بھٹکنا پڑتا بلکہ ان کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھتا۔ بہرحال اسی طرح دھیرے دھیرے یہ لوگ اپنے آپ قرآن کے آسمانی ہونے کا ثبوت پا جائیں گے مگر اس کے لئے انھیں صدیوں اندھیرے میں بھٹکنا پڑے گا جیسے کہ ان کی عادت ہے کہ ایک طویل گمراہی کے بعد جو لوگ راہ راست پر آتے ہیں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ دنیائے سائنس میں اگر آج کوئی نیا قدم اٹھتا ہے تو کل کی مزید تحقیقات اسے غلط ثابت کرکے اس کی تردید کرتی ہے لیکن نبوت کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ ہر نبی کا تجربہ اور اس کا نتیجہ اساساً و اصولاً ایک ہوتا ہے ان میں کہیں کوئی اختلاف نہیں ہوتا حتی کہ زمان و مکان کی دوری بھی اس پر کچھ اثر نہیں کرتی ہے اس لئے کہ قرآن خود شہادت دیتا ہے:

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراہیم واسماعیل واسحق ویعقوب والاسباط وعیسی وایوب ویونس وھارون

۱۔ سورۃ الاعلیٰ آیت ۲-۳۔

۲۔ سورۃ الشعراء آیت ۷۸۔

وسلیمٰن واتینا داؤد زبوراً[1]

یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کرام ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہر نبی اپنے دعوے کی صداقت تسلیم کرانے کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کراتے آئے ہیں کہ اس سے پہلے جس قدر نبی گذرے ہیں وہ بھی اسی حقیقت کے بیان کرنے والے تھے۔ وحی ایک نبی کا بے نظیر تجربہ ہے۔ یہ وحی ہی ہے جس کے ذریعہ نبی ایک حد تک غیب کی باتوں کو بھی جانتا ہے اور یہ حقیقت اس پر آشکارا ہو جاتی ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ اس علم اور ادراک کی حقیقت کو پہونچکر وہ پھر انسان کی طرف لوٹ آتا ہے اور تبلیغ و نصیحت کے دفتر کھول دیتا ہے مگر جب انسان اسے نہیں سمجھ پاتا تو اس سے منکر ہو جاتا ہے۔ مضراب کی چھیڑ سے تاروں سے نکلنے والے ارتعاش سے جو والہانہ کیفیات ہمارے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اسے نہ تو ہم خود سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کو سمجھا سکتے ہیں مگر ہم اس کے وجود سے کبھی بھی انکار نہیں کرتے۔ Huxley لکھتا ہے کہ:

"لیکن اگر تم کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے تو اس کا
مطلب یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں"۔[2]

یہ بالکل غلط ہے کہ جس چیز کو ہم عقلاً نہ سمجھ سکیں اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ وحی علم و عقل کی حریف نہیں جیسا کہ چند اعتراض کرنے والوں نے کہا ہے کہ قرآن سائنس کے بالکل خلاف ہے لیکن اہل مذہب کو ان اعتراضا

۱۔ سورۃ النساء آیت ۱۶۳۔

۲۔ Religion without Revelation Julian Huxley P. 6

سے گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سائنس ادراک حقیقت کا ناقص یا جزئی طریقہ ہے جبکہ وحی کامل ومکمل اور مذہب کسی ایک شعبۂ زندگی کا نام نہیں یہ تو خالی خیال ہے نہ ہی خالی احساس وعمل بلکہ تمام عالم انسانیت کا ترجمان ہے عقل کا ایک محدود دائرہ تحقیق ہے جس کو اسے وحی سہارا ہی لینا پڑے گا جس سے اہل مغرب اور کچھ اہل مشرق بھی ابھی تک دامن چرائے ہوئے ہیں کیونکہ یہ لوگ مذہب کو علم وبصیرت کا دشمن تصور کرتے ہیں حالانکہ وہ ذرا گہری نظروں سے قرآنی آیات پر غور کریں تو وہ کبھی بھی مذہب کے متعلق ایسی غلط رائے نہ رکھتے۔ قرآن پاک کو شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو ہر صفحہ پر عقل و بصیرت کی طرف دعوت نظر آئے گی۔ قرآن کا تخاطب ہی عقل ودانش سے ہے۔ وہ حق وصداقت سے انکار کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا الزام یہی عائد کرتا ہے کہ وہ عقل وفہم سے کام نہیں لیتے۔

صم بکم عمی فھم لا یعقلون [1]

دوسری جگہ فرماتا ہے:

ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذی لا یعقلون [2]

اس طرح کی آیات ہم قرآن میں جابجا پاتے ہیں لیکن اہل مغرب کے ایک غلط تصور (قرآن علم وبصیرت کا حریف ہے) کی وجہ سے قرآن جیسی سراپا علم و بصیرت کی کتاب کو علم وعقل کے خلاف سمجھ لیا گیا ہے یہ بہت بڑا جھوٹ ہے اور

۱۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۷۱۔

۲۔ الانفال آیت ۲۲۔

قرآن جیسی پاک و مقدس کتاب پر بہتان ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن سائنسی تحقیقات کی کتاب نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد تکمیل شرف انسانیت ہے جس کی ایک ایک بات عقل و بصیرت پر مبنی ہے۔ قرآن سرتا پا علم و حقیقت ہے اس لئے وہ ضد اور انکار کرنے والوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل و برہان مانگتا ہے۔

قل هل عندكم من علم فتخرجوه لنا ان تتبعون
الا الظن و ان انتم الا تخرصون۔[1]

مگر یہ دلیل ایسی ہو جو ظنی اور قیاسی نہ ہو کہ حق و یقین پر مبنی ہو کیونکہ اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہے۔

وما لهم به من علم ان يتبعون الا الظن و ان الظن
لا يغني من الحق شيئا ٥[2]

اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بلا یقین و علم کے کسی چیز کی پیروی نہ کرو۔

ولا تقف ما ليس لك به علم ان السمع و البصر والفؤاد
كل اولئك كان عنه مسئولا ٥[3]

قرآن آیات کی کہاں تک مثال دی جائے خود قرآن پاک کے الفاظ سے ثابت ہے کہ قرآن نے علم و بصیرت پر کتنا زور دیا ہے لیکن پھر بھی یہ کہا جاتا ہے

۱۔ الانعام آیت ۱۴۸۔
۲۔ النجم آیت ۲۸۔
۳۔ بنی اسرائیل آیت ۳۶۔

بلکہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ثبوت ہیں کہ قرآن آسمانی کتاب ہے؟ آ
نے تو اس زمانے میں عقل و بصیرت کی عظمت کو دنیا کے سامنے پیش
کیا جب دنیا جہالت اور توہم پرستی کو انسانیت کے لئے مایۂ ناز سم
کرتی تھی جس کا اعتراف دنیا بھر کے دانشوروں نے کیا مگر عقل کا ایک
دائرہ ہے جہاں وہ رک جائے تو اسی کو منزل آخر قرار دیتی ہے، اس
لئے قرآن نے عقل کے ساتھ ادراک وفہم اور تمیز کو بھی ہمارے سا
زندگی کے اصول کی طرح رکھا ہے۔

(باقی)

عہد عباسی کے نامور مترجم حنین بن اسحٰق العبادی کے دستیاب طبی مخطوطات

از جناب حکیم سید محمد حسان نگرامی ، ذاکر نگر ، نئی دہلی

ابو زید حنین بن اسحٰق العبادی عرب قبیلہ بنی عباد کا فرزند تھا سنہ ۱۹۴ھ د ۸۰۹ء میں مملکت عراق کے مقام حیرہ میں پیدا ہوا[1] ستر سال تک طبیب، مترجم اور مؤلف کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ طبی کتابوں کے ترجمہ میں اس قدر بلند مقام حاصل تھا کہ عباسی حکمرانوں کے قائم کردہ دار الترجمہ بیت الحکمت کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا اور ترجمہ کے میدان میں بیش بہا کارنامے انجام دے کر رئیس المترجمین قرار دیا گیا[2]۔ اخیر عمر تک تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ جاری رہا بالآخر ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء میں اس عظیم طبیب، مترجم اور مؤلف نے جان جان آفریں کے سپرد کردی[3]۔

اگرچہ حنین، مترجم، مصنف اور مؤلف تینوں حیثیتوں سے ایک نمایاں مقام کا مالک تھا لیکن مترجم کی حیثیت سے اسے زبردست شہرت اور فوقیت حاصل

ہے۔ حنین کو بحیثیت مترجم جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فارسی، عربی، یونانی اور سریانی زبانوں میں تبحر و مہارت رکھتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی اس کی معلومات بہت گہری تھیں۔ عام طور سے اس سے قبل کے ترجمہ نگار باضابطہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی ترجمہ نگار کا لسانیاتی پہلو مستحکم ہوتا تو وہ فن کے طبی نکات سے بھرپور واقفیت نہ رکھتا اور اگر کوئی فنی نقطۂ سے مکمل ہوتا تو اس کے اظہار و ابلاغ کا لسانی پہلو پوچ ہوتا۔ اس کے برخلاف حنین بن اسحٰق نے لسانی اور فنی دونوں تعلیم پائی تھی، جن کو وہ اپنے ترجمہ میں برت کر شہرت کے آسمان پر پہونچ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف افلاطون، ارسطو اور ایٹولیس کی کتابوں کے ترجمے کئے بلکہ طبی سائنس کے تین اہم ترین مصنف بقراط، جالینوس اور دیسقوریدوس کی اکثر کتابوں کے تراجم کئے جو براہ راست طب یونانی اور طب عربی دونوں کے لئے بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اگر حنین نے ان تراجم کے ذریعہ علوم کا احیاء نہ کیا ہوتا تو مشرق میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اتنی تن دہی اور صبر حاصل طریقہ پر حصہ لیتا۔ حنین کے ساتھ ایک پورا گروہ ترجمہ کے کام میں مصروف تھا۔ المتوکل نے اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر ترجمہ کے کام پر مامور کر کے اصطفن بن بسیل، موسیٰ بن خالد اور یحییٰ بن ہارون جیسے مشہور علماء کو اس کے ساتھ کر دیا تھا، یہ علماء جب کام کر کے لاتے تو حنین ناقدانہ نظر سے تمام تفاصیل کو دیکھتا تھا۔

حنین ترجمہ اور تالیف دونوں ملا کر ۱۲۵ اہم کتابوں کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ جن میں ۶۰ ترجمے، جن میں جالینوس کی ۳۹، بقراط کی ۸، ارسطو کی ۷، افلاطون کی ۲، فلس الاجانیطی کی ۲، اریباسوس کی ۳ اور جوتس اور دیسقوریدوس کی ایک ایک کتاب شامل ہے۔

پیش نظر مضمون میں دنیا کی مختلف لائبریریوں میں دستیاب حنین بن اسحٰق کے طبی مخطوطات کی تفصیل بھی درج کی جا رہی ہے جو تصنیفی اور تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لئے بے حد ضروری ہے۔

دنیا کے مختلف کتب خانوں میں طبی مخطوطات

پیش نظر فہرست میں حنین بن اسحٰق کے ۵۰ سے زائد طبی مخطوطات، کی تفصیل درج کی جا رہی ہے۔ افسوس کہ صرف ۱۰ مخطوطات ہندوستان کی لائبریریوں میں دستیاب ہیں باقی دنیا کی مختلف لائبریریوں کی زینت ہیں ان میں سے بعض اتنے اہم ہیں جن کے مطالعہ سے بقراط اور جالینوس کی بنیادی طب کا ایک بار پھر سائنٹفک جائزہ لینے میں مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ بعض مخطوطات امراض چشم اور اخلاط کے موضوع پر ملتے ہیں جو بہر حال اخلاط کے متنازعہ بحث پر بڑی حد تک معاون ہو سکتے ہیں اور امراض چشم پر آج کی طبی دنیا اہم معلومات کا اضافہ کر سکتی ہے

۱۔ کتاب مسائل حنین : امراض چشم پر اہم ترین تصنیف ہے اس کا مخطوطہ برلین، قونیہ، میونخ، لیڈن کی لائبریری میں دستیاب ہے۔

۲۔ کتاب ترکیب العین : اس کا مخطوطہ ایتھنز، برٹش میوزیم، لیڈن اور دار الکتب مصریہ کے ذخیروں میں شامل ہے۔

۳۔ کتاب العین : اس کا مخطوطہ تیموریہ، لینن گراڈ اور دار الکتب مصریہ کے ذخیروں میں شامل ہے۔

۴۔ کلام جمعہ حنین بن اسحٰق لارسطوطالیسی : مخطوطہ دار الکتب مصریہ اور حلب کی خیاط لائبریری کی زینت ہے۔

۵۔ کتاب الاغذیہ : اس کا مخطوطہ خدا بخش پٹنہ میں دستیاب ہے۔

۶۔ رسالۃ فی تدبیر الصحۃ : اس کا مخطوطہ طہران کے سنا، اور علب کے مکتبہ حکیم کی زینت ہے۔
۷۔ کتاب الفوائد فی تنویع الفوائد : اس کا مخطوطہ آصفیہ حیدآباد اور خدابخش پٹنہ میں محفوظ ہے۔
۸۔ معانی استخرجہا حنین من کتب البقراط وجالینوس : البول: مخطوطہ طہران کے مکتبہ ملی میں دستیاب ہے۔
۹۔ کتاب الکرمہ : اس کے مخطوطات ایا صوفیہ، احمد ثالث، تیموریہ اور دارالکتب مصریہ کے ذخیرے میں شامل ہیں۔
۱۰۔ اختصار کتاب جالینوس فی الادویۃ المفردہ : احمد ثالث، سرای استانبول اور نور عثمانیہ کی لائبریری میں موجود ہے۔
۱۱۔ کتاب اختلاف الاعضاء لجالینوس : مخطوطہ استانبول میں دستیاب ہے۔
۱۲۔ کتاب ترکیب الادویۃ لجالینوس : اس کا مخطوطہ پیرس، احمد ثالث اور اسکوریال کے کتب خانوں کی زینت ہے۔
۱۳۔ اساس الطب : مخطوطات رضا رام پور، نیشنل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ اور آصفیہ حیدرآباد میں دستیاب ہیں۔
۱۴۔ کتاب الاخلاط لابقراط : بیروت کے قدیس یوسف کے ذخیرہ میں شامل ہے۔
۱۵۔ تفسیر جالینوس لکتاب الفصول البقراط فاتیکان؛ رضا رام پور، شتانیشتا پوزسکے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔
۱۶ کتاب النبض للمتعلمین : جاریت اور مجلس طہران کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۱۷۔ جوامع مقالات جالینوس فی التدابیر الملطف : اباصوفیا میں محفوظ ہے۔
۱۸۔ کتاب الاعضاء الآلمہ لجالینوس : اس کا مخطوطہ دار الکتب مصر، تیموریہ، اسکوریال میونخ اور اڈنبرہ کے ذخیرہ میں شامل ہے۔
۱۹۔ کتاب فی علامات البحران لجالینوس : استانبول کے جار اللہ کتب خانہ کی زینت ہے۔
۲۰۔ کتاب لشفاء الامراض جار اللہ : رضا رامپور، اباصوفیا اور مجلس طہران میں اس کے مخطوطات محفوظ ہیں۔
۲۱۔ کتاب ترکیب الادویۃ بحسب المواضع الآلمۃ : اس کا مخطوطہ استانبول اور احمد ثالث کی لائبریری میں دستیاب ہے۔
۲۲۔ شمار تفسیر جالینوس لکتاب البقراط فی تدبیر الامراض الحادۃ : اباصوفیا میں موجود ہے
۲۳۔ شمار کتاب البقراط فی المولودین لثمانیۃ اشہر : میونخ، پیرس اور اسکوریال کے ذخیرہ کی زینت ہے۔
۲۴۔ جوامع الاسکندرانیین الستۃ عشر لکتب جالینوس : مخطوطہ رضا رامپور اور اناضول کی مغنیسا لائبریری میں دستیاب ہے۔
۲۵۔ مقالۃ فی الدغدغۃ : اباصوفیا اور مجلس طہران کی زینت ہے
۲۶۔ کتاب ثبت الکتب التی لم یذکرھا جالینوس فی فہرست کتبہ : اباصوفیا میں دستیاب ہے۔
۲۷۔ کتاب قوی الاغذیہ : نور عثمانیہ کے ذخیرہ میں شامل ہے۔
۲۸۔ کتاب فرق الطب لجالینوس : جاریت طہران میں دستیاب ہے۔

۲۹۔ جوامع جالینوس فی اسرار النساء : مکتبہ دانشگاہ طہران کی زینت ہے

۳۰۔ کتاب تقدمۃ المعرفۃ : اس کا مخطوط پیرس، اباصوفیا، المدینہ اسکندریہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

۳۱۔ تفسیر کتاب الابیذیمیا لجالینوس : برلین، دمشق، آصفیہ کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۳۲ ابدال الادویۃ المفردۃ : مخطوطہ اباصوفیا میں محفوظ ہے۔

۳۳۔ آلات الغذاء : اس کا مخطوطہ مکتبہ ملی اور حکیم حلب کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۳۴۔ تحفۃ الاطباء و ذخیرۃ الاطباء : رباط میں محفوظ ہے۔

۳۵۔ کتاب الحمیات : حکیم حلب اور جار اللہ میں دستیاب ہے

۳۶۔ کتاب فی تدبیر المستسقین
۳۷۔ کتاب تدبیر السود اویین
۳۸۔ مقالۃ فی الاجن
۳۹۔ مقالۃ فی الحمام
۴۰۔ مقالۃ فی تولد الحصاۃ
۴۱۔ مقالۃ فی دق النفاس
۴۲۔ مقالۃ فی قرص العود
۴۳۔ مقالۃ فی قرص البنفسج
۴۴۔ کتاب فی البقول

} ان ساری کتابوں کے مخطوطات حلب کے مکتبہ حکیم کی زینت ہیں۔

۴۵۔ کتاب اصلاح الجبن : مکتبہ قاہرہ میں دستیاب ہے ۔

۴۶۔ معرفة قوة الابدان : آصفیہ اور حکیم حلب کے ذخیرہ میں شامل ہے ۔

۴۷۔ دفع مضار الابدان : آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے ۔

۴۸۔ کتاب التشریح الصغیر : حکیم سید ظل الرحمن علی گڑھ کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہے۔

۴۹۔ کتاب المزاج : یہ بھی حکیم صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں شامل ہے ۔

۵۰۔ شرق الطب : طبیہ کالج قرول باغ دہلی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ۔

مصادر

۱۔ طبقات ابن جلجل ص۶۸

۲۔ عیون الاخبار، ابن ابی اصیبعہ ص۲۶۸

۳ مختصر التاریخ الطب العربی جلد اول ص۴۲ کمال سامرائی

۴۔ عربین میڈیسن، ای جی براؤن ص۸۱

۵۔ بیت الحکمت کی طبی خدمات ــــ وسیم احمد اعظمی

۶۔ دی کیمبرج ہسٹری آف اسلام پی ایچ ہٹ ص۸۶

۷۔ ہسٹری آف پرشیا، الگڈ ص۱۰۴

۸۔ تاریخ الحکماء جمال الدین قفطی ص۲۴۶

۹۔ ہندوستان کے کتب خانوں میں غیر مطبوعہ طبی مخطوطات ص۳۵
خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۴ء

بغداد کی وجہِ تسمیہ

از جناب مقصود احمد صاحب لکچرار شعبہ عربی یونیورسٹی بڑودہ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق کوئی بات یوں ہی مشہور ہوجاتی ہے اور آگے چل کر وہ سند یا کم از کم ایک رائے کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ بعینہ یہی صورت شہر بغداد کی وجہ تسمیہ سے متعلق پیش آئی۔ حمد اللہ قزوینی نے اپنی کتاب "نزہۃ القلوب" جو ۷۴۰/۱۳۳۹ء کی تصنیف ہے میں نوشیرواں کو بغداد کا بانی قرار دیا اور اس کو اس کے باغِ داد (باغِ عدل) سے مشتق بتایا اور عام طور پر یہی مشہور ہوگیا۔ بعد کے مؤرخین نے اس خیال کی تائید کرکے اس کو مزید تقویت بخشی حتیٰ کہ علامہ شبلی جیسے بلند پایہ مؤرخ و محقق نے بھی اس کو تسلیم کرلیا چنانچہ "المامون" میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

"بغداد کی وجوہ تسمیہ میں یہ روایت غالباً زیادہ اعتبار کے قابل ہے کہ اس کے قریب نوشیرواں کا ایک باغ تھا جہاں بیٹھ کر وہ مقدمات فیصل کرتا تھا اور اسی وجہ سے وہ باغِ داد یعنی انصاف کا باغ مشہور ہوگیا۔"

(جلد دوم مطبوعہ ۱۹۵۷ ص ۱۲۴)

ان کے علاوہ سید امیر علی متوفی ۱۹۲۸ء[1] و دیگر مؤرخین بھی اس سے متفق ہو گئے

---

[1] A Short History of the Saracens، لندن ۱۹۶۱، ص ۲۵۰

مگر نہ تو نوشیرواں اس کا اصل بانی ہے اور نہ ہی اس کے تمام تہاد یا باغ داد سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بغداد نوشیرواں کے عہد سے بہت پہلے وجود میں آچکا تھا۔ مرحوم پروفیسر عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵ء ـــ ۱۹۷۲ء)، سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی کے مطابق خود فردوسی نے شاہنامہ میں اس کا ذکر کوئی چار جگہ نوشیرواں سے پہلے کے بادشاہوں کے حال میں کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پروفیسر صاحب یہ بھی دعوی کرتے ہیں، کہ فردوسی نے خود نوشیرواں کے حال میں بغداد کا نام ایک جگہ بھی نہیں لیا ہے اور نہ ہی کہیں یہ کہا ہے کہ نوشیرواں کسی باغ میں بیٹھ کر دادرسی کیا کرتا تھا۔ فردوسی کے علاوہ مؤرخین میں سے بھی کسی نے نوشیرواں کے حال میں کہیں بغداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

پروفیسر عبدالستار صدیقی کے مطابق "بغداد" باغ اور داد بمعنی باغ عدل سے نہیں بلکہ بغ بمعنی بت یا دیوتا اور داد بمعنی عطیہ سے مشتق ہے اور سنسکرت کے الفاظ "بھگوان" اور "بھگوت" وغیرہ کا پہلا جزء "بھگ" اور یہ "بغ" ایک ہی لفظ ہے[1]۔ موصوف کی تحقیق کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) "بغداد" بغ اور داد (بت کا عطیہ) سے مشتق ہے۔ عبدالعزیز داد، الاصمعی، ابن قتیبہ، ابوعبداللہ محمد بن احمد الخوارزمی، الجوالیقی، یاقوت الحموی کے علاوہ فارسی لغویوں نے بھی بغ کے معنی بت بتائے ہیں۔ بغ کی صورت اوستا میں بغ اور بگ اور میخی کتبوں میں بغ ہے۔ ایران میں لفظ بغ زردشتی مذہب سے پہلے موجود تھا اور اس زمانہ سے تعلق رکھتا تھا جب وہاں بت کی پرستش کی جاتی تھی[2]

---

[1] دیکھئے مقالات صدیقی حصۂ اول، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۲۳ ـ ۱۲۷

[2] ایضاً صفحات ۱۳۶ ـ ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۴۔

(۲) بغداد کا نام زردشت کے زمانے سے پہلے کا ہے یعنی نوشیروان سے گیارہ بارہ سو برس پہلے کا۔[1]

(۳) فردوسی نے اس کا ذکر کیخسرو، فریدون اور اردشیر بابکان کے حال میں کیا ہے جو نوشیروان سے پہلے بادشاہ ہوئے ہیں۔[2]

(۴) نوشیروان کے حال میں فردوسی نے اس کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشیروان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔[3]

(۵) پہلوی اور سریانی ماخذوں میں بھی اس بات کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے کہ نوشیروان اپنے کسی باغ میں ہفتے کے ایک دن بیٹھ کر مظلوموں کی داد رسی کیا کرتا تھا۔ اول تو یہی مشتبہ ہے کہ وہ ہفتے میں ایک دن ایک باغ میں بیٹھ کر داد رسی کیا کرتا تھا اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو وہ ایسا اپنی دار الحکومت مدائن (طیسفون) میں کرتا ہوگا۔[4]

(۶) یہ بات عقل سے دور اور بہت دور ہے کہ دار السلطنت مدائن کے آرام دہ محلوں کو چھوڑ کر وہ ہر ہفتے بغداد جاتا جو مدائن سے کوئی پچیس میل کی دوری پر واقع تھا۔ خود بھی اتنی مشقت اٹھاتا اور عدل خواہ مظلوموں اور مجبوروں کو بھی مصیبت میں ڈالتا۔ اس کے ڈر سے شاید بہت سے مظلوم نوشیروان کے عدل سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہوں۔[5]

---

[1] دیکھئے مقالات صدیقی حصۂ اول، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء [illegible]۔
[2] ایضاً صفحات ۱۲۵ — ۱۲۶۔
[3] ایضاً ص ۱۲۷۔
[4] ایضاً صفحات ۱۲۹ — ۱۳۰۔
[5] ایضاً صفحات ۱۳۰ — ۱۳۱

مندرجہ بالا دلائل و شواہد کی روشنی میں بغداد کو نوشیرواں کے نام نہاد باغ داد کے مقابلے میں بغ اور داد (دیت یا دیوتا کا عطیہ) سے مشتق ماننا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کا سوال ہے کہ اس کا نام بغداد کیونکر پڑا تو اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا انتہائی مشکل ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ خطۂ زمین بغ نامی دیوتا کے کسی پجاری کو کسی بادشاہ سے بطور عطیہ ملا ہوگا اور اس پجاری نے ازراہ امتنان و تشکر اس کا نام اپنے دیوتا کے نام پر "بغداد" رکھ دیا ہوگا اور بعد میں یہ اسی نام سے مشہور ہوگیا۔

حوالہ کتب

۱۔ علامہ شبلی نعمانی، المامون، جلد دوم، اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء۔

۲۔ سید امیر علی، A Short History of the Saracens، مطبوعہ لندن، ۱۹۶۱ء۔

۳۔ عبدالستار صدیقی، مقالات صدیقی، حصہ اول، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

الواح الصنادید

پروفیسر محمد اسلم، شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری نے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس قائم کیا تھا جسے اکابر دیوبند کی سرپرستی حاصل تھی۔ آزادی کے بعد مولانا خیر محمد صاحب ملتان تشریف لے آئے اور یہاں انھوں نے از سرِ نو خیر المدارس کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے کا شمار ملتان کے اچھے مدارس میں ہوتا ہے۔ موصوف وفات کے بعد اپنے مدرسے ہی میں دفن ہوئے۔ ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مرقد مبارک

اُستاد العلماء مولانا خیر محمد جالندھری نور اللہ مرقدہٗ

بانی مدرسہ عربی خیر المدارس

خلیفۂ اجل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ وفات

۲۰ شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء

بروز پنجشنبہ بوقت چاشت در مدرسہ خیر المدارس

مادۂ تاریخ
تنقل خیر

آقا بیدار بخت کا شمار نامور ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے علوم شرقیہ کی بڑی خدمت کی ہے اور ہزاروں انسانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر کے ان کا مستقبل بنایا ہے۔ ان کا مزار گلبرگ کے قبرستان میں ریلوے لائن کے قریب ہے۔ آقا بیدار بخت کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آقا بیدار بخت

ماہر تعلیم، شاعر و ادیب، دانشور

بانیٔ دار العلوم السنۃ الشرقیہ لاہور

تاریخ پیدائش ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء

تاریخ وفات ۳۰ر اپریل ۱۹۸۱ء

میرے اللہ نے بھیجا مجھے پیغامِ قضا
نالۂ شب کا فلک بوس اثر ہو کے رہا
شان و شوکت سے گریزاں تھا ہمیشہ بیدار
آخر کار وہ خود خاک بسر ہو کے رہا

آقا بیدار بخت کی قبر سے تھوڑے ہی فاصلے پر جانب شمال مغرب، جناب جسٹس ایس اے رحمٰن کی آخری آرامگاہ سے جانب جنوب اندازاً ۳۰ میٹر کے فاصلے پر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور مشہور انگریزی داں پروفیسر سراج الدین کی قبر ہے جس کے لوح

مزار پر یہ مختصر سی عبارت کندہ ہے :

سید نصیر سراج الدین

ولد

میاں معراج الدین

پیدائش　　۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء

وفات　　۲۸ر اگست ۱۹۸۶ء

مولانا سید حامد میاںؒ کا انتقال ۳ر مارچ ۱۹۸۸ء کو ہوا۔ موصوف مشہور عالم دین اور مؤرخ سید محمد میاں صاحب "علماء ہند کا شاندار ماضی" کے فرزند اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفۂ راشد تھے۔ ان کی قبر پر لوہے کا ایک بورڈ لگایا گیا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے :

آخری آرام گاہ

شیخ طریقت شیخ الحدیث

حضرت اقدس

مولانا سید حامد میاں صاحب نوراللہ مرقدہ

بانی جامعہ مدنیہ لاہور

میاں صاحب کے مزار منور سے سات میٹر جانب جنوب مشہور شاعر سلامت جالندھری کی قبر ہے۔ راقم نے انھیں دیکھا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :

یا اللہ　　یا محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شاعر ملت

الحاج سید سلامت علی شاہ سلامت جالندھری

مصنف تصویر انقلاب و درس حیات

تاریخ وفات ۲۷ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ

۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء

دل کے شیشے کو ذرا چشم بصیرت سے تو دیکھ
ریزۂ خاک میں پوشیدہ ہیں لاکھوں گوہر

سلامت جالندھری

میں گزشتہ کئی برسوں سے نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے فرزند قطب صاحب کی قبر کی تلاش میں تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جج مرزا غلام محمد کے ساتھ ان کی قرابت داری ہے۔ میں نے ایک بار مرزا صاحب سے ان کی قبر کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ گاہے گاہے ان کی قبر پہ جاتے رہتے ہیں لیکن محل وقوع کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ اتنے بڑے قبرستان میں ان کی قبر تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ دو تین روز ہوئے میں اپنے ایک استاد کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تو مجھے اچانک ہی تکیہ کمہاراں میں قطب صاحب کی قبر مل گئی۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

یا اللہ — یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یا علیؓ

مرقد

مرزا غلام قطب الدین ابن سائل

تاریخ وفات ۲۸ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ
مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء

نواب سراج الدین احمد خاں سائل کا انتقال ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو دہلی میں ہوا اور وہ قطب صاحب کی درگاہ میں اپنی خاندانی احاطہ میں دفن ہوئے۔ ان کی اہلیہ لاڈلی بیگم آزادی کے بعد پاکستان آگئیں۔ قطب صاحب ان کے فرزند تھے۔ داغ دہلوی کی صلبی اولاد میں ایک بیٹا احمد نامی تھا جو ان کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ احمد کی وفات کے بعد داغ نے اپنی سالی کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا تھا۔ ان کا عقد سائل سے ہوا۔ سائل کو داغ کی دامادی پر بڑا فخر تھا اور ان کے متعدد اشعار میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ لاڈلی بیگم اپنے فرزند قطب صاحب کی قبر کے سرہانے دفن ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے

۷۸۶

لاڈلی بیگم

دختر

نواب مرزا خاں داغ

زوجہ

مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

تاریخ وفات

۲۵ ستمبر ۱۹۶۳ء

بقیہ طبی مخطوطات

۱۰۔ فہرس مخطوطات الطب الاسلامی فی مکتبات ترکیا
دکتور اکمل الدین احسان اوغلی ۱۹۸۴ء

۱۱۔ علی گڑھ کے ذخیروں میں محفوظ غیر مطبوعہ طبی مخطوطات
حکیم سید ظل الرحمٰن صدر شعبہ علم الادویہ حکیم اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ

برہان

جلد ۱۰۲ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۸ء شمارہ ۳

عمیدالرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق اراکان کے ہمراہ کئی اعلیٰ فوجی
اگست کو بہاولپور کے قریب ایک فضائی حادثہ کا شکار ہو کر جاں بحق ہو گئے۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہاولپور سے اڑنے کے بعد ہی طیارہ میں زبردست دھماکہ ہوا اور سی ۱۳۰
طیارہ آناً فاناً ٹوٹ کر بکھر گیا۔ طیارہ کے تمام مسافر، امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافل، پاکستان
کے سربراہ جناب جنرل محمد ضیاء، پاکستان کے دو لفٹننٹ جنرل، تین میجر جنرل، پانچ بریگیڈیئر
ایک کرنل، ایک اسکواڈرن لیڈر سمیت ۱۳۷ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

حادثہ کی وجوہات کیا ہیں؟ ابھی اس پر تحقیقات جاری ہے اور اس سلسلے میں ا
نے پاکستان کے ساتھ ہر ممکن تعاون اور سی آئی اے کے ذریعہ تحقیقات میں مدد دی
کی پیش کش کی ہے۔

اس بھیانک حادثہ اور بین الاقوامی سازش کے پیچھے کون ذمہ دار ہے، لیکن حقیقت
ہے کہ صدر ضیاء الحق اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم ۱۲ اگست ۱۹۲۳ء میں پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں
ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دہرہ دون کے دون اسکول میں ابتدائی تعلیم
کے بعد سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخلہ لیا جہاں قبلہ جناب پروفیسر مولانا سعید احمد
اکبرآبادی مرحوم سابق مدیر "برہان" سے بھی مرحوم صدر کو استفادہ کا موقع ملا او
اس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل ضیاء، حضرت اکبرآبادی سے تمام زندگی بے حد
متاثر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں دہرہ دون کی انڈین ملٹری اکیڈمی سے فراغت کے بعد
فوج میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء تک وہ ایک جونیئر افسر تھے جنرل ٹکا خان ن

[illegible] صدر بھٹو نے ان کو جنرل بنا دیا۔ ۱۹۷۶ء میں جنرل ضیاء بھٹو کا تختہ [illegible] پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد چیف [illegible] کے طور پر کام کرتے رہے۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں مرحوم باضابطہ پاکستان کے صدر بنے۔ [illegible] میں مرحوم نے ریفرنڈم کرایا جس کا نتیجہ ان کے حق میں نکلا جس کے بعد انھوں نے پھر ملک کے منتخب سربراہ کی حیثیت سے صدر کے عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس دوران انھوں نے جو بھی اقدامات اٹھائے وہ اپنے ذہن و فکر کے اعتبار سے پاکستانی عوام کی فلاح و بہبودی کے لئے اٹھائے۔ بلاشرکت غیرے پاکستان کے سب سے بڑے اور ذمہ دار عہدے پر فائز رہ کر انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے سیاست داں، ہوش مند قائد اور مدبر و منتظم بھی ہیں جنھوں نے اپنی انفرادیت، خودی اور تشخص کو ہر حال میں قائم رکھا، اور جس کا اعتراف آج مرحوم کی وفات کے بعد ملکی، بین الاقوامی اور عالمی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

مرحوم کی شہادت کی وجوہات سے قطع نظر جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت اور عظمت کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بلاشبہ صدر پاکستان مرحوم برصغیر کی حالیہ سیاسی تاریخ کی اہم ترین شخصیات میں سے تھے۔ پاکستان اور پڑوسی ممالک کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام کے لئے ان کی موت ایسا دردناک سانحہ ہے جس کے اثرات طویل مدت تک محسوس کئے جائیں گے۔

یہ بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے کہ ان کی موت کا حادثہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اتنا ہی اہم موڑ ثابت ہوگا جتنا کہ گیارہ سال پیشتر ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔ اندرونی و بیرونی مخالفت و مزاحمت اور پاکستان میں متحارب قوتوں کی اقتدار کے لئے رسہ کشی اور سازشوں کے باوجود مرحوم صدر ایک طویل عرصے تک بڑی شان اور وقار کے ساتھ برسر اقتدار رہے، اور آپ نے معاشی، انتظامی اور سیاسی اعتبار سے پاکستان کے استحکام کے لئے زبردست

[illegible] کیں اور اسے بین الاقوامی برادری میں ایک [illegible]
صدر ضیاء نے پڑوسی ممالک خاص طور پر ہندوستان کے ساتھ [illegible]
خیر سگالی کے تعلقات رفتہ رفتہ معمول پر لانے کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا سے
تعلقات اور روابط میں بھی صدر مرحوم نے مناسب، موزوں اور متوازن حکمت عملی
(STRATEGY) اپنائی تھی

وہ اگرچہ بعض توسیع پسند اور طاقت ور ملکوں کے لئے ہمیشہ ان کی راہ میں ایک رکاوٹ رہے۔ ان ممالک کی اندرونی سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود کامیابی اور استقلال کے ساتھ ملکی نظم و نسق سنبھالتے رہے۔ پاکستان کی تاریخ میں اتنا طویل دور حکومت کسی اور حکمران کو نصیب نہیں ہوا۔ اقتدار کی اس طویل مدت میں ان کے کٹر سے کٹر سیاسی مخالفین بھی ان کی دیانت و امانت یا ذاتی نوعیت کے کسی معاملہ میں ان کا نام کبھی ملوث نہیں کر سکے۔ اپنے قریب ترین عزیزو اقارب اور دوستوں کو بے جا مراعات یا مالی منفعت پہونچائی ہو۔ جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہونے والے اس پیشہ ور سپاہی اور مجاہد کے لئے "پاکستان جغرافیائی وطن نہیں بن سکتا تھا پاکستان مرحوم کے لئے ایک نظریاتی وطن تھا" مرحوم ضیاء کی ذاتی زندگی میں اخلاص اور پاکیزگی اور عوامی زندگی میں فرض شناسی اور دیانت داری کا اعتراف دوست دشمن سب کو رہا۔ یہ اسی "آئیڈیل ازم" کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کو ایک تاریخی وراثت، ایک نظریہ، ایک فلاحی ریاست اور مثالی مملکت اور نظریات کی بنیاد پر قبول کیا جانے والا وطن سمجھتے تھے۔

جنرل ضیاء مرحوم کے گیارہ سال پر محیط دور اقتدار کا تجزیہ فی الوقت ممکن نہیں ہے۔ مرحوم نے ملک کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں جو مثبت، تعمیری اصلاحات کیں، ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔
اسلام کو بحیثیت ایک نظام (SISTAM) اور پاکستان میں اسلامی شریعت

پاکستان کو ایک مسلم اور اسلامی ملک بنانے میں جنرل ضیاء الحق ذاتی طور پر بڑے مخلص تھے اور بڑی سرگرمی سے کوشاں تھے اور اس تعلق سے وہاں جو کچھ بہتری نظر آرہی ہے وہ مرحوم کی کوششوں اور خواہش ہی کا نتیجہ ہے۔ نئی حکومت "اسلامی شریعت کے نفاذ" کے تعلق سے کیا رویہ اپناتی ہے ابھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ صدر مرحوم کی ہلاکت کے پیش نظر فی الحال پورے ملک میں ایمرجنسی نافذ کی گئی ہے اور عام لوگوں کے بنیادی حقوق معطل اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

اسی طرح مسلم ممالک سے روابط اور تعلقات میں صدر ضیاء کے دور میں قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔ مسلم سربراہ کانفرنس میں صدر مرحوم نے خصوصی مقام حاصل کیا۔ وہ امن کمیٹی کے چیئرمین (Chairman) تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ مصر کو دوبارہ کانفرنس کا رکن بنانے کا ذریعہ بنے اور اس سے تعلقات استوار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کے سکریٹری جنرل کے عہدے پر پاکستان کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ پاکستان غیر جانبدار تحریک کا رکن بنا۔ افغانستان کے مسئلہ کا باوقار اور پر امن حل اور افغانستان سے روسی افواج کے انخلاء کے معاملہ میں بین الاقوامی اصولوں کی پاسداری اور جرأت مندانہ موقف نے صدر مرحوم کو ایک یادگار اور بلند وقار عطا کیا۔ پاکستان نے ۳۰ لاکھ افغان مہاجرین کو پناہ دے کر اور ان کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کر کے جو عظیم انسانی کارنامہ انجام دیا ہے اسے دنیا بھر میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اقوام متحدہ میں اس کی پیش کردہ قرار داد پر ۱۲۳ ممالک نے حمایت میں ووٹ ڈالے جو مسلم اور غیر مسلم دنیا اور متعدد اشتراکی ممالک کی جانب سے اظہار اعتماد کا ایک شاندار اور قابل فخر ریکارڈ ہے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج کا پاکستان دنیا کی نظروں میں کل کے پاکستان سے بہت بلند مقام پر فائز ہے۔

پاکستان کے سیاسی افق سے صدر ضیاء کے اچانک غائب ہو جانے سے پاکستان کے سامنے کئی اہم سوالات اٹھ گئے ہیں اور فی الحقیقت پاکستان مسائل اور آزمائشوں سے دوچار ہو گیا ہے۔ صدر ضیاء کی ہلاکت سے طاقتوں کا ہر توازن انتشار کا شکار ہوا ہے۔ سیاست کی وہ ساری بساط الٹ گئی ہے

[illegible] مشرق [illegible] سیاست کی ایک [illegible]
[illegible] ایک سیاست [illegible]
[illegible] دنیا میں سیاست کا رخ بدل سکتا ہے [illegible]
[illegible] تعلقات بڑے وسیع [illegible] کی سیاست [illegible]
[illegible] ......

بہرحال مرحوم کی المناک فضائی حادثے میں شہادت سے ایک ایسے صدر کا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے مستقبل کا مورخ کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چونکہ صدر مرحوم ایک مسلمان [illegible] رب کریم کے حضور پہنچے ہیں اور شریعت اسلامی کے اعتبار سے ایک مسلمان جب کسی ناگہانی حادثہ کا شکار ہو کر مرتا ہے تو اس کو "شہادت حکمی" کا عظیم مرتبہ ملتا ہے۔ اس معنی کر صدر ضیاء کی موت ایک شہید کی موت ہے [illegible] محشر میں شہید سے کوئی پوچھ گچھ نہیں۔ بارگاہ خداوندی میں ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم اور ان کے رفقاء کو اعلیٰ علیین میں جگہ دیں ان کے درجات بلند فرمائیں، اپنے دیدار سے نوازیں۔ اور سوگوار خاندان، ہم سب کو اور پاکستانی عوام کو اس حادثہ جانکاہ کو برداشت کرنے کی توفیق وہمت دیں۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ پاکستان کے موجودہ حاکموں کو پورے عزم اور یکجہتی کے ساتھ حالات میں سدھار لانے کی توفیق دے اور پاکستانی قیادت اور باشعور عوام جلد از جلد اس خلا کو پر کر سکیں جو صدر مرحوم کے اٹھ جانے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ دراصل ایک متحد، مضبوط، پائدار اور اندرونی اعتبار سے مستحکم پاکستان سے ہی ہندوستان اور برصغیر کے لوگوں کا وسیع تر مفاد وابستہ ہے!!!

اے مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پہلی بار میں نے مفتی صاحب کو ۱۹۵۲ء میں دیکھا۔ اُن دنوں میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ ہمارے استاد ڈاکٹر حمید الدین مرحوم مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ کے تلمیذ الرشید تھے۔ انھوں نے سینٹ اسٹیفنس کالج میں اُن سے فارسی پڑھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب لاہور سے طلبہ کے ایک گروپ کو بھارت کے تاریخی مقامات دکھانے کے لئے لائے تھے۔ دہلی میں ہمارے قیام کا مسئلہ تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ شاید ندوۃ المصنفین میں قیام کا خاطر خواہ انتظام ہو جائے۔ میں ڈاکٹر حمید الدین کے ساتھ مفتی صاحب کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا۔ اس وقت تک میں ان کے نام اور مقام سے نا واقف تھا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ اتنے بڑے گروپ کے لئے دفتر برہان میں قیام کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ جامع مسجد کے علاقے میں ہنوز ناز، تاج اور وکیل نام کے ہوٹل تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ مفتی صاحب ہمیں لے کر کوچۂ رحمان پہنچے۔ وہاں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے ملے۔ انھوں نے ہمیں بلیماران میں [illegible] ہوٹل میں، جو نواب لوہارو کی حویلی میں قائم ہوا تھا، ہمارے قیام کا انتظام کرا دیا۔ اب یہ ہوٹل ختم ہو چکا ہے اور وہاں غالباً کوئی سکول

کیا گیا ہے۔

۱۹۵۱ء میں کلکتہ میں میری ملاقات مولانا سعید احمد اکبر آبادی ؒ سے ہوئی اور خط کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ "برہان" پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں آتا تھا۔ میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ ۱۹۵۹ء کے موسم بہار میں انگلستان چلا گیا۔ وہاں سے چندہ بھیجنا آسان تھا اس لئے میں برہان کا باقاعدہ خریدار ہوگیا۔ انگلستان کے قیام کے آخری زمانہ میں ریحانہ کے ساتھ میری نسبت طے پاگئی۔ نہ ہی مولانا اکبر آبادی مرحوم نے میرے والدین کو دیکھا تھا اور نہ ہی میرے والدین ان سے متعارف تھے۔ مولانا نے میرے توسط سے والد مرحوم کو خط لکھا، والد صاحب نے ہاں کر دی، یوں نسبت طے پاگئی۔ میں فروری ۱۹۶۷ء میں نو سال بعد وطن واپس آیا۔ مارچ کے اوائل میں والد مرحوم نے فرمایا کہ علی گڑھ چلے جاؤ اور نکاح کر کے ریحانہ کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ میں لاہور سے کراچی گیا اور وہاں سے ۶ مارچ کو جرمنی کی ایئرلائن لفتھانزا میں سیٹ ریزرو کروائی اور ڈیڑھ گھنٹے میں دہلی پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ سے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سوا پانچ بجے جنتا ایکسپریس ملے گی اس سے پہلے علی گڑھ جانے کے لئے کوئی ٹرین نہیں ہے۔ میں نے سامان کلوک روم میں جمع کروایا اور چاندنی چوک اور دریبہ سے گزرتا ہوا جامع مسجد پہنچ گیا۔ اردو بازار میں ان دنوں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ میں کٹرہ نظام الملک میں داخل ہوا۔ ندوۃ المصنفین کے دروازے پر چق پڑی تھی۔ اس لئے میں اندر جانے سے ہچکچایا۔ میں دروازے پر کھڑا تھا کہ کسی راہگیر نے کہا "اندر چلے جائیے، یہاں مردانہ ہے۔" میں چق اٹھا کر اندر داخل ہوا، مفتی صاحب حسب معمول اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی اس لئے ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں

[illegible] کے برابر تھیں ان کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی اور میں چپکے سے [illegible]

[illegible] کے بعد میں اور ریحانہ علی گڑھ سے دہلی آئے۔ ریحانہ کا پاسپورٹ بنوانا تھا اور پھر پاکستان جانے کے لئے ویزا بھی حاصل کرنا تھا۔ مولانا اکبرآبادی مرحوم نے مفتی صاحب کو پیغام بھجوایا کہ انھیں کسی ہوٹل میں ٹھہرا دیں، مگر میرے خیال میں ہمارے دہلی پہنچنے سے پہلے مفتی صاحب نے جامع مسجد کے قریب تاز ہوٹل میں ہمارے قیام کا بندوبست کر دیا۔ ہمیں جو کمرہ ملا اس کی بالکنی جامع مسجد کے سامنے پر تھی۔ مفتی ضیاء الحق صاحب نے اپنے گھر سے کئی چیزیں پہنچا دیں تاکہ ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ جناب محمد احمد شمس مرحوم دن میں دو تین بار اپنی بچی سلمیٰ کو ساتھ لے کر ہماری خیریت معلوم کرنے آتے۔ پانچ روز میں پاسپورٹ اور ویزا مل گئے۔ جب میں ہوٹل چھوڑنے سے پہلے کاؤنٹر پر بل ادا کرنے گیا تو منیجر صاحب نے بتایا کہ میرا بل ادا ہو چکا ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میرا بل کس کرم فرما نے ادا کیا ہے؟ منیجر صاحب سے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے کہا، "بس آپ جائیے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ ہوٹل کے مالک محمد حسین نے مفتی صاحب کے مہمان سمجھ کر بل لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب مفتی صاحب نے ان سے کہا کہ اگر کمرے کا کرایہ نہیں لیتے تو جو کچھ انھوں نے کھایا پیا ہے اس کا بل تو لے لیں۔ محمد حسین صاحب نے جواب دیا، "مفتی صاحب میں بل لے کر آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" یہ تھا مفتی صاحب کا احترام دہلی میں۔

میرے پاس چند پوسٹل آرڈرز تھے۔ میں انھیں بھنانے کی غرض سے جی پی او لے گیا۔ متعلقہ کلرک نے کہا کہ انھیں کراس ہونا چاہیے تھا اور اس پر کیش کروانے والے کا نام بھی لکھا ہونا چاہیے تھا۔ میں وہاں سے مایوس ہو کر جامع مسجد کے ڈاک خانے گیا۔

[illegible] جانے سے پہلے [illegible]
[illegible] کرکے کہا ہم آپ کو نہیں جانتے۔ کسی ایسے شخص کو ساتھ لائیے [illegible]
[illegible] سکے۔ میں نے کہا [illegible]
[illegible] اور آپ کو کہہ سکے۔ اس پر وہ کہنے لگا آپ [illegible]
نے کہا دفتر برہان میں۔ کلرک نے کہا کہ ان کے پیچھے مفتی صاحب سے تصدیق کرا[ئیے]
کہ آپ ہی اسلم ہیں۔ ہم ان کے دستخط پہچانتے ہیں۔ میں دفتر برہان آیا۔ مفتی صا[حب]
نے تصدیق فرمائی اور وہ پوسٹل آرڈر لے کر دیا۔ ڈاکخانے پہنچا۔ کلرک
مفتی صاحب کے دستخط دیکھ کر پوسٹل آرڈر کیش کر دیئے۔

۱۱ر مارچ کو میرا نکاح اتنی عجلت میں ہوا کہ مفتی صاحب اس میں شریک نہ ہو[سکے]
۱۸ر مارچ کو میں اور ریحانہ پاسپورٹ اور ویزا لے کر علی گڑھ پہنچے۔ ۱۹ر مارچ کو مو[لانا]
اکبر آبادی مرحوم نے استقبالیہ دیا۔ دہلی سے مفتی ضیاء الحق، اور مفتی صاحب تشری[ف]
لائے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے جن کا نام اب یاد نہیں رہا۔ اس تقریب [میں]
مفتی صاحب توجہ کا مرکز بنے رہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، آل احمد سرور، مولانا [...]
امینی، قاضی مظہر الدین بلگرامی، نواب احمد سعید چھتاری، نواب حبیب الرحمٰن خاں شرو[انی]
ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر عبدالعلیم اور علی گڑھ کے بہت سے اساتذہ اس تقریب میں [شریک]
ہوئے۔ مفتی صاحب کے ان سب کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے۔ مفتی صاحب تقریب [کے]
اختتام پر علی گڑھ میں رکے نہیں اور مفتی ضیاء الحق کی کار میں واپس لوٹ گئے۔ بعد میں [...]
نے بتایا کہ رات کو دس بجے کے قریب کار خراب ہو گئی۔ وہ علاقہ غیر محفوظ تھا۔ وہاں [...]
کی آبادی ہے جو چوری چکاری اور لوٹ مار کے لئے بدنام ہیں۔ اس لئے جب تک کار درست
نہیں ہو گئی، خوف و ہراس طاری رہا۔ جب مفتی صاحب سے میری بے تکلفی ہو گئی تو ا[یک]
روز فرمانے لگے، "میاں! تمہارے ساتھ ریحانہ کے نکاح کے متعلق مولوی صاحب

[illegible] کیا تھا اور یہ پوچھا ہے پر انھوں نے تمہارے والد کو خط لکھا
اور [illegible] صاحب کی وفات نہیں ہوئی۔ جب مفتی صاحب پاکستان
میں [illegible] انتقال ہو چکا تھا لیکن مولانا اکبر آبادی رحمہ کے خط کے جواب میں
[illegible] فرمایا تھا [illegible] مرحوم نے مفتی صاحب کو دکھایا تھا۔ صرف اسی خط
[illegible] صاحب تا حیات مولانا مرحوم کی ظرافت اور طبیعت کے معترف رہے۔

[illegible] میں بھارت کا دورہ ختم کر کے لاہور جا رہا تھا۔ اس زمانے میں [illegible]
[illegible] کا [illegible] تھا۔ ریحانہ اور [illegible] جس کی عمر اس وقت نو ماہ تھی۔ میرے ساتھ تھے۔
مفتی ضیاء الحق صاحب نے [illegible] کے ساتھ شام کو کھانے پر بلایا۔ میں نے عرض کیا کہ نو بجے
جناب میل [illegible] دہلی سے روانہ ہوتی ہے اس لئے آپ کھانا وانا نہ کھلائیے کیونکہ مجھے ہر صورت
میں ساڑھے آٹھ بجے تک اسٹیشن پہنچ جانا چاہئے۔ مفتی ضیاء الحق بھلا کب ماننے والے تھے۔
انھوں نے مفتی صاحب کو بھی مدعو کر لیا۔ کھانے کے بعد مفتی ضیاء الحق صاحب نے اپنی
کار میں ہمیں بٹھایا اور ندوۃ المصنفین لے آئے۔ جلدی جلدی کار میں سامان رکھا اور نئی دہلی
ریلوے اسٹیشن جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ اجمیری گیٹ کے قریب پہنچ کر کار خراب ہو گئی۔
مفتی ضیاء الحق کار درست کرنے لگے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے میں ۲۰ منٹ تھے۔
میں نے عرض کیا کہ آپ اجازت دیں تو ہم ٹیکسی میں سوار ہو جائیں۔ موصوف بضد تھے کہ
بس ابھی انجن درست ہو جاتا ہے۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ میں نے اگلے روز لازمی
طور پر سرحد عبور کرنا تھی۔ اگر ٹرین چھوٹ جاتی تو میں مشکل میں پھنس جاتا۔ مفتی صاحب
بضد تھے کہ بس ابھی انجن درست ہو جائے گا۔ خدا خدا کر کے گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔
ہم پانچ منٹ کم نو بجے اسٹیشن پر پہنچے۔ سامان قلیوں نے اٹھایا اور میں ان کے
پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ریحانہ نے بھی چھوٹی موٹی چیزیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ مفتی صاحب
نے [illegible] کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ مفتی ضیاء الحق پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے چلے گئے۔

[illegible] کے قریب پہنچ [illegible] ریحانہ جلدی جلدی ٹرین میں سوار ہوئی۔ مفتی صاحب نے [illegible] نے ساتھ رکھا اور [illegible] میں جا اتری۔

اس وقت مفتی صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ ذفر کو گود میں اٹھا کر بیٹھے [illegible] تھے جیسے چلے جا رہے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ بھاگ رہے ہیں۔

[illegible] سال بعد مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد تشریف لائے۔ وہاں سے لاہور آنے کا پروگرام تھا۔ ان کا قیام سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ شام کو لاہور میونسپل کارپوریشن نے مفتی صاحب کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ میں اور ذفر وہاں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مفتی صاحب تشریف لانے لگے۔ مفتی صاحب کار سے نکلے تو میں آگے بڑھا۔ ذفر بھاگ کر ان کے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے عرض کیا "حضرت یہ وہی بچہ ہے جسے آپ گود میں اٹھا کر نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر بھاگے تھے۔" فرمانے لگے "ماشاء اللہ یہ تو جوان ہو گیا ہے۔" میں استقبالیہ میں مدعو نہ تھا۔ انتظامیہ کے لوگ بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں نے ذفر کا ہاتھ تھاما۔ اب ہمیں گیٹ پر روکنے والا کون تھا؟ ڈیڑھ گھنٹہ ہم مفتی صاحب کے ساتھ رہے۔

اگلے روز مفتی صاحب سرکاری گاڑی لے کر غریب خانے پر تشریف لائے۔ ریحانہ سے ایسے ملے جیسے اپنی بیٹی سے ملتے ہیں۔ پہلی بار ہمارے ہاں تشریف لائے تھے۔ ریحانہ سے کہنے لگے "بھئی چائے وائے کے چکر میں نہ پڑو۔ ابھی ناشتہ کر کے سیدھا یہیں آ رہا ہوں۔" پون گھنٹہ کے قریب قیام فرمایا، ہمارا گھر دیکھا، بہت خوش ہوئے اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ رخصت ہوتے وقت جیب سے کچھ رقم نکالی۔ ریحانہ نے کہا [illegible]

[illegible] کہ ہم تو آپ کے ہی رہتے ہیں، لیکن مفتی صاحب نے فرمایا "بھئی [illegible] ضرور چلئے" پھر بڑے اصرار کے ساتھ وہ ہم آئے تھے۔

مفتی صاحب اپنے پرانے دوست کرنل خواجہ عبدالرشید سے ملنا چاہتے تھے۔ آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے وہ ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں انہیں خواجہ صاحب کے ہاں لے گیا۔ تیس پینتیس سال بعد پہلی بار دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مفتی صاحب ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھے پرانی یادیں تازہ کرتے رہے ؎

عجب رنگینیاں باتوں میں کچھ ہوتی ہیں اے انشا
بہم ہو بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ ان دنوں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ تغلق آباد میں قیام پذیر تھے۔ میں لاہور سے اپنی اہلیہ اور بچوں کے ہمراہ فلائنگ میل سے رات نو بجے نئی دہلی پہنچا۔ ہمارے ساتھ انڈین آرمی کے ایک میجر اور دہلی کے ایک بڑے تاجر اسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ میں نے ان سے تغلق آباد کا محل وقوع پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ جگہ دہلی سے بہت دور ہے اور مناسب یہی ہے کہ ہم رات کو ٹیکسی میں سفر نہ کریں۔ رات کسی عزیز کے ہاں یا ہوٹل میں بسر کر لیں اور صبح کو تغلق آباد جائیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمارے جاننے والے تو دہلی میں بہت ہیں لیکن ہم بے وقت کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کسی ہوٹل میں رات گزار لیں گے۔

ہم اسٹیشن سے باہر نکلے۔ سامان ایک تانگے پر لدوایا اور پہاڑ گنج کے پل کی طرف جاتے ہوئے ایک اچھا سا ہوٹل نظر آیا۔ ہم اس میں ٹھہر گئے۔ صبح کا ناشتہ کر کے میں نے اپنے بیٹے [illegible] کو، جس کی عمر اس وقت سات سال تھی، اپنے ساتھ لیا اور اہلیہ سے کہا کہ میں مفتی صاحب سے ان کا پتہ معلوم کر کے ٹیکسی لے کر آتا ہوں، تم بچوں کو تیار کر لینا۔ ہم دونوں رکشا میں سوار ہو کر دفتر برہان پہنچے۔

... کے قریب پہنچے ... [illegible]
... ریحانہ جلدی ... ٹرین میں سوار ہوئی۔ ... صاحب نے ... [illegible]
... سامان ... [illegible]
... جانا تھا۔

اس وقت مفتی صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ زفر کو گود میں اٹھا کر پلیٹ فارم پر تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بھاگ رہے ہیں۔

کچھ سال بعد مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد تشریف لائے۔ وہاں سے لاہور آنے کا پروگرام تھا۔ ان کا قیام سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ شام کو لاہور میونسپل کارپوریشن نے معتقدین کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ میں اور زفر وہاں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مفتی صاحب تشریف لانے لگے۔ مفتی صاحب کار سے نکلے تو میں آگے بڑھا۔ زفر بھاگ کر ان کے ساتھ چمٹ گیا۔ میں نے عرض کیا حضرت یہ وہی بچہ ہے جسے آپ گود میں اٹھا کر نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر بھاگے تھے۔" فرمانے لگے "ماشاء اللہ اب تو جوان ہو گیا ہے۔" میں استقبالیہ میں مدعو نہ تھا۔ انتظامیہ کے لوگ بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں نے زفر کا ہاتھ تھاما۔ اب ہمیں گیٹ پر روکنے والا کون تھا؟ ڈیڑھ گھنٹہ ہم مفتی صاحب کے ساتھ رہے۔

اگلے روز مفتی صاحب سرکاری گاڑی لے کر غریب خانے پر تشریف لائے۔ ریحانہ سے ایسے ملے جیسے اپنی بیٹی سے ملتے ہیں۔ پہلی بار ہمارے ہاں تشریف لائے تھے۔ ریحانہ سے کہنے لگے بھئی چائے وائے کے چکر میں نہ پڑو۔ ابھی ناشتہ کر کے سیدھا یہیں آ رہا ہوں۔ پون گھنٹہ کے قریب قیام فرمایا، ہمارا گھر دیکھا، بہت خوش ہوئے اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ رخصت ہوتے وقت جیب سے کچھ رقم نکالی۔ ریحانہ نے کہا ...

[illegible] ہم تو تغلق آباد آگئے ہیں۔ سنتے ہیں کہ مفتی صاحب نے تغلق آباد ہی میں [illegible] پھر بڑے اصرار کے ساتھ [illegible] آئے تھے۔

مفتی صاحب میرے پرانے دوست کرنل خواجہ عبدالرشید سے ملنا چاہتے تھے کیونکہ کچھ عرصہ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں انھیں خواجہ صاحب کے ہاں لے گیا۔ تیس پینتیس سال بعد پہلی بار دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مفتی صاحب ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھے پرانی یادیں تازہ کرتے رہے ؎

عجب رنگینیاں باتوں میں کچھ [illegible] صادق
ہم [illegible] میں جب سعادت، عبدالغنی اور ہم

یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ ان دنوں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ تغلق آباد میں قیام پذیر تھے۔ میں لاہور سے اپنی اہلیہ اور بچوں کے ہمراہ فلائنگ میل سے رات نو بجے نئی دہلی پہنچا۔ ہمارے ساتھ انڈین آرمی کے ایک میجر اور دہلی کے ایک بڑے تاجر اسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ میں نے ان سے تغلق آباد کا محل وقوع پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ جگہ دہلی سے بہت دور ہے اور مناسب یہی ہے کہ ہم رات کو ٹیکسی میں سفر نہ کریں۔ رات کسی عزیز کے ہاں یا ہوٹل میں بسر کر لیں اور صبح کو تغلق آباد جائیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمارے جاننے والے تو دہلی میں بہت ہیں لیکن ہم بے وقت کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کسی ہوٹل میں رات گزار لیں گے۔

ہم اسٹیشن سے باہر نکلے۔ سامان ایک تانگے پر لدوایا اور پہاڑ گنج کے پل کی طرف جاتے ہوئے ایک اچھا سا ہوٹل نظر آیا۔ ہم اس میں ٹھہر گئے۔ صبح ناشتہ کر کے میں نے اپنے بیٹے ڈُوز کو، جس کی عمر اس وقت سات سال تھی، اپنے ساتھ لیا اور اہلیہ سے کہا کہ میں مفتی صاحب سے ان کا پتہ معلوم کر کے ٹیکسی لے کر آتا ہوں [illegible] بچوں کو تیار کر لینا۔ ہم دونوں رکشا میں سوار ہو کر دفتر برہان پہنچے۔

تی صاحب اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ میں ظفر کو ساتھ لئے ہوئے
و سلام کر کے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مفتی صاحب نے مجھے دیکھا تو فوراً کھڑے ہو گئے۔
بغلگیر ہو کر مصافحہ و معانقہ کے بعد ظفر کو پیار کیا۔ فرمانے لگے "کب آئے؟" میں نے
عرض کیا کہ ابھی دہلی پہنچا ہوں۔ ریحانہ اسٹیشن ہی دلی میں ہیں۔ آپ ایسا کیجئے کہ کسی واقف
ٹیکسی والے کو مولانا اکبر آبادی کا پتہ سمجھا دیجئے جو ہمیں بآسانی وہاں پہنچا دے۔ مفتی صاحب
نے فرمایا "چائے نہیں پیو گے؟" میں نے عرض کیا ابھی پی کر آ رہا ہوں۔ اس وقت سب سے
اہم مسئلہ تغلق آباد پہنچنے کا ہے۔ مفتی صاحب میرے ساتھ باہر آئے۔ جامع مسجد کے باہر
کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ مفتی صاحب نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی تو اس نے کہا
کہ وہ تغلق آباد میں ہمدرد کا کمپلیکس جانتا ہے۔ میں ٹیکسی میں سوار ہو کر ہوٹل پہنچا اور بچوں
کو ساتھ لے کر تغلق آباد پہنچ گیا، اسی اثنا میں مفتی صاحب نے مولانا اکبر آبادی کو فون پر
ہمارے آنے کی اطلاع کر دی۔

میں نے ۲۳ روز تغلق آباد میں قیام کیا۔ اس زمانے میں وہاں اتنی ہماہمی نہ تھی جتنی
ان دنوں ہے۔ ایک گھنٹے بعد دہلی جانے والی بس وہاں سے گذرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا
کہ میں ناشتہ کر کے دہلی جانے کے لئے سڑک پر آیا۔ جب بس آئی تو دیکھا کہ اندر کھڑے
ہونے کی بھی جگہ نہیں ہے اور لوگ چھت پر سوار ہیں تو میں یہ کہتے ہوئے واپس لوٹ گیا
کہ کل دیکھا جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں تغلق آباد سے مہرولی چلا جاتا اور وہاں سے
شہر کی جانب جانے والی بس مل جاتی۔ میں تغلق آباد سے شہر آتا تو پہلے مفتی صاحب کی
خدمت میں حاضر ہوتا۔ کچھ دیر وہاں رکتا اور پھر گھومنے نکل جاتا۔ دوپہر کو دفتر برہان
آ جاتا۔ حکیم ظفر احمد مرحوم بڑے دالان کا تالا کھول دیتے اور میں وہاں سو جاتا۔ سہ پہر کے
قریب سو کر اٹھتا اور نہا کر تازہ دم ہو جاتا۔ ظہر کی نماز بڑے دالان میں ادا کر کے اخبارات
کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔ عصر سے ذرا قبل مفتی صاحب بھی تشریف لے آتے۔ کبھی میں

[?]اصرار پر چائے پی لیتا اور کبھی معذرت کر دیتا۔ موصوف کبھی چائے گھر سے منگا لیتے اور کبھی قلوپطرا ہوٹل میں آرڈر دے دیتے۔ عصر کی نماز میں مفتی صاحب کا ساتھ ہی ادا کرتا۔ مرحوم میرے امام ہوتے اور میں ان کا واحد مقتدی۔ نماز کے بعد میں تغلق آباد چلا جاتا۔

انہی دنوں ایک روز میں ندوۃ المصنفین آیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ مفتی صاحب نے کھانے پر اصرار کیا۔ کھانا کھاتے کھاتے دیر ہوگئی۔ میں جامع مسجد میں نماز ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہاں نماز ذرا جلدی ہو جاتی ہے اس لئے میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ مفتی صاحب نے میری پریشانی دیکھی تو فرمانے لگے: "فکر نہ کریں، میں نے بھی نماز جمعہ ادا کرنی ہے۔" ہم دونوں دفتر برہان سے نکلے اور مفتی صاحب مجھے مٹیا محل میں سے ہوتے ہوئے کریم ہوٹل کی طرف لے گئے۔ آگے ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اب خیال آتا ہے کہ وہ مفتی صاحب کے مکان کے عقب میں ہونی چاہیے۔ مسجد کھچاکھچ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور تِل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، ہمیں دیکھ کر نمازیوں نے ہمارے لئے جگہ بنا دی اور ہم نے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی۔

ایک روز میں حسب معمول دس بجے کے قریب ندوۃ المصنفین پہنچا۔ مفتی صاحب اپنی نشست پر تشریف فرما تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا تو فرمانے لگے "میاں! اچھے وقت پر آئے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے روسی سفارت خانہ سے دو دعوت نامے موصول ہوئے ہیں۔ ایک میرے نام آیا ہے اور دوسرا مولوی سعید (مفتی صاحب عام گفتگو میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو اسی نام سے یاد کیا کرتے تھے) کے نام یہ مولوی سعید کا دعوت نامہ لے لو۔ ان سے کہنا کہ امام بخاریؒ کا ہزار سالہ جشن ولادت منایا جا رہا ہے۔ جب اپنا مقالہ لکھو تو پندرہ بیس منٹ کا مقالہ میرے لئے بھی لکھ لینا۔" مفتی صاحب نے متعدد مقامات پر اپنے "کوتاہ قلم" ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ مرحوم "کوتاہ قلم" نہ تھے۔

خیر، مدت ہوئی مفتی صاحب کے انتقال کو [illegible] کے سب [illegible]
چکا تھا۔ یہ تحریر تو معلوم نہیں ہوتا، تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ [illegible] زمانہ میں
[illegible] طیب مفتی صاحب نے اپنے قدرشناسوں کے [illegible]
"تماشا" کے عنوان سے ان کے جو مقالات ڈاکٹر عنوان چشتی نے مرتب کئے ہیں ان
کا عنوان کوئی تصنیف میں دخیل ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں مرحوم
نے انھیں "[illegible]" بنا دیا تھا۔

میں وہ دعوت نامہ جیب میں ڈال کر خانقاہ شاہ ابوالخیرؒ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے
میں شیریں بھون کے مالک میاں تاج الدین سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے بڑے بھائی میاں
شجاع الدین لاہور میں قصر شیریں چلا رہے ہیں۔ میاں تاج الدین نے اس روز کسی
کی فرمائش پر قلاقند بنائی تھی۔ اس زمانے میں دودھ کی مٹھائی بنانے کی ممانعت تھی۔
میاں صاحب نے مجھے نصف کلو کے قریب قلاقند بطور تحفہ دی۔ شام کو میں تغلق آباد
پہنچا تو اس وقت مولانا اکبرآبادی مرحوم مطالعہ میں مگن تھے۔ میں نے ڈبہ کھول کر ان کے
سامنے کیا۔ انھوں نے بغور قلاقند کو دیکھا اور ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ پھر
حسب عادت اس کی بڑی تعریف کی۔ جب مولانا منہ میٹھا کر چکے تو میں نے دعوت نامہ
پیش کیا۔ مرحوم بہت خوش ہوئے اور سب اہل خانہ کو جمع کر کے فرمانے لگے "دیکھو
یہ میاں اسلم کتنے قاعدے کے آدمی ہیں۔ پہلے میرا منہ میٹھا کرایا، پھر دعوت نامہ دیا۔
تم ہوتے تو یونہی منہ اٹھائے چلے آتے۔" چند لمحے سکوت کے بعد میں نے کہا کہ
مفتی صاحب فرماتے تھے کہ جب اپنا مقالہ لکھیں تو پندرہ بیس منٹ کا مقالہ ان
کے لئے بھی لکھ دیں۔ اس پر مولانا بگڑ گئے اور فرمانے لگے "لو اور سنو! تقریب
میں مفتی صاحب شرکت کریں اور مقالہ میں لکھوں۔ خود ہی کیوں نہیں لکھ لیتے۔"
ایک دفعہ میں تغلق آباد سے لوٹ آیا تو مفتی صاحب نے فرمایا "میاں تماشا

جموں گر جا رہا ہوں۔ شیخ محمد عبداللہ نے بلایا ہے۔ وہاں حضرت بل میں ایک مدرسہ مدینۃ العلوم۔ اس کا معاینہ کر کے سفارشات مرتب کرنی ہیں۔ تمہیں تو ملنے کشمیر جانے کا۔ چلو گے؟" یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں کبھی سری نگر جاؤں گا۔ حالانکہ میں ان دنوں برطانیہ کا شہری تھا اور میرے وہاں جانے پہ کوئی پابندی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ چلئے۔ میں کل صبح دلی سے روانہ ہو کر پرسوں شام تک سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ آپ کا قیام کہاں ہوگا؟ فرمانے لگے "وہاں مدینۃ العلوم حضرت بل میں ہی قیام ہوگا۔ اس کے پرنسپل ہمارے دوست مولانا ابو العرفان ندوی ہیں۔" میں اسی وقت تغلق آباد روانہ ہو گیا اور اہل خانہ کو بتا دیا کہ میں چند روز کے لئے حسب عادت سیاحت کے لئے نکل رہا ہوں اس بار پنجاب کی طرف جاؤں گا۔ شام کو میں نے اپنا سامان اٹھایا اور بس میں سوار ہو کر دفتر برہان پہنچ گیا۔ رات وہاں گذاری۔ صبح چھ بجے کے قریب ایک ٹرین پانی پت جاتی تھی۔ میں اس میں سوار ہو کر دس بجے کے قریب پانی پت پہنچ گیا سامان کلوک روم میں رکھ کر قلندر صاحب کی درگاہ دیکھنے گیا۔ بعد ازاں مولانا حالیؒ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ، ابراہیم لودھی اور حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے مزارات پر حاضری دی اور دوپہر کے وقت ایک پسنجر ٹرین میں سوار ہو کر شام تک انبالہ پہنچ گیا۔ نصف شب کے قریب کشمیر میل وہاں پہنچی۔ جالندھر تک تو اس میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی۔ جالندھر پہنچ کر ٹرین قریب قریب خالی ہو گئی اور مجھے سونے کے لئے برتھ مل گئی۔ صبح نو بجے میں جموں پہنچ گیا۔ وہاں سے بس میں سوار ہو کر رات کو عشاء کے وقت سری نگر پہنچ گیا۔ ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور وہ مجھے حضرت بل لے گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مفتی صاحب قریب ہی کشمیر یونیورسٹی کے صدر دروازے کے سامنے محکمہ اوقاف

کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن اس وقت مولانا ابوالعرفان صاحب کے ساتھ کسی کے ہاں ضیافت پر تشریف لے گئے ہیں۔ مفتی صاحب نے میرے آنے کی اطلاع مدرسے کے ذمہ داروں کو کردی تھی چنانچہ مجھے مہمان خانے بٹھادیا گیا۔ جاڑے کے آخری دن تھے تاہم رات کے وقت سردی تھی اور پانی بھی کافی حد تک سرد تھا۔ طلبہ نے مجھے چائے بنادی۔ میں چائے نوش کرکے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان بھی پہنچ گئے۔ مفتی صاحب مجھے وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے "اچھی گذرے گی"۔ مولانا ابوالعرفان کے ساتھ میرا تفصیلی تعارف کرایا۔ میں نے عرض کیا کہ کل سے آپ کسی کے ساتھ میرا تعارف نہیں کرائیں گے، میں خود اپنا تعارف کراؤں گا۔ سری نگر میں احتیاط ضروری ہے۔

اگلی صبح ناشتہ کے بعد لوگ ملاقات کے لئے آنے لگے۔ پہلے مفتی عبدالغنی صاحب شعبۂ عربی، کشمیر یونیورسٹی تشریف لائے، پھر مولانا ابوالعرفان آگئے۔ تھوڑی دیر میں آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ مفتی صاحب نے عبدالغنی صاحب سے کہا کہ ہاشم کو یونیورسٹی دکھلائیں۔ موصوف مجھے یونیورسٹی لے گئے۔ شعبۂ کشمیریات میں پروفیسر سعید گیلانی سے ملایا، پھر شعبۂ تاریخ میں ڈاکٹر محب الحسن سے ملاقات کرائی۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار سے بھی ملے۔ انھوں نے مجھے شعبۂ تاریخ میں ملازمت کی پیشکش بھی کی۔

شام کو مفتی صاحب، مولانا ابوالعرفان اور میں راجوری کدل میں جناب میرواعظ محمد فاروق کے ہاں گئے۔ مفتی صاحب کے میرواعظ محمد یوسف مرحوم کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ وہ آزادی کے بعد مظفرآباد چلے گئے اور آزاد کشمیر میں عہدۂ صدارت پر بھی فائز رہے۔ ان کی وفات کے بعد مفتی صاحب کا سری نگر جانا نہیں ہوا تھا۔ مفتی صاحب میرواعظ محمد فاروق کے ہاں ان کی تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ موصوف دیر تک مرحوم کی خوبیاں بیان فرماتے رہے۔ اتنے میں سماوار میں کشمیری چائے آگئی۔ اہل کشمیر

نمکین چائے پیتے ہیں اور وہ چائے میں شکر ملانا بدعت بلکہ شرک گردانتے ہیں۔ اگر کوئی غیر کشمیری چائے میں ملانے کے لئے ان سے شکر مانگ لے تو یہ ایک [illegible] کہی جاتی ہے۔ مفتی صاحب نمکین چائے پینے کے عادی نہ تھے اور اس عادت سے بھی ناواقف تھے۔ انھوں نے نمکین چائے کی ایک چسکی لے کر میری طرف دیکھا۔ میں سارا معاملہ بھانپ گیا۔ میں نے میر واعظ کی خدمت میں عرض کیا میں جانتا ہوں کہ کشمیری سے چائے میں ملانے کے لئے شکر طلب کرنا گالی دینے کے مترادف ہے لیکن مفتی صاحب نمکین چائے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ میر واعظ مسکرائے اور انھوں نے خادم کو اشارہ کیا اور وہ چینی لے آیا۔ پھر مولانا ابوالعرفان اور راقم نے بھی چائے میں چینی ڈالی۔

میر واعظ نے ہمیں دعوت دی کہ ہم ان کے ساتھ گلمرگ چلیں۔ اگلے روز میر واعظ اور مفتی بشیر الدین صاحب دو کاریں لے کر پہنچ گئے۔ میر واعظ، مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان ایک کار میں سوار ہو گئے اور میں مفتی بشیر الدین صاحب کی کار میں بیٹھ گیا۔ ٹنگمرگ پہنچ کر ہم کچھ دیر کے لئے ریسٹ ہاؤس میں رکے۔ باہر لان میں کرسیاں لگا دی گئیں۔ راقم نے بھی بات چیت میں حصہ لیا۔ میر واعظ فرمانے لگے "آپ تو بڑے کام کے آدمی ہیں، اب آپ ہماری کار میں بیٹھئے گا۔" مفتی صاحب نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور میرے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم گلمرگ پہنچ گئے۔ وہاں گالف کلب میں کھانے کا انتظام تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور نماز ظہر ادا کر کے واپس ہوئے۔

واپسی پر میر واعظ نے فرمایا کہ اگر ہم چاہیں تو ایک دن رات ان کے مہمان کی حیثیت سے ہاؤس بوٹ میں قیام کر لیں اور اگر وہاں نہ رہنا چاہیں تو چشمہ شاہی پر سجے سجائے بنگلے میں ایک دن رات گزار لیں۔ ہم نے ایک ہاؤس بوٹ دیکھا لیکن چشمہ شاہی

کے بنگلے میں رہنا پسند کیا۔ عصر کے بعد میر واعظ بھی تشریف لے آئے۔ اصطبل پیچھے
پہنچ گئے۔ اس چشمے کا پانی صحت کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ وہاں ایک لیبارٹری
بھی ہے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ایک بیرا چشمے کا پانی صاف و شفاف گلاس میں
لے آیا۔ وہ بار بار آتا اور کپڑے سے میز صاف کر جاتا۔ اس کی حرکات سے ظاہر تھا کہ
وہ جاسوس ہے۔ میر واعظ نے بھی اس کی تصدیق کی۔

مغرب کی نماز ہم نے بنگلے کے لان میں مفتی صاحب کی اقتدار میں ادا کی اور وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد میر واعظ کے گھر سے کھانا آگیا۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا اور دس بجے کے قریب میر واعظ تشریف لے گئے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب میر واعظ دوبارہ تشریف لائے۔ ہم باہر لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بنگلے کا ملازم، جو جاسوس بھی تھا، بہانے بہانے سے ہمارے گرد منڈلاتا پھرتا تھا۔ میر واعظ اور مفتی صاحب سیاست کے موضوع پر گفتگو کرنے لگے تو میں اور مولانا ابوالعرفان بہانہ کر کے دوسری جگہ جا بیٹھے۔

ایک روز شام کو صوفی نذیر احمد نے ہمیں بربرشاہ میں مسجد اہلحدیث میں مدعو کیا۔ ہم نے مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔ اس کے بعد انھوں نے پیسٹری اور چائے سے ہماری تواضع کی۔ صوفی صاحب جتنی گھنی اور لمبی داڑھی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ بیٹھتے تو داڑھی بلا مبالغہ زمین کو چھوتی تھی۔ میں نے اجازت لے کر اسے ہاتھ لگایا تو مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا، "میاں اچھی طرح دیکھ لو پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔" صوفی صاحب بھی مسکرا دیئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بل میں رسول اکرم ﷺ کا چھوٹا سا موئے مبارک موجود ہے اور خانیار شریف میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا موئے مبارک ایک چھوٹی سی شیشی میں ڈال کر رکھا ہوا ہے۔ صوفی صاحب کی ریش مقدس کا ایک بال بھی کسی مرتبان میں سنبھال کر رکھ لیا جائے تو

[illegible]

اگلے دن ہم مدرسہ نصرت العلوم دیکھنے گئے جسے میرزا عطاء چلا رہے ہیں۔ وہیں ملاقات مفتی عبدالکبیر مرحوم سے ہوئی۔ مفتی صاحب انھیں پرانی باتیں سناتے رہے اور خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ مفتی عبدالکبیر نے حضرت بل میں بنگلہ تعمیر کرایا تھا۔ انھوں نے وہاں آنے کی دعوت دی لیکن مفتی صاحب نے وقت کی کمی کا عذر کر کے معذرت طلب کی۔

ایک روز شیخ عبداللہ نے ہمیں دعوت دی کہ ہم ایک روز پہلگام ہو آئیں۔ ان کا ایک معتمد عبدالسلام دیوہ شیخ صاحب کی گاڑی لے کر آ گیا۔ ہم صبح نو بجے کے قریب سری نگر سے چلے۔ راستے میں پانپور اور اونتی پور ہوتے ہوئے اسلام آباد (اننت ناگ) پہنچ گئے۔ وہاں داراشکوہ کا تعمیر کردہ تالاب دیکھ کر ہم اچھابل چلے گئے۔ وہاں دوپہر کے کھانے کا آرڈر دے کر ہم کوکرناگ روانہ ہوئے۔ ہمارے لئے چشمے کے کنارے ایک چنار کے گھنے درخت کے نیچے کرسیاں لگا دی گئیں اور چشمے کا پانی پینے کے لئے پیش کیا گیا۔ تا حدِ نظر گلاب کی کیاریاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ کوکرناگ میں رُک کر اچھابل چلے گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں کھانا تیار تھا۔ میرے اصرار پر ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی بجائے ہم نے ریسٹ ہاؤس کے لان میں ایک چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھانا تناول کیا اور اسی چشمے کے پانی سے وضو کر کے مفتی صاحب کی اقتدا میں نمازِ ظہر ادا کی۔ نماز کے بعد ہم پہلگام کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں پام ویو ہوٹل میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ ایک کمرے میں مفتی صاحب نے ڈیرہ جمایا۔ دوسرے کمرے میں میں اور مولانا ابوالعرفان [illegible] عبدالسلام اور ڈرائیور نے تیسرے کمرے میں اپنا سامان رکھ لیا۔

پہلگام کا موسم قدرے خنک تھا۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی ہم سو گئے۔ عصر سے تھوڑی

دیر سے بیدار ہوئے۔ وضو کر کے چائے نوش کی اور بازار کی طرف نکل گئے۔ [illegible]
[illegible] سے بدمزہ ہو چکے تھے۔ دوسری جانب گنتی کی چند [illegible]
[illegible] سے زائد نہ ہوں گی۔ امرناتھ جی کی یاترا [illegible]
[illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] کے کنارے [illegible]
[illegible]

[illegible] امرناتھ جی جانے والی سڑک [illegible] بارش
کی وجہ سے سڑک خراب ہو چکی تھی، اس لئے [illegible]
[illegible] صاحب کی [illegible]
[illegible] روانہ ہو گئے
[illegible] تک یہ سلسلہ جاری
[illegible] ! اس دریا کا بھلا کیا نام تھا؟ [illegible]
[illegible] پھر خود بھی ایک دو بار یہ نام دہرایا [illegible]

[illegible] شیخ عبداللہ کے ہاں ہماری دعوت [illegible]
[illegible] میں رہے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم ان کے ہاں [illegible]
[illegible] کا انتظام تھا۔ ہمیں وہاں بٹھایا گیا۔ چند منٹ [illegible]
مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے سفید [illegible]
تھا اور کرتے کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی واسکٹ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔
[illegible] کی تصاویر اور کارٹون بہت دیکھے تھے لیکن زندگی میں پہلی بار [illegible]
سے ابھی [illegible] ملاقات ہوئی تھی۔ تصاویر کے برعکس ان کے چہرے پر [illegible]
تھا۔ شیخ صاحب ہم سے ملے اور فرداً فرداً سب کی خیریت دریافت کی۔

دیر پہلے بیدار ہوئے۔ وضو کر کے چائے نوش کی اور بازار کی طرف نکل گئے۔ بازار کے ایک طرف دریا بہتا تھا جسے لدھرو کہتے تھے۔ دوسری جانب گنتی کی چند دکانیں تھیں۔ اس زمانے میں تیس پینتیس سے زائد نہ ہوں گی۔ امرناتھ جی کی یاترا کو جانے والے سادھو پہلگام پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ دریا کے کنارے امرتسر کے تاجروں کا تعمیر کردہ مسجد تھی۔ عصر کی نماز ہم نے اس مسجد میں ادا کی۔ اتنے میں ڈرائیور گاڑی لے آیا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو کر امرناتھ جی جانے والی سڑک پر چھ سات میل گئے ہوں گے کہ آگے بارش کی وجہ سے سڑک خراب ہو چکی تھی، اس لئے واپس لوٹ آئے۔ مغرب کی نماز بھی اسی مسجد میں ادا کی۔ پھر ہوٹل کے لان آکر بیٹھ گئے۔ عشاء کی نماز مفتی صاحب کی اقتداء میں ادا کی اور کھانا کھا کر سو گئے۔ اگلے روز ناشتہ کر کے سری نگر روانہ ہو گئے۔ مفتی صاحب دریائے لدھرو کا نام بھول جاتے تھے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ موصوف بار بار مجھ سے پوچھتے "کیوں بھئی! اس دریا کا بھلا کیا نام تھا؟" میں عرض کرتا "لدھرو"۔ پھر خود بھی ایک دو بار یہ نام دہراتے اور مسکرا کر میری طرف دیکھتے۔

اسی شام شیخ عبداللہ کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ موصوف نیڈو ہوٹل کے عقب میں ایک اینکسی میں رہتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم ان کے ہاں پہنچے۔ ایک وسیع کمرے میں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ ہمیں وہاں بٹھایا گیا۔ چند منٹ بعد شیخ صاحب مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے سفید کرتا اور پاجامہ پہنا ہوا تھا اور کرتے کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی واسکٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کی تصاویر اور کارٹون بہت دیکھے تھے لیکن زندگی میں پہلی بار بالمشافہ ان سے اسی روز ملاقات ہوئی تھی۔ تصاویر کے برعکس ان کے چہرے پر بڑا نکھار تھا۔ شیخ صاحب ہم سے ملے اور فرداً فرداً سب کی خیریت دریافت کی۔ اتنے

میں انگلستان میں مقیم چند کشمیری نوجوان، جو آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے وہاں آگئے۔ ان کے آنے کے بعد کھانا شروع ہوا۔ شیخ صاحب نے بڑے اہتمام کے ساتھ وازہ وان تیار کیا تھا۔ ایک بڑی سینی میں اُبلے ہوئے چاول ہمارے سامنے رکھے گئے۔ مفتی صاحب اور مولانا ابو العرفان آمنے سامنے بیٹھے۔ میں اور شیخ صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے۔ اکیس کورس کا وازہ وان تھا۔ جب وازہ ہمارے سامنے سالن لاکر ڈالتا تو شیخ صاحب اس سالن کا نام بتاتے۔ رات گیارہ بجے کے قریب یہ تقریب سعید دلپذیر انجام پذیر ہوئی۔

اگلی صبح میں اور مفتی صاحب شاپنگ کے لئے بازار چلے گئے۔ عبد السلام دیوہ نے ہمیں رعایتی نرخوں پر شالیں دلوادیں۔ شام کو مفتی بشیر الدین صاحب کے ہاں ہمیں وازہ وان کھلایا گیا۔ ایک روز مفتی صاحب کے کسی معتقد نے ایسا ہی پرتکلف کھانا ہمیں کھلایا۔ ایک رات رینہ واڑی میں متو خاندان میں شادی کی تقریب تھی، ہم بھی اس میں مدعو تھے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کشمیری رسم ورواج کا مشاہدہ کیا۔

ایک دن مولانا محمد سعید مسعودی ہمیں ملنے آئے۔ ان کی داڑھی بڑی طویل وعریض تھی۔ مفتی صاحب ان پر فقرے چُست کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "حضرت! یہ کون بزرگ ہیں۔" مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "بزرگ وزرگ کچھ نہیں یہ محمد سعید مسعودی ہیں۔ کافی عرصہ تک لوک سبھا میں کشمیر کی نمائندگی کر چکے ہیں، یہ بزرگی تو اب انھوں نے اپنے اوپر طاری کی ہے۔" مولانا مسعودی بھی یہ فقرہ سن کر محظوظ ہوئے۔

قصۂ کوتاہ ایک ہفتہ کشمیر میں قیام کرکے مفتی صاحب دہلی جانے کے ارادے سے رخت سفر باندھنے لگے۔ جانے سے قبل مدرسہ کے بارے میں

فرمایا کہ شیخ صاحب کو بھرانا نہیں، مجھے کچھ لکھانا ہے۔ ایک کاغذ اور قلم سنبھالو۔ میں بولتا جاؤں گا، تم لکھتے جانا۔" مفتی صاحب نے رپورٹ لکھوائی۔ میں نے پڑھ کر سنائی۔ اس میں چند ترمیمات کیں اور مجھ سے فرمایا "اب اسے صاف کرکے لکھ دو۔" میں نے رپورٹ لکھ کر پیش کی۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور دستخط فرما دیئے۔ مفتی صاحب دہلی روانہ ہوگئے، میں مزید چند روز کے لئے سری نگر میں رک گیا۔ اب میں تھا اور مولانا ابوالعرفان۔ ہم نے جی بھر کر سری نگر اور اس کے مضافات کی سیر کی۔

(باقی)

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

(۲)

ڈاکٹر محمد یوسف، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قرآن وہ واحد کتاب ہے جو ہم کو ہماری فطری جذبات، فطری قابلیت اور اچھی زندگی کے اصول کو اجاگر کر کے اس پر عمل کرنا سکھاتا ہے۔ قرآن گم کردہ راہ انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے:

فی قلوبہم مرض[1] اور وحی خداوندی اس مرض کی دوا ہے۔ شفاء لما فی الصدور[2]۔ کہیں انہیں گمراہ لوگوں کے متعلق کہتا ہے علی قلوبہم اکنۃ[3] کہیں فرماتا ہے: ام علی قلوب اقفالہا[4]

دوسری جگہ ہے:

۱۔ البقرہ آیت ۱۰

۲۔ یونس آیت ۵۷

۳۔ بنی اسرائیل آیت ۴۶

۴۔ محمد آیت ۲۴

وعلی ابصارھم غشاوۃ[1]

ایک پردہ ہے،

فی اذانھم وقر[2]

[illegible]

کلام ہو جاتے ہیں۔

وھم فی غفلۃ معرضون[3]

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے بارے میں خود فرمایا ہے: ان ھذہ تذکرۃ[4]۔ تذکرہ کے معنی وہ چیز جو بھولی بات یاد دلائے جس طرح کوئی شخص بھولی ہوئی بات کو یاد دلا کر کوئی نئی ..... نہیں بتاتا بلکہ اس بھولنے والے کے دماغ میں چھپی ہوئی بات پر سے نسیان کا پردہ ہٹا دیتا ہے۔ اسی طرح وحی یا قرآن بھی سوئی ہوئی قوت انسانی کو جگاتی ہے۔ اس طرح دین اسلام ایک فطری دین ہے اس میں کسی قسم کی کوئی الجھا یا مخفی نہیں ہے۔ صاحب وحی صرف وہی شخص ہوتا ہے جس کو اس امر کے لئے منتخب کیا ہو۔ اس میں کسب و ہنر کا بالکل دخل نہیں۔ ایک صاحب وحی اپنے علم و فراست سے اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن خود اس کو (تنزیل) کے لفظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ قرآن پاک کو ہم شروع سے آخر تک دیکھیں تو ہر مقام پر یہ ملے گا کہ آیات قرآنی کا خدا کی طرف سے نزول ہوتا ہے۔

۱۔ البقرہ آیت ۷۔

۲۔ حٰم السجدہ آیت ۴۴۔

۳۔ الانبیاء آیت ۱۔

۴۔ المزمل آیت ۱۹۔

تنزیل العزیز الرحیم [1]
جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
تنزیل الکتب من اللہ العزیز الحکیم ○ انا انزلنا الیک الکتب بالحق [2]
[illegible] یہ بے بنیاد شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے
[illegible] تھے کہ اگر یہ قرآن ہو تو قرآن سے خود ہی تمام شکوک کو رفع کر دیا۔
قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ
مصدقا لما بین یدیہ وھدی وبشری للمومنین۔ [3]

حضورؐ نے جو ایک امی تھے جب اہل مکہ کو قرآن پاک کے ذریعہ توحید کی دعوت دی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ کلام تو ایک شاعر کا ہے، محمدؐ تو ایک [illegible] ہے، مجنوں ہے، کاہن ہے، غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ ایک مرتبہ تنگ آکر کفار مکہ نے سردار قوم عتبہ بن ربیعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اس نے کہا:

اے محمد صلعم تم نے اپنی قوم کو بڑی مصیبت میں ڈال رکھا ہے
تم نے ان کی جماعت کو پراگندہ کر رکھا ہے ان کی عقلوں کو
ناکارہ بنا دیا ہے، ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا ہے اور
ان کے دین کی مذمت کی ہے۔

حضور صلعم نے فرمایا: اے ابوالولید! پھر تمہارا کیا مقصد ہے؟

۱۔ الزمر آیت ۱-۲ ، یٰسین آیت ۵ -
۲۔ الزمر آیت ۱-۲ -
۳۔ البقرہ - آیت ۹۷-

[illegible] نے کہا! اے محمدؐ تم نے جو ڈھونگ رچایا ہے [illegible]

[illegible] ہے تو ہم تمہارے لئے [illegible]

[illegible] پر بادشاہ [illegible] اگر تم پر کوئی آسیب کا اثر ہے تو اس کا علاج [illegible]

[illegible] اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ سورۂ [illegible]

جنہیں سن کر عتبہ کی عجیب حالت ہوگئی اور وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ کفار کے اصرار پر اس نے کہا: اے قوم قریش تم میری بات مانو اور اس کے [illegible] ورنہ ہوگا۔[1]

اس طرح نہ جانے کتنے موقعوں پر دین اسلام کے مخالفین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ قرآن ایک موثر کلام ہے یہ نہ تو کسی جادوگر کا جادو ہے اور نہ کسی کاہن کی کہانت۔ اب ذرا اسی ایک مندرجہ بالا قصہ پر غور کیجئے کہ اہل عرب کے [illegible] کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر کسی کے اوپر کسی جن کا اثر ہوگا تو کیا اس سے علاج کیا جائے گا کہ "آپ کا علاج کرا دیں۔" ان کے اس جملے سے ہی [illegible] ہے کہ انہیں یقین تھا کہ محمدؐ برحق نبی ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں [illegible] عرب اس حقیقت کو اتنی آسانی سے مان لیتے تو پھر ان کی [illegible] ضد پر بٹہ نہ آجاتا۔ اپنی انہیں خوبیوں کی وجہ سے [illegible] نے کہا: "ابو الولید معلوم ہوتا ہے تم پر بھی جادو ہے۔"[2]

اگر وحی کسب و ہنر سے حاصل کی جاتی تو رسول کے [illegible] بھی ہوتے ہیں وہ ایسا کیوں نہیں کر پاتے اگر ایک [illegible]

۱۔ نبی عربی (سجاد) ص ۴۰۔۴۱

۲۔ ؍؍ ؍؍ ؍؍

یہ معلوم ہے تو دوسرے سے اس کا ادراک کیوں نہیں ہو سکتا۔ لیکن وحی ایک انتہائی پیچیدہ اور نازک چیز ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ اس عالم میں سے بہترین انسان کو منتخب کرتا ہے۔

اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا ومن الناس ان اللہ سمیع بصیر[1]

وحی جب وحی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے گرد بیٹھے لوگ حیران ہو جاتے ہیں کیونکہ نزول وحی کے ساتھ پیغمبر کی باتیں غیر متوقع ہوتی ہیں ... ہو جاتے ہیں جبکہ پیغمبر کی شخصیت بھی عرصہ کے سامنے کوئی نئی نہیں تھی۔

ولئن شئنا لنذهبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا ٥[2]

خود پیغمبر کی واقفیت کو وحی سے پہلے علم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان[3]

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وما کنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک[4]

۱۔ الحج آیت ۷۵۔
۲۔ بنی اسرائیل آیت ۸۶۔
۳۔ الزخرف آیت ۵۲۔
۴۔ العنکبوت آیت ۴۸

[illegible] سے چالیس کی عمر تک [illegible] کتاب نہ پڑھی [illegible] جانتے تھے [illegible]

وما كنت ترجو ان يلقى اليك الكتب الا رحمة من ربك[1]

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب نبی اسلام امی تھے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ معجزہ کی تخلیق ہے۔ نہ جانے کتنے شعراء، مبلغ اور کاہنوں نے اپنے کلام کو قرآن کا مقابل بنا کر نبوت کا دعویٰ کیا ہے مگر دنیا نے اسے قبول نہیں کیا۔ آج تک کوئی بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ قرآن من جانب اللہ نہیں بلکہ انسانی کلام ہے حالانکہ اس سلسلے میں کوششیں کی گئیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے اس بات کو ہم ایک اور طرح سے سمجھا سکتے ہیں کہ جس طرح کسی چیز کا مالک اپنی چیز کی یا برتن بنانے والا اپنے برتنوں کی ہر طرح سے حفاظت کرتا ہے اسی طرح اللہ پاک جو قرآن بلکہ ساری دنیا کا مالک ہے اپنے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے اور یہ وعدہ برحق ہے کہ آج چودہ سو سال سے بھی زیادہ مدت گزرنے پر بھی ویسا ہی ہے جیسا تھا انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون[2]۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصحاء عرب اور امراء نے قرآن کو مٹانے اسلام کو ختم کرنے کے لئے گالی گلوچ، مار پیٹ اور لالچ یعنی ہر طرح کی ناکام تدابیر کیں مگر جب صاحب قرآن نے للکارا کہ اگر یہ کلام یعنی قرآن منزل من اللہ نہیں ہے ایک انسانی کلام ہے تو تم سب مل کر ایک ہی سورہ بنا لاؤ، یہ سن کر سب خاموش ہو گئے کیونکہ ایسا ان کے لئے ناممکنات میں سے تھا۔ اللہ پاک نے اپنے کلام کی بنیاد

۱۔ القصص آیت ۸۶

۲۔ صارم، تاریخ القرآن ص ۱۵۵

محفوظ رہی ہے کیا باعتبار عبارت کیا باعتبار معانی و مطالب تمام قرآن ابتدا سے آخر تک ایک ہی طرز پر ہے۔ اس میں کسی انسانی کلام کو دخل نہیں۔ علم رسول صلعم ہے خود رسول کا اس میں ایک لفظ نہیں۔ جس جگہ بھی حدیث میں قرآن کی کوئی آیت نقل کیا گیا ہے وہاں دونوں کلام علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں جس فصاحت سے قرآن کریم لکھا ہوا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کو ایسی مقدس ہستی (محمدؐ) نے پیش کیا ہے کہ جس کے دشمن بھی کوئی انکار نہیں اور جس کی مقدس زندگی ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ قرآن کتاب ہے جس کے تاریک زمانہ میں نازل ہو کر دنیا میں ظاہری و باطنی روشنی پھیلائی علم و ادب، عمل اور تہذیب و تمدن کا علم بلند کیا۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کی وجہ سے اسلام وجود میں آئے۔ Life of Mohammed کا مؤلف لکھتا ہے:

"دنیا میں آسمان کے نیچے قرآن کے علاوہ اور کوئی
مذہبی کتاب نہیں ہے جس کا متن ابتدا سے
لے کر اس وقت تحریف سے پاک ہو۔[1]"

قرآن وہ کتاب ہے جو ایسی زبان میں ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور یہ زبان دنیا کی زبانوں میں سے سب سے زیادہ وسیع باقاعدہ اور خوبصورت ہے۔ قرآن خود صاف لفظوں میں دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے ہوں اور خدا کا کلام ہوں۔[2]

۱۔ صارم۔ تاریخ القرآن ص ۱۵۵

۲۔ البقرہ آیت ۲

جیسا کہ آیت مبارکہ ہے

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ[1]

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد ہے

وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ[2]

قرآن حکیم کی نظر میں ہر انسان برابر ہے۔ قرآن کریم کے متعین کردہ نظام حیات میں رنگ و نسل کی بنا پر کسی نوع کی تفریق نہیں کیا گیا ہے بلکہ انفرادیت اور اجتماعیت کو ایک دوسرے سے اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ باہمی تعاون و تناصر اور فکر و عمل کی ایک ایسی فضا بن جاتی ہے اور اس فضا میں ہر شخص کو اپنی فطری صلاحیت کا اپنا اپنا حق ملتا ہے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے اس میں کسی کی حق تلفی مقصود نہیں ہوتی۔ قرآن انسانی تقسیم صرف کفر و ایمان پر کرتا ہے اس میں کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوتی بلکہ یہ تفریق اس طرح ہوتی ہے کہ قرآنی اصول کو ماننے والی ایک جماعت اور اس کے خلاف چلنے والی دوسری جماعت ہوتی ہے۔ اس تفریق کی بنیاد صرف انداز فکر و عمل پر ہوتی ہے۔ مذہب اسلام نے اسی وحدت فکر و عمل کی بنیاد پر مساوات کی اتنی بلند عمارت کھڑی کی ہے کہ اہل مغرب اسے حیاتی مساوات سے بہت بلند مانتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم ڈی سیٹ ٹیلر کہتا ہے:

> اسلام کی بڑی خوبی اس کی مساوات ہے۔ اسلام سے قبل کوئی یہ جانتا بھی نہ تھا کہ مساوات کیا ہے؟ مگر اسلام نے اللہ کی کل مخلوق کو خواہ وہ کسی رنگ و نسل کے ہوں اس کا معنوی کنبہ قرار دے کر

۱۔ المائدہ آیت ۶۷۔

۲۔ یونس آیت ۵۷۔

بھاری عطا کردی ہے اور یہ اسلام کا اتنا بڑا احسان ہے جسے
دنیا شاید کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔"

اس حقیقت کا اعتراف Dr. Maude Royden نے اپنی کتاب The Problem Palestine میں کیا ہے۔[1]

تعجب تو اس بات کا ہے کہ یہ انقلابی نظام حیات اس زمانے میں پیش کیا گیا جبکہ تمام دنیا میں تصورات زندگی بالکل اس کے برعکس تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت لوگوں نے اس نئے انقلاب کی ہر طرح مخالفت کی مگر اس مخالفت کا نتیجہ صفر نکلا، بلکہ اب انسان ایک طویل مدت تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اصول حیات کی طرف آرہا ہے جن کی اس نے اس قدر مخالفت کی تھی۔ اب بھی کچھ لوگ عقل کو رہبر مان کر زندگی کی راہوں پر چلتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد وہ خود ان اصولوں کے ہاتھوں تنگ آکر انھیں توڑ پھوڑ دیتے ہیں جس میں انسے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں لیکن جب بھی انسان آگ دخان کے دریا میں سے ابھر کر نکلتا ہے تو خود بخود اس نظام حیات کی طرف بڑھتا ہے جس کی کرن چھٹی صدی عیسوی کی تاریکیوں میں سرزمین عرب میں پھوٹی تھی۔ ان تمام حقائق کو اگر سامنے رکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انسانیت غیر فطری طرز زندگی کے ایک ایک شعبے کو آزمانے کے بعد اندھا سے تاریک پانے کے بعد وحی یا قرآن کے چراغ کی طرف کھنچی آرہی ہے۔ کیا اتنے تمام حقائق پر مبنی ثبوت مل جانے کے بعد وحی یا قرآن کے متعلق کسی اور دلیل کی ضرورت ہے۔

چودہ سو سال قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا تھا کہ اس تعلیم فطرت

۱۔ معارف القرآن جلد دوم ص۲۷۰ غلام احمد پرویز

اور دیکھنے کو اس لئے نہ جھٹلاؤ کہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی (دیکھو تمہاری آنکھوں اور دلوں پر جہالت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں جو دھیرے دھیرے ہٹیں گے) یہ تو سراپا بصیرت و حکمت پر مبنی ہے۔ اسی لئے جوں جوں انسان کی علمی و عقلی سطح بلند ہوتی گئی اس نے دیکھ لیا کہ یہ دعویٰ کتنا سچا ہے مگر اس کے باوجود یورپ نے پورے طور پر قرآن کے نظام کو نہیں اپنایا ہے بلکہ کہیں کہیں سے مستعار لیا ہے۔ وحی کے متعلق طرح طرح کے سوالات ذہنوں میں اٹھ کر اب بھی انسان کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں۔ یہ سب ایمان کے فقدان کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے آج ساری دنیا جہنم بنی ہوئی ہے۔ انسانوں کو ذہنی و دلی سکون میسر نہیں ہے۔ صحیح و نیک عمل کے لئے ایمان بہت ضروری ہے اور ایمان صرف اس چیز پر لایا جاتا ہے جو حق اور ہر اعتبار سے بلند ہو اور ایمان ہی کے صحیح و صادق ہونے پر مذہب کا صحیح و صادق ہونا موقوف ہے۔

وحی کے لغوی معنی اشارہ کرنا، پیغام دینا اور دل میں ڈال دینا وغیرہ ہے۔ یہ لفظ استعمال کے لحاظ سے دیگر معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ حیوانات اپنی جبلی قوتوں سے جن امور کو سرانجام دیتے ہیں قرآن میں اس کے لئے بھی لفظ وحی استعمال ہوا ہے مثلاً واوحی ربک الی النحل[۱]۔ اسے وحی فطری کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کی دوسری کیفیات وجدانی ہوتی ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے متعلق ہے[۲] ان اوحینا الی امک ما یوحیٰ[۳]۔

۱۔ النحل آیت ۶۸۔

۲۔ معارف القرآن غلام احمد پرویز جلد ۲ ص ۲۸۳

۳۔ طٰہٰ آیت ۳۸

[illegible] وحی کی آخری شکل ہے جو بنی نوع انسان کے لئے بطور ضابطۂ حیات
[illegible] اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کو عطا ہوئی۔ اور قرآن پاک
اسی وحی کا نام ہے۔ اور وحی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا میں انسان
کو ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور آخر میں مکمل شکل میں قرآن کریم محفوظ ہو گیا
اور ہمیشہ کے لئے انسانی رشد و ہدایت کا نصاب بن گیا۔ وحی ہر رسول پر نازل
ہوئی۔ انبیاء کرام اسی وحی کے ذریعہ انسانوں کو ان کے اعمال کے انجام سے آگاہ
فرماتے تھے، انسان کو جینے کا طریقہ بتاتے تھے۔ رسول کا کام صرف وحی کا پہونچانا
ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اس پر عمل کر کے ایک نمونہ بن کر دکھانا پڑتا تھا کیونکہ
یہ مشہور مقولہ ہے کہ اپنے قول پر پہلے خود عمل پیرا ہو تب کسی کو اس کا سبق دو
یہی بات اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی۔

واتبع ما یوحیٰ الیک واصبر حتی یحکم اللہ[1]

اگر کسی کتاب یا گروہ کی صداقت و بلندی کا اندازہ لگانا ہے تو ہمیں چاہئے
کہ اس کے لکھنے والے بانی یا لیڈر کے کردار اور زندگی کو پرکھیں کیونکہ ہر چیز
اپنی اصل پر ہے۔ اگر ہم کو قرآن کی صداقت کا پتہ لگانا ہے تو ہمیں اس کے
لانے والے کی زندگی اور کردار کو ہر کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ یہ ایک کھلی حقیقت
ہے کہ رسول کی زندگی خود اس کی صداقت کی دلیل ہے کیونکہ اس کی تعلیم
منزل من اللہ ہوتی ہے۔ جب رسول سے ان کی صداقت کی دلیل مانگی گئی تو
آپ نے فرمایا کہ میں تم میں سے ایک انسان ہوں نہ کبھی کسی معلم سے پڑھا
نہ کبھی کسی ادبی محفل میں شامل ہوا جیسے تم بخوبی جانتے ہو تو کیا یہ تمہارا جاننا

۱۔ ھود آیت ۱۰۹

صداقت کا ثبوت نہیں کیا کوئی ان پڑھ اور ایسا شخص جو میرے جیسے حالات میں پیدا ہوا ہو اور تربیت پائی ہو قرآن جیسی کتاب پیش کر سکتا ہے جو سے پہلے اور بعد کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ آپ نے کبھی کسی شخص سے جھوٹ مذاقاً بھی نہ بولا تو کیا آپ خدا اور اس کی وحی کے متعلق جھوٹ کہہ سکتے تھے ان باتوں پر اگر ہم دل سے غور کریں تو جواب نفی میں ملے گا۔ آپ کی صداقت کے آپ کے دشمن بھی معترف ہیں[1]۔ انھیں لوگوں کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

فانھم لا یکذبونک ولکن الظلمین بآیت اللہ یجحدون[2]۔ قرآن کو آپ اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ انھیں الفاظ میں پہونچا دیتے تھے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتے تھے حتی کہ لفظ قل بھی جیسے قل ھو اللہ احد۔ ہاں جب کبھی آپ اپنی گفتگو میں قرآنی باتوں کے ذریعہ تبلیغ کرتے تو لفظ قل نہ فرماتے بلکہ مقصد بیان کر دیتے جیسا کہ قیصر وغیرہ کے خطوط میں آپ نے فرمایا:

یا اھل الکتاب تعالوا حالانکہ آیت لفظ قل سے شروع ہوتی ہے[3]۔

خود قرآن پاک کے ذریعہ یہ ثابت ہے کہ قرآن محمدؐ کا کسب ہرگز نہ تھا بلکہ خدا نے اس کے ذریعہ آپ کی تربیت کی اور علم سکھایا۔

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم[4]۔

۱۔ رشید رضا، وحی محمدی ص ۴۵۶۔

۲۔ الانعام آیت ۳۳۔

۳۔ رشید رضا، وحی محمدی ص ۴۵۶۔

۴۔ بنی اسرائیل آیت ۷۵۔

بھی قرآن آپ کی فروگذاشتوں کو درست کرتا تھا کبھی نرمی کے ساتھ ...... تو کبھی سختی کے ساتھ قرآن میں خدا اپنے رسول کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

اذا لاذقناک ضعف الحیاۃ وضعف الممات ثم لا تجد لک نصیرا[1] اللہ نے اس آیت میں ایک عام انسان کی طرح اپنے رسول کو مخاطب کیا ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ بھی انسان ہیں اور یہ جتلا دیا کہ ان سے بھی بھول ہو سکتی ہے۔ خدائے پاک قرآن میں جابجا اپنے رسول کو اسی بات کی نصیحت کرتا ہے جس کی نصیحت لوگوں کو کرنے کے لئے چنا تھا۔

قرآن کو خدائی ہونے کے بارے میں ساری دنیا کو چیلنج دیا کہ فاتوا بسورۃ من مثلہ چنانچہ ساری دنیا ہکا بکا رہ گئی۔ چنانچہ جب مشرکین نے حضورؐ سے اس قرآن کے علاوہ دوسرا قرآن لانے کا مطالبہ کیا تو خدا نے آپ کو حکم دیا۔

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائ نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی[2]

میں تم میں پورے چالیس برس سے جی رہا ہوں نہ علم میں نہ زبان میں تم سے زیادہ واقفیت رکھتا ہوں پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ قرآن میں نے اپنے دل سے بنایا ہے اور جب چاہوں اسے بدل کر دوسرا قرآن پیش کر دوں[3]

۱۔ بنی اسرائیل آیت ۷۵۔

۲۔ یونس آیت ۱۵۔

۳۔ وحی محمدی رضا ص ۴۶۵

اس سلسلے میں ایک مضبوط دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیوی حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی جس میں منافقوں کے ساتھ بعض مومنوں نے بھی یقین کر لیا تھا۔ یہ تہمت آپ کے لئے اب تک کی تمام تکالیف میں سب سے بڑی تھی۔ بہت دنوں تک وحی کا نزول بند رہا۔ پھر حضرت عائشہؓ کی برأت میں سورہ آیات نازل ہوئیں۔ اگر نزول وحی میں حضور کی ذاتی استعداد کو دخل ہوتا تو اس بڑی مصیبت میں وحی ہرگز اتنے روز بند نہ ہوتی۔ چنانچہ بہت پہلے ہی کوئی ایک آیت بنا کر (نعوذ باللہ) اپنے دل کو سکون بخشتے اور منافقوں کی زبان پر قفل لگا دیتے۔

یہ سچ ہے کہ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو اللہ نے ایک مخصوص طریقے سے اپنے رسول کو عطا کی۔ دنیا کے تمام دانشوران محمد صلعم جیسا کوئی دوسرا انسان پیدا نہ کر سکے اور نہ پیدا کر سکتے ہیں۔ تو کیا ان کی یہ بے بسی اس دعوے کے لئے کافی نہیں؟ اس وحی کو جھٹلانے کے لئے مشرکین و منکرین نے جو کچھ بھی کہا ہے ان میں سے بعض خود تاریخ پر تہمت ہے اور بقیہ باطل ہے۔ آج صدیاں گذر جانے کے بعد کسی یقینی دلیل سے اس کی بتائی ہوئی کسی خبر کی تردید و تکذیب نہیں ہو سکی مثلاً قرآن نے کائنات کے مادّے کو دخان کہا ہے جو سائنس کی اصطلاح میں ابتہد ہے اور فرمایا کہ آسمان و زمین دونوں رتقاً تھے یعنی ایک ہی مادہ تھے جو باہم پیوست و متصل تھا پھر خدا نے ہر ایک کو جدا جدا صورت دیدی اور ان میں جاندار پھیلا دیئے اور فرمایا کہ خدا نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا ہے اور یہ کہ خدا نے تمام نباتات و حیوانات کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے[1]۔

۱۔ وحی محمدی رشید رضا ص ۲۶۵۔

اسلام کی بہت سی مثالیں قرآن پاک سے دی جا سکتی ہیں۔ قرآن نے انسانی زندگی کے مختلف قانون کی بنا دیئے ہیں۔ قرآن میں عقائد، اخلاق اور ان کی جائزیں قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے اس میں صرف اخلاقِ انسانی کی اصلاح کے لئے بہترین رہنمائی موجود نہیں ہے بلکہ عدل و انصاف، انتظامی معاملات اور مالیات کے بارے میں قوانین موجود ہیں اور جس کی بنیاد خدمتِ خلق اور خدائے واحد کے یقین پر قائم کی گئی ہے۔

ہمارا ایمان ہونا چاہیئے بلکہ ہے کہ قرآن کتاب اللہ ہے، کلام اللہ ہے۔ یہ انسانی پیداوار نہیں، یہی تو کتاب ہے جس میں تمام بنو نوع کی رشد و ہدایت ہے۔ اس میں وہی حقائق بیان کئے گئے ہیں جن کے مصدقات فطرت انسانی میں موجود ہیں۔ قرآن کی پیش کردہ مساوات اور اخوت کسی ملک و قوم یا کسی رنگ روپ کو نہیں دیکھتی۔ آج دنیا میں صرف قرآن ہی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے کہ وہ جس طرح جس زبان میں نازل ہوئی اسی میں محفوظ ہے۔ اس حیثیت کی کوئی کتاب آج دنیا میں موجود نہیں۔

اگر کسی کتاب کی قیمت کا اندازہ اس کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے یعنی اس بات سے کہ آدمی کے سوچ بچار کے گہرے سے گہرے اور اچھے سے اچھے پہلوؤں پر کیا اثر پڑا تو ضروری ہے کہ قرآن کو دنیا کی عظیم سے عظیم کتب میں ایک منفرد درجہ دیا جائے۔[1]

فرانسیسی دانشوروں کے قرآن کے بارے میں الفاظ ہیں:

"It is therefore the first
Arabic prose work - one that

۱۔ سندرلال، گیتا اور قرآن۔ ۱۸۱-۱۸۲۔

raised the idiom of that being to the eight of a civilized - while at the same time its declamatory style provide a rhythm and an inspiration for the whole of Moslem life."

آرتھرجیفری لکھتا ہے:

"The scripture of nother community, not even the old testament among the Jews, has had quite the same influence on the life of the comm ty as the Quran has had in Islam." ٢

اس طرح اہل اسلام کے ساتھ ساتھ بعض غیر قوم کے دانشوروں نے قرآن کو دوسری کتب آسمانی سے بڑا مانا ہے اور بالفاظ دیگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے مگر پھر بھی لوگ اس

Dominique Sowdel Translated by -١ Dunglass cutt - Islam.
he Quran as scripture. Arthur Jeffery -٢

اس حقیقت کو جھٹلانے میں عار نہیں سمجھتے۔ حضورؐ کے زمانے میں اور آپ کے فوراً بعد بہت سے لوگوں نے قرآن کو جھٹلایا جن میں مسلیمہ اور متنبی وغیرہ کا نام مشہور ہے۔ ان لوگوں نے اپنی شاعری کے مجموعہ کو قرآن کا مثل بنا کر پیش کیا لیکن زمانے نے اس کو قبول نہیں کیا۔ صرف انھیں پر کیا موقوف ہے شیطان نے تو قیامت تک اللہ سے مہلت مانگ رکھی ہے۔ ہر دور میں ایسے ولید اور مسلیمہ پیدا ہوتے رہیں گے جو قرآن کو اکتسابی ہنر بتا کر خود اس کے مدعی بن بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ وحی نہ تو کسب و ہنر سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی انسانی قوت و فکر سے۔ یہ تو خالص وحی اور منزل من اللہ ہے۔ اللہ پاک خود فرماتا ہے:

یاایھا الذین امنوا امنوا باللہ ورسولہ والکتب الذی
نزل علی رسولہ[1]

۱۔ النساء۔ آیت ۳۷۔

جامع مسجد رام پور

جناب محمد شعائر اللہ خاں صاحب، انگوری باغ رام پور

رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

غالب

شہرِ مصطفےٰ آباد جو ریاست رام پور کے نام سے جانا جاتا ہے ہمیشہ سے مرکز علم وفن اور گہوارۂ تہذیب رہا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کو اگر آپ ہندوستان کے نقشہ پر دیکھنے کا ارادہ کریں تو کافی جستجو اور تلاش کے بعد چند نقطوں سے زیادہ طول وعرض نہ دیکھ پائیں گے۔ پھر اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ۱۱۸۸ھ میں نواب فیض اللہ خاں صاحب نے اس کو پایۂ تخت قرار دے کر باقاعدہ آباد کیا تھا۔ اس حساب سے اس کی عمر صرف دو سو نو سال کی ہے لیکن اتنے قلیل عرصہ میں اس مختصر سی آبادی نے اپنا نام عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا ہے اور محتاج تعارف نہیں رہی۔ جس کی پہلی وجہ تو خدائے برتر کا کرم اور علمائے کرام و خاصانِ خدا کا وجود مسعود ہے اور دوسری وجہ تعلیم دین اور شعائر اسلام سے دلچسپی و رغبت کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ اہل علم نے اپنی زبان وقلم سے کبھی اس خطۂ رام پور کو

[illegible] کیا ماضی قریب میں بھی اور ماضی بعید میں بھی۔

اسی سلسلے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ [illegible] اوراق پر اُن منتشر حالات و واقعات کو یکجا کیا جائے جن کا تعلق اسلام کی اس عمارت سے ہے جو ہر مسلم آبادی کے لیے ضروری ہے اور جسے مسجد [illegible] کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عنوان پر اب تک باقاعدہ نہیں لکھا گیا ہے بلکہ عمارات رام پور کے تحت ذیلی طور سے بہت مختصر تعارف کرایا گیا ہے اسی لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ مفصل طور سے اس پر لکھا جائے چنانچہ اب تک کی حاصل شدہ معلومات کو سپرد قلم کر رہا ہوں۔

جامع مسجد رام پور کی بنیاد عہد فیض اللہ خانی سے مانی گئی ہے جس کو اکثر مصنفوں نے تسلیم کیا ہے لیکن کسی نے تاریخ کا تعین نہیں کیا ہے۔ نجم الغنی خاں (م ۱۹۳۲ء) لکھتے ہیں:

"نواب (فیض اللہ خاں) صاحب کے عہد میں مسجدیں بکثرت تعمیر ہوئیں جامع مسجد قدیم انھیں کی تعمیر کرائی ہوئی تھی۔[۱۱]"

امیر مینائی (م ۱۹۰۰ء) بھی اسی طرح کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عہد دولت میں مسجدیں بکثرت تعمیر ہوئیں اور ایک مسجد ایسی عالی شان بنی کہ اس سرزمین پر بے نظیر ہے حسن نیت سراپا برکت سے آج تک دن رات مصلیوں کی جماعت سے رونق پذیر ہے۔"[۱۲]

تاریخ کے تعین کے سلسلے میں پہلی بار کلب علی خاں فائق رام پوری نے اپنے مضمون مدرسہ عالیہ رام پور میں یہ انکشاف کیا ہے کہ "میرے مرحوم چچا احمد رضا خاں (ولادت ۱۸۸۱ء وفات ۱۹۷۲ء) نے بتایا کہ جامع مسجد فیض اللہ خانی کے دروازہ کی محراب [illegible] کندہ تھا۔

ایک مسجد فیض کعبۂ نو [۳]

۱۱۸۰ھ

ہجری سال ۱۱۸۰ کا عیسوی ۱۷۶۶ برآمد ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ رام پور کے پایۂ تخت قرار پانے سے پہلے اس کی تعمیر ہوئی۔ اس کا مزید ثبوت جسٹس ارشاد اللہ خاں (م ۱۹۷۹ء) کی تحریر سے بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> نواب فیض اللہ خاں صاحب مع مولوی (غلام جیلانی خاں) صاحب اور دیگر پٹھانوں کے سرداروں کے ساتھ رام پور آئے تو انھوں نے رام پور شہر میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ [۴]

فیض اللہ خاں کے رام پور آنے سے مراد وہ وقت ہو سکتا ہے کہ جب وہ اور ان کے بھائی عبداللہ خاں احمد شاہ ابدالی کی قید سے اپنے والد علی محمد خاں کے انتقال سے تین سال بعد ۱۷۵۲ء میں رام پور آئے تھے اور یہ مسجد انھوں نے وُرودِ رام پور کے دس پندرہ سال بعد بنائی ہو۔ اس طرح سال ۱۱۸۰ھ کی صحت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

اس مسجد کی بنیاد ہمیشہ علماء و صوفیاء کے ہاتھ سے رکھی جاتی رہی ہے چنانچہ فیض اللہ خانی مسجد کی بنیاد کے سلسلے میں ایک واقعہ کی کتاب حالات ۔ ان مولوی غلام جیلانی خاں مصنفہ جسٹس ارشاد اللہ خاں میں ملتا ہے۔ [۵]

اس کے علاوہ اس مسجد کی بنیاد رکھنے والوں میں حافظ سید محمد ایوب صاحب بھی تھے جو قادریہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ [۶]

بہرحال یہ خوبصورت جامع مسجد ۱۱۸۰ھ میں تیار ہوئی جو اس وقت کی آبادی اور شاندار رہائشی عمارتوں کے لحاظ سے یقیناً بے مثل رہی ہو گی۔

منشی امیر اللہ تسلیم (م ۱۹۱۱ء) اس کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اسی عہد دولت میں شام و سحر
بنیں مسجدیں جا بجا بیشتر
خصوص ایک مسجد ہے وہ دلپذیر
نہیں جس کا ہندوستاں میں نظیر [۸]

لیکن جب آبادی میں اضافہ ہوا اور رہائشی عمارتوں نے شان و شوکت اختیار کی تو خدائے برتر کی عبادت کے گھر کی توسیع اور تعمیر جدید کی بھی ضرورت پیش آئی چنانچہ جامع مسجد کو وسیع کرنے کے لئے برابر کی جگہ حاصل کی گئی اور اس جگہ پر ایک خوشنما دالان کے پانچ دروازوں والی لاثانی عمارت تعمیر کی گئی جس پر تین گنبد اور چار مینار تعمیر کئے گئے جن پر کلس ہائے ملمع طلائی نصب کئے گئے اس طرح یہ مسجد الگ مکمل حیثیت کی مالک ہوگئی اور جامع مسجد کہلائی ۔ کلب علی خاں (م ۱۸۸۷ء) نے قدیم جامع مسجد کے برج گرا دیئے اور وہ اس کی بغل میں سماگئی۔" [۸]

اس نو تعمیر کے بارے میں نجم الغنی خاں صاحب رقم طراز ہیں کہ

"(کلب علی خاں) نے ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی ۲۲ شعبان ۱۲۹۱ھ مطابق ۴ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو علماء و فضلاء اور اولیائے شہر کے ہاتھ سے اس کی بنیاد کی اینٹ رکھوائی اور ۱۲۹۲ھ میں بن کر تیار ہوئی ۔ عمارت خوشنما اور وسیع تھی جس کے مصارف کی تعداد نواسی ہزار دو سو تینتیس روپے پونے دو آنے ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے : تعمیر میں بیاسی ہزار آٹھ سو چار روپے سوا تیس آنے ۔ کلس ہائے ملمع طلائی چھ ہزار چار سو اٹھارہ روپے ساڑھے چودہ آنے ۔" [۹]

محمد ایوب قادری صاحب نے اپنے ایک مضمون "عمارات بھوپال" سنہ ۱۹۶۲ میں امپیریل گزیٹیر جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۳ کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ کلب علی خان نے جامع مسجد کی تعمیر پر تین لاکھ روپے صرف کئے تھے[۱]

منشی امیر اللہ تسلیم اس تعمیر جدید کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

سراپا دلہن کی طرح دل فریب
فلک دیکھ کر دل میں ہوں ناشکیب
وہ تعمیر کی مسجد لاجواب
کہ عالم میں نکلے نہ جس کا جواب
یہ رفعت نہ دیکھی سنی خواب میں
کہ نُہ چرخ ساجد ہیں محراب میں
فضا صحنِ مسجد کی ایسی کہ دل
تمنائے جنت سے ہو منفعل
اگر آنکھ پڑ جائے دیوار پر
صفا سی نظر آئے عکسِ نظر
وہ پائی ہے عظمت کہ میں کیا کہوں
بجا ہے اگر گھر خدا کا کہوں
ہزاروں مسلمان اہلِ نیاز
جماعت سے پڑھتے ہیں باہم نماز
مقرر ہیں روز و شب و صبح و شام
خطیب و مؤذن مکبّر امام[۱]

مسجد کے آنگن میں داہنے اور بائیں جانب کمرے بنائے گئے جن میں ۔۔۔ کے قریب

مدرسہ عالیہ بھی آگیا تھا جو ۱۹۱۲ء تک رہا اور پھر گنج قدیم میں منتقل ہوگیا جہاں سے ۱۹۲۰ء میں یہ کلب گھر کی عمارت میں منتقل ہوا اور اب تک وہیں ہے۔

ایک صدر دروازہ تعمیر کیا گیا جس پر ایک گھنٹہ ہر دو رخ نصب ہے کہ اندر اور باہر والے ایک ساتھ اس میں وقت دیکھ سکتے ہیں۔ یہ گھنٹہ ۱۸۶۷ء میں خصوصاً پرنس آف ویلز کے لئے بنا تھا اور اسے لندن کی جے بی بینسن کمپنی نے بنایا تھا بزرگوں کی روایت کے بموجب کلب علی خاں صاحب نے لندن سے سیکنڈ ہینڈ منگوایا تھا اور یہاں لگوایا۔ اس گھنٹہ پر دو تختیاں نصب ہیں جن پر یہ تحریر ہے:

پہلی تختی

Wath and Clock Maker by Special Appointment To H.R.H: The Prince Of Wales

دوسری تختی

J. B. Benson Ludcate Hill and Old Bondst LONDON.

اس گھنٹہ کی آواز میلوں دور تک سنی جاتی ہے۔ بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ نواب کلب علی خاں خود بھی نماز جمعہ کے لئے مسجد تشریف لاتے تھے۔

زمانے کے شب و روز گذرتے رہے بالآخر نواب حامد علی خاں کی نوابی کا زمانہ آیا انھیں تعمیرات کا بے حد شوق تھا۔ حسن اتفاق سے انھیں کرنل [illegible] نام کا ایک فرانسیسی انجینئر مل گیا جس کے ذریعہ انھوں نے تعمیرات کا کام کرایا۔

عام چونکہ اکثر سرکاری عمارات اندرونِ قلعہ رنگ محل، حامد منزل (رضا لائبریری) پچلی بھیت (گرلز ڈگری کالج) امام باڑہ و مسجد اور بیرونِ قلعہ صدر کچہری کوٹھی خسرو باغ (رضا ڈگری کالج) کوٹھی شاہ آباد، کوٹھی بے نظیر، کوٹھی خاص باغ، اسٹیٹ ہائی اسکول (حامد انٹر کالج) وغیرہ سب اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان تمام تعمیرات کے ساتھ نواب حامد علی خاں نے جامع مسجد کو بھی از سرِ نو تعمیر کرانے کا ارادہ کیا۔ اخبار دبدبۂ سکندری لکھتا ہے:

> "نواب خلد آشیاں (کلب علی خاں) کی تعمیر کردہ جامع مسجد جو اب مخدوش حالت میں تھی نواب حامد علی خاں نے اپنی علوِ ہمتی سے براہِ رعایا نوازی منہدم کرا کے از سرِ نو نہایت خوشنما و شاندار جامع مسجد تعمیر کرنے کے لئے کئی لاکھ روپے کی منظوری صادر فرمائی اور انہدام کا کام شروع ہو گیا ... . . . اور طے پایا کہ مسجد کی تعمیر کی تکمیل تک نمازِ جمعہ موتی مسجد میں ہو۔ چنانچہ ۴ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۱۲ء کو پہلی مرتبہ نمازِ جمعہ موتی مسجد میں ہوئی۔ موتی مسجد جامع مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے اور کافی وسیع ہے اور مسجد کے اندر حوض بھی ہے۔"[۱۱۶]

جامع مسجد منہدمہ کے برابر قدیمی جامع مسجد تھی جسے نواب فیض اللہ خاں صاحب نے بنوایا تھا۔ نواب کلب علی خاں نے ۱۸۷۴ء میں تعمیرِ نو کے وقت اس کا الگ وجود برقرار رکھا تھا لیکن نواب حامد علی خاں نے اس موقع پر اس مسجد کا کچھ حصہ موجودہ جامع مسجد میں شامل کر دیا اور باقی حصہ کو الگ ایک

حصہ کو صحن میں چھوڑ دیا جس میں عورتیں اب بھی جمعہ کے روز نماز ادا کرتی ہیں۔

میرے نانا خطیب اعظم حضرت مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں صاحب (م ۱۹۸۴ء) نے میرے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ قدیم جامع مسجد کو صحن شامل کرنے سے جامع مسجد کا دالان تو ضرور وسیع ہو گیا لیکن صحن ٹیڑھا ہو گیا جس سے اس کی خوبصورتی جاتی رہی۔ اگر حامد علی خاں پرانی مسجد کو اس میں شامل نہ کراتے تو اس کی خوبصورتی دیکھنے کے قابل ہوتی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صحن کی ٹیڑھ مسجد کی خوبصورتی پر اثر انداز ہے۔

الغرض مسجد کی تعمیر کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔

> نواب حامد علی خاں نے چاہا کہ نماز جمعۃ الوداع اپنے قدیم مقام پر ہو اور مسلمانوں کو عظیم الشان جماعت کے برکات حاصل ہوں لہٰذا شب و روز تعمیر کا کام کرایا گیا اور ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۱۳ء کو نماز جمعۃ الوداع جدید تعمیر شدہ جامع مسجد میں پورے اسلامی کروفر اور شان و شوکت کے ساتھ ہزارہا مسلمانانِ رامپور نے ادا کی۔" ۱۳

اس کے اختتام پر عبدالحکیم خاں مضطر نے یہ تاریخ لکھی:

شاہ اورنگِ عدالت نورِ چشم دین و داد
ظلِ اُو بر فرقِ ما بادا الٰہی دائما
مسجدِ جامع وسیع و مرتفع تعمیر کرد
فی المثل گوئی کہ بر فرش ست عرشِ کبریا
از پئے تاریخ بمضطر ہاتفِ القا نمود
از پئے ذکر و صلوٰۃ و منبر و بانگ و دعا ۱۴

۱۳۳۲ھ

جامع مسجد [illegible] کا محل وقوع بہت عمدہ ہے۔ چاروں طرف بازار ہے اور [illegible]
میں واقع ہے۔ شمالی جانب میں کوچہ سعل ہے نیچے بانا مرادف ہے جنوب مشرق
میں بازار صفت گر ہے۔
مسجد کافی وسیع ہے اندرونی حصہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ساڑھے تیرہ سو افراد بآسانی نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں۔ اندرونی حصہ میں سنگ مرمر کا سفید اور کالا فرش شطرنج کی بساط کی طرح بچھا ہوا ہے جو ہر زمانہ میں ٹھنڈا رہتا ہے اور اس پر خوبصورت دریاں بھی رہتی ہیں۔ مسجد کے درمیانی حصہ میں تین شاندار منبت کاری کے سنہری و روپہلی کام سے مزین محرابیں ہیں۔ بیچ میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور دائیں بائیں پتھر کے تراشیدہ خوبصورت منبر ہیں۔ ابھی حال میں بیچ کی محراب میں رنگین ٹائلیں (TILES) لگ گئی ہیں جن سے محراب کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔
مسجد کے اندرونی حصہ میں داخل ہونے کے لئے محرابی شکل میں بہترین قسم کی منبت کاری سے مزین طویل و عریض سات شاندار دروازے ہیں، درمیانی دروازہ نسبتاً بڑا ہے۔ سب پر انتہائی شاندار تانبہ کے کواڑ جڑے ہوئے ہیں اندرون حصہ کے درمیان میں خوبصورت قسم کے چھ ستون ہیں پہلے ان پر پلاسٹر اور رنگ کیا ہوا تھا ابھی ۱۹۸۰ء میں ان پر مزیک (MOSAIC) کیا گیا ہے جس سے اس کی خوشنمائی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ان ستونوں کے درمیان سنہری کام کے بہت عمدہ بلوری جھاڑ زنجیروں کے ذریعہ چھت میں آویزاں ہیں ان پر سونے کا پانی کیا ہوا ہے اور بجلی کے بلب نصب ہیں۔ اس کے علاوہ خاص تعداد میں بجلی کے پنکھے بھی آویزاں ہیں جو گرمی کے زمانہ میں نمازیوں کو بہت آرام پہنچاتے ہیں۔
مسجد کا صحن بھی بہت وسیع ہے جس میں تقریباً ڈھائی ہزار افراد بیک وقت

نماز ادا کر سکتے ہیں اس کا فرش سرخ پتھر کا ہے۔ درمیان صحن میں دو خوبصورت کھمبے نصب ہیں جن پر روشنی کے لئے لائٹیں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ پورے صحن میں دیگر کھمبے بھی نصب ہیں جن پر ٹاٹ کھنچے ہوئے ہیں ان پر دھوپ وغیرہ سے بچنے کے لئے سائبان لگا دیئے جاتے ہیں۔ شرقی جانب صدر دروازہ مسجد کے مناسب اور شاندار طریقہ پر بنا ہوا ہے۔ اس پر گھنٹہ بھی نصب ہے۔ وضو کرنے کے لئے جنوب کی سمت میں کافی وسیع و عریض حوض بھی ہے جس کے بیچ میں دو فوارے نصب ہیں اس میں رنگین مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں اس کے علاوہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایک ٹنکی بھی بن گئی ہے جس سے نمازیوں کو مزید آسانی ہو گئی ہے۔

صدر دروازے کے علاوہ دو چھوٹے دروازے اور بھی ہیں جو ہر وقت آمد و رفت کے لئے کھلے رہتے ہیں ان میں تحصیل کی جانب کے صدر دروازہ کی تعمیر جدید اگست ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی۔ جنوب مشرقی جانب میں اذان دینے کے لئے ایک مینارہ (اذان گھر) ہے جہاں سے اذان لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ دی جاتی ہے، لاؤڈ سپیکر نظام یہاں ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا۔

جامع مسجد کی ایک خاص تقریب جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو ہوتی ہے اس میں قرآن خوانی، نقل اور جلسہ سیرت کے پروگرام مرتب ہوتے ہیں بعدہٗ لڈو تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس جشن کو عام طور سے اہل رام پور لڈو خانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جشن برسہا برس سے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

اس مسجد کا انتظام و انصرام ہمیشہ سے ریاست کے زیر تحت رہا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں انضمام ریاست کے بعد اسٹیٹ وقف آفس اس کی دیکھ بھال کرتا رہا جس کے ذمہ دار نواب صاحب رام پور تھے۔ اب یکم اپریل ۱۹۷۶ء سے اس کا انتظام شہر کے

دہلی کی ایک کمیٹی کر رہی ہے جس کا یوپی سنی سینٹرل وقف بورڈ لکھنؤ سے الحاق
ہے۔

اس کمیٹی کے قیام سے جامع مسجد کے انتظام و انصرام میں کافی بہتری واقع ہوئی۔ کمیٹی نے بہت سی جدید تعمیرات بھی کرائی ہیں جیسے اندر کے حصّے میں دیواروں پر پلاسٹر، ستونوں پہ موزیک، آنگن میں کمل شمسی سائبان گنگوں کی تعمیر اور جدید مارکیٹ کا قیام، جس سے کہ آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے ـــــ خدا کرے یہ سلسلۂ انتظام اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

آخر میں جامع مسجد کے اماموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ قاری سید علی حسین نقشبندی محدث	آپ ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ وفات آپ کی ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ آپ فیض اللہ خانی جامع مسجد کے امام تھے۔
۲۔ مولوی حافظ عبدالشکور	آپ ۱۸۴۰ء / ۱۲۵۶ھ سے ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ تک فیض اللہ خانی جامع مسجد کے امام رہے۔
۳۔ مولوی ثناء اللہ	جمادی الاول ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء تک زندہ تھے آپ فیض اللہ خانی جامع مسجد کے امام رہے۔
۴۔ مولوی سید منیر علی قادری	۱۸۷۵ء / ۱۲۹۲ھ میں تعمیر نو کے وقت آپ نے کلب علی خاں صاحب کی خواہش پر صرف ایک جمعہ پڑھایا۔ خطبہ کا ایک شعر یہ ہے ؎ اے دل بکن گناہ کہ تحقیق مردہ نیست اعمال نیک کن کہ قیامت رسیدہ نیست

۵۔ مولوی سید شاہ ولی قادری	۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۲ء تک آپ نے بحیثیت خطیب صرف جمعہ پڑھایا۔ ۸ رجون ۱۹۰۲ء کو آپ کا انتقال ہوا۔
۶۔ سید مرتضیٰ علی صاحب	آپ کا نام امام کی حیثیت سے ۱۸۹۱ء میں ملتا ہے [١٩] اور انتقال ۲۳ر جولائی ۱۹۱۳ء کو ہوا [٢٠] لہٰذا آپ کلب علی خانی جامع مسجد کے امام رہے۔
۷۔ سید فتح علی صاحب	آپ کا ذکر بھی ۱۸۹۱ء میں ملتا ہے [٢١]۔ لہٰذا آپ بھی کلب علی خانی جامع مسجد کے امام رہے۔
۸۔ حافظ سید محمد شاہ صاحب	آپ کا نام ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۱ء تک پیش امام کی حیثیت سے آتا رہا ہے [٢٢]۔ لہٰذا آپ کلب علی خانی جامع مسجد کے امام رہے۔
۹۔ سید جمیل حسن قادری	آپ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۲۳ء تک نائب امام کی حیثیت سے رہے۔ ۱۹۲۳ء کے بعد آپ امام اول ہو گئے۔ ۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔
۱۰۔ حافظ حاجی کلن صاحب	آپ کا ذکر ۱۹۰۹ء میں آیا ہے۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں آپ کا انتقال ہوا [٢٣]۔
۱۱۔ سید ابو الحسن صاحب	آپ ۱۹۱۳ء میں امام اول مقرر ہوئے

اور ۱۹۲۳ء میں مستقل ہو گئے۔

۱۲۔ حافظ صدیق صاحب

نائب امام کی حیثیت سے آپ نے کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دی اس کے بعد موتی مسجد میں تبادلہ ہو گیا۔ لیکن ایک ماہ کے بعد ہی پھر آپ کو جامع مسجد میں بلا لیا گیا۔ جہاں کچھ مدت رہے۔

۱۳۔ مولوی جلال میر صاحب افغانی

نائب امام کی حیثیت سے آپ نے صرف ایک ماہ کام کیا اس کے بعد آپ کا تبادلہ کربلا کی مسجد میں کر دیا گیا۔

۱۴۔ قاری محمد امین الدین صاحب

نائب امام کی حیثیت سے آپ کا ذکر دبدبۂ سکندری شمارہ ۲۷ / اگست ۱۹۴۴ء میں ملتا ہے۔ فروری ۱۹۴۹ء میں آپ امام اول ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۱ء میں آپ پاکستان چلے گئے۔

۱۵۔ مولوی محمد افضل صاحب افغانی

ابتداء ۱۹۴۶ء میں ایک ماہ کے لئے نائب امام مقرر ہوئے لیکن بسبب اختلاف عقائد ناپسندیدہ برطرف کر دیئے گئے۔

۱۶۔ حافظ محمد وحید الرحمن صاحب مجددی

آپ بھی ۱۹۴۶ء میں صرف تین چار ماہ ہی بحیثیت نائب امام رہے۔

۱۷۔ قاری عبدالحق خاں صاحب

۱۹۴۶ میں بحیثیت نائب امام آپ کا تقرر ہوا اور ۱۹۵۱ء میں [illegible] گئے

لیکن ۱۱ر جنوری ۱۹۵۴ء کو بوجہ اختلاف علیحدہ ہو گئے۔

۱۸۔ سید نورالحسن صاحب قادری

آپ کا باضابطہ تقرر ۱۹۵۱ء میں بحیثیت نائب امام ہوا۔ اس سے پہلے آپ مؤذن کے عہدہ پر تھے۔ یکم مئی ۱۹۵۴ء کو آپ کا پیش امام کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں مستعفی ہو گئے۔

۱۹۔ مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی

یکم مئی ۱۹۵۴ء کو آپ کا پیش امام کے عہدہ پر تقرر ہوا لیکن دسمبر ۱۹۵۷ء آپ برطرف ہو گئے۔

۲۰۔ خطیب اعظم مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب قادری مجددی

۱۳ر جنوری ۱۹۵۸ء میں آپ باقاعدہ امام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس سے پہلے آپ مختلف اوقات میں خطیب کی حیثیت سے کام انجام دیتے رہے۔ یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو آپ اس عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔

۲۱۔ مفتی حبیب علی صاحب قادری (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ رام پور)

ویسے تو آپ ۱۹۵۸ء سے بحیثیت نائب امام تھے لیکن آپ کا باضابطہ تقرر ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۴ء سے ہوا ہے جس پر آپ فائز ہیں۔

۲۲۔ مولوی سید احمد علی صاحب چشتی نظامی

یکم جولائی ۱۹۷۸ء سے بحیثیت خطیب آپ کا تقرر ہوا ہے۔

۲۳۔ مولوی عطاء اللہ خاں

آپ کا تقرر ۷ر مئی ۱۹۸۴ء کو بحیثیت امام ہوا ہے۔

حوالہ جات

ا۔ اخبار الصنادید حصہ اوّل مولفہ نجم الغنی خاں مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۸ء صفحہ ۵۹۸ ۔

۲۔ انتخاب یادگار مؤلفہ امیر احمد مینائی مطبوعہ تاج المطابع (رام پور) ۱۲۹۰ھ صفحہ ۳۴ ۔

۳۔ مضمون "مدرسہ عالیہ رام پور" از کلب علی خاں فائق شائع شدہ علم و آگہی کراچی علمی ادارے نمبر ۷۵-۱۹۷۴ء صفحہ ۲۹ ۔

۴،۵۔ حالات خاندان مولوی غلام جیلانی خاں جسٹس ارشاد اللہ خاں مطبوعہ کراچی صفحہ ۷ ۔

۶۔ تذکرہ کاملان رام پور مولفہ احمد علی شوق رام پوری مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء صفحہ ۷۶

۷۔ تاریخ بدیع مصنفہ امیر اللہ تسلیم مطبوعہ حسنی پریس رام پور ۱۲۹۸ھ صفحہ ۳

۸۔ اخبار الصنادید ایڈیشن ۱۹۰۶ء مطبوعہ خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور صفحہ ۹۳۶

۹۔ اخبار الصنادید جلد دوم ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۸۳

۱۰۔ مضمون "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟ علمائے روہیل کھنڈ" از محمد ایوب قادری، شائع شدہ رسالہ العلم کراچی جلد ۲ شمارہ ۳ صفحہ ۸۱

۱۱۔ تاریخ بدیع صفحہ ۲۱۱ ۔

۱۲۔ ہفتہ وار دبدبۂ سکندری رام پور جلد ۴۸ مورخہ [illegible] نومبر [illegible] صفحہ ۱۲

۱۳۔ دبدبۂ سکندری جلد ۴۹ شمارہ ۳۸ مورخہ ۲۷ ستمبر [illegible] صفحہ ۱۳

۱۴۔ اخبار الصنادید حصہ اول ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ [illegible]

۳۵ دبدبۂ سکندری مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۳۹ء
۳۶ تذکرۂ کاملانِ رام پور صفحہ ۲۵۳
۳۷ خود نوشت بیاض مولوی منور علی صاحب مملوکہ صغیر احمد صاحب (مرحوم)
۳۸ تواریخ آئینۂ تصوف از محمد حسن صابری، لاہور آرٹ پریس لاہور، ۱۹۷۴ء صفحہ ۵۰۹ ۔
۳۹ رام پور اسٹیٹ گزٹ جلد ۳ شمارہ ۱۵ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۸۹۱ء ۔
۴۰ دبدبۂ سکندری جلد ۴۹ شمارہ ۳۴ مورخہ ۴ اگست ۱۹۱۳ء ۔
۴۱ رام پور اسٹیٹ گزٹ جلد ۳ شمارہ ۱۵ ۔
۴۲ رام پور اسٹیٹ گزٹ ۱۹۰۳ و دبدبۂ سکندری ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۱ء
۴۳ دبدبۂ سکندری جلد ۴۵ شمارہ ۴۴ مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۰۹ء

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شمالی افریقہ کی مکمل فتح کے بعد وہاں کی مسلم حکومت نے اسپین کی طرف توجہ کی۔ اسپین میں سیاسی اور سماجی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں کے عوام موجودہ حکمرانوں کے ظلم وستم سے نجات پانے کے متمنی تھے۔ شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے ابتدا میں اسپین کی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے پانچسو افراد پر مشتمل ایک دستہ کے ساتھ اپنے ایک معتمد فوجی ظریف کو بھیجا۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد ۷۱۱ء میں اپنے مسلم غلام اور فوجی بربر کو جس کا نام طارق بن زیاد تھا، اسپین کی فتح کے لئے پانچ ہزار فوج لیکر روانہ کیا۔ طارق نے اپنی فوج کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر اسپین کے ساحل پر قدم رکھا اور یہ کہہ کر اپنی کشتیوں کو جلانے کا حکم دیا کہ ہم اسپین کو فتح کریں گے یا اسی سرزمین پر شہید ہو جائیں گے اس جگہ کو آج تک جبل الطارق (JIBRALTER) کہا جاتا ہے۔ طارق کو یہاں تیزی کے ساتھ فتوحات حاصل ہوئیں اور ایک سال سے کم ہی مدت میں طارق نے نصف سے زیادہ ملک کو فتح کر لیا۔ بہت سی جگہوں پر بغیر کسی لڑائی کے لوگوں نے اپنے شہر اور قلعے مسلم فوج کے حوالے کر دیئے۔ جن شہروں کو طارق نے فتح کیا ان میں زیادہ اہم

قرطبہ وغیرہ فتح ہو گئے تھے۔ طارق کو موسیٰ کی طرف سے مدد ملتی رہی۔ مگر کچھ دنوں بعد موسیٰ بن نصیر خود بھی ایک فوج لے کر اسپین پہونچ گئے۔ اور باقی اسپین کو موسیٰ اور طارق نے مل کر فتح کیا۔ دو سال سے کم ہی مدت میں پورا اسپین مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ یہ بنو امیہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور شام کے پایۂ تخت دمشق میں ولید کی حکومت تھی۔

۷۱۵ء میں ولید کا بھائی سلیمان خلیفہ بنا اور اس نے اپنی خفگی کی وجہ سے شمالی افریقہ اور اسپین کی گورنری سے موسیٰ بن نصیر کو معزول کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس کے بعد چالیس سال تک اسپین میں حکومت تو مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہی لیکن آپس کے جھگڑے شروع ہو گئے جس کی وجہ سے آئے دن گورنر بدلنے لگے۔ یہاں تک کہ عرب قبیلوں کے اس جھگڑے کی وجہ سے پینتیس چالیس سال کے درمیان اتنے ہی گورنر آئے اور گئے۔ آٹھویں صدی کے وسط میں اسلامی دنیا میں سیاسی سطح پر ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ نظام حکومت بنو امیہ کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس نئی حکومت نے اپنے دارالسلطنت کے لئے بغداد کا انتخاب کیا۔ مگر شمالی افریقہ اور اسپین پر عباسیوں کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ چنانچہ اسپین کے گورنر یوسف الفہری نے اپنی آزاد بادشاہت قائم کر لی اور اسپین عباسی حکومت سے الگ ہو گیا۔

بنو امیہ کے ہر ہر فرد کو عباسیوں نے ۷۵۰ء کے انقلاب میں چن چن کر مار ڈالا۔ لیکن بنو امیہ کے شاہی خاندان کا صرف ایک نوجوان لڑکا جس کی عمر پندرہ سال تھی کسی نہ کسی طرح جان بچا کر شمالی افریقہ پہونچ گیا اور پانچ سال تک یہ نوجوان جس کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ شمالی افریقہ کے مختلف دیہاتوں میں چھپ چھپ کر وقت گذارتا رہا۔ آخر اس نے اپنے ایک غلام کو جس کا نام بدر تھا۔ یہ معلوم کرنے

کے لئے اسپین بھیجا کہ وہاں کے عرب قبیلے عبدالرحمٰن کی حمایت کر سکتے ہیں یا نہیں اور اس کا ساتھ دیں گے یا نہیں۔ بدر جو جواب لے کر آیا اس سے عبدالرحمٰن کا حوصلہ بلند ہوگیا اور وہ خاموشی سے اسپین پہونچ گیا۔ یہاں کے عرب قبیلے جو بنو امیہ کے خاندان سے بہت ہمدردی رکھتے تھے، عبدالرحمٰن کا پورا ساتھ دیا۔ اسپین کے آزاد گورنر یوسف الفہری اور عبدالرحمٰن کے ساتھ "زلاقہ" کے میدان میں زبردست جنگ ہوئی جس میں عبدالرحمٰن فتح یاب ہوا۔ اس طرح ۷۵۶ء میں اسپین میں بنو امیہ کی حکومت دوسری بار قائم ہوگئی جس کا پہلا بادشاہ عبدالرحمٰن تھا۔ عبدالرحمٰن نے باہر آکر اسپین کو نئے سرے سے فتح کیا اس لئے لوگوں نے اس کو الداخل کا خطاب دیا یعنی باہر سے داخل ہونے والا۔

عبدالرحمٰن نے اسپین میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے باہمی تنازعات کو ختم کیا اور بہت نظم وضبط کے ساتھ حکومت شروع کی۔ اسپین میں بنو امیہ کی یہ حکومت ۷۵۶ء سے ۱۰۳۱ء تک تقریباً پونے تین سو سال قائم رہی۔ اس مدت میں یہ حکومت نشیب وفراز سے گزرتی رہی۔ بعض کمزوریاں راہ پاتی رہیں لیکن موقع موقع ان کا مداوا بھی ہوتا رہا۔ مثلاً تین نسلوں کے بعد یہ حکومت جو آپسی جھگڑوں کا شکار ہوکر کمزور اور محدود ہونے لگی لیکن دسویں صدی کے آغاز میں عبدالرحمٰن نے جس کو الناصر کہا جاتا ہے، دوبارہ اس حکومت کو مستحکم کیا۔ یہ عبدالرحمٰن سوم ۹۱۲ء سے ۹۱۶ء تک حکمراں ۔ ۹۲۹ء تک بنو امیہ کی یہ حکومت اسپین میں "امارت" کے نام سے معروف رہی اور اس کے بادشاہوں کو امیر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا لیکن ۹۲۹ء میں جب عبدالرحمٰن الناصر کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی اس نے بنو امیہ کی اس حکومت کو "امارت" کے بجائے "خلافت" میں بدل دیا اور اپنے لئے امیر کے بجائے خلیفہ کا لقب پسند کیا۔ اس کے بعد سے آخری دور

بجاطور پر کی حکومت اموی خلافت کہلائی۔ اس طرح سے بنو امیہ کی اسپین میں امارت کا زمانہ ۷۵۶ء سے لے کر ۹۲۹ء تک ہے۔ اس کے بعد ۹۲۹ء سے ۱۰۳۱ء تک کا زمانہ خلافت کا کہلاتا ہے۔ لیکن آخری دنوں میں بنو امیہ کی یہ حکومت اتنی کمزور ہوگئی کہ اکثر گورنروں نے اپنے اپنے شہروں میں آزاد حکومتیں قائم کرلیں۔ یہاں تک کہ بنو امیہ کی حکومت جو سمٹتے سمٹتے اپنے دار الحکومت قرطبہ میں محدود ہوگئی تھی وہ بھی آخرکار ختم ہوگئی۔

(باقی)

جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

کی

چوتھی برسی کی یاد

یکم مئی سنہ ۱۹۸۸ء

ایثار و حریت کے عنوان تھے عتیق — بنیادِ انقلاب ایمان تھے عتیق
زاہد کہیں مجاہد حافظ کہیں محافظ — آدم کے وارثوں کی پہچان تھے عتیق
حق نے انھیں بنایا دانائیوں کا پیکر — تفسیر درسِ آلِ قرآن تھے عتیق

ہر دردِ دلا دوا کے درماں تھے عتیق
رحمت چراغ راہ ایمان تھے عتیق

بعد از ختم قرآنِ کریم اور درود، فاتحہ خوانی نیز دعائے مغفرت اور تعزیت کے ایصال ثواب برائے روح پاک جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلی بر موقعہ اُن کی چوتھی برسی یکم مئی سنہ ۱۹۸۸ء
منجانب مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگ والی سوہنہ ضلع گوڑگانوہ ہریانہ

آج ہم ایک ایسے انسان کے متعلق گفتگو اور یاد منا رہے ہیں جس کی بلند و بالا شخصیت کی تعریف و توصیف سے زبان و قلم عاجز ہے۔ وہ انسان جس کا باطن ان کے ظاہر سے کہیں پاک و صاف اور پرکشش تھا اس لئے وہ انسان اسلامی عرفان و تہذیب کے دریائے بے کراں کا دُرِّ بے بہا تھا۔ وہ انسان جس کے قلب پر نورِ علم درخشاں جس کی روح پر عشق الٰہی محیط، وہ انسان جس کے پورے وجود پر اخلاص کی حکمرانی تھی۔ یہ سب آثار اس کے چہرے پر باہر دظاہر تھے۔ مرحوم ایک بہت بڑے جیّد عالم باعمل اور قوم کے مجاہد ہی نہ تھے بلکہ اخلاق تہذیب کے بھی ایک عظیم معلّم تھے۔ آپ کی انکساری سادگی مہربانی، خاموشی اور وقار کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ مرحوم وہ انسان تھے جنھوں نے مذہب اور اس کی روحانیت کو سمجھا تھا، آج کل تو حالت یہ ہے کہ مذہب میں روحانیت ہی نہیں دکھائی دیتی، جہاں اجلی پوشاکیں تو ہوتی ہیں مگر روح سیاہ اور دِل اُتنے ہی میلے ہوتے ہیں لیکن مرحوم مولانا جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب کچھ بہت پہلے اس وقت محسوس کیا تھا کہ جب انسان دین حق یعنی مذہب کی ہی بنیاد پر زندگی گزارتا تھا مگر افسوس کہ وہ اب وہ نہیں رہے۔

(اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی دینی، ملّی و قومی خدمات کو بے حد مقبول فرماکر پسران و عزیزان کو ان کا نعم البدل عطا فرمادے آمین۔

اللہ اُن کی پوری پوری مغفرت فرماکر جنت الفردوس

میں مقام عطا فرما دے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل بالخصوص ان کے پیارے بیٹوں کو مرحوم موصوف کے اوصاف حمیدہ کو اپنانے کی توفیق دیں۔
آمین ثم آمین

ابرِ رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے
(آمین ثم آمین)

رحمت علی غفرلہٗ
سوہنہ ضلع گوڑگانوہ

نوٹ: یہ اشتہار ماہ مئی ۱۹۸۸ء کے رسالہ میں شائع ہونے کے لئے تھا کسی وجہ سے اس کو تاخیر کے ساتھ ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

برہان

جلد ۱۰۱ | صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۸ء | شمارہ ۴

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

برطانوی سامراج سے ملک کو سیاسی اور فکری اعتبار سے آزاد ہوئے چار دہائیاں مکمل ہو چکی ہیں لیکن آزادی کا جو سنہرا خواب باشندگان وطن نے دیکھا تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہے۔

عام طور سے مفکرین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ کوئی بھی نسل چالیس سال کے عرصے میں وہ اپنے جوہر دکھا کر میدانِ عمل سے پوری طرح ہٹ جاتی ہے اور پھر اس کی جگہ دوسری نسل لے لیتی ہے۔ انسان کی مکمل جوانی، فکری و جسمانی بلوغت طاقت و قوت اور مضبوطی کو پہونچنے کے لئے بھی چالیس سال کی عمر کا تذکرہ کتابِ فطرت یعنی قرآن کریم میں آیا ہے:

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً	یہاں تک کہ خوب جوان ہو گیا اور اپنی طاقت کو پہونچا اور چالیس سال کا ہو گیا۔

ملک کی چالیس سالہ سیاسی زندگی کا اگر بے لاگ جائزہ لیا جائے تو آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک نسل ختم ہو چکی ہے اور دوسری نسل نے سیاسی اقتدار سنبھال لیا ہے۔ چالیس سالہ طویل عرصے میں ہم نے مجموعی طور

پر کیا کھویا اور کیا پایا؟ یہ ایک بہت ہی غور طلب، سنجیدہ اور اہم سوال ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ قوموں کی ایک علامت اور نشانی یہ بھی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی ہے۔ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیتی ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

آزادی کے بعد پچھلے چالیس اکتالیس برسوں میں ملک نے مالی وسائل، مادی ترقی، سائنس اور ٹکنالوجی میں اضافہ، سیاسی استحکام، سوشل اور رفاہی اداروں کے ذریعے قابلِ ذکر تعمیر و ترقی میں پیش رفت کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ملک نے COUNTRY BUILDING میں بڑی حد تک ترقی کی ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کی حیثیت، انفرادیت اور قوت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک کردار کی تعمیر (NATIONAL BUILDING) کا سوال ہے تو ہمیں یہ تلخ حقیقت مان لینی چاہئے کہ اس میدان میں مایوس کن حد تک ہمارا ملک، ہمارا سماجی نظام اور ہماری اجتماعی زندگی پیچھے ہے۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور کردار سازی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کسی بھی نظام کی تبدیلی کے لئے بنیادی چیز تعلیم و تربیت ہے۔

ملک کے بے پناہ داخلی و خارجی مسائل میں اہم ترین اندرونی مسئلہ آئے دن فرقہ پرستی، تشدد، تعصب، تنگ نظری، تفریق اور دہشت گردی کے غلط رجحانات کا تشویشناک حد تک فروغ اور بڑھاوا ہے۔ موجودہ وقت میں ملکی سالمیت، قومی وحدت اور فرقہ وارانہ یکجہتی کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ماضی میں

اس طرح کبھی نہیں رہا۔ آزادی کے اتنے عرصے کے بعد بھی ملک جارحانہ فرقہ پرستی کی لعنت سے آزاد نہیں ہوسکا۔

انگریز سامراج ملک سے چلے گئے لیکن ان کی شاطرانہ سیاسی چالیں، جیسے اور "لڑاؤ اور حکومت کرو" (DEA I DE RULE) کی پالیسی اقتدار پرست افراد اور جماعتوں کے ذہنوں میں پیوست ہے اور وہ محض اپنے حقیر ذاتی مفادات اور اغراض کے لئے قومی، ملکی اور اجتماعی مفاد کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ان مایوس کن حالات میں جبکہ ملک بحرانی دور سے گذر رہا ہے ہمیں علاقائیت اور زبان و نسل کی تنگنائیوں سے بالاتر ہو کر انسانی، اخلاقی، روحانی اور مذہبی اقدار کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کرنا ہے اور یہ بات عام لوگوں کے ذہن نشین کرانی ہے کہ ہماری قومی زندگی کے بقا اور ارتقار کا راز باہمی اتحاد اور یکجہتی میں مضمر ہے جبکہ انتشار اور تفریق قومی زندگی کی موت کی علامت ہے۔

ملک میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مابین نیز اپنے ہی فرقے کے مختلف طبقوں کے درمیان بھی آئے دن نت نئے حالات اور حوادث کے پیش نظر اعتماد و اعتبار کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ خود ملکی سطح پر مسلم قیادت (LEADER SHEP) کا جو فقدان ہے اس کے سبب مسلم عوام کا اعتماد دانشوروں اور مفکرین کی جماعت سے اٹھتا جا رہا ہے، اب اکثر قائدین اور رہنمایانِ ملت کی صحیح بات بھی عوام کو مصلحت آمیز نظر آتی ہے۔

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک اور اس کے موجودہ سیکولر نظام میں جہاں روز اول سے مختلف مذاہب کے پیروکار ایک ساتھ زندگی گزارتے چلے آرہے ہیں لیکن اب موجودہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر

قومی یکجہتی (COMMUNAL HARMONY) کے کاز کی تقویت اور اس کو بڑھاوا دینے کے لئے ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ غیر مذاہب کے افراد اور دانشوروں سے انسانیت اور شرف آدمیت کے اعتبار سے قریب آتا جانا چاہئے۔ ایک دوسرے کے خیالات، نظریات، افکار، نقطۂ نظر اور معاشرتی و مذہبی زندگی کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس چیز کا احساس اکثریتی فرقہ کو بھی ہونا چاہئے اور اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اس نفسیاتی نکتہ کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ صرف ایک دوسرے کے مذہب کی جانکاری ہی مسئلے کا حل نہیں جب تک ایک دوسرے فریق کے اندر برداشت اور تحمل کا جذبہ نہ ہو۔

ہمیں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو مختلف مذاہب خاص طور پر دین اسلام کے بارے میں بدرجۂ اتم اور خصوصی علم رکھنے کے باوجود اس کی تشریح اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور نہ شرماتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اس سے خراب اور فرسودہ کوئی نظام ہی نہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال ہمیں اس غیر معقول نظریہ سے بھی ملتی ہے جس کا ان دنوں بڑے زور و شور کے ساتھ چرچا کیا جا رہا ہے کہ "اس ملک میں مسلم تہذیب و ثقافت کے نام کی کوئی چیز ہی نہیں" اس بے بنیاد نظریہ کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے؟

یہ واقعہ ہے کہ بہت سے لوگ دوسرے مذاہب اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت کے باوجود انھیں ہضم نہیں کر پاتے۔ اسے ایک نظام زندگی (SYSTEM OF LIFE) سمجھنے کو تیار نہیں۔ اس لئے قدرتاً ایک دوسرے

کے مابین جو بُعد اور دوری ہے وہ کم نہیں ہو پاتی۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ملکی وحدت اور سالمیت کی خاطر مخالف نظریات اور مذاہب کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں اور ان کو اپنے خصائص اور لوازمات کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دیں۔ درحقیقت مذکورہ اصول ہی زندگی گذارنے کا مہذب، معقول اور بقائے باہم کا صحیح طریقہ ہے جس کے لئے وسعتِ قلب، وسعتِ ذہن، وسعتِ نظر اور وسعت ظرف درکار ہے اس سے ہم انسان اور انسانیت سے محبت کرنا سیکھیں گے۔ ایک دوسرے کے تئیں تعاون، ایثار اور قربانی کا پاکیزہ جذبہ بیدار ہوگا اور اس سے ایک فلاحی اور مہذب معاشرے کے قیام کی راہیں ہموار ہوں گی۔

اپیل

قارئینِ کرام وہمدردانِ ملت! "ادارۂ ندوۃ المصنفین"
اکابر اور بزرگوں، خاص طور پر مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم
کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنے قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی
ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی
ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک
لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا
اور ارتقاء کے پیشِ نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین،
محبین اور بہی خواہ حضرات اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔
یہ حقیقت ہے کہ اس کمر توڑ مہنگائی اور دورِ گراں بازاری میں ایسے ادارے
بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے ہرگز نہیں چلائے جا سکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب
مرحوم انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے اس کا نظام چلاتے رہے،

اور اس کا تحقیقی و علمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا، اب یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ کئی منصوبے جو تشنۂ تکمیل اور کئی اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک "مستقل فنڈ" قائم کیا جائے، تاکہ بسہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلایا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ ارباب خیر اور سبھی خواہانِ ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے! — چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر اسی پتے پر ارسال کیا جائے۔

مینیجر ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی ۶

اے مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

(۲)

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

شیر میوات علی محمد نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کی درگاہ میں
سہ رحیمیہ کا اجراء کیا۔ مفتی ضیاء الحق صاحب اس کے پہلے مہتمم مقرر ہوئے۔ میں
لیا تو مفتی ضیاء الحق نے موقع غنیمت جان کر مدرسے میں "شاہ ولی اللہ کی
ات" کے موضوع پر میری تقریر رکھ دی۔ اخبارات میں خبر شائع کرائی۔ ہینڈ بل
تقسیم کئے گئے۔ صدارت کے لئے مفتی صاحب کا نام تجویز ہوا۔ میرے لئے یہ
ٹھن مرحلہ تھا۔ مفتی صاحب ایسے فاضلِ اجل کی صدارت میں مجھ ہیچمدان
قریر ایک طرح سے میرا امتحان تھا۔ خیر یہ مرحلہ خدا کے فضل و کرم سے بخوبی
ر گیا۔ مفتی صاحب نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اور مجھ کج مج بیان کی تعریف
بائی۔ شیر میوات نے بھی ایسے ہی الفاظ سے میری ہمت بندھائی۔ تقریر کے
کھانے کا اہتمام تھا۔ کھانے کے موقع پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے سے
رغ ہو کر میں اور مفتی صاحب ایک ہی رکشا میں سوار ہو کر ندوۃ المصنفین

اسی طرح ۱۹۷۳ء میں، مجھے اب تک یاد ہے جولائی کی ۱۲ تاریخ تھی، جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی نے غالب اکیڈمی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمات کے بارے میں میری تقریر کروادی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم کی صدارت میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ مفتی صاحب چند احباب کے ساتھ تشریف لائے۔ ادھر ہمدرد انسٹی ٹیوٹ تغلق آباد سے ایک بس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حکیم عبدالوہاب ظہوری، جناب عبدالحئی فاروقی، ڈاکٹر اوصاف علی، ڈاکٹر وحیدالدین اور ادارے کے بہت سے رفقاء تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ سے ڈاکٹر عابد حسین بھی آئے ہوئے تھے۔ اہل فکر ونظر کا اچھا خاصہ مجمع تھا۔ پاکستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو دو قومی نظریے کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے، لہٰذا بھارت کی سیکولر فضا میں ان کی تعلیمات اور خدمات کو پاکستانی نقطہ نظر سے بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ مفتی صاحب نے میری گھنٹہ بھر کی تقریر بڑے صبر وتحمل کے ساتھ سنی۔ جب خطبۂ صدارت کے بعد جلسہ ختم ہوا تو مفتی صاحب نے میری کج مج بیانی کی تعریف کی۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ میری دلداری کے لئے کہا ہوگا، ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

ایک زمانے میں مجھے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سننے کا بڑا شوق تھا۔ عموماً رات کی نشریات سنا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے ریڈیو کھولا تو حضرت شاہ کلیم اللہ ولی شاہجہاں آبادیؒ کے عرس کی جھلکیاں نشر ہو رہی تھیں اور مقرر کے خطاب کے اقتباسات پیش کئے جارہے تھے۔ اچانک ہی اناؤنسر نے کہا، آپ جناب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے خیالات سماعت فرمائیے۔ میں نے فو

ان کی تقریر ٹیپ ریکارڈ پر ریکارڈ کرلی۔ اس بعد موصوف نے اخلاق عیال اللہ کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا۔

مصنفین کو ناشروں سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا ہے کہ ناشرین انھیں حسب توقع رائلٹی نہیں دیتے۔ ناشروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر وہ مصنفین کی کتابیں شائع نہ کریں تو انھیں علمی حلقوں میں کون جانتا؟ ان کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کی تصانیف چھپ کر علمی حلقوں میں چلی جائیں۔ یہ کشمکش ہمیشہ رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کا اپنے مصنفین کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ جہاں تک مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کا معاملہ ہے، مفتی صاحب اور مولانا مرحوم میں "من و تو" والی بات نہ تھی، بالکل گھر کا معاملہ تھا۔ مولانا مرحوم کے بچے مفتی صاحب کو تایا جان کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور مفتی صاحب کی اولاد مولانا مرحوم کو چچا میاں کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی۔ مولانا مرحوم نے کبھی کسی کتاب پر رائلٹی نہیں لی۔ ۱۹۶۹ء میں جب میری پہلی تصنیف ——— وحی الٰہی اور اس کا پس منظر ——— ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی تو میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ اس کے پروف میں نے خود دیکھے تھے۔ مفتی صاحب نے حکیم ظفر احمد مرحوم سے کہا "اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ کتاب ان کے لاہور جانے سے پہلے چھپ جائے اور انھیں اس کے ایک سو نسخے دے دینا۔ یہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" چنانچہ میرے جانے سے پہلے کتاب چھپ گئی اور آخری دن حکیم صاحب نے پچاس نسخے یہ کہہ کر میرے حوالے کئے کہ اتنی ہی جلد میں تیار ہو سکی ہیں۔ میں اپنی پہلی تصنیف چھپی ہوئی دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ مفتی صاحب نے مجھے مصنفین کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، میں پچاس کتابیں لے کر

ہندستان چلا آیا، اور وہ چند ہی دنوں میں دوست و احباب میں تقسیم کر دیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ماموں زاد بھائی تھے اور مفتی صاحب کے ساتھ ان کی دوستی اس حد تک تھی کہ یک جان و دو قالب کی ضرب المثل ان پر صادق آتی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی تصانیف قصص القرآن اور اسلام کا اقتصادی نظام بڑے معرکہ کی کتابیں ہیں، موخر الذکر کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایم اے اقتصادیات کے نصاب میں شامل ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ مولانا اکبرآبادی مرحوم نے راقم الحروف سے ایک بار ذکر کیا کہ اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک مفتی صاحب ہر ماہ ایک معقول رقم ان کی بیوہ کو بھجواتے تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تینوں حضرات مزاجاً ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہوگا کہ ہم مزاج ہونے کے علاوہ یہ تینوں ہم مرض بھی تھے اور تینوں کا انتقال بمرض سرطان ہوا۔

میں ایک بار برسات کے موسم میں اہل و عیال سمیت علی گڑھ گیا۔ مولانا اکبرآبادی مرحوم نے دریائے گنگا کے کنارے نرورہ میں ایک ریسٹ ہاؤس ریزرو کرایا۔ تمام اہل خانہ مع باورچی نرورہ پہنچے اور کئی روز وہاں ٹھہرے۔ ریسٹ ہاؤس ایک پہاڑی کے اوپر تھا اور نیچے گنگا بہتی تھی۔ قریب ہی گنگا پر بندھ باندھ کر ایک نہر نکالی گئی ہے۔ مولانا مرحوم کے باورچی کریم خاں کو مچھلیاں پکڑنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ گنگا سے مچھلیاں پکڑ لاتا اور سالن تیار کر کے مولانا مرحوم کو کھلاتا۔ مچھلی اور بریانی ان کی کمزوری تھی۔

مولانا نرورہ میں قیام کے دوران بار بار مفتی صاحب کو یاد کرتے اور فرماتے اگر مفتی صاحب بھی یہاں آجاتے تو چند روز آرام کر لیتے۔ ہم جتنے روز وہاں ٹھہرے مفتی صاحب کی یاد انھیں برابر ستاتی رہی۔

اگلے سال موسم گرما کی تعطیلات میں میں علی گڑھ گیا تو نرورہ کا پروگرام بنا لیا گیا۔ مفتی صاحب کو اس کی اطلاع کی گئی۔ موصوف علی گڑھ تشریف لے آئے اور اگلے روز ہم نرورہ روانہ ہوگئے۔ چار روز وہاں قیام رہا۔ شام کے وقت ہم لان میں بید کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ چائے بھی وہیں پیتے۔ عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں وہیں مفتی صاحب کی اقتداء میں ادا کرتے۔ ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ بارش بھی وقفے وقفے سے ہوتی رہتی تھی کھانے کے وقت آم ضرور ہوتے تھے۔ شام کو آلو اور مچھلی کے پکوڑے تلے جاتے اور سبھی مزے لے لے کر کھاتے۔ صبح کے وقت گنگا کے پل پر جاکر دریا کا نظارہ کرتے۔

نرورہ کے چاروں اطراف میں ہندوؤں کی آبادی تھی۔ مفتی صاحب فرمانے لگے کہ یہاں صرف زمانۂ امن میں ہی آکر رہ سکتے ہیں ورنہ پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے۔

مولانا اکبر آبادی کثیر العیال ہونے کے باوجود بڑے شاہ خرچ تھے۔ ایک بار اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، مفتی صاحب فرمانے لگے "ان کے ہاتھ میں چھید ہے، اس لئے ان کے پاس پیسے نہیں رہتے۔"

مفتی صاحب کی یہ بڑی خدمت ہے کہ انھوں نے بہت سے اہل قلم کو جن کی علمیت کا آج علمی دنیا میں سکہ چلتا ہے، علمی حلقوں میں متعارف کرایا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا تقی امینی،

پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا بدر عالم میرٹھی، پروفیسر محمد مسعود احمد، مولانا رشید نعمانی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، قاضی اطہر مبارکپوری، ڈاکٹر خورشید احمد فارق، ڈاکٹر ماجد علی خاں، مولوی محمد عبداللہ طارق، مولانا حامد الانصاری غازی، [illegible] خواجہ عبدالرشید، ڈاکٹر حنیفہ رضی اور بیسیوں دوسرے اہل قلم برہان کے ذریعہ دینی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ کے بارے میں پوچھا "کیا حاجی صاحب بھی عالم ہیں؟" حضرت قاسم العلوم رحؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا "عالم ہونا کیا معنی، اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات بابرکات کو عالم گر بنایا ہے۔" یہی جواب مفتی صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔ آج کوئی اسکالر بام شہرت پہ پہنچ کر مفتی صاحب کے احسان کا انکار کرے تو یہ تحدیث نعمت کے منافی ہوگا۔

ایک بار مفتی صاحب دفتر برہان میں تشریف فرما تھے کہ اردو شاعری پر بات چل نکلی۔ انھوں نے انیس و دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک اجنبی آکر حضرت امام حسین رضؓ سے کہتا ہے۔ ع

اظہار اسم اقدس و اعلیٰ میں کیا ہے باک

امام صاحب نے اجنبی کو جو جواب دیا اسے دبیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ع

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

دیکھیے دبیر نے اس مصرعے میں کتنی فاش غلطی کی ہے۔ اولاً یہ کہ حضرت امام عالی مقام ایک اجنبی سے اپنا تعارف کروا رہے ہیں۔ اس لئے اس میں عجز و انکسار کا اظہار ہونا چاہیے نہ کہ تعلّی۔ ثانیاً یہ کہ متکلم اپنے لئے واحد غائب

حسین علیہ السلام" کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ اب دیکھیں انیس نے اسی مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اب خود ہی اندازہ لگا لیں کہ انیس نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ (یہ شعر پڑھتے وقت مفتی صاحب نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر سر کو قدرے جھکایا اور یوں اپنے ایکشن سے پوری تشریح کر دی)۔ اس کے بعد انھوں نے انیس کا یہ شعر پڑھا:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

پھر اس کی تشریح شروع کر دی کہ اوس اور شبنم میں کیا فرق ہے اگر یہاں اوس کی جگہ شبنم ہوتا تو شعر بے مزہ ہو جاتا۔ یہاں اوس لکھنا ہی مناسب تھا۔ انیس نے شبنم کا استعمال ایک مصرع میں یوں کیا ہے:

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

یہاں اگر شبنم کی بجائے اوس لکھتے تو شعر پھیکا ہو جاتا۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس موقع پر انھوں نے علم کے کتنے موتی لٹائے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ادیب چھپا ہوا ہے اور اگر موصوف علم دین کی طرف راغب نہ ہوتے تو ان کا شمار ملک کے چوٹی کے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا۔

ایک روز تصوف پر بات چل نکلی۔ میں نے عرض کیا "حضرت آپ کے والد ماجد تو بہت بڑے عارف باللہ تھے۔ آپ نے اس طرف توجہ کیوں نہیں فرمائی"۔ مفتی صاحب

نے مسکراتے ہوئے فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ نجات کا واسطہ نہیں ہے خود بھی کئی راستے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ آپ کے والد بزرگوار سے یہ سلسلہ آگے بھی چلا ہے؟ فرمانے لگے "مولوی اسحٰق صاحب میرٹھی اباجی سے بیعت تھے اور مولانا بدر عالم مولوی صاحب کے مرید تھے۔" میں نے مولانا محمد اسحٰق میرٹھی کے بارے میں زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی۔ اب برہان کا مفکر ملت نمبر موصول ہوا تو یہ جان کر بیحد مسرت ہوئی کہ قاری محمد ادریس صاحب اُن کے پوتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی کہ قاری صاحب بلا ناغہ شام کو جامع مسجد نئی دہلی سے واپسی پر کیلئے مفتی صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ اگر مفتی صاحب موجود نہ ہوتے تو بھی قاری صاحب اس معمول میں فرق نہ آنے دیتے۔

مفتی صاحب کے جدِ امجد حضرت شاہ فضل الرحمٰن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ دار العلوم دیوبند کے چھ بانیوں میں سے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ان ہی کی دعوت پر دیوبند تشریف لائے تھے۔ مفتی صاحب کے والد بزرگوار حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں صاحب نسبت بزرگ تھے اور پورے ملک میں ان کا فتویٰ چلتا تھا۔ ان کے ایک چچا حضرت حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم اور بڑے دبدبہ والے بزرگ تھے۔ ان کے دوسرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمت والرضوان پاکستان کے پہلے شیخ الاسلام، قائد اعظم کے معتمد ساتھی اور اپنے زمانے کے سر برآوردہ مفسر و محدث تھے۔ ان کی شرح مسلم شریف اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن حکیم پر حواشی ان کی علمی یادگاریں ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں قرار داد مقاصد، جس کی رو سے پاکستان کی قومی اسمبلی قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون پاس نہیں کرسکتی

کے لوگ آپ ہی تھے۔ ان کے ایک چچا جناب مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی صاحب دل بزرگ تھے۔ ان سب کے باوجود مفتی صاحب نے ابنائے زمانہ کی طرح اپنے بزرگوں کی استخواں فروشی سے مکمل اجتناب فرمایا۔ اب تو یہ دستور چل نکلا ہے اور "صاحبزادے" اپنے ناموں سے پہلے ابن الفلاں لکھ کر اپنے بزرگوں کے نام سے روٹی کما رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے مولانا جامیؒ کا کلام بغور پڑھا تھا اور مرحوم خوب جانتے تھے۔ ع

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

انھیں یہ معلوم تھا کہ اگر ابن الفلاں ہونا ہی بڑے ہونے کی دلیل ہے تو کنعان اپنے نام سے پہلے ابن نوحؑ لکھ کر بڑا نہ ہو سکا۔ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ۔ مجھے مفتی صاحب دیوبندی حلقے میں واحد بزرگ نظر آ رہے ہیں جنھوں نے اپنی "صاحبزادگی" سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی، مجھے یاد آیا۔ ملتان میں تحریک ختم نبوت کے زیر اہتمام سید عطاء اللہ بخاری علیہ رحمۃ الباری کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ مقررین میں ان کے فرزند ارجمند سید ابوذر ابو معاویہ عطاء المنعم بھی تھے۔ جب ان کے تقریر کرنے کی باری آئی تو اناؤنسر نے اعلان کیا، "حضرات اب آپ کے سامنے صاحبزادہ عطاء المنعم تشریف لاتے ہیں۔" سید عطاء اللہ بخاریؒ نے اناؤنسر کو مخاطب کر کے کہا، "بھائی، یہ میرا بیٹا ہے، صاحبزادہ نہیں، ابھی تو میرے نکاح کے گواہ بھی زندہ ہیں۔" اس سے اندازہ لگائیے کہ ہمارے اکابر "صاحبزادگی" کو کتنا معیوب سمجھتے تھے۔"

میں نے ایک بار مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم سے یہ سنا کہ مفتی صاحب کے والد محترم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ سکندرہ تشریف لے گئے وہاں انھوں نے اکبر بادشاہ کی قبر پر مراقبہ کیا تو فوراً گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے

اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے "تعجب ہے یہاں سے یہ تو عذاب قبر میں مبتلا ہے۔" وقت گذرنے کے ساتھ میرے ذہن سے حضرت مفتی صاحب قبلہ کا نام محو ہو گیا اور میں نے یہ واقعہ حضرت مطلوب الرحمٰن عثمانیؒ سے منسوب کر دیا۔ میں نے ایک بار یہ واقعہ مفتی صاحب کے سامنے بیان کر کے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انھوں نے فرمایا "نہیں بھئی! یہ واقعہ تو خود ابا جی کے ساتھ پیش آیا تھا۔"

حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمٰن عثمانیؒ روحانیت کے بڑے اونچے مقام پر تھے اور بڑی قوی نسبت رکھتے تھے۔ مفتی صاحب سے سنا ہے کہ جب ان کے جد امجد شاہ فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے وصال کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے فرزند گرامی مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے کہا کہ وہ انھیں توجہ دیں۔ سعادتمند بیٹے نے اسے گستاخی پر محمول کیا لیکن والد بزرگوار کے اصرار پر ان کے پلنگ کے قریب ہو کر انھیں توجہ دی۔ اس پر شاہ فضل الرحمٰن نے فرمایا "الحمد للہ! میں دنیا سے خالی ہاتھ نہیں جا رہا۔"

ایک بار میں دہلی گیا۔ "منارِ صدا" ماضی قریب میں چھپ چکی تھی۔ مفتی صاحب نے ایک نسخہ یہ عبارت لکھ کر مجھے عنایت فرمایا "بگرامی خدمت برادرِ عزیز پروفیسر محمد اسلم صاحب، عتیق الرحمٰن عثمانی"۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مرحوم اپنے خوردوں سے کس طرح پیش آتے تھے۔

شیخ عبداللہ نے اپنے دور وزارت میں سری نگر میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں سیمینار کروایا جس میں بھارت کے فضلا بشمول حضرت قاری محمد طیب صاحب مرحوم و مغفور، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا احمد رضا بجنوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور جناب بدر الحسن قاسمی نے گراں قدر مقالے پیش کئے۔ حکومت کشمیر کے محکمۂ اوقاف نے ان مقالات کو "تجلیاتِ انور" کے عنوان سے

شائع کر دیا۔ مجھے ان دنوں مولانا الکشمیریؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور یہ مولانا اکبر آبادی اور مفتی صاحب کی صحبت کا اثر تھا۔ (جب مولوی انظر شاہ نے ماہنامہ تجلی میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا اکبر آبادی پر کھلے بندوں سب و شتم کیا تو یہ عقیدت ختم ہو گئی۔) میں نے ان کے بارے میں عبدالرحمٰن کونڈو، ازہر شاہ، انظر شاہ، مولانا محمد انوری لائلپوری، مولانا حامد الانصاری غازی اور قاری محمد رضوان اللہ کی تصانیف جمع کر لی تھیں اور خود محمد بشیر نامی اسکالر سے تھیسیس لکھوایا تھا۔ تجلیاتِ انور حال ہی میں شائع ہوئی تھی اور پاکستان میں دستیاب نہ تھی۔ یہ کتاب ہنوز دہلی کے تاجران کتب کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی۔ میں جس روز لاہور روانہ ہونے والا تھا مجھے یہ کتاب مفتی صاحب کے کمرے میں پڑی ملی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ یہ کتاب مجھے دے دیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں اور وہ سری نگر سے دوسرا نسخہ بآسانی منگوا سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے بڑے سخت لہجے میں فرمایا "ہرگز نہیں"۔ مدتوں تک یہ معمہ لاینحل رہا کہ مفتی صاحب جیسے مشفق بزرگ نے، جو مجھے بیٹا اور داماد سمجھتے تھے، تجلیات انور دینے سے کیوں انکار کر دیا۔ اب کبھی سوچتا ہوں تو اسے ان کی کتاب دوستی اور مولانا الکشمیریؒ سے عقیدت پر محمول کرتا ہوں۔

اب اتفاق دیکھیے کہ پاکستان پہنچنے کے چند روز بعد سری نگر سے ایک ریسرچ اسکالر نے مجھے لکھا کہ اسے ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر صاحبہ کی تصنیف "سید علی ہمدانیؒ" کی اشد ضرورت ہے۔ سری نگر سے قیمت کی ادائیگی ممکن نہیں۔ میں نے اسے لکھا کہ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، میں مطلوبہ کتاب بھیج رہا ہوں، تم مجھے "تجلیاتِ انور" بھیج دو۔ یوں مجھے یہ کتاب مل گئی۔

ایک بار میں دیوبند میں تھا اور مفتی صاحب بھی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت

کی وجہ سے وہیں تھے۔ شام کے وقت میں عیدگاہ کی طرف نکل گیا۔ راستے میں ایک چھپر میں دو تین بھینسیں بیٹھی ہوئی تھیں اور بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا ان کی رکھوالی کر رہا تھا۔ اتنے میں اس کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے غصہ میں آکر بے تحاشا اپنے بیٹے کو بے نقط سنانی شروع کر دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دیہاتی کی زبان پر پنجابی کا بڑا اثر ہے۔ میں نے اس کا ذکر مفتی صاحب سے کیا تو انھوں نے فرمایا "پنجاب کے قرب کی وجہ سے پنجابی زبان کا اثر اس علاقے کی بولی پر ہے اور یہاں تشدید بہت استعمال ہوتی ہے"

سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے میں ندوۃ المصنفین میں مقیم تھا انہی دنوں دیوبند میں شوریٰ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور شاہ فضل اللہ شارح ادب المفرد علی گڈھ سے دہلی پہنچ گئے۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی بھی وقت مقررہ پر جامعہ ملیہ سے دفتر برہان میں تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ میں بھی اس قافلے میں شامل ہوگیا۔ ٹرین صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوئی۔ جب ٹرین میرٹھ پہنچی تو قاضی صاحب یہ کہہ کر اتر گئے کہ وہ اپنے گھر جا رہے ہیں اور اس کے بعد جانے والی ٹرین سے دیوبند پہنچ جائیں گے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ مجھے چائے کی طلب تھی۔ میں نے چائے خریدی تو قاضی صاحب کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فرمایا کہ اس چائے کی قیمت وہ ادا کریں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ نہیں میں اس کے دام ادا کروں گا۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ میرٹھ ہے۔ یہ ان کا وطن ہے۔ اس لئے وہی اس کی قیمت ادا کریں گے۔ قاضی صاحب قیمت ادا کرکے تشریف لے گئے۔ مجھے چائے پیتا دیکھ کر مفتی صاحب اور شاہ صاحب نے بھی چائے پینے کا اظہار کیا۔ شاہ صاحب اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ میں لپک کر ان کے لئے چائے لے آیا۔ مولانا اکبرآبادی ضرورت سے زیادہ نفاست پسند

... مٹی کے آبخوروں میں چائے پیتا دیکھ کر کراہت کا اظہار کرنے لگے۔
... سے ٹرین روانہ ہوئی تو مفتی صاحب سیٹ پر لیٹ گئے ....
.... ایک جگہ ٹرین رکی تو آنکھیں کھول کر مجھ سے
پوچھا۔ "میاں! کونسا اسٹیشن آیا ہے؟" میں نے نام بتایا تو فرمانے لگے "ابھی دیوبند
پہنچنے میں دیر ہے۔" پھر ترتیب وار تمام ریلوے اسٹیشنوں کے نام گنوا دیئے جو
راستے میں آتے تھے۔

یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مفتی صاحب دیوبند میں تھے۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ نماز مغرب کے بعد قبلہ مفتی صاحب غائب پائے گئے۔ عشاء کے قریب تشریف لائے تو میرے استفسار پر فرمایا "جامع مسجد کے سامنے میرے ایک عزیز ہیں شاہد حسین، بڑے تعلق والے ہیں، ان کی بہن کا نکاح تھا۔ برات منگلور سے آئی تھی۔ ان کا یہ اصرار تھا کہ نکاح میں پڑھاؤں، اس لئے وہاں گیا تھا، ورنہ ایسی جگہوں پر میں کب جاتا ہوں۔ میں نے وہاں کھانا نہیں کھایا، تمہارے ساتھ اور مولوی سعید کے ساتھ کھاؤں گا۔" میں نے عرض کیا میں شاہد صاحب کو خوب جانتا ہوں، فرمایا، "وہ کیسے؟" میں نے عرض کیا ان کے ایک ماموں لاہور میں رہتے ہیں۔ شاہد صاحب کبھی کبھی لاہور جاتے ہیں تو مجھ سے بھی ملاقات رہتی ہے۔

دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر میں بھی دیوبند حاضر ہوا۔ امرتسر سے مجھے سہ پہر کے وقت جنتا ایکسپریس ملی جس نے رات کے تین بجے کے قریب دیوبند پہنچایا۔ میں اسٹیشن سے ایک رکشا میں سوار ہو کر دار العلوم کے مہمان خانے پہنچا۔ صدر دروازہ کھٹکھٹایا تو مولوی شمیم مرحوم آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے۔ میں نے مولانا اکبر آبادی کے بارے میں دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ

موصوف حسب معمول مہمان خانے میں قیام فرما ہوں گے۔ شمیم صاحب نے کچھ ترشروئی سے جواب دیا کہ مجلس شوریٰ کے تمام اراکین دفتر ناظم تعلیمات میں قیام پذیر ہیں۔ مہمان خانہ غیر ملکی مہمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ میں پوچھتے پوچھتے ناظم تعلیمات کے دفتر میں پہنچا۔ مدھم سی روشنی میں میں نے مولانا اکبر آبادی کو پہچان لیا۔ ان کے پاؤں کو ہلایا تو مرحوم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ معانقہ اور مصافحہ کے بعد فرمایا کہ برابر والا پلنگ میرے لئے مختص ہے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ فجر کی اذان ہونے والی تھی، نیند بھلا کیسے آتی؟ ساڑھے چار بجے اذان ہوگئی۔ میں وضو کے لئے چلا گیا واپس آیا تو تمام حضرات نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ قبلہ مفتی صاحب کو مصلیٰ امامت پر کھڑا کیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص دلسوز لہجے میں قرأت فرمائی۔ نماز اور دعا کے بعد میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے "کب آئے؟" میں نے عرض کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ فرمایا "اچھا کیا یہ تقریب بھی تمہارے دیکھنے کی چیز ہے۔" اتنے میں ایک ملازم نمکین بسکٹ اور چائے لے آیا۔ چائے پر مفتی صاحب کے علاوہ مولانا اکبرآبادی، قاضی زین العابدین سجاد۔ مولانا حکیم محمد زماں حسینی، مولانا عبدالحلیم گوریٹی والے اور مولانا منت اللہ رحمانی بھی موجود تھے۔ تین چار روز ان حضرات کے ساتھ دیوبند میں صحبت رہی۔

دیوبند جانے سے دو تین ماہ پہلے میری ملاقات مولانا عزیز گل اسیر مالٹا سے ان کے گاؤں "سیری" نزد سخاکوٹ (مالاکنڈ ایجنسی) میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کا انٹرویو لیا اور جب اس ملاقات کی روداد لکھنے بیٹھا تو اٹھارہ صفحے کا اچھا خاصہ مضمون تیار ہوگیا۔ دیوبند روانہ ہوتے وقت میں وہ مضمون اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے وہ مضمون مفتی صاحب کو دکھایا تو انھوں نے

وہ مجھ سے لیا اور یہاں کے اگلے شمارے میں ایک ہی قسط میں شائع کر دیا۔

ایک روز شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید اور حلقۂ دیوبند کے معمر ترین بزرگ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی، سابق صدر شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، جنھیں مفتی صاحب کے والد بزرگوار سے بھی شرف تلمذ تھا، ناظم تعلیمات کے دفتر میں تشریف لائے۔ مفتی صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا "یہ بھی آپ کی طرح پروفیسر ہیں۔ اپنی کوئی تصنیف اگر ساتھ لائے ہیں، تو انھیں دیجیے۔ یہ تاریخ کے استاد ہیں۔" جب ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو مجھے اپنی قیام گاہ میں لے گئے اور "قائد بدر واحد" اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے مرحمت فرمائی۔

مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگرسی تھے اور موصوف جمعیۃ العلماء ہند کے اس گروپ میں شامل تھے جو تقسیم ہند کا سخت مخالف تھا۔ میں نے ان کا ایک فتویٰ پڑھا ہے جس میں موصوف لکھتے ہیں کہ ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے کا محتاج ہے اور ملک کی منفعت اسی میں ہے کہ یہ متحد رہے۔ جس طرح چکی، ترازو اور قینچی ناقابل تقسیم ہیں اسی طرح ہندوستان بھی ناقابل تقسیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں ان کا رویّہ پاکستان کے بارے میں بڑا سخت تھا۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے "جب پاکستان قائم ہوا تو میرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی رح کراچی چلے گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے مجھے بلانے کے لئے بڑا زور لگایا اور کئی خط لکھے، لیکن میں نہ گیا۔ انھوں نے کسی مدرسہ میں ناظم تعلیمات کا عہدہ سال بھر تک میرے لئے خالی رکھا۔ آخر انھوں نے تنگ آکر مجھے لکھا کہ تم یہاں کیوں نہیں آجاتے۔ میں نے جواب دیا۔ چچا جان آپ ہی نے ہمیں وہ حدیث پڑھائی تھی کہ جہاں طاعون پھیل جائے، وہاں نہ جانا چاہیے۔ یہ پاکستان طاعون

ہی تو ہے۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے خط لکھنا بند کر دیا۔ جب مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آئے تو اس سفر میں کراچی جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی بیوہ ان دنوں حیات تھیں موصوف اپنی چچی سے ملنے گئے۔ مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "چچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور چند روپے بھی دیئے۔" مفتی صاحب اس بات پر خوش تھے کہ ابھی ان کے سر پر کوئی بزرگ موجود ہے۔

ایک بار میں دفتر برہان میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں خان غازی بھی وہاں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ کہنے لگا "میں سال میں ایک بار سیاسی کارکنوں کی میٹنگ بلایا کرتا ہوں اس کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب بھی اس "عرس" کے لئے کچھ رقم دے دیا کرتے ہیں۔" مفتی صاحب نے حسب معمول کچھ رقم اس کے حوالے کی اور وہ رخصت ہو گیا۔

برہان کے مفکر ملت نمبر میں کئی جگہ اس کا ذکر آیا ہے کہ جب علماء دیوبند نے تحریک ترک موالات کے زمانے میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کا فتویٰ دیا تو مولوی ظفر احمد تھانوی نے اس کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا کہ بدیشی مال خریدنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ دینی حلقوں میں اس فتویٰ کے خلاف ہیجان پیدا ہو گیا۔ دیوبند میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس فتویٰ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار فرما رہے تھے لیکن دانستہ طور پر مفتی کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مفتی صاحب کی جوانی کا عالم تھا۔ انھوں نے بڑی جرأت رندانہ سے کام لے کر بآواز بلند کہا "مولانا نام نہیں لے رہے ہیں۔ یہ فتویٰ مولوی ظفر احمد تھانوی نے صادر کیا ہے، جن کے والد (عبداللطیف) عیسائی ہو گئے تھے۔" مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا۔ مفتی صاحب نے ایک سے زائد بار مجھ سے اس

عادی بنایا ہے۔
مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگرسی ضرور تھے لیکن وہ غیر مسلم کانگرسی رہنماؤں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک بار خود مجھ سے فرمانے لگے کہ ایک جلسے میں مرار جی ڈیسائی (وزیر اعظم مقرر ہونے سے بہت پہلے) تقریر کر رہے تھے۔ مرار جی نے مسلمانوں کے خلاف کوئی بات کی تو مفتی صاحب فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے :
"مرار جی اپنے الفاظ واپس لیں" انھوں نے انکار کیا تو مفتی صاحب نے فرمایا "آپ اپنے الفاظ واپس لیں ورنہ میں ابھی آپ کو بازو سے پکڑ کر اسٹیج سے نیچے اتار دوں گا" یہ تھی ان کی غیرت ایمانی کہ اپنے ایک دیرینہ سیاسی رفیق سے مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ نہ سن سکے۔
گاندھی جی کی تحریک نمک سازی اور ڈانڈی مارچ کے زمانے میں مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مقیم تھے اور انھوں نے اس زمانے میں دو تاریخ ساز فتوے جاری کیے۔ اولاً یہ کہ جس سیاسی کارکن کی جائداد بحق سرکار ضبط کی جائے کسی شخص کے لئے اس کا خریدنا شرعاً حرام ہے۔ ثانیاً یہ کہ پانی نمک اور گھاس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی منفعت سب کے لئے یکساں ہے۔ اسی زمانے میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بھی ایک حدیث سے یہی استدلال کیا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک کو مفتی صاحب کے فتویٰ سے بڑی تقویت ملی اور یہی فتویٰ گاندھی جی کے ساتھ ان کے تعارف کا سبب بنا۔ مفتی صاحب کو انجامِ کار اس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی اور کارکنانِ مدرسہ نے انھیں استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔
ایک مرتبہ میں جولائی میں لاہور سے علی گڑھ گیا اور چند روز میں رمضان شروع

ہوگیا۔ علی گڑھ میں تو یقیناً باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھتا رہا اور ہاں
میں شریک ہوتا رہا۔ علی گڑھ سے دہلی گیا تو روزے ترک کر دیئے۔ میرا قیام
حسب معمول دفتر برہان میں تھا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "مسافر کو رخصت ہے
اچھا کیا کہ سفر میں روزے ترک کر دیئے۔ ورنہ بہت تکلیف ہوتی۔" برادر
دفتر برہان کے اس برآمدے میں جہاں مفتی صاحب کی نشست ہوا کرتی تھی
کو میرے لئے پلنگ بچھا دیئے، میں بستر پر دراز تھا کہ مفتی صاحب نماز تراویح
فارغ ہوکر تشریف لائے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے
میاں ناشتہ کس وقت کرو گے؟ آٹھ بجے ٹھیک رہے گا؟" میں نے عرض کیا
حضرت میں روزہ نہیں رکھتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ روزہ
ناشتہ کرائیں۔ اس پر فرمانے لگے "میاں تم مسافر ہو، تمھیں رخصت ہے۔ آ
اس میں حرج ہی کیا ہے؟ آخر ناشتہ تو کہیں کرو گے، یہیں کر لینا۔ اگر سحر
کے وقت چائے پینا پسند کرو، تو میں لے آؤں۔" میں نے بصد عجز معذرت
اور بڑی مشکل سے انھیں ناشتہ لانے سے باز رکھا۔ مرحوم بار بار فرماتے
"میاں تمھیں رخصت ہے۔ جب رخصت ملے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چا
خواہ مخواہ خود کو تکلیف میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟"

یہ ان کی وسیع القلبی اور تفقہ فی الدین کی بہترین دلیل ہے۔ ان کی جگہ
کوئی عالم دین ہوتا تو روزہ خور مسافر کو گھر سے نکال دیتا اور یہاں ناشتہ
لانے پر اصرار ہو رہا تھا۔ اللہ اکبر۔ کیسے لوگ تھے یہ۔ ع

اب ڈھونڈو انھیں چراغ رخ زیبا لے کر

مفتی صاحب کی حیات میں میں پندرہ سولہ مرتبہ دہلی گیا ہوں گا۔ قیام
ان ہی کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ ایک بار میں ہوٹل میں ٹھہر گیا تو بہت ناراض ہو

ماتے بہت سے ان دفتر یہیں منگوا لیا۔ خوب خوب کھانے پر اصرار کرتے۔
عرض کیا کہ میں چند منٹ کے لئے یہاں آیا ہوں۔ مجھے بہت جگہ جانا ہے۔
کھانے کے وقت اپنا کام درمیان میں چھوڑ کر یہاں آنا ہوگا۔ اس
یہ بیچارے کے لئے مشکل ہے۔ اس پر بھی ایک بار شاندار ضیافت کرتے۔
کی تھی جو ان کی منیب خاتون، جنھیں ہم منی آپا کہتے ہیں، کئی طرح کے کھانے
رکرتیں۔ مفتی صاحب مجھے دفتر سے اپنے گھر لے جاتے، منی آپا کا سلام پہنچاتے۔
انا شروع ہوتا تو اصرار کرکے مختلف چیزیں کھلاتے۔ ایک بار سیخ کباب بھی
ستر خوان پر موجود تھے۔ کبابوں کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے فرمایا "میاں!
سیخ کبابی کے ہاں سے منگوائے ہیں۔ میرٹھ کا رہنے والا ہے اور بڑا عمدہ
باب بناتا ہے۔ میں نے ہی اصرار کرکے اسے یہاں رکھا ہوا ہے۔ ذرا چکھ کر
یکھو۔" صبح ناشتے کے وقت گھر سے چائے، مکھن توس اور انڈہ لاتے، مٹیا محل
ے پوریاں اور حلوہ منگواتے اور پھر اصرار کرکے کھلاتے۔ اگر میں عرض کرتا کہ
پ بھی کچھ لیجیے، تو فرماتے "میں بہت صبح ناشتے سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ یہ
ما رے لئے ہے۔"

وفات سے چند ماہ پہلے میں دہلی گیا۔ حسب معمول ندوۃ المصنفین میں قیام
۔ گھر پر ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ اپنی عادت کے مطابق بڑے تپاک سے
ے۔ گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کی۔ اتنے میں عمید میاں اور ایک اور صاحب،
ن کا نام اب یاد نہیں پڑتا، انھیں ایکسرسائز کرانے لگے۔ میں پاس بیٹھا تھا
رمانے لگے "اب میں اچھا ہو رہا ہوں۔ ذرا سی کمزوری باقی ہے۔" میں نے تسلی
یتے ہوئے عرض کیا کہ یہ بھی جاتی رہے گی۔ اتنے میں پتہ نہیں جی میں کیا آیا فرمانے
کہ "کل شام کا کھانا یہیں کھا لینا۔" میں نے عرض کیا "حضرت کھانا تو بہت کھایا

ہے۔ آپ تندرست ہو جائیں، پھر کھائیں گے۔ میں تو آتا جاتا رہوں گا۔" فرمانے لگے "پھر کیا ہوا۔ آج یہیں تو کھانا کھاؤ گے، یہیں کھا لینا۔" ان کے اصرار پر چپ سادھ لی۔ اگلے روز شام کو میں کھانے پر حاضر ہوا۔ اپنے پلنگ کے قریب ایک کرسی پر مجھے بٹھایا اور میز پر کھانا چنا گیا۔ میں کھانے بیٹھا تو فرمانے لگے "میاں تکلف سے کام نہ لینا۔" میں جتنی دیر وہاں رہا، بڑی شفقت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔

میں احباب کے لئے تحائف لے گیا تھا۔ ان میں ریشمی جاپانی کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی تھا جس سے ایک زنانہ قمیص تیار ہو سکتی تھی۔ میں نے وہ کپڑا مفتی صاحب کو تھماتے ہوئے کہا "یہ ریحانہ نے منی آپا کے لئے بھیجا ہے۔" مفتی صاحب نے وہ کپڑا منی آپا کو بھجوا دیا۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے "وہ کپڑا بہت عمدہ ہے۔ منی نے شکریہ ادا کیا ہے۔" میں نے عرض کیا اس میں بھلا شکریہ کی کیا بات ہے، میں کئی بار مفتی صاحب کے لئے جاپان کے بنے ہوئے پن (قلم)، جو پاکستان میں بارہ تیرہ روپے میں مل جاتا ہے، لے گیا۔ انھوں نے ہمیشہ اسے استعمال کیا۔

چند روز بعد میری اہلیہ بچوں کے ہمراہ دہلی گئیں۔ قیام غالباً شمس بلڈنگ چوڑی والان میں جناب عبدالقدیر کے ہاں تھا۔ ایک روز مفتی صاحب کی عیادت کو حاضر ہوئیں۔ مفتی صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور منی آپا سے کہنے لگے "منی ذرا خیال رکھنا یہ میرے نواسے نواسیاں ہیں، خالی ہاتھ نہ جائیں۔" میری اہلیہ نے عرض کیا "تایا جان رہنے دیجئے۔ آپ پہلے تندرست ہو جائیں پھر دیکھا جائے گا۔ اتنا روپیہ علاج پر اٹھ رہا ہے۔" فرمانے لگے۔ "یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ یہ بچے ہیں، ان کا خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔" منی آپا سو روپے کا نوٹ

گئی تھیں اور مفتی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے یہ رقم بھجوانے کے لئے دی۔

ایک روز مفتی صاحب کسی کام کی غرض سے دیوبند روانہ ہونے لگے۔ میں نے دریافت کیا کہ جب موصوف دیوبند جاتے ہیں تو وہاں نماز قصر ادا کرتے ہیں؟ اس پر فرمایا "میں دیوبند کو اپنا وطن سمجھتا ہوں، دہلی میرا دوسرا وطن ہے۔ ابھی تک میں نے دیوبند کی سکونت ترک نہیں کی، اس لئے وہاں قصر نماز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں بھارت کے ہر سفر میں ایک پہاڑی مقام ضرور دیکھتا تھا۔ ایک بار مفتی صاحب فرمانے لگے "کبھی چکروتہ بھی ہو آتے۔" میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا تھا اس لئے اس کا محل وقوع دریافت کیا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "سہارنپور سے راستہ جاتا ہے۔ جب مولانا حفظ الرحمٰن بیمار ہوئے تو بحالی صحت کے لئے کچھ عرصہ کے لئے مرحوم چکروتہ چلے گئے تھے۔ میں اور مولوی سعید بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں جانے والے راستے میں بڑے چکر آتے ہیں۔ اس لئے اس کا نام چکروتہ یعنی "چکر آتا" پڑ گیا۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب برہان کا مفکر ملت نمبر نکلنے والا تھا تو برادرم عمید الرحمٰن کی تاکید اکید کے باوجود میں مفتی صاحب کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ میں کئی بار کاغذ اور قلم لے کر بیٹھا لیکن ہر بار بے کیف ہو کر اٹھ گیا۔ اب ان کے بارے میں اپنے مشاہدات و تأثرات لکھنے بیٹھا تو ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا ذہن میں پردۂ سکرین کی طرح فلم چل رہی ہے اب ان کی زندگی کے مختلف گوشے میرے سامنے آرہے ہیں۔ اب اس مضمون کو سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔

مفتی صاحب ایسے نابغۂ روزگار بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

عمرہا باید تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

اب وہ سانچے ہی نہیں رہے جن میں ان بزرگوں کی سیرت اور کردار ڈھلے تھے۔ جیسے بلند پایہ اساتذہ انھیں میسر آئے تھے اب ان کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ جس ماحول میں ان بزرگوں نے آنکھیں کھولی تھیں اب ویسا پاکیزہ ماحول کیسے میسر آسکتا ہے۔ مفتی صاحب اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش جریدۂ عالم پر ثبت کرکے جوار رحمت میں ابدی نیند جا سوئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس حد تک ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

دفتر برہان موجود ہے۔ برہان ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ندوۃ المصنفین قائم و دائم ہے۔ وہ کرسی جس پر مفتی صاحب بیٹھا کرتے تھے ہنوز اپنی جگہ پر اسی حالت میں پڑی ہے۔ دفتر کا عملہ بھی موجود ہے لیکن صاحب خانہ موجود نہیں۔ انھوں نے ایک تعزیتی جلسے میں نظیر اکبرآبادی کا یہ شعر پڑھا تھا۔ میں اسی شعر پر مفتی صاحب کا ذکر خیر ختم کرتا ہوں ؎

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

شیخ القراء قاری عبدالواحد رامپوریؒ

جناب محمد نظر علی خاں ، سفارت خانہ کویت ، نئی دہلی

آج سے تقریباً ۷۵ سال قبل رام پور کے افق پر ایک ستارہ طلوع ہوا تھا، اور بتاریخ ۸ راپریل ۱۹۸۶ء رام پور ہی میں غروب ہوگیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

قاری عبدالواحد (عرف قاری چھٹمن) ابن حمید اللہ مرحوم محلہ خدایان، متصل دو محلہ روڈ، رامپور (سابق ریاست) کے رہنے والے تھے، بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے اور نابینا بھی۔

میرے والد مرحوم میر منشی شوکت علی خاں صاحب ڈپٹی سکریٹری اجلاس ہمایوں کے مکان کے متصل قاری صاحب کی والدہ مع اپنے بچوں کے رہتی تھیں، والد مرحوم کو وہ بھائی کہتی تھیں، اور مثل اپنے حقیقی بھائی کے جانتی تھیں، ہم لوگ انھیں پھوپو کہتے تھے، اسی باعث قاری صاحب اور ان کے بھائی میرے والد کو ماموں کہا کرتے تھے، والد مرحوم اُن کے اور اُن کے بیٹوں کے ساتھ بہن بھائیوں

جیسا سلوک کرتے تھے۔

قاری صاحب مرحوم بچپن ہی سے خوش آواز تھے۔ چنانچہ بچپن میں ان کی والدہ مرحومہ بھی ان سے نعت ومنقبت کے اشعار سنا کرتی تھیں، اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی ریاست کے نواب سردار امپور کے مشہور رئیس و وزیر قانون قمر شاہ خاں صاحب کے ہمراہ مدرسہ عالیہ تشریف لائے، مجھے (قاری صاحب کو) تلاوت قرآن کریم کے لئے بلایا گیا، جب میں نے تلاوت کی تو قمر شاہ خاں صاحب زار زار روتے تھے، اور مجھے انعام میں دونوں نے اپنی جیب سے خاص رقم بھی عنایت فرمائی۔

ابتداء میں قاری صاحب نے قرآن کریم محلے میں حافظ اسماعیل صاحب سے حفظ کرنا شروع کیا۔ اور اسی زمانے میں مدرسہ غوثیہ (رام پور کی مشہور درسگاہ مدرسہ عالیہ کی شاخ) میں داخل ہوئے اور وہاں بھی قرآن شریف حفظ کیا۔ اس کے بعد قرارت وتجوید کی تعلیم قاری خلیل الرحمان ساکن نوا کھالی، استاذ قرارت مدرسہ مطلع العلوم رامپور سے حاصل کی اور مختلف لہجات قرارت بھی ان ہی سے سیکھے۔ قاری خلیل الرحمان صاحب نہایت خوش الحان تھے۔

اسی دوران قاری صاحب نے مشہور قاری عبدالرحمان خاں صاحب رامپوری (فرزند شیخ القرارۃ والتجوید علی حسین خاں صاحب) کو پورا قرآن شریف سنایا اور ان ہی سے تکمیل قرارت وتجوید کی۔

مشہور درس گاہ مدرسہ فرقانیہ میں قاری محمد نظر صاحب سے قرارت قرآن کریم کی مشق کی۔

تکمیل حفظ وقرارت کے بعد مسند تدریس کلام اللہ پر مدرسہ مطلع العلوم رامپور میں فائز ہو گئے۔

صاحب مدرس قاری عبدالواحد صاحب بھوپال بھی گئے، اور کچھ عرصے
بعد قاری محمود صاحب بھی صدر مدرس قرارت و تجوید مدرسہ عبیدیہ بھوپال
قرآن شریف سنایا اور ان سے سند قرارت حاصل کی۔
قاری محمود صاحب، قاری صاحب کی قرارت و خوش الحانی سے اس
قدر متاثر ہوئے کہ نواب حمید اللہ خان مرحوم والیِ بھوپال سے قاری صاحب کی
ملاقات کرائی، نواب صاحب نے قاری عبدالواحد صاحب سے قرآن شریف
سنا اور بہت محظوظ ہوئے اور کرایۂ آمد و رفت بھوپال کے نام سے ایک رقم
بھی عنایت فرمائی۔
قاری عبدالواحد صاحب نے دیوبند میں بھی تقریباً چار ماہ رہ کر ہندوستان
کے مشہور قاری استاذ القراء حضرت مولانا قاری حفظ الرحمانؒ صدر شعبۂ قرارت و
تجوید دارالعلوم دیوبند کو پورا قرآنِ عظیم سنایا اور اُن سے بھی سند حاصل کی۔
قاری حفظ الرحمان صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے سند کے آخر میں تحریر فرمایا
تھا کہ "قاری عبدالواحد صاحب اپنے فن میں بے مثل ہیں" اور آخر میں قاری صاحب
نے رامپور کے مشہور قاری علی محمد صاحب سنبھلی کو پورا قرآن شریف سنایا اور اُن سے
بھی سلسلۂ پانی پت کی سند حاصل کی۔
آغاز ہی میں تحریر کر چکا ہوں کہ قاری عبدالواحد نے سب سے پہلے مدرسہ
مظہر العلوم میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد مشہور عالم دین مولانا
عبدالوہاب خان صاحبؒ کے مدرسے جامعۃ المعارف میں قرارتِ قرآنِ کریم کے
مدرس مقرر ہوئے، پھر مدرسۂ پنجابیان گھیر مردان خان میں صدر شعبۂ قرارت و
تجوید کے عہدے پر کام کیا۔
پھر سے قاری صاحب نے مسجد گھیر غلام ناصر خان دو محلہ میں، اور منشی

عبدالمجید صاحب قریشی مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ گلشن بغداد میں، نیز سید امجد میاں صاحب کے قائم کردہ مدرسے (محلہ پیلا تالاب) میں بھی تدریس تلاوت و تجوید کلام اللہ کے تبرکات تقسیم کئے۔

کئی سال تک سہ پہر کے وقت، جماعت اسلامی رام پور کی درس گاہ میں بھی تدریس قرآنِ عظیم کا اشتغال رہا، درس گاہ کے بہت سے طلبہ جو آج کل مراتبِ عالیہ پر فائز ہیں آپ سے نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں۔

دوران تدریس مدارس مذکورہ، قاری صاحب اپنے گھر پر صبح و شام محفلِ درسِ کلام اللہ سجاتے تھے، جس سے مقامی و بیرونی تشنگانِ قرارت کلام الٰہی سیراب ہوتے تھے۔

عمر کے آخری دور میں اپنے گھر پر اپنے قائم کردہ مدرسہ عاصمیہ تجوید القرآن میں قرارت کلام اللہ کا درس دیتے ہوئے اعظم و اکبر سے جا ملے۔ تغمدہ اللہ بغفرانہ و اسکنہ جنانہ۔

رامپور میں قرارت و تجوید کا چرچا شیخ القراء حضرت مولانا قاری علی حسین خاں صاحبؒ رامپوری (شاگرد امام القراء قاری عبدالرحمان محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ) کی ذات بابرکات سے ہوا۔

قاری علی حسین خاں صاحب کے علاوہ دیگر قراء کرام خصوصاً خاندان مجددیہ کے بعض افراد مثلاً قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی وغیرہ بھی مسند درس قرارت و تجوید پر فائز ہوئے اور اس فن شریف میں کمال پیدا کیا جن سے اہل رامپور مستفید ہوئے۔

نامناسب ہوگا اگر اس بابرکت سلسلے میں جناب قاری عبدالحق خاں مدظلہ رامپوری حال مقیم کراچی پاکستان کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف کا تلمذ و

اور ایسی بلند آواز کے ساتھ قرأت کہ باید و شاید، رام پور والوں کو آج بھی یاد ہے۔ آپ سے بھی اہل رامپور نے کافی استفادہ کیا۔ لیکن رامپور میں جس قدر فروغ و اشاعتِ تجوید قرآنِ کریم قاری عبد الواحد صاحب کی ذات سے ہوا، اتنا کسی اور سے نہیں ہوا۔

قرآنِ کریم تجوید کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، بعض حروف کی غلط ادائیگی سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ہر مسلمان کے لئے بقدرِ ضرورت قرآنِ کریم (یعنی جتنا قرآن شریف نماز میں پڑھا جاتا ہے) صحیح پڑھنا بہت ضروری ہے اور لحنِ جلی حرام ہے۔ خصوصاً ائمۂ مساجد کے لئے اس کتابِ عظیم کی تلاوت تجوید کے ساتھ اشد ضروری ہے، اور ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جو قرآنِ کریم غلط پڑھتا ہو، صحیح نہیں ہے۔

قاری عبد الواحد صاحب کے میدانِ قرأت و تجوید میں ورود سے قبل عام طور پر رام پور کے گھروں میں قرآن شریف صحیح طور پر پڑھنے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی الا ماشاء اللہ۔ اور مساجد رامپور میں بھی بالعموم صحتِ تلاوتِ کلام اللہ کا اہتمام نہیں تھا۔ یہ قاری صاحب کی بشدت کوشش تھی جس نے لوگوں کو قرآن شریف صحیح پڑھنے کی طرف متوجہ کیا۔ قاری صاحب کا نہایت شدت و غصے سے یہ فرمانا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کی ادائیگی صحیح مخارج کے ساتھ نہ کرنا سخت گناہ ہے، مجھے آج تک یاد ہے۔ یہ کہتے وقت اُن کے چہرے کی کیفیت، اور غصے سے اُن کے چہرے کا سُرخ ہو جانا، گویا آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

قاری صاحب کی سچی تلخ گفتاری اور جد و جہد کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے لوگ قرآنِ کریم صحیح پڑھنے لگے، اور اپنے بچوں کو بھی قرآن صحیح طور پر تجوید کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرنے لگے، نیز مساجد میں ایسے ائمہ کا تقرر ہونے لگا

جو قرآنِ کریم صحیح پڑھتے ہوں۔

قاری عبدالواحد صاحب مرحوم حروف کی ادائگی بہت صحیح طور پر اور مخارج صفات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کرتے تھے، بکثرتِ مشق سے آپ کو ایسی قدرت اور اس کی ایسی مزاولت ہوگئی تھی کہ اگر آپ سوتے میں بھی قرآن شریف پڑھتے تو صحیح ہی پڑھتے۔ حرف ضاد جس کا صحیح طور پر ادا کرنا دشوار ہے جب آپ ادا کرتے تھے تو آپ کے مخالفین بھی سمجھتے تھے کہ یہ تو اسی طرح ادا کر رہے ہیں جیسے ہم چاہتے ہیں بعد میں اس طرح اس حرف کی ادائگی صحیح ہے، البتہ ان کے شاگرد اس حرف کو صحیح ادا نہیں کرتے، حرف ظاء سے بہت مشابہ کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کثرتِ مشق اور ریاضت کی وجہ سے آپ اس قدر عمدہ ادا کرتے تھے کہ وہ لوگ (مخالفین) سمجھ نہیں پاتے تھے کہ آپ نے کیسے ادا کیا، جس پر آپ مسکراتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں تو وہی ادا کرتا ہوں جسے صحیح سمجھتا ہوں اپنی رائے کے مطابق۔

قاری صاحب کا لہجہ اس قدر مؤثر تھا اور آپ اس قدر خوش الحان تھے کہ ایام جوانی میں اور ادھیڑ عمر تک جب بھی آپ قرآن کریم پڑھتے تھے لوگوں پر گریہ طاری ہوجاتا تھا اور سننے والے بےخود ہوجاتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ صبح کے وقت دو محلہ روڈ پر آپ اپنی بیٹھک میں بنگالی و منی پوری طلبہ کو قرآن شریف پڑھا رہے ہیں اور راہ گیر قاری صاحب مرحوم کی قرات سن کر سڑک پر رک گئے ہیں اور ذوق وشوق سے معجز قرآن کی معجز قرات سماعت کر رہے ہیں اور جھوم رہے ہیں۔ ایک مرتبہ گھیر مردان خاں میں تراویح میں قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہے تھے کہ ادھر سے رامپور کے ایک مشہور مجذوب صفتِ حافظِ کلام اقبال واجد الدین احمد خاں کا گذر ہوا، وہ ٹھہر گئے اور جھومنے لگے

... بلند انداز میں کہنے لگے، معلوم ہوتا ہے نزول قرآن ہو رہا ہے۔ آخری عمر میں کبرسنی میں گو آواز پہلے جیسی نہیں رہی تھی لیکن بلحاظِ فن یکتائے روزگار تھے۔

ایک زمانے میں حرفِ ضاد (ض) کی ادائیگی کے قضیے کے سلسلے میں قاری صاحب نے پوسٹر بھی شائع کئے تھے، اور ان کے خلاف بھی پوسٹر شائع ہوئے تھے، قاری عبد الواحد صاحب کا موقف تھا کہ حرف (ض) مشتبہ الصوت بالظاء ہے نہ کہ بالدال، کیونکہ بہ لحاظِ صفات یہ حرف (ظ) سے مشترک ہے نہ کہ (د) سے۔ علاوہ ازیں اس حرف کو "اصعب الحروف" کہا گیا ہے، اور دال (د) سے تشابہ کی صورت میں نہایت آسانی سے ادا ہو جاتا ہے، البتہ تشابہ بالظاء کی صورت میں ادائیگی میں دشواری ہوتی ہے۔ قاری صاحب اپنے اس موقف کی دلیل میں کتب قرارت و فقہ کی عبارتیں پیش فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ یاد آگیا۔

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے شیخ، شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ جس عمدگی سے حرف ضاد (ض) ادا فرماتے تھے، ہم سے ادا نہیں ہو سکا۔ غرض کہ اس مسئلہ کے قضیہ میں میدان قاری عبد الواحد صاحب کے ہاتھ رہا۔

قاری صاحب نماز تراویح میں پورا قرآن شریف ختم کرنے کی صورت میں بسم اللہ بالجہر کے قائل تھے اور سختی سے اس پر عمل پیرا تھے۔ ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی "مسئلہ تسمیہ" کے نام سے آپ نے اس مسئلے پر شائع کیا تھا۔

قاری صاحب مرحوم کے مزاج میں تیزی تھی، اور جلد ہی غصے سے بپھر جاتے تھے۔ کبھی کبھی سب وشتم بھی کرتے تھے۔ آپ کے ایک افغانی

شاگرد مولوی شیر بہادر، جو موتی مسجد (رام پور) میں امام تھے، کہتے تھے کہ قاری صاحب آپ اسی زبان سے جس سے تلاوتِ کلام اللہ کرتے ہیں، سب دشتم بھی کرتے ہیں۔ جواباً قاری صاحب فرماتے تھے کہ مولانا کیا کروں، ناشائشتہ حرکات سے دل کڑھتا ہے، آنکھیں نہیں ہیں ورنہ ہاتھوں کا استعمال کرتا۔ لیکن یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ وہ دل کے صاف تھے۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے قاری صاحب "وہابی" مشہور تھے، لیکن اس کے باوجود چشتی بزرگ حضرت مولانا سید غلام محی الدین صاحب سے (جن سے قاری صاحب بیعت تھے) اور اپنے پیر کے پاس ان کی وفات تک آمد و رفت رکھی اور وفات کے بعد بھی اُن کے صاحبزادے سید جمیل میاں صاحب چشتی نظامی، جو قاری صاحب کے شاگرد بھی ہیں، کے پاس آتے جاتے رہے۔ مرشد بھی قاری صاحب سے محبت کرتے تھے، اور اپنے صاحبِ کمال مرید کی تکریم کرتے تھے۔

موجودہ دور کے علماء میں قاری صاحب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا سید عبدالدائم جلالیؒ سے زیادہ متأثر تھے۔

قاری صاحب موزوں طبع ہونے کے باعث کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے بالخصوص نعت ترنم سے پڑھتے تھے۔

مدرسہ مطلع العلوم کے مدرسی کے زمانے کا ایک واقعہ قاری صاحب اس طرح سناتے تھے کہ میرے ایک شناسا مولانا محمد قمر صاحب ولایتی، سُوات کے رہنے والے نہایت صالح آدمی تھے، بیرون شہر ایک مسجد میں (جو رضا انٹر کالج کی تأسیس کے بعد اس کے احاطے میں آگئی ہے) قیام پذیر تھے، اور اسی غیر آباد مسجد میں امامت بھی کرتے تھے، میں ان کے پاس آمد و رفت رکھتا تھا، ایک دفعہ

بڑے مولانا قمر صاحب نے کہا، کہ دو جوان جو قوم اُجنہ میں سے ہیں، آپ سے قرآن شریف پڑھیں گے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ، پہلی شرط یہ ہے کہ آپ انھیں مدرسے کے اوقات میں نہیں پڑھائیں گے، بلکہ ایک بجے کے بعد جب طلبہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے تب انھیں پڑھائیں گے۔ دوسرے آپ اُن سے کسی قسم کا سوال ان کے جن ہونے سے متعلق نہ کریں گے۔ قاری صاحب نے ان دو شرطوں کو مان کر ان کو پڑھانا شروع کردیا۔ ایک ماہ تک تو قاری صاحب اپنے مزاج کے خلاف خاموشی سے ان کو پڑھاتے رہے، اس کے بعد قاری صاحب سے صبر نہیں ہوسکا، اور ایک روز ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا کہ کیا بات ہے کہ جب تم میرے قریب بیٹھتے ہو تو مجھے شدید گرمی محسوس ہوتی ہے، اور جب تم چلے جاتے ہو تو گرمی ختم ہوجاتی ہے، کیا تم جن ہو؟ حالانکہ قاری صاحب کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ دونوں جن ہیں، لیکن قاری صاحب بھی اپنے غصے اور تیزیٔ مزاج میں مثلِ جن تھے، اس لئے غیر ارادی طور پر انھیں جن کہدیا۔ ان دونوں نے مولانا محمد قمر صاحب کو یہ واقعہ سُنا کر اُن سے شکایت کی۔ قمر صاحب نے قاری صاحب کو بلا کر ان سے معلوم کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا، جبکہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اس امر کا اظہار کہ وہ جن ہیں نہیں کریں گے، قاری صاحب نے کہا کہ غیر ارادی طور پر زبان سے نکل گیا، جو ہونا تھا، وہ ہوگیا، اس پر قمر صاحب نے کہا کہ آئندہ وہ دونوں آپ کے پاس نہیں جائیں گے، اور آپ کو میرے تعلق کی وجہ سے ایذا تو نہیں دیں گے لیکن آپ کو قرأت قرآن عظیم کی تکمیل کے بعد جو فائدہ ان دونوں سے پہنچتا وہ بھی ختم ہوگیا۔

قاری عبدالواحد صاحب مرحوم مغفور اپنے شاگردوں کی تعداد ۱۹۷۶ء میں یعنی اپنے انتقال سے دس سال قبل مجھے اس طرح بتاتے تھے۔

دس ہزار طلبہ نے بقدر ما یجوز بہ الصلوٰۃ قرآن کریم پڑھا۔
دو ہزار طلبہ نے قرآنِ کریم مکمل ناظرہ پڑھا۔
ایک سو پچیس طلبہ نے پورا قرآن کریم حفظ کیا۔

اس تعداد میں آخری دس سال (۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۶ء) کے طلبہ شمار نہیں کئے گئے ہیں۔ اللہ اکبر اس سے بڑی نعمت اور کامیابی کیا ہوگی کہ اس قدر کثیر تعداد کو سب سے عظیم کتاب قرآنِ کریم صحیح طور پر پڑھنا سکھا دی۔

چند مشہور شاگردوں کے نام ذیل میں مندرج ہیں، جن میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے پورا قرآن شریف پڑھا، اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے قاری صاحب سے چند پارے یا چند سورتیں قرآنِ کریم کی پڑھیں اور اُن کی تصحیح کی:

قاری احمد الزماں صاحب صدیقی میانی، قاری عبدالرحمان صاحب جے پوری، قاری خلیل میاں صاحب مجددی، قاری سردار خاں صاحب بریلی، قاری صولت علی، قاری خالد شمسی، قاری مختار احمد شمسی، مولوی قاری ریاض الدین خاں صاحب، مولوی قاری عرفان صاحب شمسی مقیم قطر، قاری طفیل صاحب، قاری وقار احمد شمسی، قاری زبیر احمد شمسی، مولوی قاری محمد حسین شمسی، حافظ مقبول صاحب، مولوی قاری فضل الرحمان صاحب مجذوب فرزند مولانا رفیق صاحب مرحوم، جناب مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند، جناب نجات اللہ صدیقی پروفیسر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ، جناب مختار علی خاں فرزند حضرت مولانا اقبال علی خاں عرشی مرحوم، جناب مزمل حسین صدیقی، جناب مدثر حسین صدیقی، ڈاکٹر مولوی ماجد علی خاں صاحب ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جناب حافظ اشتیاق علی خاں صاحب کینیڈا، جناب قاری راشد مجددی ناظم شعبۂ قرأت مدرسہ عالیہ، جناب محمد ارشاد علی خاں

مدرسہ ذو الفقار ہائی اسکول وبرادر مضمون نگار اور مضمون نگار محمد نظر علی خاں۔

قاری صاحب کی نماز جنازہ درس گاہ جماعت اسلامی رام پور میں سید جمیل میاں صاحب فرزند مولانا غلام محی الدین صاحب کی اقتدار میں ادا کی گئی، اور تدفین سید جمیل میاں کے ایما ء پر پیر و مرشد کے مزار کے متصل محلہ احاطہ (جو ہاتہ کے نام سے مشہور ہے) رام پور میں ہوئی۔

قاری صاحب کی زندگی کے دو پہلو تھے جو بعد از وفات بھی نمایاں رہے۔

خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

احسان کی روش

(قرآن کی روشنی میں)

از جناب محمد بدیع الزماں، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پٹنہ

ایمان لانے کے دو تقاضے ہیں۔ ایک تقویٰ کی روش اختیار کرنی اور دوسرا احسان کی۔ اول الذکر کا تعلق دل سے ہے اور موخر الذکر کا عمل سے۔ جو دل خدا کے خوف سے خالی ہے وہ تقویٰ سے خالی ہے اور جس عمل میں نیکی اور خیر کا پہلو نہ ہو وہ کفر کے مترادف ہے۔ تقویٰ اور احسان اطاعتِ الٰہی کے لازم وملزوم پہلو ہیں اور یہی ایمان کے سکے کے دو رُخ ہیں۔ یہی دونوں ایک مومن کو اللہ سے قریب کرتے ہیں۔ فرمایا:

"اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں (إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ)"

(۱۶: ۱۲۸)

قرآن کا نزول عام انسانوں کے لئے ہے مگر اس سے ہدایت وہی پاتے ہیں

یا پا سکتے ہیں جو تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ ارشاد ہے :

"یہ (قرآن) اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے (هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ)" ——— (۲:۱)

"یہ کتاب حکیم (قرآن) کی آیات ہیں۔ ہدایت اور رحمت نیکوکار لوگوں کے لئے (هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ)" ——— (۳۱:۱)

احسان لفظ حُسن سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو اپنی پوری قابلیت اور صلاحیت کو بروئے کار لاکر، اپنے سارے وسائل کو صرف کرتے ہوئے، دل و جان سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔ مگر اپنے اس فعل و عمل میں اپنے ایمان پر ثابت قدم رہ کر اچھے کام کرنا، جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے پرہیز کرنا، جو فرمانِ الٰہی ہے، اسے ماننا، حق کو حق جاننا اور حق کی حمایت کرنی اور شر کے مقابلے میں ہر طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنی۔ یہی احسان کی روش کے تقاضے ہیں۔

ایمان کے اِن دو تقاضوں، یعنی تقویٰ کی روش کے ساتھ ساتھ احسان کی روش اختیار کرنے کے متعلق فرمایا خدائے تعالیٰ نے :

"جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اُس پر کوئی

گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے
رہیں جو حرام کی گئی ہیں۔ اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور
اچھے کام کریں۔ پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس
سے بچیں، جو فرمانِ الٰہی ہے اسے مانیں۔ پھر خدا ترسی
کے ساتھ نیک رویہ رکھیں (اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ
اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا)۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند
کرتا ہے (وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ــــــ
(۵ : ۱۲)

اِن آیات سے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ احسان کی روش یہ ہے کہ انسان عملاً نیک ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ صرف حوالگی اور سپردگی کا اعلان کرے بلکہ وہ رویہ اختیار کرے جو خدا کے ایک مطیع فرمانبردار بندے کو کرنا چاہیئے۔ اِسی روش پر چلنے والے وہ سہارا تھام لیتے ہیں جو انھیں حیات ابدی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے:

"جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور
نیکوکار ہو (وَھُوَ مُحْسِنٌ) تو اس نے
فی الواقع ایک بھروسے کا سہارا تھام لیا
اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی
کے ہاتھ ہے" ــــ (۳۱ : ۳)

خدا کو خوف و طمع سے پکارنا بھی احسان کی روش میں شامل ہے:
رحمتِ الٰہی کا باعث بنتی ہے:

"اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیکوکار لوگوں کے قریب ہے۔ (وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ")

——(۷:۷)

انسانی معاشرے کی درستگی اور اس کی صحت مند تشکیل کے لئے خدا نے، ان لوگوں کو جنھوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، یہ ہدایت دی ہے کہ:

"اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے" —— (۱۶ : ۱۳)

اس آیت میں پہلی چیز عدل اور دوسری احسان ہے۔ جس سے مراد نیک برتاؤ فیاضانہ سلوک، ہمدردانہ رویّہ، رواداری، خوش خلقی، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ بھی شامل ہے۔ اجتماعی زندگی میں عدل اگر معاشرہ کی اساس ہے تو احسان اُس کا جمال اور اُس کا کمال۔ عدل اگر معاشرہ کی ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں پیدا کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں احسان کی روش اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والا سب سے اہم جذبہ ہے

محسنین کی صفات و خصوصیات قرآن میں مختلف سورتوں میں وارد ہوئی

ہیں۔ نفسِ مضمون کو ملحوظ رکھ کر، چند ایسی آیات درج ذیل نقل کی جا رہی ہیں:

"ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک، پیاس اور
جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ (ایمان لانے والے)
جھیلیں اور منکرینِ حق کو جو راہ ناگوار ہے اُس پر
کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے (عداوتِ حق کا)
کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے اُن کے حق
میں عملِ صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے یہاں
محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا۔ (اِنَّ اللّٰہَ
لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ) ——— (۹: ۱۵)

یہی بات محسنات سے بھی دہرائی گئی ہے جس کا اطلاق مردوں پر بھی ہوتا ہے کہ:

"اگر تم (نبیؐ کی بیولو) اللہ اور اُس کے رسولؐ اور
دارِ آخرت کے طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو
نیکوکار ہیں اللہ نے اُن کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا
ہے (فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ
اَجْرًا عَظِیْمًا" ——— (۳۳: ۲۹)

احسان کی روش پر چلنے والوں کے لئے یہ اجر اس لئے مہیا کر رکھا گیا ہے چونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ:

"نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے
(ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ" ۵۵: ۶۰)

"ہم نیکوکاروں کو اُن کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں (وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ) ۶ : ۱۰)

احسان کی روش اختیار کرنے والوں سے خدا کا وعدہ ہے کہ :

"جو سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچ مانا وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔ انھیں اپنے رب کے یہاں سے وہ سب کچھ ملے گا جن کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا (ذٰلِکَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ" (۳۹ : ۴)

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

(۲)

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلمانوں کے پہونچنے سے پہلے اسپین کے عوام طرح طرح کے ٹیکسوں کے بوجھ میں دبے ہوئے تھے۔ حکمراں طبقہ ان حالات سے نہ صرف بے بہرہ تھا بلکہ ان کی مشکلات میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ مذہبی طور پر وہاں بڑی آبادی عیسائیوں اور دوسرے درجے میں یہودیوں کی تھی۔ دونوں ہی کی سماجی زندگی خراب تھی۔ لیکن خاص طور پر یہودی اور بھی زیادہ خستہ حال تھے۔ اس کے علاوہ وہاں گاتھوں کی حکومت تھی جو خود بھی آپس کی رسہ کشی اور انتشار میں الجھے ہوئے تھے۔ عام لوگوں کی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئی اور نتیجتاً اسپین پر مسلمانوں کے حملے اور اس میں کامیابی کی ایک بڑی وجہ خود اسپین کے لوگ ثابت ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کے کردار کی عظمت سے متاثر ہو کر انھیں آنے کی دعوت دی تھی اور مسلمانوں نے وہاں کے بہت سے شہروں اور علاقوں کو [illegible] کے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے سماجی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں پہلا اور معزز طبقہ شاہی خاندان اور [illegible] کا تھا۔ دوسرا طبقہ مزدوروں اور کسانوں کا تھا۔ تیسرا طبقہ ان

یہودیوں کا تعاقب پر عیسائیوں نے بہت ظلم کئے تھے۔ انھیں [illegible]
[illegible] حاصل رہے تھے۔ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد [illegible]
آئی۔ مسلمانوں نے ان تینوں طبقوں کو برابر کے شہری حقوق اور عہدے دئے [illegible]
علاوہ عرب قبیلے [illegible] سے یہاں آکر آباد ہوئے [illegible]
[illegible] کے دوسرے باشندوں کو حاصل تھے۔ [illegible]
کو بھی مساوی مرتبہ دیا گیا۔ مسلمان عیسائی اور یہودیوں کو اہل کتاب مانتے تھے ا[illegible]
لئے ان کے درمیان معاشرتی رشتوں کا آغاز و فروغ ہوا۔ یہودیوں کے ساتھ [illegible]
اور برابری کا سلوک اس حد تک کیا گیا کہ وہ جن زمینوں پر کاشت کرتے تھے و[illegible]
زمینیں ان کو عطا کر دی گئیں۔ اس داد و دہش اور حوصلہ افزائی کا یہ اثر ہ[illegible]
کہ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے اپنے مذہب کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے [illegible]
عربی زبان سیکھی۔

فتح اسپین کے بعد آٹھویں صدی کے شروع میں عرب قبائل اسپین میں
آکر تیزی سے آباد ہونے لگے۔ انھوں نے اپنے لئے سرسبز و شاداب علاقے
پسند کئے۔ حکومت کی جانب سے عوام کے لئے جابجا حمام بنوائے گئے۔ [illegible]
قرطبہ میں حمام کی تعداد آٹھ سو بتائی جاتی ہے اور اسی طرح وہاں چشمے [illegible]
شہروں میں پانی پہونچانے کے لئے نہروں کا جال بچھایا گیا۔ غرضیکہ وہاں [illegible]
خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا اور عافیت سے پھر سماجی زندگی بسر ہونے لگی
ابتدائی زمانے میں مسجد سے متصل ہی مدرسے قائم کئے گئے۔ سب سے بڑ[illegible]
جامعہ قرطبہ میں تھی جس میں ہزاروں طلباء تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔

سند دینے کا رواج اور دستور اسی زمانے سے شروع ہوا ہے [illegible]
بالاقسم کے عرب قبیلے اپنی تہذیب و اخلاق اور اطوار و عادات کے ساتھ

پر نمایاں ہونے لگے۔ ان تمام چیزوں کا گہرا اثر ان کی عیسائی اور یہودی آبادی پر پڑا۔ مسلمانوں اور مقامی عیسائیوں کے درمیان شادی کے رواج نے اس میل جول کو مزید تقویت دی۔ جغرافیائی طور پر عرب و اسپین اور مذہبی سطح پر اسلام اور عیسائیت اور ان دو مختلف معاشروں کی زبانوں کے اختلاط و امتزاج کے نتیجے میں سو سال سے کم مدت میں ہی ایک ملی جلی تہذیب اور مشترک سماج وجود میں آگیا اور مسلمانوں کے حسن عمل کی وجہ سے اسپین میں بہت جلد اسلامی تہذیب مقبول ہوگئی اور مقامی آبادی کی اکثریت نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا اور وہ لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔ انھوں نے بھی اسلامی تہذیب، وضع قطع اور طور طریقوں اور عربی زبان کو حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ "مستعرب" کہلاتے تھے ان کے لباس، وضع قطع اور طور طریقوں میں عربوں سے زیادہ فرق نہ تھا تاہم اس سلسلے میں مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا اور غیر مسلموں کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ اگر معاملہ ان کے اپنے آدمیوں کے درمیان ہو تو وہ اسے اپنے مذہبی قانون کے مطابق خود اپنی عدالتوں میں طے کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایک فریق مسلمان اور دوسرا عیسائی ہوتا تو فیصلہ مسلم عدالت میں مسلمان قاضی کرتا تھا۔ مسلمانوں کی اس پالیسی کی وجہ سے اسپین میں تہذیب و تمدن کی بڑی ترقی ہوئی۔ مسلمانوں کو اسپین کی گاتھک تہذیب سے خود بھی پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مثلاً اسپین میں مسلمانوں نے جو عمارتیں، محلات اور مسجدیں بنائی تھیں ان میں گاتھک اسٹائل اور اسلامی فن تعمیر کے امتزاج سے ایک نیا اور دنیا کا حسین ترین فن تعمیر ایجاد ہوا اور جو مسجد قرطبہ اور غرناطہ کے محل الحمرا میں آج بھی اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ اسی طرح شعر و ادب کے میدان میں مسلم اور عیسائی تہذیب کے میل جول کے نتیجے میں عربی زبان میں نئے اسالیب پیدا ہوئے مثلاً چودہ

پچھے لائنوں والی گیت نما نظم جس کو "موشحات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور عوامی گیت کی اور قسم جس کو "زجل" کہا جاتا ہے اسی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ یہ طرز معاشرت جو عرب حکومت کے تحت اسپین میں پیدا ہوا تھا اس میں مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے رنگ نظر آتے ہیں۔ مثلاً ابتدائی دور میں حکمراں طبقہ کی حیثیت سے عرب عنصر غلبہ حاصل رہا بعد میں شمالی افریقہ کے بربر کی بھی خاصی شمولیت ہوگئی اور اسپین میں ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی حکومت میں حصہ دیا گیا لیکن یہ جذبۂ ہمدردی و رواداری ان مسلم حکمرانوں کو مہنگا پڑا اور عیسائیوں کا اسلام دشمن ذہن ان کی علمی و سیاسی بیداری کے جلو میں بتدریج بلوغت کی منزلوں سے گذرتا ہوا اپنے اوج کمال پر پہونچ گیا اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

ادھر مسلمان حکمرانوں کے تعیش اور باہمی انتشار نے حکومت کے مضبوط ستونوں کو کمزور کر دیا اور پندرھویں صدی کے طلوع کے ساتھ ہی مسلمان اپنی حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ عیسائی جو اسپین میں مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے علوم سے فیض یافتہ اور مہذب بنے تھے، مسلمانوں سے حکومت چھین لینے کے بعد ان کی تہذیب کے آثار کو مٹانے کے درپے ہوگئے اور اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مسلمانوں کی یہ عالی ظرفی تھی کہ انھوں نے تمام علوم سکھانے میں غیر قوموں کے ساتھ کوئی امتیاز و تعصب روا نہیں رکھا۔ سائنسی، تمدنی، سماجی، سیاسی، طبی اقتصادی، فلسفیانہ، مذہبی اور ادبی علوم کو تحقیقی مہارت کے ساتھ ان قوموں کے سامنے پیش کیا۔ جب عیسائی ان علوم میں ماہر ہو گئے تو انہی ہتھیاروں سے انھوں نے مسلمانوں کو فتح کیا اور ان سے قدیم عناد کا بھرپور انتقام لیا۔

(باقی)

قرآن کریم میں ترادف

(پہلی قسط)

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی
پروفیسر مطالعات قرآنی (شعبہ دینیات)
جامعۃ القرویین مغرب۔

عربی سے ترجمہ:
محمد رضی الاسلام ندوی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

زمانۂ قدیم سے عربی زبان کے ابناء ترادف کی بحث میں مشغول رہے ہیں اور اس میں ان کے مسالک وآراء میں اختلاف رہا ہے۔ ضروری ہے کہ ان کی اس مختلف فیہ بحث میں بیان قرآنی کی فیصلہ کن بات ہو۔ قرآن جب 'کلمہ' کے راز کی طرف اشارہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک کلمہ کی جگہ دوسرے ان کلمات میں سے جنھیں اس کا مترادف قرار دیا جاتا ہے کوئی کلمہ نہیں آسکتا۔

یہی معاملہ قرآن کے الفاظ کے سلسلہ میں بھی ہے۔ قرآن میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے ہٹا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ لایا جاسکے۔ اس بات کا ان خالص اور فصیح اہلِ عرب نے جن کے درمیان قرآن نازل ہوا تھا، ادراک کرلیا تھا۔

یہاں میں چاہتی ہوں کہ مترادف کے مسئلہ کی کچھ وضاحت کردوں جس میں طویل عرصے تک سخت اختلافات رہا ہے مترادف سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ایک معاملہ کیلئے متعدد الفاظ عرب قبائل کی لغات کے اختلافات کی وجہ

سے بھی ... [illegible] ... کہ میری معلومات کی حد تک کسی ... [illegible] ... اختلاف نہیں ... [illegible]
مترادف سے جہاں مراد یہ ہو کہ ایک معنی کے ... [illegible]
متعدد صفت ہو۔ نہ ان الفاظ کے درمیان بھی کوئی ... [illegible] ... کہ
صوتی قرابت ہو۔

ہم میں سے بعض اس تعدد کو حسن کے فقدان الفاظ کی دلالتوں کو منضبط کرنے اور معانی کی تعیین کے عدم قدرت کا مظہر شمار کرتے ہیں اور اسے تنافر اسباب قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اسے ثروت، وسعت اور تصرف پر قدرت کا مظہر سمجھتے ہیں اور اس لغوی ثروت پر فخر کرتے ہوئے اسے عربی زبان کا ایک امتیاز قرار دیتے ہیں۔

اب جب کہ لغوی مطالعات کی ترقی نے ہمیں اپنی زبان اور دوسری زبانوں کے درمیان سادہ موازنہ اور برتری کے مرحلے سے آگے بڑھا دیا ہے اور ہمیں لغوی اور صوتی مباحث میں علمی تحقیقات سے حاصل ہونے والی معلومات سے استفادہ کرتے ہوئے عربی زبان کے خصائص و امتیازات میں غور کرنے کی طرف رہنمائی کی ہے اس لیے اب ایک معنی پر دلالت کرنے والے الفاظ کی کثرت محض مباہات کی چیز نہیں رہ گئی بلکہ ایک مسئلہ بن گیا ہے جو حل چاہتا ہے۔

× × ×

ہم جب لغت کی ان کتابوں اور ڈکشنریوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ترادف کے مسئلہ پر چند متضاد مسلک پائے جاتے ہیں۔

۱؎ السیوطی: المزھر فی علوم اللغۃ ص ۴۰۵ طبع الحلبی۔

۲؎ ابن فارس: الصاحبی فی فقہ اللغۃ ص ۸

بعض کتابوں میں ترادف ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک معنی یا ایک چیز کے لیے متعدد الفاظ بیان کئے گئے ہیں۔ بغیر یہ اشارہ کئے ہوئے کہ یہ مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ یہ مسلک ابو مسحل الاعرابی (دوسری صدی ہجری) صاحب کتاب النوادر اور ابن السکیت (تیسری صدی ہجری) صاحب کتاب "الالفاظ" کا ہے۔ اسی طرح فیروز آبادی صاحب القاموس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "الروض المسلوف فیما لہ اسمان إلی ألوف" دوسری کتاب "اسماء العسل" ہے جس میں انھوں نے شہد کے ۸۰ نام بیان کئے ہیں۔

لیکن بعض کتب لغت ایک چیز یا ایک معنی کیلئے آنے والے الفاظ میں سے ہر لفظ کیلئے خاص دلالت بیان کرتی ہیں۔ یہ ابو منصور الثعالبی صاحب فقہ اللغۃ، ابو ہلال العسکری صاحب "الفروق اللغویہ" اور احمد بن فارس صاحب "الصاحبی فی اللغۃ" کا ہے۔ یہ لوگ چوتھی صدی ہجری کے علماء لغت میں سے ہیں۔

دونوں مسالک میں اختلاف قدیم ہے۔ احمد بن فارس نے اصمعی کا ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ہارون رشید نے اس سے ایک "غریب" شعر کے بارے میں دریافت کیا۔ اصمعی نے اس کی تشریح کردی تو رشید نے کہا "اے اصمعی تمہارے نزدیک "غریب" بھی "غریب" نہیں ہوتا" اصمعی نے کہا اے امیر المومنین کیوں نہ ہو۔ مجھے پتھر کے ستر نام یاد ہیں۔

ابن خالویہ کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ مجھے شیر کے پانچ سو نام اور سانپ کے دو سو نام یاد ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن اس نے حلب میں سیف الدولہ کی مجلس میں کہا "مجھے 'سیف' (تلوار) کے پچاس نام یاد ہیں۔ ابو علی فارسی جو اس دن اس مجلس میں موجود تھے۔ یہ سن کر ہنسے اور کہا "مجھے تو صرف

ایک نام یاد ہے اور وہ ہے 'سیف' جب خالویہ نے ان سے پوچھا: "پھر مہند، صارم، قضیب، حسام وغیرہ کیا ہیں؟" تو ابوعلی نے جواب دیا: "یہ صفات ہیں لگتا ہے کہ حضرت اسم اور صفت میں فرق نہیں کرتے۔"

مبرد اپنی کتاب 'ما اتفق لفظہ واختلف معناہ فی القرآن' میں کہتے ہیں۔

"یہ حروف ہم نے کتاب اللہ سے منتخب کئے ہیں۔ ان کے الفاظ یکساں ہیں۔ لیکن معانی مختلف ہیں وہ تلفظ میں قریب قریب ہیں لیکن مفہوم میں مختلف ہیں جیسا کہ کلام عرب میں پایا جاتا ہے اس لیے کہ اہل عرب کے کلام میں دو الفاظ دو مختلف معانی کے لیے ہوتے ہیں اور دو الفاظ ایک معنی کے لیے ہوتے ہیں اور ایک لفظ دو معانی کے لیے ہوتا ہے۔"[۲]

جیسے دو مختلف الفاظ دو مختلف معنٰی کے لیے: ظننت وحسبت (گمان کرنا) قعدت وجلست (بیٹھنا) ذراع وساعد (بازو) انف ومرسن (نکیل)

اور ایک لفظ دو مختلف معنوں کے لیے: وجد وجدانا (پانا) وجد علی کذا موجدۃ (غصہ ہونا) وجد (جاننا) جیسے وجدت زیدا کریما (میں زید کو کریم جانا)۔[۳]

(باقی)

---

[۲] المبرد: ما اتفق لفظہ واختلف معناہ ص۴۸۔

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

(قسط ۳)

رئیس فاطمہ شعبہ کلیات طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ۔

قرآن پاک نے انسانی ذہن کو وہ پرواز تخیل عطا کیا ہے کہ وہ اس
قابل ہو گیا کہ اس مادی دنیا کے تمام بندھنوں کو توڑ کر یہ سوچے کہ اس مادی
دنیا میں ایسے بہت سے رموز و اشارات پوشیدہ ہیں جو بالآخر اسے اللہ خالق و معبود
کی طرف واپس لے جاتے ہیں۔ قرآن کے ذریعہ ہی انسان کو یہ علم حاصل ہوا کہ
تمام دنیا اسی تبارک تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اس میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے
اس لیے بنایا ہے کہ وہ تلاش و جستجو کے ذریعہ اس سے مستفید ہو سکے۔ اور اس
تلاش و جستجو کا طریقہ بھی قرآن پاک ہی سکھاتا ہے۔

قرآن پاک نے خود دعویٰ کیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے ایک رشد
و ہدایت کی کتاب ہے۔ اس کا پیغام کسی ایک گروہ یا فرقے کے لیے نہیں ہے
بلکہ تمام ہی نوع کے لیے ہے۔ اور نہ ہی کسی ایک متعین و مقرر وقت کیلئے
ہے بلکہ یہ قیامت تک کیلئے ہر دور کے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ کوئی
انسان کی تخلیق کردہ کتاب انسانیت کے لیے مشعل راہ نہیں بن سکتی۔

آج کے دور میں انسان کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی میں جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں ان سب کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں ہم قرآن میں پا رہے ہیں۔ قرآن پاک نہ صرف ہم کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے بلکہ وہ ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ اس کی ایک ایک بات ہمارے دلوں کو چھوتی ہے اور ہمارے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے جواب دیتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ہمارے دلوں میں ا[مید] کا چراغ بھی روشن کرتی ہے کہ ہمارا خالق اگر غضبناک ہے تو بہت ہی زیادہ رحیم و کریم بھی ہے جو ہمیں ہماری غلطیوں پر معاف بھی فرمائیگا۔ سر ولیم میور کہتا ہے:

"قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے ا[علیٰ] ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکرگزاری پر جھکا دیا۔ وہ کمال ہے جس سے دنیا کی تمام کتابیں عاجز ہیں"[1]

یہ قرآن ہی تو ہے جس کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، وہی ہماری تمام ضرورتوں کو پیدائش سے موت تک پو[را] کرنے والا ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ ایٹم جیسے چھوٹے سے چھوٹے عنصر سے لے[کر] بڑی بڑی طاقتور چیزیں سب اللہ کے بنائے ہوئے قدرتی نظام کے مطابق پیدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کرکے اندھیرے میں بھٹکنے کے [لیے] نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے اتنی ہی حقیقت کی جانکاری دی جس کے ذریعہ [وہ] عدل و انصاف اور امن کے ساتھ اپنی زندگی باعزت طور پر گزار سکے۔

---

[1] عبدالقیوم ندوی: قرآن اور اس کی تعلیمات ص [illegible]

سارا علم صحف کے ذریعے ہی حاصل ہوا جو وقتاً فوقتاً پیغمبروں پر نازل ہوتا رہا ہے۔ قرآن پاک سے پہلے صحف آسمانی میں تحریف کر لی گئی۔ مگر ایک قرآن ہی ایسا صحیفۂ آسمانی ہے جو آج تک ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ پاک نے جبرئیل کے ذریعہ نبی آخر الزماں پر نازل فرمایا تھا۔ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو کسی ایک عنوان یا مضمون پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہمیں مذہبی علوم، فلسفیانہ علوم، تاریخی، معاشی، سماجی، سیاسی عدل و انصاف، داخلی و خارجی تعلقات، گناہ، عذاب، محبت و اخلاقیات یعنی کہ سب کچھ ملیگا۔ ہم دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا بنیادی مضمون انسانیت اور اس سے متعلقات ہیں جیسا کہ قرآن خود شاہد ہے :

"شھر رمضان الذی اُنزل فیہ القرآن ھدیٰ للناس وبینٰت من الھدیٰ والفرقان" ۲ہ

ہم آج کے دور میں دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کے زیادہ تر اعمال قرآن پاک کی انھیں تعلیمات کے نزدیک ہیں۔ اور اہلِ (اسلام) میں ان لوگوں کی کثرت ہے جنکے اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پائے جاتے ہیں اور اسلام کا دعویٰ کرنے والے زیادہ تر مسلمان تنزلی کی راہ پر ہیں۔ حالانکہ ہمارے سامنے قرآن پاک جیسی ایک مثالی کتاب موجود ہے جو ہمیں ہر طرح کی تعلیم و ہدایت دیتی ہے مثال کے طور پر علم حاصل کرنا اسکو فروغ دینا ہر مسلمان کا فرض بتایا گیا ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ علم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے :

ہ ۲ : ۱۸۵

آج کے دور میں انسان کی سیاسی معاشی اور سماجی زندگی میں ہم جتنی ترقی دیکھ رہے ہیں ان سب کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں ہم قرآن میں پاتے ہیں۔ قرآن پاک نہ صرف ہم کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے بلکہ وہ اس پر بھی مصر ہے کہ ہم اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ اس کی ایک ایک بات ہمارے دلوں کو چھوتی ہے اور ہمارے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جواب دیتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ہمارے دلوں میں امید کا چراغ بھی روشن کرتی ہے کہ ہمارا خالق اگر غضبناک ہے تو بہت ہی زیادہ رحیم و کریم بھی ہے جو ہمیں ہماری غلطیوں پر معاف بھی فرمائیگا۔ سر ولیم میور کہتا ہے:

"قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکر گذاری پر جھکا دیا۔ یہ وہ کمال ہے جس سے دنیا کی تمام کتابیں عاجز ہیں"۔[1]

یہ قرآن ہی تو ہے جس کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، وہی ہماری تمام ضرورتوں کو پیدائش سے موت تک پورا کرنے والا ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ ایٹم جیسے چھوٹے سے چھوٹے عنصر سے لے کر بڑی بڑی طاقتور چیزیں سب اللہ کے بنائے ہوئے قدرتی نظام کے مطابق عمل پیرا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کر کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے اتنی ہی حقیقت کی جانکاری دی جس کے ذریعہ وہ عدل و انصاف اور امن کے ساتھ اپنی زندگی باعزت طور پر گذار سکے اور یہ

---

[1] عبدالقیوم ندوی: قرآن اور اس کی تعلیمات ص [illegible]

سارا علم صحف کے ذریعے ہی حاصل ہوا جو وقتاً فوقتاً مختلف پیغمبروں پر نازل ہوتے رہے ہیں۔ قرآن پاک سے پہلے صحف آسمانی میں تحریف کر لی گئی۔ مگر ایک قرآن ہی ایسا صحیفہ آسمانی ہے جو آج تک ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ پاک نے جبرئیل کے ذریعہ محمد نبی آخر الزماں پر نازل فرمایا تھا۔ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو کسی ایک عنوان یا مضمون پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہمیں مذہبی علوم، فلسفیانہ علوم، تاریخی، معاشی، سماجی، سیاسی، عدل و انصاف، داخلی و خارجی تعلقات، گناہ، عذاب، محبت و اخلاقیات یعنی کہ سب کچھ ملیگا۔ ہم دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا بنیادی مضمون انسانیت اور اس سے متعلقات ہیں جیسا کہ قرآن خود شاہد ہے:

"شھر رمضان الذی أنزل فیہ القرآن ھدی للناس و بینٰت من الھدی والفرقان" ج ۲ ؎

ہم آج کے دور میں دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کے زیادہ تر اعمال قرآن پاک کی انھیں تعلیمات کے نزدیک ہیں۔ اور اہل میں ان لوگوں کی کثرت ہے جنکے اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پائے جاتے ہیں اور اسلام کا دعویٰ کرنے والے زیادہ تر مسلمان تنزلی کی راہ پر ہیں۔ حالانکہ ہمارے سامنے قرآن پاک جیسی ایک مکمل کتاب موجود ہے جو ہمیں ہر طرح کی تعلیم و ہدایت دیتی ہے مثال کے طور پر علم حاصل کرنا اسکو فروغ دینا ہر مسلمان کا فرض بتایا گیا ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ علم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے:

؎ ۲ : ۱۸۵

"قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون" [۳]

قرآن پاک علم کی اہمیت کو دوسری جگہ اس طرح بیان کرتا ہے:

"ولقد اخترنٰھم علیٰ علم علی العٰلمین" [۴]

اس کے علاوہ قرآن پاک خود اپنی مدافعت کے طریقے بتاتا ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا خذوا حذرکم فانفروا ثبات او انفروا جمیعاً" [۵]

یہاں تک کہ نماز کے دوران بھی اپنی حفاظت کا طریقہ بتاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نماز کے درمیان اپنی حفاظت سے غافل ہو کر مارے نہ جائیں [۶]۔ قرآن پاک نے ہمیں بہادری کی بھی اسی طرح دی ہے کہ اے مومنو! جب کبھی کافروں سے جنگ ہو تو تم پیٹھ مت دکھاؤ اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر غضب ناک ہوگا اور جہنم تمہارا مقام ہوگا [۷]

اسی طرح پورے قرآن پاک میں ہم ہدایت پاتے ہیں۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ملک میں، دنیا میں کسی کونے میں کسی بھی بحران کا سامنا ہوتا ہے تو اصحاب فہم و ادراک اور معزز لوگوں کو اکٹھا کر کے مشورے کیے جاتے ہیں اور اس بحران سے نپٹنے کے طریقے سمجھائے جاتے ہیں۔ یہ انسانیت کا وہ پہلو ہے

۳۔ ۳۹ : ۹

۴۔ ۴۴ : ۳۲

۵۔ ۴ : ۷۱

۶۔ ۴ : ۱۰۲

۷۔ ۸ : ۱۵+۱۶

جس کی تعلیم قرآن ہمیں بہت پہلے دے چکا ہے:

"وشاورھم فی الأمر" [۸]

اللہ تعالیٰ نے محنت کرنیوالوں کو اجر دینے کا وعدہ کیا ہے:

"ونعم اجر العٰملین" [۹]

آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ صفائی پر کتنا زور دیا جاتا ہے صفائی کو صحت کا ضامن قرار دیا گیا ہے مگر صفائی کا یہ تصور بھی انسان کو بہت پہلے قرآن کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے:

"ان اللّٰہ یحب التوابین ویحب المتطھرین" [۱۰]

"وثیابک فطھر والرجز فاھجر" [۱۱]

"تاریخ شاہد ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اور نہ ہی انکے کوئی حقوق تھے۔ اسلام نے ان کے حقوق مقرر کئے اور مقام عزت متعین کیا جسکی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ آج بھی اس نام نہاد ترقی کے دور میں کہیں عورت کو "ستی" کے نام پر زندہ جلا دیا جاتا ہے کہیں اسے جھوٹی عزت اور آن کی خوف سے دنیا میں آتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا ہے کہیں دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے تو کہیں پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے بیچ دیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے کو دنیا کی سب سے زیادہ

---

[۸] ۔ ۳ : ۱۵۹ ۔ یہی بات سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۸ میں بھی ہے۔

[۹] ۔ ۳ : ۱۳۶

[۱۰] ۔ ۲ : ۲۲۲

[۱۱] ۔ ۷۴ : ۴ + ۵

مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کے علمبردار کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انکے یہاں عورتوں کو سب سے زیادہ آزادی اور مساوی حقوق حاصل ہیں عورتوں کو چند دنوں کیلئے شریک حیات بنا کر طلاق جیسی منحوس اور قابل نفرت تحفے سے نواز کر ذلیل کرتے ہیں اور اس سلسلے میں تا زندگی قائم رکھتے ہیں۔ یہ قرآن پاک ہی ہے جو حقیقت میں ہمیں عورتوں کی عزت کرنا سکھاتا ہے:

"وعاشروهن بالمعروف" [12]

خداوند کریم سورۃ بقرۃ میں ارشاد فرماتا ہے ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف یعنی جسطرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ یہی نہیں پوری ایک سورۃ النساء عورتوں کے معاملات سے متعلق نازل فرمائی۔

اسلام ایک علمی اور عملی مذہب ہے جسکے لیے قرآن پاک کو ہدایت بنا کر ہمارے سامنے رسول ﷺ نے پیش کیا۔ یہ تمام دنیا کیلئے اخلاق وعبادت اور علوم وضاعات کی تبلیغ کرتا ہے۔ قرآن کا تخاطب ہر سطح کے خاص وعام لوگوں سے ہے یہ انسانی زندگی کیلئے ایک مکمل دین اور جامع نظام فکر وعمل پیش کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی شعبہ ایسا نہیں جسکے لیے قرآن نے واضح ہدایت اور اصولی احکام نہ دیئے ہوں۔

قرآن پاک کی بلاغت، مضامین کی عظمت اور اس کے اسلوب وبیان کی شوکت کے سامنے انسان نے ہمیشہ اپنے کو عاجز پایا۔ امام رازی کا کہنا ہے:

"میں نے علم کلام کے سارے مباحث اور فلسفے کے تمام ابواب پر گہ

---

[12] ۔ ۴: ۱۹ ۔

طرح غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب۔ میں نے پایا کہ منزل مقصود تک لیجانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا ہے۔"[۱۳]

قرآن انسان کے ظاہر و باطن کی تعمیر ایسی کرتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ دنیا و آخرت میں چین پاتا ہے۔ قرآن منزل من اللہ ہے۔ کوئی بھی بہتر سے بہتر کلام حتیٰ کہ خود رسول صلعم کے اپنے کلام کا کوئی ایک ٹکڑا بھی اس میں ملا کر رکھیں تو فرق صاف ظاہر ہو جائیگا۔ یہ قرآن کا بہت بڑا اعجاز ہے جو ہمیں یہ ماننے کے لیے مجبور کر دیتا ہے کہ قرآن کسی انسان کے بس کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم قرآن کی عظمت و فضیلت اور حسن و خوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہوں گے کیونکہ قرآن پاک کی ہدایات کی بنا پر ہی اسلام کو دوسرے مذاہب پر فوقیت حاصل ہے۔ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں بھی دیکھتے ہیں کہ کوئی اچھا مقرر یا شاعر کسی ایک عنوان پر بات کرتا ہے تو اکثر وہ کمزور اور بے جان الفاظ استعمال (جا ہے انجانے میں) کر جاتا ہے جس سے اس مضمون کی ساری خوبصورتی اور اصل مقصد ضائع ہو جاتا ہے اور اگر بھولے سے ہی کسی بات یا جملہ کا اعادہ بار بار کرتا ہے تو وہ سامع اور قاری سب کو گراں گذرتا ہے۔ لیکن قرآن کے سلسلہ میں ہم ایسا نہیں پاتے ہیں۔ بلکہ جب کسی قصّہ یا بات کو دُہراتا ہے تو وہ اسے اس طرح پیش کرتا ہے کہ سامع و قاری پر الگنے کے بجائے اچھا لگتا ہے اور اس کی تکرار سے دل و دماغ پر اپنا گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ یہ

---

[۱۳] ۔ محمد منظور نعمانی: قرآن آپ سے کیا کہتا ہے۔ ص ۱۱

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے ۔ قرآن پاک کی انھیں تمام خوبیوں کی بناء پر ہی غیر مسلم اسکالر بھی اسے انسانی ذہن کی تخلیق تسلیم نہ کرکے اسے الہامی کتاب مانتے ہیں ۔

مہاتما گاندھی کا قول ہے :

"مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کر لینے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے" ۱۴؎

۱۴؎ ۔ عبدالقیوم ندوی : قرآن اور اس کی تعلیمات ص ۱۰۵

برہان

جلد ۱۰۲ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۹ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۸۸ء | شمارہ ۵

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

یہ ایک تلخ حقیقت اور تاریخی حقیقت ہے کہ روزِ اول سے "تحریکِ اسلام" کو جس قدر زک اور نقصان نام نہاد مسلمانوں اور منافقین کی ٹولیوں سے پہونچا ہے اتنا نقصان کسی دوسرے فرقے کے لوگوں اور افراد سے ہرگز نہیں پہونچا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کو اس بات سے ہرگز غافل نہیں رہنا چاہیے کہ سامراجی، صہیونی، طاغوتی اور لادین قوتیں اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے برابر سازشوں میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں وہ داخلی و خارجی مفاد پرست نئے حربے استعمال کرنا بخوبی جانتی ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک تازہ مثال سامراجی ایجینٹ، کمیونسٹ اور دریدہ دہن مصنف "مسٹر سلمان رشدی" (جو پیدائشی اعتبار سے ہندی اور برطانیہ میں مقیم ہے) کی شیطان ... کتاب "THE STANIC VERSES" ہے جس میں تمام مذاہب عالم کا عموماً اور دین اسلام کا خصوصاً جی بھر کر مذاق اڑا کر گھٹیا اور رکیک الفاظ میں توہین کی گئی ہے۔ اور اس طرح اس بیہودہ کتاب کے ذریعے دنیا بھر کے مذہب پرست لوگوں خاص طور سو کروڑ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور احساسات کو مجروح کرنے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔

اس نام نہاد کتاب میں گستاخ مصنف نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے لے کر ازواج مطہراتؓ، حضرات صحابۂ کرامؓ سیدنا جبرئیل امینؑ، قرآن کریم یہاں تک کہ اللہ رب العالمین کی شان میں بھی گستاخی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس شیطان صفت مصنف نے بزعم خود یہ بات ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ نعوذ باللہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہنی اختراع اور اساطیر الاولین ہے۔ اس بدنام زمانہ کتاب کے ذریعے عربی، عجمی اور شیعہ سنّی تنازع کو ہی ہوا دینے سعی نا مشکور کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ کتاب کو ایک پڑھا لکھا، عقلمند، سنجیدہ اور غیر جانب دار آدمی نہ ناول سمجھ سکتا ہے، نہ فلسفہ، نہ تاریخ، اور نہ حالات و کوائف پر کوئی معقول رپورٹ و تبصرہ، کتاب شروع سے لے کر آخر تک ایک بکواس نامہ، اور اول فول کا پلندہ ہے

یہ بڑا اچھا ہوا اور اس پر ہم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ بعض مسلمان قائدین اور ذمہ داروں کے توجہ دلانے سے مرکزی حکومت نے فوراً اس اور فتنہ انگیز کتاب کی ملک میں درآمد، اس کی اشاعت و طباعت اور خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی ہے ورنہ اس بات کا شدید اندیشہ اور خطرہ لاحق تھا کہ اس نازک مسئلہ کی آڑ میں جہاں موجودہ ملکی حالات کے پس منظر میں افتراق و انتشار کو مزید ہوا ملتی وہاں ہماری مسلمہ قومی روایات، تشخص، مختلف مذاہب کے تئیں احترام کی قومی اور ملکی پالیسی کی روح بھی بری طرح متاثر ہوتی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان آئندہ بھی اس طرح کی سازشوں

سے پوری طرح باخبر اور چوکنا رہیں۔ مرکزی حکومت سے بھی ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ ملک کے کسی حصہ میں مذکورہ کتاب کی کسی بھی شکل میں اشاعت اور نقل پر "آرڈی ننس" کے ذریعہ قانونی پابندی لگائی جائے کیونکہ یہ ملک کے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام انصاف پسند سکھ، عیسائی اور ہندوؤں کی بھی آواز ہے اور یہی ملکی سالمیت، یک جہتی اور وحدت کا مطالبہ بھی ہے مسلمانوں کو بھی اس طرح کے نازک معاملات میں بہرحال انتہائی صبر وتحمل، ہوشمندی اور دانشمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی جب اس طرح کی اہانت آمیز تحریریں سامنے آتی ہیں تو لوگوں کا اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھنا قدرتی طور پر بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔

یہ ایک سوالیہ نشان ہے اور ہمارے مفکرین اور دانشوروں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ موجودہ دور میں جس احساس کو عام طور پر "زمانے کے تقاضے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ دراصل زمانہ کے تقاضے نہیں بلکہ "مغربی اقدار" کے تقاضے ہیں۔ جنہیں نام نہاد دانشوروں اور مفکرین کے ایک طبقہ کی ذہنی مرعوبیت نے زمانہ کے ہم معنی سمجھ لیا ہے انہوں نے یہ فرض کر لیا کہ زمانہ دراصل "مغرب" ہی ہے اور جو کچھ اس وقت وہاں موجود ہے اور ہو رہا ہے وہ صحیح، درست، برحق اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ہمارے اپنے ملک وقوم میں اگر کوئی چیز ایسی موجود ہے جس کی نظیر وہاں نہیں ملتی تو وہ بوسیدہ (OUT OF DATE.) ناکارہ، اور ازکار رفتہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے فوراً مٹا دیا جائے۔ اسی طرح اگر وہاں کسی نظریہ (THEORY) یا عمل (ACTION.) کو قبول عام حاصل ہے اور ہمارے یہاں اس کا وجود

نہیں ہے تو ہمیں اسے فوراً رواج اور بڑھاوا دینا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر زمانہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکیں گے اور زمانہ ہم سے ہماری "رجعت پسندی" "دقیانوسیت" اور بنیاد پرستی کا سخت انتقام لے گا۔

یہ بنیاد جس پر ہمارے نام نہاد معلمین اور مفکرین کے فکر و عمل کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ دراصل یہی سوچ، اپروچ اور طرز فکر غلط اور کمزور ہے۔ مغربی اقتدار (WESTERN VELU) کو زمانہ کا تقاضا نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی مغربی تہذیب (WESTERN CULTURE) کے استیلاء اور غلبہ کو فکری مجبوریوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کے بارے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ کوئی ... باطل نہیں جس کے مطابق ہم اپنے افکار و اعمال کو پرکھنے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک باطل ... کی عملداری اور غلط افکار و رجحانات کا دھارا ہے جسے ہم اپنی کوتاہ نظری اور ذہنی مرعوبیت کے سبب "زمانہ کے تقاضے" یا "عصری مطالبے" سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور ہمارا یہی چیز فکر و دانش کی بنیادی خامی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم جب بھی شخصی اور اجتماعی معائب کا جائزہ لینے کے آگے بڑھتے ہیں تو مغرب کی عینک لگا کر ساری صورتحال پر نگاہ ڈالتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے عیوب اور کمزوریوں کو اچھی طرح دیکھ نہیں ... ہماری تنقید کا ملاں ہیر پھیر کر وہی موضوعات بنتے ہیں جو مغرب کی نظر ... اعتراض بنتے ہیں اور جن میں اہل مغرب ترمیم و تصحیح چاہتے ہیں۔

چنانچہ ہم اپنے پورے معاشرتی، معاشی، اقتصادی، سیاسی، سماجی، اجتماعی اور روحانی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں ... پہلوؤں میں تغیرات کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی سرے سے ضرورت

ہی نہیں ہوتی اور ان حصوں کو صحیح سمجھ کر جوں کا توں رہنے دیتے ہیں جو سرتاپا غلط ہے اور جن کے وجود سے ملت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچ رہا ہے - یہ اسی بنیادی نقطۂ نظر کے تغیّر کے اعجاز ہے کہ آج ملّت میں رقص و سرود، ناچ و نغمہ، شراب و کباب، قمار بازیاں اور فحاشی و بے حیائی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو کسی تشویش کی نگاہ سے دیکھا نہیں جا رہا ہے بلکہ ابھی باقاعدہ پشت پناہی ہو رہی ہے ضرورت ہے آج کا مسلمان از اول تا آخر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا محاسبہ کرے اور اپنے مقام و منصب "کو سمجھ کر اپنی ان بنیادی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے جو بحیثیت "مسلمان" اس پر عائد کی گئی ہے -

نومبر ۱۹۸۴ء

اپیل

قارئینِ کرام وہمدردانِ ملت! ادارۂ ندوۃ المصنفین اکابر اور بزرگوں، خاص طور پر مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی ایک معنوی علمی یادگار ہے۔ جو اپنے قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا اور ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین محبین اور بہی خواہ حضرات اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کمر توڑ مہنگائی اور دور گراں بازاری میں ایسے ادارے بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے ہرگز نہیں چلائے جاسکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب مرحوم انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے اس کا نظام چلاتے رہے۔

اور اس کا تحقیقی و علمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا، اب یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ کئی منصوبے جو تشنۂ تکمیل اور کئی اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک مستقل فنڈ قائم کیا جائے تاکہ بسہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلایا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ ارباب خیر و بہی خواہان ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے! —

چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر اس پتہ پر ارسال کیا جائے۔

مینجر ندوۃ المصنفین

اردو بازار دہلی ۶

سیّد قطب کی سیاسی بصیرت

(سید قطب شہید کی حیات و خدمات پر مشتمل کتاب "فولاد ہے مومن" کا ایک باب)

از عبید اللہ فہد فلاحی ایم اے شعبۂ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید قطب نے جس خاندان میں پرورش پائی وہ سیاست کے نشیب و فراز سے واقف اور ملک کی سیاسی فضا سے پوری طرح آشنا تھا۔ والد مرحوم ملک کی بڑی سیاسی پارٹی حزب وطنی سے وابستہ تھے جس کی سربراہی مصطفیٰ کامل جیسے مدبر کے ہاتھوں میں تھی۔ عنفوانِ شباب سے ہی سید قطب نے اس پارٹی کے ترجمان جریدۃ الحزب الوطنی میں مصر کی آزادی اور فرانسیسی و سامراجی طاقتوں کے انخلاء کا مطالبہ شد و مد سے شروع کر دیا تھا۔ اس وقت الحزب الوطنی کے سامنے دو مقاصد تھے، ایک تو بیرونی سامراج سے جنگ اور دیار عرب کی مکمل آزادی اور دوسرا اسلام کا نفاذ جس کے سایہ میں مسلمان اطمینان و سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ وطن کی آزادی کی قومی تحریک کے علم بردار سعد زغلول اور حزب الوفد کے کارکنوں کے ساتھ سید قطب کے

جولمحات گزرے وہ مصر کی آزادی اور بیرونی مداخلت کاروں کے انخلاء کے مطالبہ میں صرف ہوئے۔

وفد پارٹی سے سید قطب کا تعلق جس قدر مستحکم ہوتا گیا اسی قدر ان کے قلم کی جرأت، ظلم و استعمار کے خلاف تحریری نفرت اور غیر ملکی حکمرانوں پر تنقید کا عمل شدید ہوتا گیا۔ ابتدائے شباب کی بیشتر تحریریں آزادئ وطن کے نعروں سے پُر ہیں۔ بیرونی سامراج کی ظلِ عاطفت میں حکومت کرنے والے حکمرانوں کے خلاف مصنف کے تند و تیز لہجہ و اسلوب نے انھیں عوام میں ممتاز کر دیا تھا اور لڑکپن کے زمانہ سے ہی حکومت کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگے تھے: چنانچہ وزیر اعظم محمد محمود پاشا مرحوم کے زمانہ میں اخبارات میں ان کا ایک بیان شائع ہوا کہ "وہ لاقانونیت اور انارکی پھیلانے والوں اور امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کریں گے اور اس طرح کی سرگرمیوں کی ہر صورت میں اجازت نہ دی جائے گی اور ان میں ملوث افراد کی لوہے کے ڈنڈے سے خبر لی جائے گی"

مصنف نے اس سرکاری بیان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی سخت تنقید کی:

"یا صاحب الید الحدیدیۃ (اے لوہے کے ہاتھوں کے مالک!) اگر تو اپنے لوہے کے ہاتھوں پر نظر ڈالے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ وہ زنگ آلود ہو چکے ہیں اور مفلوج ہیں۔

وزیر اعظم اس سخت تنقید کی تاب نہ لا سکا مضمون نگار کو ذاتی ملاقات کے لئے طلب کیا۔ سید قطب اس کے دفتر میں حاضر ہوئے تو ان کی کم عمری کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور تعجب سے پوچھا، کیا اس مضمون کے مصنف آپ ہیں؟

سید قطب نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے اس قدر سخت اور بیباکانہ لہجہ میں تنقید کرنے کی وجہ پوچھی۔ نوجوان مضمون نگار نے فوراً کہا: "میرا عقیدہ یہی ہے" فضیاء علم نے فراست سے کام لیتے ہوئے انھیں یہ کہہ کر رخصت کر دیا: جاؤ میرے بیٹے، جو جی میں آئے لکھو"۔[1]

یہ وہ دور ہے جبکہ اخوان المسلمون ابھی تشکیل کے مرحلہ میں داخل نہ ہوئی تھی۔ حسن البنا شہید کا بھی عنفوان شباب تھا کیونکہ سید قطب اور حسن البنا کا سال ولادت ایک (۱۹۰۶ء) تھا۔ البتہ آغاز ہی سے سید قطب کی سیاسی اٹھان کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تحریک میں شامل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک جری، بے خوف اور بیباک انسان تھے اور قدرت نے انھیں تحریر و تصنیف کا خصوصی ملکہ عطا کیا تھا۔ سامراجی طاقتوں، سرمایہ داری اور شاہی نظام کے خلاف ان کا اسلوب بالکل شروع ہی میں نکھر کر سامنے آچکا تھا البتہ اس میں وہ رخ (ORIENTATION) پیدا نہ ہوا تھا جو تحریک اخوان میں شمولیت کے بعد سامنے آیا۔ اس وقت ان کے سامنے ... کی بنیادوں پر تیشہ چلانا ہی اصل الاصول تھا۔ تخریب کے بعد تعمیر کا مکمل نقشہ ... تک ان کے ذہن میں واضح نہ تھا۔

مصنف نے قرآن کی منظر نگاری پر جب لکھنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ اسلامی نظام ... یت اور ہمہ گیری ان پر منکشف ہوتی گئی اور ایک وقت وہ آیا جبکہ اسلام ... اجب العمل ہونے پر ان کا ایمان مستحکم ہو گیا اور انسانیت کے تمام مسائل ... انھیں اسلام کی صورت میں میسر آ گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اخوان المسلمون ... کی شکل میں اسلام کی نمائندگی کر رہی تھی اور بائیں بازو کی قوتیں ... یمی المصری کے پلیٹ فارم سے یہودیوں اور صہیونیوں کے عزائم کی تکمیل ... اب مصنف کا قلم جڑ پکڑ چکا تھا اور اسے اسلامی تحریک کی روشنائی

میسر آنا شروع ہوگئی تھی۔ العالم العربی، الرسالۃ، المصری، اخبار الیوم، اخوان المسلمون
مصر الفتاۃ، بالعہد الجدید، الدعوۃ، النور المصری اور نور الاسلام جیسے اخبارات اور
رسالوں میں آپ کی تحریروں نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔ باطل کے ایوانوں میں آپ کے خلاف
سازشیں رچی گئیں۔ سامراجی طاقتوں کے کان کھڑے ہو گئے کہ آواز بڑی بارعب اور
بلند تھی اور صور اسرافیل کا کام کر رہی تھی۔ شاہ فاروق نے فاضل مصنف کی گرفتاری
کا حکم دیا لیکن وزیر اعظم محمود فہمی نقراشی کا نوجوان مصنف سے ذاتی تعلق تھا اس نے
ذاتی دوستی کا بھرم رکھا اور شاہ کو اس حرکت سے منع کیا۔ دوسری طرف اس نے
اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دو سال کی مدت کے لئے مصنف کو امریکا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔
مقصد سید قطب کو گرفتاری سے بچانا اور ان کی بیباک تحریروں سے گلو خلاصی کرلینا
تھا۔ اور یہیں سے تقلبات کھل گئے۔ پورے ایک سال تک توقف کرتے رہے۔
لیت ولعل سے اس پروگرام کے متعلق کام لیتے رہے۔ بالآخر اعلیٰ تعلیم کے حصول، مختلف
تعلیمی و تہذیبی نظاموں کا مشاہدہ اور سیاسی [illegible] جیسے مقاصد نے
امریکہ جانے پر رضامند کیا۔ یہی اصل مقصد تحریکات کے سپہ سالاروں کو
توجہ [illegible] اختیار کی ہے۔ آج بھی
دنیا کے مختلف حصوں میں تحریک اسلامی کے علم برداروں کو انقلابی فکر اور
طریقہ کار سے ہٹا کر [illegible] تعمیری و تحقیقی اداروں اور
منصوبوں میں باطل نے الجھانے کی کوشش کی ہے کہیں اسے کامیابی نصیب ہو چکی ہے
اور کہیں وہ جد و جہد جاری رکھے ہوئے ہے[2]۔ لیکن امریکہ جا کر سید قطب کو ایک
ضرور ہوا۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی تباہ کاری بچشم سر دیکھی۔ امریکی معاشرت کا
مطالعہ کیا اور اسلام پر ایمان و یقین میں اضافہ ہوا چنانچہ مصر واپس آ کر انھوں نے
تحریک، اخوان المسلمون میں شمولیت اختیار کر لی۔

امریکی سیاست کا تجزیہ

فاضل مصنف نے امریکی سیاست کا مطالعہ خود اس کی لائبریری اور میدان عمل میں جاکر کیا تھا اس لئے ان کی معلومات، تجزیہ اور مختلف منصوبوں پر ان کے تبصرے حقیقت سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ باہر کا انسان امریکی سیاست کو اس کی معاشی و تکنیکی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے رفاہی و امدادی منصوبوں کی وجہ سے ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا۔ وہ مشرقی ممالک میں امریکہ کی شطرنجی سیاست کی چالوں کو نہیں بھانپ پاتا لیکن خود امریکہ میں رہنے والے انسان حکومت اور سرمایہ داروں کے چہروں پر پڑا ہوا نقاب ہٹا کر اصل حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سید قطب نے اپنی تحریروں میں امریکی معاشی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے ... پروگراموں سے نقاب ہٹادیا اور امریکہ کے مکروہ عزائم طشت از بام کئے ... پر سید قطب کو زیادہ توجہ اس لئے دینی پڑی کہ شاہ فاروق کا دور امریکی ... کا دور تھا اور بعد کے ادوار ... بھی زیادہ تر مصری و عربی سیاست پر امریکی ... اور پالیسی بنانے والے چھائے رہے۔ مصر کے صدر انور سادات ... اپنی ڈائری "یا ولدی ھذا عمک جمال" میں امریکہ کے تئیں جن جذبات ... اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سربر حکومت پر متمکن طبقہ کتنی ... یا خطرناک سازش کا شکار تھا اور دشمنوں کے منصوبوں اور پالیسیوں ... کتنا خوش فہم تھا۔ ایک جگہ مصری سیاست کے پیچ و خم کا تذکرہ کرتے ...

... ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ امریکہ سامراجی عقلیت ... نقطہ نظر اپناتے ہوئے معاملات و مسائل کو حقیقت کو سمجھنا

ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ امریکہ کی اپنی ایک سیاست ہے جو وہ اس علاقے میں اپنائے ہوئے ہے حالانکہ ہم لوگ عام طور سے یہی سمجھتے ہیں کہ امریکی سیاست سامراجی برطانوی سیاست ہی کا ضمیمہ ہے جبکہ عالم عرب میں برطانوی سامراجی سیاست دانوں کا اعلان یہ ہے کہ تنہا وہی وہاں کے حالات سے باخبر ہیں۔ میرے بیٹے! ان حقیقتوں کے انکشاف سے اس بات پر مزید روشنی پڑے گی جو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ انقلاب مصر کے تئیں امریکہ کا اپروچ اول روز سے برطانوی اپروچ سے یکسر مختلف رہا ہے۔ اور ہمارے درمیان اور امریکی سفیر کیفرے کے درمیان حقیقی دوستی استوار ہو چکی ہے اور یہ شخص اپنے تعلقات میں مخلص ہے۔

پہلے دن ہی ہم نے مسٹر کیفرے کی اس دعوت کو قبول کرلیا تھا جو انہوں نے شام کے کھانے پر ہماری کی تھی اور ہم سب اس کے گھر پہ گئے تھے جبکہ مصر میں اور باہر دنیا میں بھی لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ انقلاب مصر کے اصل افراد کون ہیں اور اس وقت برطانیہ سے تمام سفارتی تعلقات منقطع کرلئے تھے یہاں تک کہ برطانوی سفیر کا مشرقی مشیر بھی ہماری شخصیات کو پہچاننے کی کوشش میں لگا ہوا تھا پھر ہمارے بعض صحافی دوستوں سے اس نے میل جول شروع کیا تاکہ ان کے ذریعہ ہم تک وہ رسائی حاصل کرسکے یا ہم سب کے ایک جگہ جمع ہونے میں وہ واسطہ کا کام کرسکے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ امریکی سفیر کا ہم سے برابر ربط تھا اور ہر بار وہ ہمارے اہداف و مقاصد کے ادراک کا اظہار کرتا تھا جس نے ہمیں یہ محسوس کرنے پر مجبور کردیا کہ امریکہ اپنے اس اعلان میں برحق ہے کہ وہ سامراجیت کے خلاف ہے اور سختی سے اپنے اس اصول پر کاربند بھی ہے اور وہ کمزور قومیں جو غیر ملکی

اقتدار کے شکنجہ میں پھنسی ہوئی ہیں انھیں اپنا فیصلہ آپ کرنے کے حق کا وہ حامی ہے۔[۲۶]

اس کے برعکس سید قطب امریکی شاطرانہ سیاست کے ان مہروں کو خوب پہچانتے ہے۔ وہ امن وامان کے خالی خولی دعووں اور سلامتی ویکجہتی کے پُر فریب ساحرانہ ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے بہت سے امریکی منصوبوں کی حقیقت منکشف کی۔ اس کی مسموم فکر، ذلت آمیز اقتصادی تعاون اور سودی پروگراموں پر مبنی اور امریکی امداد و تعاون کا تاجرانہ سیاست سے گہرا رشتہ قائم کرکے دکھایا ... منڈیوں کی تلاش کے پیچھے اپنے پیداوار کی کھپت کے ذریعہ معاشی ... غلبہ کا ناپاک منصوبہ بے نقاب کردیا۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

امریکہ جنگ چھیڑنا چاہتا ہے، اگر یورپ بھی اس کے نقش قدم پر چل پڑتا تو وہ جنگ کوریا کے حادثے تک بھی صبر نہ کرتا۔ امریکہ تو برلن کے مشہور بحران ... ایک پوری جنگ لڑنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ لیکن اس وقت تھکا ماندہ یورپ امریکہ کے شدید اصرار اور خواہش پر لبیک کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا ... اپنے زخموں کو چاٹنے اور نقصانات کی تلافی کرنے میں مصروف تھا۔ ... کافی طاقت حاصل ہوگئی تھی اور وہ آنے والے وقت ... تیاری کر رہی تھی لیکن ڈالر کی اشتہا یورپ میں سب کچھ کرنے ... تیسری عالمی جنگ سے وہ بالکلیہ کترا رہی تھی اور اسی وجہ سے ... کی خواہش دبانا پڑی۔

... ایک نئی جنگ چھیڑنے کی ضرورت شدید طور سے محسوس ... مسئلہ ہے۔ پچھلی جنگوں میں جو علمی فتوحات تیزی سے ... جنگوں کے درمیان امریکی صنعت وحرفت کو سامان جنگ

فراہم کرکے جو تجارتی فتوحات حاصل ہوئی ہیں انھوں نے امریکی صنعت و حرفت کی کئی گنا پیداوار تیار کرنے کے نئے مواقع بہم پہونچائے مگر اس کے ساتھ ہی اس پیداوار کی نکاسی ایک پریشان کن مسئلہ بن گئی۔

باوجودیکہ جنگ عظیم کے بعد منڈیاں ویران تھیں، انھیں شہری پیداوار کی سخت ضرورت تھی اور وہ یوروپی مقابلہ آرائی سے خالی تھیں پھر بھی ان کی قوت خرید کمزور تھی خاص کر تھکے ماندے اور زخموں سے چور یوروپ میں یہ قوت زیادہ کمزور تھی۔ چنانچہ امریکی نقطۂ نظر کے مطابق اس کا مطلب کساد بازاری ہی تھا اور اس کساد بازاری کا مطلب یہ تھا کہ امریکی سرمایوں کا زیاں زیادہ ہوتا۔ چنانچہ اس صورت حال میں امریکہ کا مارشل پلان سامنے آیا۔" ؎

مارشل پلان پر تبصرہ

فاضل مصنف نے اس تاریخی تناظر کے ساتھ مارشل پلان کا تجزیہ کیا اور اس کے تین بنیادی مقاصد قرار دیئے:

۱۔ امریکہ کی بڑھتی ہوئی پیداوار کی نکاسی کی جائے۔ لیکن اس کے بیچ میں یہ شرط لگا دی گئی کہ پیداوار سے فائدہ اٹھانے والی حکومتوں پر امریکہ ڈالر کی شکل میں نقد قیمت کی ادائیگی پر زور نہ دیا جائے کیونکہ امریکی حکومت یوروپی سلطنتوں کے لئے ہیز آف کریڈٹ اس شرط پر کھولتی تھی کہ یہ حکومتیں اسے زیادہ تر امریکی مال کی خریداری میں خرچ کریں گی اور حقیقت یہ ہے کہ امریکی حکومت کے مارشل پلان کے نفاذ کے لئے امریکی سرمایہ دار بڑے بڑے ٹیکس برداشت کرتے تھے لیکن ان بڑے بڑے ٹیکسوں کے ساتھ

ایسا نفع بھی کماتے تھے جس کی وصولی میں مارشل پلان کے نفاذ کی صورت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا نیز وہ کساد بازاری کے خسارے سے بھی بچ جاتے تھے۔

۲۔ امریکہ کے مزدوروں کی بیکاری اور اس سے پیدا ہونے والی اجتماعی شورشوں سے تحفظ حاصل کیا جائے، کیونکہ مزدور جو اس سے پہلے جنگی ساز وسامان کی تیاریوں میں مصروف تھے، اب تعطل کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ تمدنی پیداوار کی کھپت کی ایسی راہیں تلاش کی جائیں جو کارخانوں کو انتہائی حد تک مصروف رکھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ مارشل پلان کا نفاذ اور یورپین سلطنتوں کو مشینیں فراہم کرنا تھا جس کا ایک نتیجہ امریکی سرمایہ کو نفع حاصل ہونے کی صورت میں نکلتا۔

۳۔ اس کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو بین الاقوامی اقتصادی عمل کو بحال کیا جائے اور اس کے لئے یورپ کی از سرِ نو تعمیر کی جائے اور اس میں زندگی کی چہل پہل پھر سے لوٹ آئے اور دوسری طرف بیکار مزدوروں میں اشتراکیت کی اشاعت کو روکا جائے۔ مارشل پلان اس مقصد کی تکمیل میں معاون تھا۔[۲]

اوپر کے اقتباسات فاضل مصنف کی مشہور کتاب السلام العالمی والاسلام آخرہ ملب والآن..... سے ماخوذ ہیں۔ یہ باب کتاب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن موجود تھا لیکن ۱۹۵۲ء یعنی فوجی انقلاب کے بعد کتاب کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے اس میں سے یہ پورا باب استعماری طاقتوں نے خارج کر دیا اور اس باب کے بغیر کتاب چھاپنے کی اجازت دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی سفارت سے مصری حکومت اور مصری فوج کے کس قدر مضبوط تعلقات تھے۔ اور

ان تنقیدوں سے امریکی مفادات کس بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔

اسی باب میں سید قطب نے ان مسائل پر بھی اظہار خیال کیا جنھیں آج ہم عالمی کرنسی کے بحران سے یاد کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنی تجزیاتی صلاحیت سے اور امریکی سیاسی پر گہری بصیرت کی وجہ سے عالمی منڈیوں کا جو تجزیہ کیا وہ بڑی حد تک درست تھا۔ لکھتے ہیں:

"... لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ مارشل پلان کی عمر ہمیشہ کے لئے باقی رہ سکے، کیونکہ یورپین منڈیاں جب پر ہو جاتیں تو فطری طور پر معاملات کا ایک معین حد تک آکر ٹھہر جانا عین تقاضائے فطرت تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ یوروپ کے پیداواری وسائل و ذرائع انتہائی حدود کو جا پہونچیں۔ یوروپ اپنی پیداواری قوت کو بحال کر رہا تھا اب وہ اس مقام پر پہونچ رہا تھا کہ نہ صرف خود تباہی سے محفوظ رہ سکے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ اب یوروپین پیداوار اپنی منڈیوں کے ماسوا دوسری منڈیوں میں بھی امریکی پیداوار کی حریف و رقیب بن چکی تھی"

اسی صورت حال میں برطانیہ نے اپنا پر فریب کھیل کھیلا اور امریکی عقل کی سادہ لوحی اور بین الاقوامی حالات سے اس کی بے خبری سے اس نے فائدہ اٹھالیا۔ یہ کھیل ڈالر کے مقابلہ میں اسٹرلنگ پونڈ کی قیمت کم کر دینے کا کھیل تھا۔ اس نے امریکہ کو موقع دیا کہ ڈالر کی سرکاری نہیں بلکہ واقعی قیمت کو قائم رکھنے کے لئے برطانیہ سے آگے بڑھ جائے۔ اس نے امریکہ سے اپنی مجبوری اور خوف کا مظاہرہ کیا حالانکہ اس کی نیت کچھ اور تھی جس کا اندازہ امریکہ کو بہت بعد میں ہو سکا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اسٹرلنگ کے حلقۂ اثر میں امریکی مال کا نرخ بڑھ جانے

کے باعث اس پر منڈیوں کے دروازے بند ہو گئے اور وہ منڈیاں برطانوی مال کے فروخت کے لئے محفوظ ہو گئیں اس کے مقابلہ میں سٹرلنگ پاؤنڈ کی قیمت گر جانے کا اثر انگریزی مال کے نرخوں پر نہ پڑا۔ اس حلقہ کے علاوہ انگریزی مال کے نرخ امریکی مال کے مقابلہ میں پہلے سے بھی ارزاں ہو گئے۔

آخر جب امریکہ کو اس فریب کا پتہ چلا تو اس نے اس کا جواب عالمی منڈیوں سے ہر قسم کے خام مال کو کھینچ لینے کی صورت میں دیا۔ اسے یہ قدرت حاصل تھی کیونکہ اس کی قوت خرید دوسروں سے زیادہ تھی نیز عالمی منڈیوں میں اس کا رسوخ جاپان برٹانیہ کی قوت اور نقد سکہ نسبتاً زیادہ تھا۔ امریکہ کے سامنے یہ مقصد تھا کہ برطانوی صنعت کے مقابلہ میں خام مال کی قیمت چڑھا دی جائے۔ اس صنعت کو مقابلہ کی طاقت سے کمزور کر دیا جائے، کیونکہ خام مال کی قیمت بڑھ جانے کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی صنعت مجبوراً اپنی پیداوار کا نرخ بڑھائے اور اس طرح برطانوی اور امریکی نرخوں میں ایک قسم کا توازن پیدا ہو جائے مثلاً اُونی خام مال کی قیمت پانچ سو فیصد بڑھ گئی کیونکہ اُون انگریزوں کی ایک بڑی صنعت ہے۔ اس طرح برطانوی ملک کے مقابلہ میں جدید طرز عمل کی بدولت ہر اس خام مال کی قیمت چڑھ گئی جس کی بنیاد پر انگریزی صنعت قائم تھی۔ گرانی کی وہ لہر جو عالمگیر جنگ کی تیاریوں سے پیدا ہونے والے دوسرے قدرتی اقتصادی اسباب کے علاوہ دنیا بھر پر محیط ہو گئی تھی اس کا بڑا سبب یہی تھا۔

لیکن یہ امریکی سرگرمی ایک معین حملہ کی روک تھام کے لئے ہنگامی کارروائی سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکی ورنہ امریکی پیداوار کے تعلق سے منڈیوں کی عام حالت کچھ زیادہ متاثر نہ ہوئی البتہ اسے

ایک بڑا دھچکا یہ لگا کہ عالمی منڈی کے ایک اہم مقام چین کو اشتراکیت نے اپنے جال میں پھانس لیا۔ چین پچاس کروڑ انسانوں کا مسکن ہے جو تقریباً دنیا بھر کے باشندوں کا ایک چوتھائی ہے۔ چین بنیادی طور پر امریکی مال کی منڈی نہ تھا لیکن جاپان کی شکست کے بعد امید تھی کہ وہ یہ حیثیت اختیار کرلے گا لیکن اشتراکیت نے اسے اپنی آغوش میں لے کر یہ راستہ بند کر دیا اور امریکی مصنوعات کو کسی قدر تنگی اور گھٹن کا احساس ہوا۔ اسی طرح اجتماعی حلقوں نے بیکاری پھیلنے کا خدشہ محسوس کیا۔ جنگ کوریا سے کچھ پہلے بیکاروں کی تعداد پچاس لاکھ تک تھی لیکن جنگ ختم ہوتے ہوتے یہ تعداد گھٹ کر تیس لاکھ رہ گئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے لئے جنگ کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ اگرچہ کوریا کی جنگ نے بیس لاکھ انسانوں کو ہضم کرلیا تھا لیکن بس ایک جنگ مسئلہ کے حل کے لئے کافی نہ تھی۔ امریکہ کو ایک وسیع پیمانے کی جنگ درکار تھی جو ایک طرف تو تمام بیکار انسانوں کو ہضم کرلے اور دوسری طرف سرمایہ کے لئے پورے نفع کی ضمانت بھی دے۔ پس آج امریکی نقطۂ نظر سے جنگ قومی زندگی کی ایک ضرورت بن چکی ہے اور تقاضائے حال کے بموجب عالمی کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی قومی خواہش اس پر مستزاد۔ عالمی اشتراکیت کا یہ سیلاب ہر روز ایک نئی سرزمین کو فتح کرتا اور ایک نئی منڈی پر قفل چڑھاتا جا رہا ہے۔"

امریکی سیاست کے حربے

سید قطب نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ کس طرح روس اور امریکہ پوری

دنیا کو اپنی شکارگاہ سمجھتے ہیں۔ وہ برابر اس فکر میں ہیں کہ باقیماندہ دنیا کو آہستہ آہستہ اپنے اپنے حصار میں کھینچ لیں اور دنیا کے تمام اقتصادی، جغرافیائی اور انسانی وسائل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کریں۔ فاضل مصنف کے نزدیک سرمایہ داری امریکی قیادت میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل حربے آزماتی ہے :

۱۔ پوری دنیا اور خاص طور پر جاگیردارانہ عرب ملکوں کے سرمایہ داروں کو اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خوف زدہ کرتی ہے اور سامراجیت اور سرمایہ داری کے درمیان مشترک امور کی موجودگی کی وجہ سے مقامی اور عالمی سرمایہ داریوں میں طبعی طور پر معاہدہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ جو ممالک سامراجیت کی براہ راست یا بالواسطہ غلامی میں مبتلا ہیں، ان میں سیاسی و اقتصادی دباؤ کام میں لاتی ہے اور بسا اوقات مسلح تشدد بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتی۔ تمام عرب ممالک میں یہی صورت حال ہے۔

۳۔ کئی عنوانات کے تحت ڈالر کی ساحری کو استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ مارشل پلان کے بعد "اقتصادی امداد" کا عنوان یہی کام کر رہا ہے۔ یا ٹرومین کے پلان میں "چوتھے نقطہ" کا عنوان یہی محرک رکھتا ہے[8]۔

فاضل مصنف کے نزدیک یہ لابی عام طور پر حاکم اور استحصالی طبقوں کو اپنا مخاطب بناتی ہے اور عوام کو زیادہ منہ نہیں لگاتی کیونکہ ان طبقوں کے مفادات سرمایہ دار لابی کی فتحیابی سے وابستہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ لابی ان کے لئے بڑے معرکے سر کرتی ہے لیکن قومی وعوامی مقاصد سے بالکلیہ انحراف کرتی ہے اور فاضل مصنف کے نزدیک امریکی قیادت میں چلنے والی سرمایہ داری کا یہ موقف اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ یہ قومیں اپنے پیروں پر خود کھڑی نہیں ہو جاتیں اور اس بات کا واضح ثبوت بہم نہیں پہونچا دیتیں کہ وہ اپنے شعبدہ باز سرداروں اور لیڈروں کی

شیدہ بازی سے مسحور نہیں ہیں اور انھوں نے طے کر لیا ہے کہ سامراج اور سرمایہ داروں کے لئے حقیقی مشکلات کا باعث بنیں گی اور جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اس لابی اور اس کی فوجوں کے مصالح کو حقیقی خطرات کی راہ میں نظر انداز کر دیں گی۔ فاضل مصنف کے نزدیک، جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے گی تبھی سامراجی سرمایہ دار لابی ان قوموں کی چیخوں پر کچھ کان دھرنے کی فکر کرے گی۔[9]

کمیونزم پر تبصرہ

فاضل مصنف کا اصل نشانہ امریکی سرمایہ داری رہا ہے۔ ان کی آتشیں تحریروں کا رخ اصلاً سامراجی امریکہ کی طرف ہے لیکن روس کی چالبازیوں، کمیونزم کی فکری بے راہ روی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے ناپاک ہتھکنڈوں کے خلاف خاموشی اختیار نہیں کی۔ آپ نے اشتراکی حربوں سے بھی بحث کی ہے اور انسانیت کو ان دونوں بلاکوں سے متنبہ رہنے کی تلقین کی ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک اشتراکی بلاک عوام سے مخاطب ہوتا ہے جنھیں طویل عرصہ سے محروم رکھا گیا ہے۔[10] وہ ہتھکنڈے کے طور پر سامراج کی بدکاریوں اور جرائم کو استعمال کرتا ہے۔ غلام قوموں کی اس خواہش کو کام میں لاتا ہے کہ وہ اپنی گردنوں سے غلامی کا جوا اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ اس طرح یہ بلاک مغربی صلیبیت اور مقامی سرمایہ داری کے ہر حقیقی اسلامی دعوت کا مقابلہ کرنے سے فائدہ اٹھاتا اور ہر اسلامی اجتماعی عدل وانصاف کی تحریک کو ناکام کرنے میں مدد لیتا ہے۔[11]

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی تضاد نہیں ہے:

عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اس وقت دو بلاکوں میں منقسم ہے ایک سرمایہ دار

کا بلاک ہے جس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا کمیونزم کا بلاک ہے جس کی سربراہی روس کر رہا ہے اور ان دونوں بلاکوں میں افکار و نظریات اور مفادات کے تعلق سے اینٹ اور کتے کا بیر ہے۔ فاضل مصنف نے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ سید قطب کے نزدیک ان دونوں بلاکوں کے درمیان یہ فرق ظاہری اور مصنوعی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تقسیم مصالح و مفادات کی تو ہو سکتی ہے افکار و نظریات کی نہیں ہو سکتی۔ یہ منڈیوں اور شکار گاہوں کا بٹوارہ ہے اصول کا عقائد کا نہیں۔ روح کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ جوہر دونوں کا ایک ہے۔ دونوں زندگی کی مادی فکر پر ایمان رکھتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک روحانیت کی کوئی ضرورت اور بنیاد نہیں ہے۔ تاریخ اور حیات و کائنات کی مادی تعبیر و تصور میں دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مغرب میں جو مادی فکر رائج ہے وہ اخلاقی اقدار کو افادی قرار دیتی ہے اور مصالح و مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ وہ زندگی سے روحانی عنصر کی نفی کرتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر ایمان کی تردید کرتا ہے اور اعلیٰ قدروں کی تذلیل کرتا ہے اور Pragmatism فلسفہ کی طرح اشیاء کی حقیقت بس ان کے وظائف و اعمال سے معلوم کرتا ہے۔ اس پورے فکر کے پس پردہ وہی مادیت کام کر رہی ہے جو مارکسزم کی روح ہے۔ روسی و امریکی فکر کے مزاج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ معاشرتی و معاشی حالات میں ہے۔ عام امریکی شہری کو کمیونزم کی طرف مائل ہونے میں جس رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے وہ زندگی کا کوئی ایسا تصور اور نظریہ نہیں ہے جو کائنات، حیات اور تاریخ کی مادی تفسیر کا انکار کرتا ہے بلکہ اس کے سامنے محض یہ امید ہوتی ہے کہ امریکی معاشرے میں دولت کمانے کے زیادہ مواقع ملیں گے اور مزدور کو اجرت بھی زیادہ ملے گی اور کمیونزم کی دنیا میں یہ مواقع چھن جائیں گے۔

سید قطب کے نزدیک حقیقی رزمگاہ مشرقی ومغربی بلاک اور اسلامی ممالک ہیں۔ اسلام کے مقابلہ میں یہ دونوں دشمن متحد ہیں افکار ونظریات کی سطح پر بھی اور مفادات ومصالح کی سطح پر بھی۔ یورپ، امریکہ، روس اور چین وغیرہ ممالک کی مادیت کی راہ میں حقیقی رکاوٹ صرف اسلام ہے۔ صرف اسلام وہ نظام ہے جو وجود اور حیات سے متعلق ہمہ گیر، جامع اور مکمل تصور دیتا ہے اور باہم کشمکش اور رزم وپیکار کی جگہ باہم تعاون وتعامل قائم کرتا ہے۔ انسانیت کو وہ روحانی اصول دیتا ہے جو خالق ارض وسماء سے انسان کا رشتہ جوڑتے ہیں اور زمین پر اس کی مرضی قائم کرتے ہیں۔ محض مادی اغراض کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرتے اگرچہ مفید مادی عمل کو عبادت الٰہی کا درجہ دیتے ہیں۔[12]

سید قطب نے فراستِ مومنانہ سے کام لیکر جو بات اپنے زمانہ میں کہی تھی وہ اب مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ ایرانی انقلاب کے خلاف امریکہ کی ریشہ دوانیاں، افغان جہاد کی روسی درندوں سے مزاحمت اور لبنان وفلسطین میں دونوں بڑی طاقتوں کا کھیل اس حقیقت کو منوانے کے لئے کافی ہیں کہ یہ دونوں بظاہر باہم دشمن اسلام کے خلاف متحد ہیں اور مسلمانوں کے مسائل پر ان کی پالیسی ایک رہتی ہے اور یہ کہ اسلام ہی ان دونوں انسانیت کش طاقتوں کا لوہا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مصری سیاست کا محاسبہ

سید قطب ان مصنفین کی فہرست میں شامل نہیں تھے جو عالمی افکار ونظریات پر تو بڑھ چڑھ کر تنقید کرتے ہیں لیکن ملکی ومقامی فکر کو شتر بے مہار چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کا محاسبہ کرنے سے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے یا انھیں اپنے

گرد و پیش کے باطل کا سراغ لگانے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور اس طرح مقامی صورت حال میں عالمی طاغوت کی تلاش سے وہ عاری ہو جاتے ہیں جبکہ تحریک اسلامی کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ اپنے معاشرے پر پہلے نظر ڈالے اور اردگرد کی برائیوں اور غلط افکار پر پہلے تنقید کرے پھر عالمی و بین الاقوامی دشمنان دین کا بھی بے لاگ محاسبہ کیا۔ شاہ فاروق اور جمال عبدالناصر کے ادوار پر نگاہ ڈالی اور ان کی سامراجی خدمات پر بھی بھرپور وار کیا اور اسی وجہ سے مصری حکام نے آپ کے خلاف سخت نوٹس لیا۔

مصری معاشرہ میں ایسے ارباب کمال اور فضلاء کی کمی نہ تھی جو اسلام کی تعلیمات کو جرأت سے پیش کر رہے ہوں اور زندگی کے ہر میدان میں اسلام کی نمائندگی اور ترجمانی علمی سطح پر نہ کرتے ہوں۔ کمی صرف اس بات کی تھی کہ اصولی طور پر اسلامی تعلیمات پیش کرنے کے ساتھ موجودہ معاشرہ پر اس کا عملی انطباق بھی کیا جاتا اور مومنین و منافقین، یہود و کفار اور دوسرے قرآنی کرداروں کو موجودہ سوسائٹی میں تلاش کیا جاتا، عالمی سامراج کی خدمت کرنے والوں کا پتہ چلایا جاتا اور تحریک اسلامی ان ساری طاقتوں سے نبرد آزما ہوتی۔ اخوان المسلمون نے یہی کام انجام دیا۔ اس کے مصنفین میں سید قطب کو وہ امتیازی مقام حاصل ہے جس نے انھیں عالمی و مقامی استعمار کا دشمن قرار دیا۔ اور ساری طاقتیں مل کر ان کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہوگئیں۔

شاہ فاروق کے زمانے میں حکومت وقت کو سامراج کا ایجنٹ قرار دیا اور اس پر کڑی تنقید کی:

> "مقامی سرمایہ داری اور مغربی سامراج کے درمیان فطری مادی معاہدہ موجود ہے۔ غلام بنانے والوں اور سامراجیوں کا یہ ایک مشترکہ مفاد ہے یہاں

کے سرکش اور سامراجی اس ظلم و استحصال سے ذرا بھی نیچے اترنے کو تیار نہیں ہیں جس پر وہ مسلسل ڈٹے رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سامراج ہی ان کا واحد مادی سہارا ہے۔ ان کا خالق اور پرورش کرنے والا وہی ہے اور اسی نے انھیں اقتدار اور سرمایہ بخش رکھا ہے۔ اس سامراج نے ان غداروں کو صلہ دیا تھا جنھوں نے عرابی کے لشکر کو دھوکہ دیا تھا اور مصر میں سامراجی حملہ آور فوج کی مدد کی تھی۔ اس نے انھیں زمینیں اور مال و دولت عطا کئے تھے۔ حتیٰ کہ آج وہ شریف گھرانوں کے افراد کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور باعزت خاندانوں کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں[۱۳]۔"

سفید فام انگریزوں کی جگہ سیاہ فام انگریزوں کی حکمرانی

انگریزوں کے مصر سے رخصت ہو جانے کے بعد آزاد مصر میں جن لوگوں نے عنانِ حکومت سنبھالی وہ اپنے فکر و نظر، رہائش و زیبائش وابستگی و وفاداری طرز سیاست و معاشرت میں انگریزوں کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے فرق صرف یہ تھا کہ سفید فام کی جگہ سیاہ فام تھا۔ بیرونی مداخلت کی جگہ اندرونی سامراجیت تھی۔ انگریزوں نے ملک تو چھوڑ دیا لیکن معیشت و سیاست اور فکر و تربیت میں اپنے متبع حکمرانوں کو قائم [illegible]

[illegible]

انگریزوں کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر مصر کو چھوڑنا پڑے گا [illegible]

[illegible]

بازاروں کو اپنی نو آبادیات میں شامل رکھنے اور مصری پیداوار کو عالمی [illegible] میں جانے سے روکنے کے لیے انھوں نے اقتصادی میدان میں

امداد کا سلسلہ شروع کیا اور کرنسی وغیرہ کے تبادلوں کے ذریعہ مالی دنیا میں تعاون کا آغاز ہوا لیکن ان تمام امدادی پروگراموں سے انگریزوں کی بقا کا سامان فراہم نہ ہوسکتا تھا۔ اگر اس اندرونی سامراج کا وجود نہ ہوتا جس نے ماضی میں کارنامے انجام دیئے تھے اور جس کی سرپرستی ان دنوں بطور خاص کی جا رہی ہے۔ حکومت کے ایوانوں سے سفید فام انگریز رخصت ہوگئے اور ان کی جگہ ان سیاہ فام مصری انگریزوں نے لے لی جن کے افکار و نظریات پہ انگریزوں کا قبضہ تھا اور جو سامراج کی سرپرستی میں سامراجی مقاصد کے لئے ڈھالے گئے تھے۔ سفید فام انگریزنے وزارت تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی جو نوجوان نسلوں کی تربیت کا کام کرتی تھی اب یہ وزارت سیاہ فام انگریزوں کے حوالے ہوئی تو سفید فاموں کو پورا اطمینان تھا۔ چنانچہ نظام تعلیم، طریق تعلیم کتابیں اور منصوبے سب فکر و روح کو نوآبادیاتی مقاصد کے لئے ڈھال رہے ہیں اور ہم سب دین کے تھوڑے سے عنصر کو شامل کرکے صرف حکومت ہی میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں جاری وساری ہے۔

اس نوآبادیاتی نظام نے کئی نسلیں پروان چڑھائیں جو وزارت تعلیم کی نگراں عقلیت اور اس منطق و فلسفہ سے مالا مال ہیں کہ اسلام دور انحطاط کی ایک یادگار ہے اور جمود و جہالت کے الزام سے بچنے کے لئے اور مصر کی آزادی و ثقافت کو روشن رکھنے کے لئے اس سے پیچھا چھڑانا ناگزیر ہے۔

مصری مدارس اور کتب میں تاریخ کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ سامراج نے کسی مقصد کے تحت ہی شروع کیا تھا۔ مقصد تھا کہ قومی و دینی روح کو یکساں طور پر قتل کردیا جائے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا

ایک طالب علم بلکہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل بھی تاریخ کے مطالعہ سے فارغ ہوتا ہے اور اسے اسلام کی اجتماعی فکر اور اس کے انسانی نظریہ سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ تاریخ اسلامی کے نام پر بس غزوات و سرایا اور واقعات و حادثات کا انبار جمع کر لیتا ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اسلام ایک جنگی تحریک تھی اور وہ کبھی فکری انقلاب یا اجتماعی یا انسانی پیغام نہیں تھا۔"[۱۲]

اس طرح سید قطب نے مصر کے اندرونی نظام پر انگلی رکھ کر بتایا کہ خرابی کہاں ہے۔ وزارت تعلیم پر آپ نے خاص توجہ دی اور نظام تعلیم، طریق تعلیم اور نصاب تعلیم پر کافی تنقید کی کیونکہ فاضل مصنف کو تعلیم و تدریس کا کافی تجربہ تھا۔ امریکہ جانے سے پہلے انسپکٹر آف اسکولس تھے اور امریکہ جا کر آپ نے ولسن ٹیچرس کالج، گریلی کولوراڈو ٹیچرس کالج، واشنگٹن اور کیلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لئے قیام کیا اور وہاں کے نصاب و نظام تعلیم کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہونچے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور انگریزوں کو امریکیوں کی اس چال کا علم ہوا کہ

توپ کھسکی، پروفیسر پہونچے
جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

تعلیم کے ذریعہ مغربی نظام نے نئی نسل کے اندر جو تباہ کن جراثیم پھیلائے اور کتابوں اور خطبات کے ذریعہ نوجوانوں کو اخلاقی اقدار اور مذہبی تعلیمات سے بیگانہ کیا اس پر سید قطب کی گہری نگاہ تھی اسی لئے اپنی تنقید دل کا زور

خدمات تعلیم پر صرف کرتے رہے ہیں۔[۱۵]

مذہبی ٹھیکیداروں کا جائزہ

سید قطب نے ان تنخواہ دار سرکاری علماء پر بھی کڑی تنقید کی اور طاغوت کی حکمرانی میں ان کے ظالمانہ کردار پر انگلی اٹھائی جنھیں عوام غلطی سے مذہب و ملت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خواہشات کی بندگی میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ایک طرف ذہنی تنگی اور مسلکی تعصب میں گرفتار ہوتے ہیں اور دوسری طرف روح اسلام سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"فکر اسلامی کا چہرہ مسخ کرنے میں استعمار کی مدد کرنے والا ایک عنصر اور ہے جس سے زیادہ مفید اور بار آور عامل کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ شیوخ اور درویش ہیں جنھیں عوام الناس نے دینداری کا سرٹیفکیٹ عطا کر رکھا ہے۔ جمودِ فکر اور تنگیٔ ذہن کی بہترین نمائندگی یہی لوگ کرتے ہیں۔ خرافات اور جہالت کے سراپا ترجمان ہوتے ہیں اور ان ساری غیر اسلامی، غیر انسانی رسوم وروایات پر دین کا لیبل لگا دیتے ہیں اور دین کی وکالت اس طرح کرتے ہیں کہ آدمی کو اس سے نفرت آجائے اور وہ منہ موڑ کر دوسری طرف چلا جائے۔ یہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں بڑے گھناؤنے جرائم کرتے ہیں اور دین کے احترام وتکریم اور افادیت کو مشکوک بنا دیتے ہیں خاص طور پر جبکہ آیاتِ الٰہی کے عوض یہ سودے بازی کرنے پر اتر آتے ہیں اور قرآن و اسلام کے نام پر ظلم و استحصال کی مدد کرنے لگتے ہیں۔[۱۶]"

ہر مجدد ملت اور مصلح وقت نے ان علمائے سوء کے کردار پر تنقید کی ہے۔ باطل نے ہر دور میں اپنے مظالم اور غیر اسلامی اقدامات کی تائید علمائے دین اور جاہل مشائخ

ے حاصل کی ہے ۔ انہی دنیادار مذہبی رہنماؤں کی بدولت وہ ہر زمانے میں اسلام کا
بل لگا کر غیر اسلام کی ترویج کرتا رہا ہے اکبر کے دین الٰہی کی ایجاد میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔
ثال کے طور پر زعفران اور لال کپڑے کا جواز حاجی ابراہیم سرہندی نے نکالا تھا۔ بادشاہ
ے سجدہ کرنے کا فتویٰ قاضی خان بدخشانی نے دیا تھا اور ملا عالم کابلی کو اس کا افسوس رہا
ہائے مجھے یہ کیوں نہ سوجھی[۱۷]۔ غرضیکہ اس کے دور میں جتنی خرافات پرورش پائیں ان
ب کا سہرا علمائے سو ہی کے سر بندھتا ہے چنانچہ مجدد سرہندیؒ کو ان علمائے سو کے
لاف بھی محاذ بنانا پڑا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے معاشرہ کے تمام طبقوں پر تنقید کرنے کے
ساتھ علمائے دین اور طالبانِ علم دین کو بھی خطاب کیا اور ان کے نقائص پر بھرپور چوٹ
ی[۱۸]۔ سید قطب نے بھی انھیں معاف نہ کیا اور ان کی دنیا دارانہ روش پر گرفت
کی۔

اس طرح سید قطب نے استعماری صحافت کا بھرپور جائزہ لیا اور اس پر بھی تنقید کی۔ اخبارات و رسائل جو ہمیشہ جمہوری مفادات کا دم بھرتے ہیں اور ملک کی سالمیت و یکجہتی کا نعرہ لگاتے ہیں، کس طرح بڑی طاقتوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں اور معاشرے کو اسلامی و اخلاقی عادلانہ قدروں سے دور رکھنے کے لئے کیا حربے اپناتے ہیں ان پر آپ نے بے لاگ گفتگو کی[۱۹]۔

سید قطب کی یہی وہ تنقیدی نگاہ اور سیاسی بصیرت تھی جس کی وجہ سے دشمنوں کی نگاہ میں آپ خار کی طرح کھٹکتے تھے اور امریکہ، روس اور مصر کی استعماری نام نہاد شاہی اور پھر بعد میں فوجی حکومت آپ کے خلاف سازشوں کے جال بُننے میں ہمیشہ مصروف رہتی تھیں۔ آپ کی شخصیت میں وہ مومنانہ فراست بدرجۂ اتم موجود تھی جس سے ہر دور میں شیطان اور اس کے حواری لرزاں رہے ہیں۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ یوسف العظم، الشہید سید قطب، دار القلم بیروت ۱۹۸۰ء ص ۲۰۶

۲۔ مثال کے طور پر سوڈان میں اخوان المسلمون نے نمیری حکومت کے ساتھ تعاون کرکے جو کچھ حاصل کیا اور عوام میں اثر و نفوذ اور حکومتی مشینری میں عمل دخل حاصل کرنے کی جو کوشش کی اس کے ساتھ ہی سب سے بڑا نقصان جو اس تعاون کا ہوا وہ تحریک کی انقلابیت کی منفعلانہ حیثیت تھی۔ انقلاب اسلامی کا پورا تصور مجروح ہوا۔ مزید برآں نمیری حکومت نے تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر اس کے خلاف جو اقدامات کئے وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ تحریک کو عوام کی نظر میں بدنام کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی جو حکومتی اداروں کی طرف سے رچی گئی تھی۔ اس تجربہ سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ حکمرانوں کے ساتھ اس قسم کے اصلاحی پروگرام چلانے اور ان میں تعاون دینے کی پالیسی بہت زیادہ مفید نہیں ہے بلکہ اس سے تحریک اسلامی کو نقصان پہونچنے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔

۳۔ یہاں امریکہ میں مقیم تحریک اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ جناب ڈاکٹر عرفان احمد کی ایک گفتگو نقل کرنا دلچسپ ہوگا۔ انھوں نے ۲-۵ جولائی ۱۹۸۸ء علی گڑھ میں منعقدہ افسو [International Islamic Faderation آف Student organazations] ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات نقل کی کہ ایک بار دوران گفتگو مولانا نے امریکہ کی آزادی اور سیکولرزم کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ سوویت سیکولرزم اور ہندوستانی سیکولرزم کے مقابلہ میں امریکی سیکولرزم کم خطرناک ہے۔ اس پر میں نے مولانا کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مولانا، امریکہ

میں بسنے والے مسلمان عالمی دشمنِ اسلام نمبر ایک امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وہ اس مسئلے میں اتنے حساس ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ دنیا کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو چھوٹتے ہی وہ امریکہ کا نام لیتے ہیں۔

۴۔ انور سادات کی ڈائری یا دلدی ھـنہ اعمدک جمال الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر بتاریخ ۱۱/۸/۱۹۶۵ ص ۳۱۲

۵۔ السلام العالمی والاسلام، مکتبہ وھبۃ مصر، الطبعۃ الثانیۃ۔ ص ۱۵۸-۱۵۹۔

۶۔ نفس مصدر، ص ۱۵۹-۱۶۰۔

۷۔ نفس مصدر، ص ۱۶۰-۱۶۲۔

۸۔ نفس مصدر، ص ۱۶۳-۱۶۴۔

۹۔ نفس مصدر، ص ۱۶۴۔

۱۰۔ نفس مصدر، ص ۱۶۵۔

۱۱۔ نفس مصدر، ص ۱۶۶۔

۱۲۔ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، مطبعۃ عیسیٰ بابی الحلبی ۱۱ ایڈیشن، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۰-۲۹۱

۱۳۔ السلام العالمی والاسلام، ص ۱۷۱۔ خود ہندوستان میں بھی صورت تھی جب انگریزی فوج یہاں حملہ آور تھی تو ہندو اور مسلم خاندان کتنے ایسے تھے نے ہندوستانی مصالح و مفادات کے علی الرغم انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان مل کر لوٹ کھسوٹ مچائی اور انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے باوجود آزاد میں اقتدار میں سب سے زیادہ شرکت انہی کی ہے اور اپنی بے ضمیری اور کی وجہ سے حکومت کے مناصب سے زیادہ وہی اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح

مسلم باشندوں پر فرانسیسی حملے کے وقت کچھ مسلمان خاندان ایسے بھی تھے جنھوں نے مسلمانوں سے غداری کرکے فرانس کی فوج کا ساتھ دیا ان میں ایک مشہور نام الجلادی کا بھی ہے جس نے فرانسیسی حملہ میں اپنا بیٹا بھی کھو دیا تھا لیکن اسے کوئی ندامت نہ تھی۔

معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ ، مطبعۃ دار الکتاب العربی، قاہرہ ۱۹۵۲ء ص ۱۲۷ ــ ۱۲۸

بدقسمتی سے آج تک پورے عالم اسلام میں وہی مغربی نظام تعلیم رائج ہے۔ ادھر چند برسوں میں علوم وفنون کی اسلام کاری (Islamization of Knowledge) کی مہم بڑے زور شور سے اٹھی لیکن دشمنوں نے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کیا اور اس کے مایۂ ناز کارکن تحریک اسلامی کے معروف خادم جناب پروفیسر اسماعیل راجی الفاروقی کو امریکہ میں شہید کر دیا۔ یہ تحریک ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ دیکھئے اس کے مسلم دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ ، ص ۱۲۸ ــ ۱۲۹

تفصیل کے لیے دیکھئے خاکسار کی کتاب "تاریخ دعوت وجہاد برصغیر کے تناظر میں" ہندوستان پبلی کیشنز دہلی ۱۹۸۴ء ص ۱۰۶۔

شاہ ولی اللہ دہلوی ، التفہیمات الالٰہیہ ، جلد دوم ص ۱۳۴ ـ ۱۳۵

تفصیل کے لیے دیکھئے معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ ص ۱۵۲ ــ ۱۵۳۔

سلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

(۳)

ناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

[illegible]رھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی حکومت اسپین سے مکمل [illegible] ختم ہو گئی [illegible] کے سو سال بعد تک ان کی تہذیب پورے طور پر یہاں برقرار رہی کہ یہاں [illegible] تہذیب کے باقی ماندہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً اسپانی زبان میں ہزاروں [illegible] زبان کے موجود ہیں بلکہ یہ الفاظ یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی [illegible] جدید تحقیق کی سان پر چڑھ کر یہ الفاظ اپنی حقیقت آشکار کر رہے [illegible] کے رسم و رواج [illegible] کے بعض اجزاء کو آج بھی اسپین کی [illegible] سکتا ہے۔

[illegible] ترقی اور حکومت [illegible] کا عروج محض فتوحات یا کثرت [illegible] فوجی قوت یا سیاسی [illegible] ترقی ہوا تو چنگیز [illegible] ہوں۔ قومی ترقی ہمیشہ تہذیب و تمدن [illegible] و فنون اور [illegible] ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کے ساتھ ساتھ اگر علوم و [illegible] و ثقافت [illegible] کوششوں کا ذہن نہ پہنچتا تو یہ فتوحات

ہرگز دیرپا ثابت نہ ہوئیں اور دین و اخلاق اور اخلاص و احسان کی خوبیاں اس پر مستزاد ہیں جس نے ایک مکمل صالح اور پرکشش نظام زندگی عطا کی، جس سے اغیار بھی ان کی قدر دانی پر مجبور ہوئے اور اسی سے ان میں وہ وسیع النظری بھی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے غیر اقوام کو ان کے علوم و فنون اور تہذیب و اخلاق سے آزادانہ خوشہ چینی کا موقع ملا۔

اسپین میں علماء، حکماء اور صلحاء کے درس و افادے کی جو مسند بچھائی گئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسویں صدی عیسوی تک ہسپانیہ کے ہر شہر میں مدرسے، کالج، کتب خانے عام ہو چکے تھے۔ عربی کتابوں کی دکانیں کوچے کوچے میں نظر آتی تھیں۔ بڑے شہروں اشبیلیہ، طلیطلہ، غرناطہ اور قرطبہ میں بڑے بڑے کالج تھے جن میں جامعہ قرطبہ کو مرکزی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل تھی جہاں انگلینڈ، فرانس، اٹلی، جرمنی وغیرہ سے آکر طلبہ داخلہ لیتے اور عربی زبان سیکھتے۔ عرب عہد عباسیہ میں ہمہ جہت علمی ترقیوں کا منبع و مرکز بن چکا تھا۔ یہاں قدیم یونانی علوم کو ہی منتقل نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہندوستان سے سنسکرت کے عالم اور ریاضی دانوں کو بلا کر علم کی ایک ایک شاخ کو مکمل کر لیا گیا تھا۔

بعد میں اس سرمایہ میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور اپنی پوری شان و شوکت اور آن وبان کے ساتھ یہ سرمایہ اسپین پہونچا تھا۔ اسپین کے مدارس اور جامعہ قرطبہ کے ان طلبہ کے ذریعہ یہ سرمایہ حسب ضرورت یورپ کے ممالک کو منتقل ہوا۔ اسلامی دنیا میں بغداد کے بعد دوسرا علمی مرکز قرطبہ تھا۔ محدود صفحات میں ہم ان تمام علوم و فنون کا مختصر ذکر بھی نہیں کر سکتے جو مسلم اسپین میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ذیل میں ہم صرف خاص خاص علوم کا اجمالی ذکر کرتے ہیں تاکہ مسلم ہسپانیہ یا اندلس کی علمی کاوشوں کے وسیع دائرے کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکے۔

۱۔ فلسفہ:

فلسفے کے میدان میں اسپین کے مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی فلسفے کی تاریخ میں اگر اندلس کے مسلم فلسفیوں کو شامل نہ کیا جائے تو اسلامی تاریخ ادھوری اور نامکمل رہ جائے گی۔ اس میدان میں خاص طور پر ابن رشد، ابن طفیل اور ابن باجہ کے نام زیادہ اہم ہیں اور ان میں بھی خاص طور پر پہلے دو نام ہیں۔ ابن رشد کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ابن رشد کا تعلق بارہویں صدی عیسوی سے ہے۔ فلسفے میں ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ارسطو کی کتابوں پر تنقید کی اور بہت سی غلطیوں کی اصلاح بھی کی۔ ارسطو کی بعض کتابیں ابن رشد کی تنقید کے ذریعہ سے ہم تک پہونچی ہیں۔ اس تنقید کے علاوہ ابن رشد کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے یونانی فلسفے کو اسلامی عقائد سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی۔ سولہویں صدی کے آخر تک ابن رشد کے فلسفہ کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ امام غزالی نے گیارہویں صدی میں یونانی فلسفے کے دفاع میں امام غزالی کی کتاب کا جواب لکھا۔ ابن رشد نے ایک طبیب کی حیثیت سے بھی بڑا نام پایا اور شاہی طبیب کا درجہ حاصل کیا لیکن اپنے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے زندگی کے آخر میں ان کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔

ابن طفیل:

ابن طفیل کا تعلق بھی بارہویں صدی سے ہے۔ ابن رشد کے ساتھ ان کا تعلق استاد کے علاوہ دوست جیسا بھی رہا۔ بلکہ ابن رشد کی ترقی کا ذریعہ بھی یہی بنے تھے۔ مسلم فلسفیوں میں ان کا مقام بلند ہے اگرچہ ابن رشد کے مقام تک نہیں

پہنچے۔ انھوں نے بھی اسلامی فکر اور یونانی فلسفے کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا اہم کارنامہ وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے فلسفے کو ایک ایسے شخص کی زندگی کی صورت میں پیش کیا ہے جو ایک ویران جزیرے میں اکیلا پرورش پاتا ہے۔ اور ہر چیز کو آہستہ آہستہ خود اپنے تجربے اور دماغ سے سیکھتا اور سمجھتا ہے اور یہاں تک کہ ایک بڑا فلسفی بن جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام "حی بن یقظان" ہے۔

ابن باجہ:

ابن باجہ پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام محمد تھا۔ ابتدائی زندگی شاعری میں گذری۔ انھوں نے ایک مرتبہ ابوبکر یعنی ابراہیم سرقسطہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا اس پر امیر نے خوش ہو کر ان کو اپنا وزیر بنا لیا۔ ۵۱۲ھ میں ابن باجہ اپنا وطن چھوڑ کر مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے مراکش پہنچے۔ یہاں کے بادشاہ یوسف بن تاشفین نے انھیں اپنے دربار میں وزیر بنا لیا اور تقریباً بیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ابن باجہ نے جوانی کے عالم میں ۵۳۳ھ میں شہر فاس میں انتقال کیا اور وہیں دفن کئے گئے۔ ابن باجہ بہت بڑے فلاسفر اور ادیب تھے۔ صرف دہیئت میں بھی انھیں مہارت تھی۔ وہ فلسفہ کے اتنے زبردست عالم تھے کہ جلال الدین سیوطی نے فلسفے میں مغرب کا ابن سینا تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن باجہ نے منطق اور ریاضی پر بھی کتابیں لکھیں۔

تاریخ:

تاریخ کے میدان میں سب سے اہم نام ابن خطیب اور ابن خلدون کا ہے۔

ں کا تعلق اسپین کی مسلم حکومت کے اس آخری دور سے ہے جبکہ صرف غرناطہ
ند تک حکومت رہ گئی تھی۔ دونوں نے غرناطہ کے دربار سے بلند مقام حاصل
زیر بھی بنے لیکن آپس کے اختلاف کی وجہ سے ابن خلدون غرناطہ کے دربار
نے پر مجبور ہو گئے۔ ابن خلدون نے بعد کی زندگی شمالی افریقہ اور مصر میں
اہ مصر کے سفیر بن کر تاتاری بادشاہ تیمور سے صلح کی بات چیت کرنے گئے۔
عکس ابن خطیب نے اپنی زندگی غرناطہ میں ہی پوری کی۔

امہ ابن حزم نے مذہبوں کی تاریخ میں ایک نہایت زبردست کتاب لکھی،
سلام، عیسائیت، یہودیت کی تاریخ کے ساتھ اسلام کے اندر پیدا ہونے
ف فرقوں کی تاریخ بھی شامل ہے۔ یہ اس موضوع پر پہلی قابل ذکر کتاب
ہ کے علاوہ تاریخ کے میدان میں سب سے اہم کارنامہ ابن خلدون کا ہے۔
نے ساری دنیا کی تاریخ اور خاص طور پر شمالی افریقہ کی بربری قوم کی مکمل
ت عمدہ لکھی ہے۔

ن خلدون کی سب سے مشہور کتاب عرب اور بربر قوموں کی تاریخ ہے لیکن
ب سے بھی زیادہ مشہور کتاب کا مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ فلسفۂ تاریخ پر
س کو آج عمرانیات (SOCIOLOGY) کی پہلی کتاب اور ابن خلدون
ن کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابن خلدون دنیا کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں
مقدمہ میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی
اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ ابن خلدون شاعر بھی تھے اور ادیب بھی
کہ عرض کیا گیا تاریخ کے میدان میں ان کی شخصیت زیادہ اہم اور حیثیت
ہے۔ ان کا کارنامہ غرناطہ کی وہ تاریخ ہے جو اپنے موضوع پر آج تک
ے نظیر کتاب ہے۔

علم طب :

طب بالخصوص جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں مسلم اسپین کا حصہ بہت زیادہ اہم ہے اور اس میدان میں سب سے اہم نام ابن زہر اور ان کے خاندان کا ہے جن میں چھ نسلوں تک بڑے بڑے طبیب اور حکیم پیدا ہوتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ابن رشد کا نام بھی آتا ہے۔ ابن رشد فلسفی ہونے کے علاوہ زبردست طبیب بھی تھے اور خاندان زہر کے ساتھ مل کر علاوہ ابن رشد نے فن طب کی کلیات لکھی یعنی وہ کتاب جس میں علاج کے اصولوں پر اور امراض کی قسموں پر نظریاتی طور پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ساتھ ہی مختلف بیماریوں کی دوائیں اور ان دواؤں کی خصوصیات کو بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے جڑی بوٹیوں کے میدان میں ابن زہر کے تجربے سے بہت فائدہ اٹھایا جنھوں نے سیکڑوں نئی جڑی بوٹیاں دریافت کیں۔ تجربے سے ان کی خصوصیات معلوم کیں اور بتایا کہ کن بیماریوں میں اور کس طرح یہ بوٹیاں مفید ہیں اور ان جڑی بوٹیوں کے نام بھی انھوں نے رکھے تھے۔ خود ابن طفیل بھی اسپین کے بڑے طبیب تھے لیکن علم طب میں ان کی تحریر نہیں ملتی۔

ادب :

مسلم اسپین میں عربی ادب اور شاعری کو بھی فروغ ملا۔ عربی شاعری میں بعض نئی قسموں کا بھی اضافہ ہوا۔ اسپین کے مسلم زعماء اور عام مسلمان ہی نہیں بلکہ بادشاہوں نے بھی گہری دلچسپی لی۔ زجل اور موشحات اسپین کی عربی شاعری کی اہم اصناف ہیں جو یہاں پیدا ہوئیں۔

اسپین میں بنو امیہ کی حکومت کے پہلے امیر عبدالرحمن الداخل کا شمار اچھے
شاعروں میں ہوتا تھا اور اس کے بعد کے مسلمان حکمرانوں میں ہشام، حکم، عبدالرحمن
سوم وغیرہ بھی بیشتر اچھے شاعر تھے۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد اشبیلیہ کے
عبادی خاندان کے بادشاہ معتمد کو اسپین کے بڑے شاعروں میں سمجھا جاتا تھا اور
اس کے بھی بہت سے اشعار محفوظ ہیں۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر ابن زیدون خیال کیا جاتا ہے۔ ابن زیدون نے
زیادہ تر موشحات کی صورت میں شاعری کی ہے۔ اس کے اشعار بڑے سادہ اور
پرتاثیر ہوتے ہیں اور اس کے زیادہ تر شعروں کا تعلق اس کی محبوبہ ولادہ سے ہے۔
جو بنو امیہ کے آخری دور سے تعلق رکھنے والے ایک خلیفہ کی بیٹی تھی اگرچہ یہ دونوں
آپس میں گہری محبت رکھتے تھے لیکن مختلف وجوہ سے اس کی شادی نہیں ہو سکی۔
ابن زیدون خلیفہ مستکفی کے دربار میں وزیر تھے اور بنو امیہ کی حکومت ختم ہونے کے بعد
اشبیلیہ کے بادشاہ ابن عباد کے دربار میں فوج کے سپہ سالار رہے۔ اس کے
بعد کی زندگی اشبیلیہ میں گزار دی۔

فرانس اور انگلینڈ جو جہالت کے شکار تھے۔ وہاں کے طلبہ اسپین کی جامعات
سے علوم و فنون کی سندیں حاصل کرنے کی بدولت اپنے ملکوں کی نشاۃ ثانیہ کا سبب
بن سکے۔ انگلینڈ کا شاعر چاسر کے عہد میں یہ فیضان عام ہو چلا تھا۔ چنانچہ مغرب میں
چودھویں اور پندرہویں صدی میں رونما ہونے والی نشاۃ ثانیہ کے لیے جس خشت
اول کا کام کیا وہ دراصل اسپین کے ہی اسلامی مدارس تھے اور یورپ کی تمام
علمی و ادبی ترقیوں کا سہرا بجا طور پر اسپین کے مسلم حکمرانوں کے سر بندھتا ہے۔
بالفاظ دیگر یورپ اگر اسپینی مسلمانوں کے علوم سے استفادہ نہ کرتا تو آج
سینکڑوں سال پیچھے ہوتا۔

گو اسپین میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے لیکن مسلم عہد کے اسپین کی تہذیب و تمدن اور علمی فتوحات کے تابندہ نقوش اب بھی اسپین کی تاریخ کے صفحات کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

ماخذ:

اس مضمون کی تیاری میں جو کتابیں زیرِ مطالعہ رہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ "تاریخ اندلس"۔ علامہ سید ریاست علی ندوی
۲۔ "اخبار مجموعہ" اسلامی اندلس کی ایک جامع عربی تاریخ۔ مولوی ذکی کاظمی
۳۔ "اخبار الاندلس" جلد ششم محمد خلیل الرحمٰن صاحب
۴۔ "مسلمان اندلس میں" رشید اختر ندوی
۵۔ "دولتِ ہسپانیہ عرب"۔ مرتبہ شمیم انہونوی
۶۔ A POLITECAL HISTORY OF MUSLIM SPAIN
BY S.M. IMAMUDDIN
۷۔ SPANISH ISLAM, A HISTORY OF THE MUSLIMS INSPAIN.
BY REINHART DOZY
۸۔ A LITERARY HISTORY OF THE ARABS
BY REYNOLD NECHOLSON

قرآن کریم میں ترادف

(دوسری قسط)

ڈاکٹر محمد عبدالرحمن [illegible] الخالی
پروفیسر مطالعات قرآن و شرعیات
جامعہ القرویین مغرب

عربی سے ترجمہ:-
محمد رضی الاسلام ندوی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

[illegible] یہ مسئلہ [illegible] مختلف الفاظ کا ایک معنی کیلئے آنے کی جو مثالیں دی ہیں مثال [illegible] یہ ہیں یعنی ظن وحسب اور قعود وجلوس اور ذراع وساعد اور أنف [illegible] سے مترادف نہیں ہیں۔ مبرد دوسری جگہ ترادف کا انکار کرتے ہیں جیسا کہ [illegible] سے نقل کریں گے۔

ترادف کے قائلین میں [illegible] فخر الرازی اور تاج السبکی قابل ذکر ہیں قریب [illegible] ہی مسلک ہے۔ جبکہ دوسرے علماء ترادف کا قطعی طور پر انکار [illegible] الاعرابی نے، ثعلب بھی ہیں جنھوں نے ابن اعرابی کا قول نقل کیا ہے

"[illegible] عرب نے ایک معنی میں استعمال کیا ہے ان میں سے ہر ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے میں نہیں۔ بسا اوقات [illegible] معلوم ہو گیا ہے تو ہم نے بتلا دیا ہے اور کبھی ہم نہیں جان سکے

[illegible] ایک دوسرے کی ہم معنی سمجھے گئے۔

ثعالبی نے 'فقہ اللغۃ' میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مترادفات کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔ ابن الانباری نے 'کتاب الاضداد' میں لکھا ہے کہ ایک معنی کے لیے متعدد الفاظ [illegible] ہے۔ ان میں سے ہر لفظ معنی میں دوسرے لفظ سے کچھ مختلف ہوتا ہے بسا اوقات معنوں میں فرق اتنا دقیق ہوتا ہے کہ اسے صرف عربی زبان جاننے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔[1]

ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب 'الفروق اللغویہ' تصنیف کی جس میں ایسے الفاظ کے معنی کے درمیان دلالتوں کے فرق بیان کیے گئے ہیں جنہیں مترادف کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ایک باب ہے "فی الابانۃ عن کون اختلاف الالفاظ فی لغۃ واحدۃ یوجب اختلاف المعانی" (اس چیز کا بیان کہ ایک زبان میں الفاظ کے اختلاف سے معانی کا اختلاف لازم آتا ہے) جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب ایک زبان میں دو الفاظ ایک معنی یا ایک چیز کے لیے آئیں تو ان میں سے ہر ایک کا مقتضی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دوسرا فضول لفظ قرار دیا جائے جس کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ کہتے ہیں:

"یہی محققین اہل علم کا مسلک ہے ... اسی کی طرف مبرد نے ارشاد باری 'لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنهاجا' کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے۔ کہا ہے کہ منہاج کا عطف شرعۃ پر ہے اس لیے کہ شرعۃ چیز کے ابتدائی حصے کو کہتے ہیں اور منہاج اس کے بڑے اور وسیع حصے کو ... چیز کا عطف چیز پر اس وقت صحیح ہوگا جب ایک معنی میں دوسرے

---

[1] ابن الانباری: الاضداد ص ۔

مختلف ہو تو اور دونوں کا معنیٰ ایک ہی ہو۔ لیکن جب دو حرف ایسے ہوں جو ایک ہی معنیٰ کے ہوں تو ایک کا دوسرے پر عطف نہ ہوگا۔ ابو ہلال کہتا ہے کہ "مبرد نے عطف کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں عربی زبان میں جو الفاظ ایک معنیٰ میں پائے جاتے ہیں جیسے العقل والقلب، المعرفۃ والعلم، الکسب والجرح، العمل والفعل ... ان کا ایک دوسرے پر عطف جائز ہے اس لیے کہ ان دونوں میں معنیٰ کے لحاظ سے فرق ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو زید کا عطف ابوعبداللہ پر جائز نہ ہوتا اس لیے کہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے ... جس طرح یہ جائز نہیں کہ ایک لفظ دو معانی کیلئے استعمال ہو اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ دو الفاظ ایک معنیٰ پر دلالت کریں اس لیے کہ اس سے زبان میں بے فائدہ اضافہ ہے۔"

ابن فارس نے اپنی کتاب "الصاحبی" میں لکھا ہے:

"ہمارا مسلک یہ ہے کہ ایک چیز کے بارے میں وارد متعدد صفات میں سے ہر صفت کے معنیٰ دوسری صفت کے معنیٰ سے مختلف ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہوں مگر معنیٰ ایک ہی ہو"

x x x

میری معلومات کی حد تک یہ مسئلہ معلق رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے جدید تحقیقی مطالعات کے لغت، صوتیات اور اجتماع کے علوم کی جدید تحقیقات سے علماء کے نزدیک عربی کا ایک ادیب کسی رائے پر متفق نہ ہو سکے۔ اگرچہ ترادف کا مسلک بعض کتابوں میں غالب ہو گیا رہا۔ اور آج فقہ اللغۃ اور علم الاجتماع

ہیں کہ اہلِ عرب کو بھی وہ معلوم نہیں تھے"۔

ثعالبی نے "فقہ اللغۃ" میں جو مسلک بیان کیا ہے اس کے مطابق وہ ترادف کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔ ابن الانباری "کتاب الاضداد" میں کہتے ہیں کہ ایک معنی کیلئے دو الفاظ ہوں تو ان کے پیچھے کچھ نہ کچھ علت ضرور ہے۔ ان میں سے ہر لفظ معنی میں دوسرے لفظ سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ بعض اوقات دونوں میں فرق اتنا دقیق ہوتا ہے کہ اسے صرف عربی زبان جاننے والا ہی سمجھ سکتا ہے"۔[1]

ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب "الفروق اللغویہ" تصنیف کی جس میں ایسے الفاظ کے معنی کے درمیان دلالتوں کے فرق بیان کئے ہیں جنھیں مترادف کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ایک باب ہے "فی الابانۃ عن کون اختلاف الالفاظ فی لغۃ واحدۃ یوجب اختلاف المعانی" (اس چیز کا بیان کہ ایک زبان میں الفاظ کے اختلاف سے معانی کا اختلاف لازم آتا ہے) جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ جب ایک زبان میں دو الفاظ ایک معنی یا ایک چیز کے لئے آئیں تو ان میں سے ہر ایک کا مقتضی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دوسرا فضول یا فضول قرار دیا جائے جس کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ کہتے ہیں:

"یہی محققین اہلِ علم کا مسلک ہے ..... اسی کی طرف مبرد نے ارشاد باری "لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا" کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے۔ کہا ہے کہ "منہاج کا عطف شرعۃ پر ہے اس لئے کہ شرعۃ چیز کے ابتدائی حصے کو کہتے ہیں اور منہاج اس کے بڑے اور وسیع حصے کو ... چیز کا عطف چیز پر اس وقت صحیح ہوگا جب ایک معنی میں دوسرے

---

[1] ابن الانباری: الاضداد ص ۷۔

مختلف ہو خواہ دونوں کا مرجع ایک ہی ہو۔ لیکن جب دوسرے سے مراد وہی ہو جو پہلے سے ہو تو ایک کا دوسرے پر عطف نہ ہوگا۔

ابو ہلال کہتا ہے کہ "یہاں مبرد نے عطف کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں عربی زبان میں جو دو الفاظ ایک معنی میں آئے ہیں جیسے العقل واللب، المعرفة والعلم، الکسب والجرح، العمل والفعل ... ان کا ایک دوسرے پر عطف جائز ہے اس لیے کہ ان دونوں میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو زید کا عطف ابو عبد اللہ پر جائز نہ ہوتا اس لیے کہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے ... جس طرح یہ جائز نہیں کہ ایک لفظ دو معانی کیلئے استعمال ہو اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ دو الفاظ ایک معنی پر دلالت کریں۔ اس لیے کہ اس سے زبان میں بے فائدہ اضافہ ہے۔"

ابن فارس نے اپنی کتاب "الصاحبی" میں لکھا ہے:

"ہمارا مسلک یہ ہے کہ ایک چیز کے بارے میں وارد متعدد صفات میں سے ہر صفت کے معنی دوسری صفت کے معنی سے مختلف ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہوں مگر معنی ایک ہی ہو"

× × ×

ہماری معلومات کی حد تک یہ مسئلہ معلق رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے جدید لسانیات کے لغت، صوتیات اور اجتماع کے علوم کی جدید تحقیقات سے بعد بھی عربی کے اہل زبان کسی رائے پر متفق نہ ہو سکے۔ اگرچہ ترادف کا لسانیات میں غالب اور رائج رہا۔ اور آج فقہ اللغہ اور علم الاجتماع

اللغوی کے متعدد ماہرین اس کے قائل ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی ذکر ہیں جنھوں نے مجلۃ الثقافہ ۱۹۶۳ء میں ایک مقالہ "عربی زبان کی خصوصیت" کے بارے میں قلم بند کیا تھا۔ اس میں انھوں نے عربی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عربی زبان اپنی ثروت کی وجہ سے ایک معنی دسیوں الفاظ کے ذریعے ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم انیس نے اپنی کتاب 'دلالات الالفاظ' میں عربی میں ترادف کے وجود کو قطعی طور پر ثابت کیا ہے۔ چنانچہ انھیں 'لم یسمع' 'وفی اذنیہ صمم' اور 'وفی اذنیہ وقر' تینوں میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آیا انھوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے:۔

" واذا تتلی علیہ آیاتنا ولی مستکبرا کأن فی أذنیہ وقرا" (لقمان)[۵۵]

قریب کے زمانے تک دوسری بحثوں کے ساتھ ترادف کی بحث بھی المجمع اللغوی قاہرہ کا موضوع بنی رہی۔ اس کے ایک ممبر کرم نے یہ تجویز رکھی کہ ہم مترادفات کے بوجھ سے ہلکے ہونے کیلئے عربی زبان کی ایک ڈکشنری تصنیف کریں جو ایک معنی کے لیے ایک ہی لفظ کو طے کر دے جسے 'مجمع' کے ممبران الفاظ کے ڈھیر میں سے اختیار کر لیں اور بقیہ الفاظ کو مستبعد قرار دے دیں'[۵۶]

قرآن کریم عربی زبان کی عظیم کتاب ہے۔ حق یہ ہے کہ ہم اس بحث میں کسی رائے کو اختیار کرنے سے پہلے اسے کتاب عربی مبین پر پیش کریں۔ اس لیے کہ وہی

---

[۵۵] میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر انیس نے بعد میں اپنے اس مسلک سے رجوع کر لیا چنانچہ وہ ترادف کے مسئلہ میں المجمع اللغوی قاہرہ میں لجنۃ الاصول کے تحت ہونیوالے مناقشہ میں ترادف کا انکار کرنیوالوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔

[۵۶] دیکھئے مجلۃ المجمع اللغوی قاہرہ شمارہ ۸ میں احمد امین کا مقالہ۔ اس میں انھوں نے قرآن میں ترادف نہ ہونیکی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس طویل اختلاف میں فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔

قرآنی مطالعات ۔ جس میں میں عرصہ دراز سے اختصاص کر رہی ہوں۔ کے سیاق میں الفاظ قرآنی کا استقرائی تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس معنی میں جس کیلئے لغت اور تفسیر کی کتابوں میں متعدد الفاظ بیان کئے گئے ہیں ہر لفظ متعین دلالت کیلئے استعمال کرتا ہے جسے کسی دوسرے لفظ کے ذریعے نہیں ادا کیا جا سکتا۔

● کیا دو الفاظ کے ایک معنی ہو سکتے ہیں ؟ :
الرؤیا اور الحلم :

مثلاً سورۂ یوسف کی دو آیتوں میں :

أفتونی فی رؤیای، إن کنتم للرؤیا تعبرون (۴۳)

قالوا أضغاث أحلام، وما نحن بتأویل الأحلام بعالمین (۴۴)

لغات میں 'حلم' کی تشریح 'رؤیا' کے ذریعے کی جاتی ہے۔

کیا زمانۂ بعثت میں خالص اہل عرب نہیں جو قرآن کے مثل ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا تھا دونوں الفاظ میں سے ایک دوسرے کی جگہ رکھ سکتے تھے اور کہہ سکتے تھے ؟

أفتونی فی حلمی، ان کنتم للحلم تعبرون" ؟

ہرگز نہیں ۔ ایسا عربی زبان کی صحیح حس رکھنے والا کوئی شخص نہیں کہہ سکتا۔

قرآن میں جب ہم ان دونوں الفاظ کا استقراء کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ترادف نہیں ہے۔ قرآن نے 'احلام' تین مرتبہ استعمال کیا ہے۔ ان کا سیاق دلالت کرتا ہے کہ ان سے مراد پریشان کن اور شدائد کے خواب اور مخلوط

وہ بے حیثیت ہونے سے ہیں۔ انھیں جگہ جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے جو غلط و
تشویش پر دلالت کرتا ہے جس میں کوئی "علم" دوسرے سے ممتاز نہیں ہوتا۔
سورۂ انبیاء میں ہے:

" بل قالوا أضغاث أحلام، بل افتراه، بل هو شاعر فليأتنا
بآية كما أرسل الأولون" (الانبیاء — ۵)

دوسری جگہ عزیز کی قوم کے ساتھ درباریوں کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ جب عزیز
نے ان سے کہا کہ اس کے خواب کی تعبیر بتائیں۔

" قالوا أضغاث أحلام وما نحن بتأويل الأحلام بعالمين" (یوسف ۴۴)

لفظ "رؤیا" قرآن میں سات مرتبہ آیا ہے۔ تمام جگہوں پر سچے خواب کے معنی
میں ہے اور مفرد کے صیغے میں آیا ہے جو اس کے واضح، جلی اور صاف ہونے پر دلالت
کرتا ہے۔

سات جگہوں میں سے پانچ جگہ انبیاء کیلئے آیا ہے جہاں اس سے مراد سچا الہام
ہے جو وحی سے قریب ہوتا ہے۔

سورۂ صافات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب:

" وناديناه أن يا إبراهيم قد صدقت الرؤيا إنا كذلك نجزي
المحسنين" (۱۰۹)

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب، جب آپ کے والد یعقوب علیہ السلام
نے آپ سے کہا تھا:

يا بني لا تقصص رؤياك على إخوتك فيكيدوا لك كيدا إن
الشيطان للإنسان عدو مبين (یوسف ۵)

اسی سورہ میں ہم اس کے سیاق کا تتبع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ خواب

شرمندۂ تعبیر ہو گیا :

"ورفع ابویہ علی العرش وخروا لہ سجدا، وقال یا ابت ھذا تاویل رویای من قبل قد جعلھا ربی حقا" (یوسف - ۱۰۰)

سورۂ اسراء میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب :

"وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنۃ للناس" (۶۰)

اور سورۂ فتح میں آپ کا خواب :

"لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رءوسکم ومقصرین لا تخافون فعلم ما لم تعلموا، فجعل من دون ذلک فتحا قریبا" (۲۷)

یہ وہ پانچ مقامات ہیں جہاں قرآن نے انبیاء کیلئے 'رویا' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آخری دو مقامات عزیز مصر کے 'رویا' کے بارے میں ہیں جو سچے ثابت ہوئے۔ اس آیت میں قرآن نے دو مرتبہ بادشاہ کی زبان سے 'رویا' کا لفظ ادا کیا۔ خواب میں اس کے واضح، جلی اور صاف ہونے کی وجہ سے اگرچہ اسکی قوم کے درباری اسے ہواجس، اوہام اور برے خواب سمجھ رہے تھے :

وقال الملک انی اری سبع بقرات سمان یاکلھن سبع عجاف وسبع سنبلات خضر واخر یابسات، یا ایھا الملا افتونی فی رویای ان کنتم للرویا تعبرون، قالوا اضغاث احلام، وما نحن بتاویل الاحلام بعالمین (یوسف ۴۳ - ۴۴)

قصۂ قرآنی سیاق میں جاری رہتا ہے کہ اچانک بادشاہ کا خواب سچا الہام ثابت ہوتا ہے۔ اور ڈراونا خواب نہیں ہوتا جیسا کہ اس کے درباریوں نے کہا تھا۔

آنس اور ابصر:

لغت میں آنس الشیٔ کے معنی دیکھنا، آنس الصوت کے معنی سننا اور استأنس کے معنی اجازت طلب کرنا بیان ہوئے ہیں۔ تو کیا پاکیزہ عربی زبان یہ جائز قرار دیتی ہے کہ قرآن جہاں 'آنس نارًا' کہتا ہے وہاں اسکی جگہ 'ابصر' یا 'نظر' یا 'شعر' یا دوسرے الفاظ جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ [illegible] کے ہم معنی ہیں۔ لائے جا سکتے ہیں۔

جب ہم قرآنی استعمال کا استقراء کرتے ہیں تو اس سے ہمیں عربی زبان کی تیز حس حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسی چیز کو دیکھنا سننے کو 'آنس' نہیں کہا جائے گا جس میں کوئی انسیت نہ ہو۔ لیکن عربی جب 'آنست' کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایسی چیز دیکھی یا سنی ہے جو انسیت بخشتی ہے۔

قرآن نے فعل 'آنس' کو پانچ جگہ استعمال کیا ہے۔ چار جگہ اس آگ کے بارے میں جسے موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا جب وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ صحرا میں سفر کر رہے تھے۔ وہ آیات یہ ہیں:

طٰہٰ-۱۰: إذ رأى نارًا فقال لأهله امكثوا إني آنست نارًا لعلي آتيكم منها بقبس أو أجد على النار هدى

النمل-۷: إذ قال موسى لأهله إني آنست نارًا سآتيكم منها بخبر أو آتيكم بشهاب قبس لعلكم تصطلون۔

القصص-۲۹: فلما قضى موسى الأجل وسار بأهله آنس من جانب الطور نارًا قال لأهله امكثوا إني آنست نارًا لعلي
آتيكم [illegible]

پانچویں جگہ سورۂ نساء میں آیا ہے:

وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح فان آنستم منہم رشداً فادفعوا الیہم اموالہم (۶)

یہاں ایناس سے مراد محض سن بلوغ کے مادی وحسی مظاہر رشد کا دیکھنا نہیں بلکہ آزمائش وامتحان کے بعد یہ اطمینان حاصل کرنا ہے کہ واقعی وہ سن رشد کو پہنچ گئے ہیں۔

اسی مادے سے سورۂ نور میں استئناس کا فعل مضارع کا صیغہ آیا ہے:

"یا أیها الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتیٰ تستأنسوا وتسلموا علیٰ أھلها" (۲۷)

یہاں استئناس سے مراد محض استئذان (اجازت طلب کرنا) نہیں جیسا کہ بعض مفسرین کو وہم ہوا بلکہ اس سے مراد داخل ہونے سے پہلے گھر والوں کو انسیت کا احساس دلانا ہے۔

عربی زبان کا ذوق یہ گنجائش نہیں رکھتا کہ پولیس، ٹیکس آفیسر یا قرض خواہ کے اجازت طلب کرنے کے لیے استأنس کا لفظ استعمال کیا جائے۔ بلکہ یہاں 'استأذن' کا لفظ استعمال ہوگا، اس لیے کہ یہاں 'انسیت' کی حس کا فقدان ہے۔ اسی طرح دشمن کو دیکھنے یا کہیں آگ لگی ہوئی دیکھنے کو یا بجلی کی کڑک یا درندے کی آواز سننے کو 'آنس' نہیں کہیں گے۔

النائی اور البعد:

بیشتر اہل لغت اور مفسرین النائی اور البعد دونوں کے درمیان کسی فرق کی طرف اشارہ کیے بغیر ایک کو دوسرے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن ترادف کا انکار کرنے والوں نے دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔

۴۔ النائی اور البعد کے قرآنی استعمال کے مقامات کا استقرا کیجیے تو واضح ہوتا ہے کہ دونوں میں ترادف نہیں ہے۔ "النائی" اعراض، روگردانی اور منہ پھیرنے کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں اس کا صریح سیاق دلالت کرتا ہے:

الاسراء-۸۳: وإذا أنعمنا على الإنسان أعرض ونأى بجانبه
[ساتھ ہی دیکھئے سورۂ حم السجدہ-۵۱]

الانعام-۲۶: "حتى إذا جاءوك يجادلونك يقول الذين كفروا إن هذا إلا أساطير الأولين وهم ينهون عنه وينأون عنه وإن يهلكون إلا أنفسهم وما يشعرون"

"البعد" تو یہ قرآن میں حقیقت و مجاز پر مختلف صیغوں کے ساتھ مکانی یا زمانی ابعاد و مادی یا معنوی بعد کے معنوں میں آتا ہے:

التوبہ-۴۲: لو كان عرضا قريبا وسفرا قاصدا لاتبعوك ولكن بعدت عليهم الشقة

الزخرف- حتى إذا جاءنا قال يا ليت بيني وبينك بعد المشرقين فبئس القرين۔

الفرقان-۱۲: إذا رأتهم من مكان بعيد سمعوا لها تغيظا وزفيرا۔

سبا-۵۲: وأنى لهم التناوش من مكان بعيد۔

هود-۸۳: وما هي من الظالمين ببعيد

الانبیاء-۱۰۱: إن الذين سبقت لهم منا الحسنى أولئك عنها مبعدون

ق-۳۱: وأزلفت الجنة للمتقين غير بعيد۔

الانبیاء-۱۰۹: وإن أدري أقريب أم بعيد ما توعدون۔

المعارج ۶-۷: إنّهم يرونه بعيدًا ونراه قريبًا۔
آل عمران ۳۰: يوم تجد كل نفس ما عملت من خير محضرًا وما عملت
من سوء تود لو أن بينها وبينه أمدًا بعيدًا۔
سبا ۱۹: فقالوا ربنا باعد بين أسفارنا وظلموا أنفسهم
فجعلناهم أحاديث ومزقناهم كل ممزق۔
النمل ۲۲: فمكث غير بعيد فقال أحطت بما لم تحط به وجئتك
من سبأ بنبأ يقين

مندرجہ بالا تمام آیات میں مکانی یا زمانی بعد مراد ہے:
اسی طرح "بعد" کا استعمال قرب کی ضد کے معنی میں مندرجہ ذیل آیات میں ہوا ہے:
هود ۹۵: ألا بعدًا لمدين كما بعدت ثمود۔
هود ۴۴، ۶۰، ۶۸: "وقيل بعدًا للقوم الظالمين"

[ساتھ ہی سورۃ المؤمنون: ۴۱، ۴۴]
اسی طرح "بعد" کا استعمال معنویات کیلئے بھی ہوتا ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل
آیات میں ہے:
"شقاق بعید" البقرہ ۱۷۶، الحج ۵۳، حم السجدہ ۵۲۔
"ضلال بعید" ابراہیم ۳، ۱۸، النساء ۶۰، ۱۱۶، ۱۳۶، ۱۶۷، الحج ۱۲۔
الشوریٰ ۱۸، سبا ۸، ق ۲۷
ان تمام آیات میں "بعد" "قرب" کی ضد آیا ہے جبکہ "النائی" صرف اعراض
کے معنی میں آتا ہے جو "توجہ" کی ضد ہے۔

الحلف اور القسم

... ایک کی تشریح دوسرے سے کی جاتی ہے اور لغت کی کتابوں میں

دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا ہے " حلف " متعدد جاہلی اشعار میں قسم کے معنی میں آیا ہے جیسے :

النابغۃ الذبیانی : حلفت فلم أترک لنفسک ریبۃ -

الاعشی : حلفت لہ بالراقصات الی منی -

شاش بن عبدۃ : حلفت بما ضم الحجیج الی منی -

لیکن پاکیزہ عربی زبان کی حس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہو حلفۃ فاجرۃ' اُحلوفۃ کاذبۃ ' یہ کبھی نہیں سنا گیا ہے ۔ حلفت ہیں' احلوفۃ صادقۃ الا یہ کہ شعر میں آئے ۔ اسی طرح عرب میں کہتے ہیں ' أحلف الغلام ' جب لڑکا سن بلوغ کو تجاوز کر جائے اور اسکی بلوغت میں شک کیا جانے لگے ۔ اسی طرح عرب کہتے ہیں ' ناقۃ محلفۃ السنام ' اس اونٹنی کے بارے میں جسکی فربہی میں شک ہو اور ' کمیت محلفۃ ' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جسکا رنگ سرخ و سیاہ کے درمیان ہو ۔ اور ' کمیت غیر محلفۃ ' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا رنگ سرخ ہو اور کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہ ہو ۔ اسی طرح کہتے ہیں : " حضار والوزن محلفان ' ان دو ستاروں کے بارے میں جو ' سہیل ' نامی ستارے سے قبل نکلتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ سہیل ہے ۔ تو کیا شعر میں ' حلف ' کا شک و ارتیاب کے علاوہ دوسرے معنی کیلئے استعمال ہونا ضرورت شعری میں سے ہے ؟

جب ہم قرآن کے اعلیٰ بیان سے اس سلسلہ میں فیصلہ چاہتے ہیں تو اس کے مکمل استقراء سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں ' ح ل ف ' کا مادہ تیرہ ۱۳ جگہ آیا ہے ۔ اور تمام جگہ ۔ بغیر کسی استثناء کے ۔ جھوٹی قسم کیلئے آتا ہے ۔

اکثر ' فعل کا اسناد منافقین کی طرف ہے ۔ جیسے سورۃ توبہ کی آیات جن میں نفاق کا کھوٹ ظاہر کیا گیا ہے :

"وسیحلفون باللہ لو استطعنا لخرجنا معکم یہلکون
أنفسهم واللہ یعلم إنهم لکاذبون (۴۲)

"ویحلفون باللہ إنهم لمنکم وما هم منکم (۵۶)

"یحلفون باللہ لکم لیرضوکم، واللہ ورسوله أحق أن یرضوه إن
کانوا مؤمنین (۶۲)

"یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا کلمة الکفر وکفروا بعد إسلامهم (۷۴)

"یحلفون لکم لترضوا عنهم، فإن ترضوا عنهم فإن اللہ لا یرضی عن
القوم الفاسقین (۹۶)

"ولیحلفن إن أردنا إلا الحسنی، واللہ یشهد إنهم لکاذبون (۱۰۷)

ان آیات کے ساتھ، منافقین نبی کے بارے میں اللہ کی آیات بھی ہیں:

النساء - ۶۲: وإذا قیل لهم تعالوا إلى ما أنزل اللہ وإلى الرسول
رأیت المنافقین یصدون عنک صدودا، فکیف إذا أصابتهم مصیبة
بما قدمت أیدیهم، ثم جاءوک یحلفون باللہ إن أردنا إلا إحسانا وتوفیقا
أولئک الذین یعلم اللہ ما فی قلوبهم فأعرض عنهم وعظهم وقل لهم فی
أنفسهم قولا بلیغا"

المجادلة - ۱۴: ألم تر إلى الذین تولوا قوما غضب اللہ علیهم، ما هم منکم
ولا منهم، ویحلفون على الکذب وهم یعلمون -

المجادلة - ۱۸: یوم یبعثهم اللہ جمیعا فیحلفون له کما یحلفون لکم ویحسبون
أنهم على شیء، ألا إنهم هم الکاذبون -

القلم - ۱۰: ولا تطع کل حلاف مهین، هماز مشاء بنمیم، مناع للخیر معتد أثیم

فعل کا اسناد صرف ایک مرتبہ "الذین آمنوا" کی ضمیر کی طرف ہوا اس وقت الا

• حلف کا کفارہ واجب ہوجاتا ہے

"ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم" (المائدہ ۔ ۸۹)

(۲) "القسم" تو اس کا استعمال سچی قسموں کیلئے ہوا ہے۔ سورۂ واقعہ میں اس کی صفت "عظیم" بیان کی گئی ہے۔

"وانہ لقسم لو تعلمون عظیم" (۷۶)

سورہ فجر میں اللہ تعالیٰ سوال کرتا ہے:

"ھل فی ذلک قسم لذی حجر" (الفجر ۔ ۵)

سورہ مائدہ آیات ۱۰۶ ۔ ۱۰۸ میں قسم، وصیت کے خلاف شہادت دینے کی حرمت کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں جھوٹی قسم کی حرمت کا بیان ہے۔

سورۂ قلم میں جن باغ والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہ اپنی قسم میں سچے تھے:

"إذ أقسموا لیصرمنھا مصبحین، ولا یستثنون" (القلم ۔ ۱۷)

اسی طرح وہ مجرم بھی جھوٹے نہیں ہوں گے جو قیامت کے دن قسمیں کھا کھا کر کہیں گے: "ویوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون" "ما لبثوا غیر ساعۃ" (الروم ۵۵)

قسم کا اسناد "ضالین" (گمراہ لوگوں) کی طرف بھی ہوا ہے۔ اس لیے کہ خود ان پر اپنی گمراہی عیاں ہونے سے پہلے، ان کی قسم سچے دل سے ہوتی تھی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں ہے:

الانعام ۔ ۱۰۹: "وأقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن جاءتھم آیۃ لیومنن بھا، قل إنما الآیات عند اللہ، وما یشعرکم أنھا إذا جاءت لا یومنون"

فاطر ۔ ۴۲: وأقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن جاءھم نذیر لیکونن أھدی من إحدی الأمم فلما جاءھم نذیر ما زادھم إلا نفورا

الأعراف ۔ ۴۹: "وَنادی أصحاب الاعراف رجالا یعرفونھم ..."

قالوا ما أغنى عنكم جمعكم وما كنتم تستكبرون، أهؤلاء الذين أقسمتم لا ينالهم الله برحمة"

ابراهیم - ۴۴: وأنذر الناس یوم یأتیھم العذاب فیقول الذین ظلموا ربنا أخرنا إلی أجل قریب نجب دعوتك ونتبع الرسل، أولم تكونوا أقسمتم من قبل ما لكم من زوال"

النحل - ۳۸: " وأقسموا بالله جهد أیمانهم، لا یبعث الله من یموت، بلی وعداً علیه حقاً ولکن أکثر الناس لا یعلمون -

سورہ مائدہ میں ہے:

ویقول الذین آمنوا أهؤلاء الذین أقسموا بالله جهد أیمانهم انهم لمعکم حبطت أعمالهم فأصبحوا خاسرین (۵۳)

اس کے سیاق میں اس بات کا احتمال ہے کہ یہ قسم منافقین کی اس آزمائش سے پہلے کی ہو جس سے ان کا کذب ظاہر ہو گیا ہو۔

اس بیان قرآنی کے سامنے یہ بات آسان نہیں کہ ہم قسم کی تشریح حلف سے کریں قرآن کا انداز ان دونوں کے درمیان دقیق فرق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر ہم یہ نہ کہیں کہ ' قسم ' علی الاطلاق سچی قسموں کیلئے (خواہ وہ حقیقی طور ہوں یا وہمی طور پر) کیلئے آتا ہے۔ اور ' حلف ' جھوٹی قسموں کیلئے۔ تو کم از کم یہ تو کہہ ہی سکتے ہیں کہ ان کی دلالتوں میں عام وخاص کا فرق ہے۔ قسم کا اطلاق تمام قسموں پر ہوتا ہے اور حلف جھوٹی قسموں کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ بیان قرآنی کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے۔

التصدع اور التحطم:

سورۂ حشر کی آیت ہے:

"لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ وتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون" (الحشر-۲۱)

اس آیت میں "تصدع" "تحطم" کے مترادف نہیں ہے۔

تصدع "صدع" سے مشتق ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں ٹھوس اجسام کا پھٹنا عربی میں مجازاً صداع (درد سر) کیلئے استعمال کرتے ہیں گویا درد اور چکر سے سر پھٹا جاتا ہے۔ اسی معنی میں سورۂ واقعہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

"لا یصدعون عنھا ولا ینزفون" (۱۹)

اسی طرح معنوی طور پر "تصدع" تفریق و تمزق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور "الصدع بالامر" کے معنی ہیں کسی قطعی بات کے ذریعے کسی کام کا فیصلہ کرنا۔ اسی معنی میں سورۂ حجر کی آیت ہے

"فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین" (۹۴)

لیکن تحطم کے عربی میں "ھشم" (چور چور ہونے) کے ہیں۔ اس کا استعمال ان چیزوں کے ساتھ خاص ہے جو خشک ہوں۔ خواہ سخت اور ٹھوس ہوں یا نہ ہوں۔ عربی میں شیر کو "حطوم" کہتے ہیں اس لیے کہ وہ شکار کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اسی طرح منحوس سال کو حاطم اور حطمۃ کہتے ہیں اس شخص کو جو بہت زیادہ کھائے پھر بھی پیٹ نہ بھرے۔ "رجل حطم" کہتے ہیں۔ اور سنگ دل چرواہے کو راع حطمۃ یا راع حطم کہتے ہیں۔ گویا وہ جانوروں کو ہانکتے وقت اپنی سختی سے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

یہ اصل معنی (یعنی سختی اور سنگ دلی کے ساتھ توڑ پھوڑ) قرآن کے ان چھیوں مقامات پر پایا جاتا ہے جہاں اس مادہ کا استعمال ہوا ہے۔

سورۂ نمل میں ہے:

قالت نملة یاأیها النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ وھم لا یشعرون (۱۸)

سورۂ الزمر اور سورۂ الحدید میں زرد، سوکھی اور چورا چورا کیلئے حطام کا لفظ آیا ہے:

"ألم تر أن الله أنزل من السماء ماءً فسلکه ینابیع فی الأرض ثم یخرج به زرعا مختلفا ألوانه ثم یهیج فتراہ مصفرا ثم یجعله حطاما (الزمر-۲۱)

"اعلموا أنما الحیاۃ الدنیا لعب ولهو وزینة وتفاخر بینکم وتکاثر فی الأموال والأولاد کمثل غیث أعجب الکفار نباته ثم یهیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما (الحدید-۲۰)

سورۂ ھمزہ میں حطمة، اس آگ کیلئے آیا ہے جو لوگوں پر طعن کرنے اور پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے والے شخص کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی:

"الذی جمع مالا وعددہ، یحسب أن ماله أخلدہ، کلا لینبذن فی الحطمة وما أدراک ما الحطمة، نار الله الموقدۃ" (۲-۶)

حطم کا استعمال جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے چورا چورا ہو جانے والی اور خشک چیزوں کیلئے ہوتا ہے جبکہ تصدع کا استعمال سخت اور ٹھوس چیزوں کیلئے ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ حشر میں پہاڑ کیلئے ہوا اور سورۂ طارق کی مندرجہ ذیل آیت میں زمین کیلئے ہوا ہے:

"والسماء ذات الرجع، والأرض ذات الصدع، إنه لقول فصل وما ھو بالھزل" (۱۱-۱۴)

الخشوع والخشیة اور الخضوع والخوف

سورۂ حشر میں پہاڑ کیلئے تصدع کا لفظ اس کے اصل لغوی معنی میں

ستعمال ہوا ہے۔ اس میں بیان کا اعجاز یہ ہے کہ خشوع کی نسبت پہاڑ کی طرف
گئی ہے جبکہ پہاڑ کی شان یہ نہیں ہے کہ اس پر خشوع یا خشیہ طاری ہو خشوع
ور خشیہ دونوں دل کے افعال ہیں۔ جن کا صدور جمادات سے نہیں ہوتا۔ یہ بیان
ں کا اعجاز ہے کہ اس سے بے جان پتھر میں زندگی کی روح پھونکی ہے۔

خشیۃ معنی میں خوف سے مختلف ہے اس لیے کہ اس کا صدور اس ذات کی
عظمت پر سچے یقین سے ہوتا ہے جس سے ہم ڈرتے ہیں۔ اسی طرح خشوع معنی
میں خضوع سے مختلف ہے۔ خشوع کا صدور اس ذات کی جلالت سے سچے تأثر
سے ہوتا ہے جس سے ہم ڈرتے ہیں جبکہ خوف قہر ودہشت کے تسلط سے بھی پیدا ہوتا
ہے اور خضوع میں نفاق اور خوف کی وجہ سے تصنع یا تقیہ یا مدارات ہو سکتی
ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں خشع قلبہ، وہ خضع قلبہ نہیں کہتے۔ إلا تجوزا۔

قرآن کے اس معجزانہ بیان میں حیرت انگیز نسق و ترتیب، لطیف دلالتیں
اور خیرہ کن اسرار ملتے ہیں۔ قرآن خشیۃ کے مختلف مقامات دنیاوی زندگی کے بارے
میں آئے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا ہی آزمائش کا میدان ہے۔

قرآن میں "خشیۃ" کی نسبت جن امور کی طرف کی گئی ہے۔ وہ ہیں غیب،
قیامت، آخرت یا تنگی و پریشانی، فقر فاقہ، تجارت کا ماند پڑجانا، یتیموں کا مال
ہڑپ کر لینا اور سرکشی اور کفر کے ذریعہ تنگ کرنا۔

... اس کی نسبت اگر کسی ذات کی طرف کی گئی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات
ہے۔ ... اس کی نسبت کسی مخلوق کی طرف نہیں کی گئی ہے۔ یہ نکتہ قرآن کے ان تمام
مقامات میں پایا جاتا ہے جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

یٰس ۱۱: إنما تنذر من اتبع الذكر وخشي الرحمن بالغيب
ساتھ ہی دیکھیے آیات: ق ۳۳، الانبیاء ۴۹، فاطر ۱۸، الملک ۱۲، الرعد ۲۱
...

البینة ۸: رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ، ذلک لمن خشی ربہ

النازعات ۱۹: واھدیک إلی ربک فتخشی

الاحزاب ۳۷: وتخشی الناس واللہ أحق أن تخشاہ

[ساتھ ہی دیکھئے آیات: المائدہ ۳، ۴۴، التوبہ ۱۳، البقرہ ۱۵۰، النساء ۷۷]

التوبہ ۱۸: ولم یخش إلا اللہ

آل عمران: الذین قال لھم الناس إن الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم إیمانا وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل

قرآن میں اللہ کی خشیت کی نسبت ان لوگوں کی طرف کی گئی ہے جو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتے ہیں، جو ذکر کا اتباع کرتے ہیں، جو ایمان اور علم کے حامل ہوتے ہیں اور جن سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے لیکن جب اللہ کی خشیت پہاڑ پر طاری ہونے لگے جیسا کہ سورۂ حشر کی آیت ۲۱ میں ہے۔ یا پتھر پر طاری ہونے لگے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۷۴ "وإن منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ" میں ہے تو یہ قرآن کا اعجاز بیان ہے جو بے جان جمادات میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے اور اسے حس و حرکت کرنے والا، تأثر قبول کرنے والا، اور خشیۃ اور خشوع پیدا کرنے والا بنا دیا ہے۔

اسی طرح خشوع بھی جامد پہاڑ کی صفت نہیں ہے بلکہ یہ دل کا فعل ہے عربی میں خشع الصوت، خشع الوجہ، خشع البصر استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی خشوع قلب میں سے ہے۔

(باقی آئندہ)

تبصرے

نام کتاب : قوموں کا کردار
مصنف : ڈاکٹر احسان اللہ خاں
صفحات : ۱۲۴
طباعت : فوٹو لیتھو ورکس دہلی
تبصرہ نگار : محمد سعید الرحمٰن شمس

ڈاکٹر احسان اللہ خاں ملک کے ایک معروف اسکالر اور مشہور مصنف ہیں جن کی چھوٹی بڑی دو درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل علم و اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو کوشش یہی کرتے ہیں کہ متعلقہ موضوع کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ اس لیے کہ موصوف تصویر کے دونوں (مثبت و منفی) پہلوؤں کو اپنی دقت نظر، وسیع معلومات اور علمی ژرف نگاہی سے پوری طرح اجاگر کر کے خاطر خواہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "قوموں کا کردار" جو اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن بقول ڈاکٹر صاحب انھوں نے سائنٹیفک انداز میں قوموں کے کردار کا محاسبہ کر کے جو مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے اس سے فکر و نظر کے کئی دروازے وا ہوئے ہیں۔ زبان و بیان عام فہم اور سادہ ہے۔ کتاب مختصر ہونے کے باوجود معلومات افزا اور فکر انگیز ہے۔

"قوموں کا کردار" اگرچہ یہ موضوع انتہائی اہم، علمی، تاریخی اور تحقیقی ہے اس عنوان پر متعدد ضخیم کتابیں موجود ہیں تاہم جو لوگ جدید رجحانات اور تقاضوں کے پیش نظر اس موضوع پر کام کرنا چاہیں انھیں ڈاکٹر احسان اللہ کی یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(محمد سعید الرحمن شمس)

برہان

جلد ۱۰۲ | ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۸ء | شمارہ ۶

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

شذرات

اسلام ہی دنیا کا تنہا اور آخری مذہب ہے جس کی تمام تر بنیادی تعلیمات ایک اٹل اور دائمی نظامِ اخلاق پر استوار کی گئی ہیں۔ جس میں مغرب کی افادیت پسندی اور مادی دور کی مصلحت بینی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ غیر مشروط طور پر ایک ازلی اور ابدی تصور پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ حالات و زمانے کے عدم ثبات۔ تبدیلیوں، اور مصلحت وقت کے تقاضوں سے اس کے بنیادی اصولِ اخلاق کو ہرگز توڑا نہیں جا سکتا۔ ان بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اسلام کے جملہ قوانین تمدن و معاشرت زمانہ اور وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جو اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو۔ یا شریعت اسلامی کی روح اس کے مقاصد، اور اسلامی زندگی کے نصب العین کا ساتھ نہ دیتی ہو۔ بنیادی اصولوں اور عقائد کا یہ ثبات و استحکام اور ان کا اس طرح ناقابل تغیر ہونا ایک بہت بڑا تحفظ اور ضمانت ہے جس کی نظیر دوسرے مذاہب و ادیان میں ہرگز نہیں مل سکتی۔ ورنہ آج جس طرح مغربی ذہن و فکر نے اپنے وقتی اور ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت ہر اخلاقی اصول اور ضابطہ کو توڑ ڈالا ہے۔ یہی حال خدا نخواستہ اسلامی اصول و مقاصد کا ہوتا۔ اس کے بنیادی عقائد اور شریعت اسلامی کے اخلاقی اصولوں میں انسانی خود غرضیوں اور کام جوئیوں کے اثرات راہ نہیں پا سکتے۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اسلام کا اخلاقی [illegible]

کی ترجمانی کا دشمن نہیں ہے بلکہ وہ فکر و تعقل کی بے قید آزادی کا سب سے بڑا مخالف ہے وہ عقل کو معطل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسے انسانی اور اخلاقی اصولوں کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی عقل کو یہ حق نہیں دیا جائے گا کہ وہ شریعت کے بنیادی مقاصد اور اسلامی زندگی کے مجموعی نصب العین میں کوئی تبدیلی کر سکے اور نہ اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو مختلف شعبے کے لئے زندگی کے جو ہدایات دیئے ہیں اور جو اصول ان کے لئے وضع کیئے گئے ہیں ان میں دخل اندازی کرے۔ ہاں اسے یہ آزادی ضرور عطا کی گئی ہے کہ وہ تفصیلی امور اور ذیلی قوانین پر نگاہ رکھے اور دیکھے کہ وہ شریعت کے مقاصد سے متصادم تو نہیں ہوتے ہیں عقل کو اتنا اختیار ضرور دیا گیا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں اسلامی قوانین (فقہ اسلامی) اگر اسلامی مقاصد کا اصول کا رسے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ تجویز کرے۔ اسلامی زندگی میں عقل و فکر کا مرتبہ یہ ہے کہ جب حوادث کے طوفان اور انقلاب کی آندھیاں زمانہ میں نئے باب کا اضافہ کریں۔ نت نئے حالات رونما ہوں۔ قدیم نظام معاشرت و تمدن درہم برہم ہو جائے اور زندگی کو نئے مسائل و مشکلات کا سامنا ہو تو وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان مطالبوں کو پورا کرے اور زمانے کے چیلنج کا جواب دے۔ اسلامی زندگی کے لئے نئے قوانین اپنی ذاتی بصیرت اور فکر و عقل کی بنیاد پر نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی عطا کی ہوئی روشنی میں وضع کرے۔ اس طرح گویا اسلام نے عقلی ارتقاء اور انسانی فکر و ذہن کے پرواز کی راہ بھی متعین کر دی ہے لیکن عملی ارتقاء میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی ہے۔

اسلام میں اخلاق کا دائرہ افراد اور جماعت کا محدود نہیں ہے اس وجہ سے محسن انسانیت رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض و

غایت اور بعثت کا مقصود اخلاق عالیہ کی اتمام اور تکمیل قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے آپ کی بعثت محض اصلاح معاشرت اور تطہیر سلوک کے لئے نہیں بلکہ عالمگیر پیمانے پر معاملات عائد واعمال تشکیل تہذیب، تعمیر تمدن اور ترقی کی انسانی قدروں کے فروغ کے لئے ہوئی ہے۔ آپ صرف انفرادی معاملات کی اصلاح کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے تھے بلکہ تمام اجتماعی معاملات کو سنوارنا اور نکھارنا بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھے۔ اس لئے رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعوت ہے ایک تحریک ہے، ایک پیغام ہے، ایک انقلاب ہے جو انسانی زندگی کے تمام تر پہلوؤں پر محیط ہے۔

آپ کی عالمگیر دعوت، انقلابی پیغام اور آفاقی تعلیمات زندگی کے کسی خاص پہلو کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور عمل کے ہر شعبہ کے لئے اپنی مستقل ہدایات واضح پالیسیاں، صاف ستھرا موقف اصلاحی تدابیر اور فکری نظریات رکھتا ہے۔ اس کا ایک مخصوص نظام تہذیب وتمدن، ایک الگ نظام معاشرت اور ایک جداگانہ نظریہ سیاست وحکومت ہے۔ اس نے زندگی کے معاشی اور اقتصادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کو مناسب اہمیت دی ہے۔ زندگی کے اور گوشوں کو جس طرح اس نے بیان میں واضح اصول وہدایات دیئے ہیں۔ اس نے خارجی نظامات باطنی محرکات پر بھی یکساں توجہ صرف کی ہے اور ایک دوسرے کے مابین گہرا ربط اور تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک عبادت کا مفہوم صرف روزہ اور نماز ہی نہیں بلکہ ہر وہ عمل عبادت شمار کیا جاتا ہے جو اس کے وضع کردہ اصولوں اور ہدایات کے مطابق ہوں، خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا اجتماعی زندگی کے معاملات سے اس کا تعلق ہو۔ اس لئے دین اسلام ایک اصول عمل، ایک ضابطہ اخلاق، عقائد کا ایک مجموعہ، تمدن

ایک نظام، حکومت کا ایک تصور اور معاشرت کا ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ وہ فکر کا ایک صحیح ترین اصول اور عقل کے ارتقاء کا سب سے سیدھا راستہ، صراط مستقیم (RAIGHT PATH) بھی ہے فکر کی سلامت روی اور عقل کی راستی جو کچھ، جہاں کہیں اور جتنی کچھ ہے وہ سب اسی میں اور اسی سے ہے دنیا کے اور تمام فلسفہائے نظام، انسانی ذہن کے تراشیدہ خود ساختہ نظریے اور "ازم"، اور تعقل کی تمام راہیں انسان کو بالیقین منزلِ مقصود سے بھٹکانے والی اور اجتماعی زندگی کے لئے ہلاکت خیز ہیں۔

اخلاق دینِ اسلام کی ایک جامع اور مکمل اصطلاح ہے اس سے مراد محض خوش روئی، خوش کلامی اور خندہ پیشانی ہی نہیں بلکہ یہ وہ آئینہ ہے جس میں انسانی زندگی کی پوری تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خلق شخصیتِ انسانی کا آئینہ ہوتا ہے فرد سے اجتماع اور ذات سے معاشرے تک اس کا نفوذ و شرب ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا مفید اور قابلِ ذکر پہلو نہیں جو اخلاق کے دائرے میں شامل نہ ہو، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے سے لے کر اہم ترین مسائلِ حیات اور امورِ نظمِ مملکت سبھی کچھ اس اخلاق کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہادیٔ عالم نبی آخر الزماں حضرت اقدس محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رب العالمین نے "خلقِ عظیم" کا طرۂ امتیاز دے کر منصبِ جلیل پر فائز فرمایا ہے۔ عظمتِ خلق کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ظرف میں وسعت پنہاں تھی اور عادات، خصائل، افعال اور کردار میں رفعت و خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

چونکہ آپ رحمت تھے اس لئے پروردگارِ عالم نے آپ کو دنیا میں حسنِ اخلاق کے ... کا عظیم ترین معیار قائم کرنے کے لئے مبعوث فرمایا تھا، چنانچہ ... ہے کہ آپ نے محض فکری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر (PRACTICALLY) عظمتِ خلق کا عظیم معیار قائم فرمایا اور بلاشبہ اس میں آپ کامیاب رہے جس کے نقوش و اثرات چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود

آج بھی محسوس کئے جا رہے ہیں۔

دورِ حاضر میں "امت وسط" کا جو انحطاط جس حد تک پہونچ چکا ہے اور مجموعی طور پر ہم جس انحطاط اور پستی کے دور سے گذر رہے ہیں یہ صورت حال انتہائی تشویشناک ہے لیکن اس کے اسباب باہر نہیں بلکہ ہمارے اندر ہے ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ اپنے اجتماعی کردار کا جائزہ لیں، تو معلوم ہوگا کہ ہمارے زوال کا عمل خود ہمارے اپنے ہی اعمال کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اسلام نے عزت و سربلندی اور قیادت و وقار کے ساتھ دنیا میں زندگی گذارنے کا جو آئین مرتب کیا تھا افسوس اسے ہم نے فراموش کر دیا، اور شعوری و غیر شعوری طور ان راہوں پر ہی چل پڑے جو بظاہر بہت پرکشش، لیکن وہ زوال پذیر قوموں کی گذرگاہوں ہیں۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثال اخلاقی پہلو اور آپ کا بے داغ کردار ہمارے لئے نئے حالات، ماحول اور تقاضا میں یہی پیغام رکھتا ہے۔ اور وقت کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ ہم اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں، ایمان و یقین کی بے بہا اور لازوال دولت کے ساتھ اپنے اجتماعی اور ملی کردار میں مثبت اور نمایاں تبدیلی پیدا کریں اور زندگی کی شاہراہ میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لازم سمجھیں۔

شکریہ

مولانا جمیل مہدی مرتب "برہان" کے وصال کے بعد دو تین ماہ سے برہان کے "نظرات" ملک کے معروف صحافی اور کہنہ مشق اہل قلم محترم ظہیر صدیقی لکھتے رہے جس کے لئے ادارہ موصوف کا بے حد شکر گذار ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی صدیقی صاحب اپنے گرانقدر مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیں گے۔

اپیل

قارئینِ کرام و ہمدردانِ ملت! ادارۂ ندوۃ المصنفین اکابر اور بزرگوں، خاص طور پر مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنے قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ الحمد للہ علی ذالک۔

لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا اور ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین محبین اور بہی خواہ حضرات اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کمر توڑ مہنگائی اور دورِ گراں بازاری میں ایسے ادارے بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے ہرگز نہیں چلائے جا سکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحبؒ

انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے ادارہ کا نظام چلاتے رہے ہیں اور اس کا تحقیقی و علمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا، اب یہ بات محسوس کی جا رہی ہے، کہ کئی منصوبے جو تشنۂ تکمیل اور کئی اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک "مستقل فنڈ" قائم کیا جائے، تاکہ بسہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلایا ہے اور ہم لوگ بھی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ ارباب خیر اور بہی خواہان ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے۔ چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر اس پتہ پر ارسال کیا جائے۔

منیجر
ندوۃ المصنفین
اردو بازار، دہلی

محمد حسین ہیکل اپنی تحریروں کے آئینہ میں

جناب محمد صلاح الدین عمری، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جدید مصری ادب — جس کو دنیائے عرب کے تمام آداب پر فوقیت حاصل ہے، اور جس نے قدیم وجدید عربی فکر وفلسفہ کا حسین امتزاج پیش کرکے ادب وفن کو ارتقائی مراحل سے ہم کنار کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے — کا مطالعہ بڑا متنوع اور دلچسپ ہے۔ علم وادب اور فکر وفن کو برتنے میں سرزمین مصر کو ہمیشہ سے ہی قیادت حاصل رہی ہے۔ یہ مصر ہی تو تھا جس کی قدیم عربی یونیورسٹی جامع ازہر نے مدتوں عالم اسلام کے مسائل کو حل کرنے اور برطانوی تسلط سے اس سے قبل، مسلمانوں کی بھنور میں پھنسی کشتی کو پار لگانے کی عظیم خدمت انجام دی ہے۔ اسی سرزمین مصر کو تو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے عظیم مجددین اور مصلحین کی شخصیت سازی کی، اسی مصر نے تو جمال الدین الافغانی کے لئے اپنے بازو وا کئے اور ان کی اصلاحی دعوت کو اپنے یہاں پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے تھے۔ اسی مصر نے تو شیخ محمد عبدہٗ کے اجتماعی، تعلیمی اور اصلاحی نظریات کی اشاعت کے لئے راہیں ہموار کیں۔ اسی کی آغوش میں تو شیخ رشید رضا نے پناہ لی تھی۔ اسی مصر کی آنکھوں کا تارا انقلابی لیڈر

مصطفیٰ کامل تھا اور اسی مصر کا جگر گوشہ تو انقلاب مصر کا بیباک قائد سعد زغلول تھا، اس کی کوکھ سے تو لطفی السید نے جنم لیا تھا۔ اسی مردم خیز سرزمین کی تو پروردہ ناقد ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عظیم عالم ڈاکٹر احمد امین، فلسفی ناقد استاذ محمود العقاد کی گوناگوں شخصیتیں تھیں۔ اس خطۂ ارض کے جمال و رعنائی کے نغمے حافظ ابراہیم نے گائے تھے۔ اسی گنج حسن کے نقوش نے تو احمد شوقی کے قصائد کی نوک پلک سنواری تھی۔ اسی سرزمین میں بہنے والے دریائے نیل کی عظمت اور اس کی قدیم تہذیب و تمدن کے راگ ہیکل نے الاپے ہیں۔ وہی ہیکل جن کو جدید عربی ادب میں پہلے فنی ناول کی تخلیق کا شرف حاصل ہے۔ اسی مصر کے چند سر پھرے نوجوانوں نے اگر ایک طرف مصری قومیت کی آواز لگائی تو دوسری طرف اس کے فرزندانِ توحید نے، اسلام کی عطا کردہ حضارتِ سلیم کو اپنانے کی دعوت دی۔ اسی سرزمین کے چند جیالوں نے کمربستہ ہوکر، اسلام اور اسلامی حضارت سے محبت و عشق کے بیج بوئے اور اسلامی اخوت و مودت کے پرلطف نغمے چھیڑے۔ پھر، چراغ سے چراغ جلے اور کارواں بنتا گیا۔ اخوان المسلمون، جماعۃ شباب محمد اور جماعۃ الشبان المسلمین کی طاقت ابھری۔

اسی عصر نے تو عربی زبان کے ارتقاء اور فنون ادبیہ و نقدیہ کی ترویج و اشاعت میں عملی حصہ لیا اور تعلیم و تدریس کی سطح کو بلند کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اسی سرزمین کی حضارت نے کھلے دل سے مغربی حضارت و تمدن کو اپنے یہاں پھلنے پھولنے اور پنپنے کے بھرپور مواقع فراہم کیے تاکہ قدیم و جدید تہذیبوں کا ایک حسین آمیزہ تیار ہوکر مصری قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں معاون ثابت ہو۔

مصر ہی کے ایک فرزند محمد حسین ہیکل کی جدید عربی ادب کا اجمالی جائزہ ہماری اس بحث کا موضوع ہے۔ جی ہاں! وہی ہیکل جس کی شخصیت عرب دنیا میں سب سے پہلے ناول نگار کی حیثیت سے معروف ہے۔ جو افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں عربی ادب کے پہلے معلم شمار کئے جاتے ہیں، جن کو عربی ادب و تنقید میں بھی ممتاز مقام حاصل تھا۔ یہ ہیکل ہی تو ہیں جنھوں نے "حیاۃ محمد" پیش کر کے، اسلام دشمن مستشرقین کے بے بنیاد الزامات کا خالص تحقیقی اسلوب میں جواب دیا ہے۔ انھیں نے تو اسلامی سلطنت کو ایسی حضارت کے روپ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود اور امن عالم کی ضمانت دیتی ہے۔ اسی طرح ان کو ادبی، سیاسی اور تنقیدی مقالات تیز صحافتی مضامین کو فنی انداز میں پیش کرنے کا بھی خاص ملکہ حاصل ہے۔ سیرت و تراجم ادبیہ میں بھی ان کا تنوع ان کی فکری ارتقار کا غماز ہے۔ دل کو چھو لینے والی ہر بات اور ذہن کو جھنجھوڑنے والا ہر احساس، ان کے یہاں الفاظ کا جامہ پہن کر قاری کو دم بخود کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک طویل عرصہ تک ایک مخلص اور خوددار سیاسی قائد اور مفکر کی حیثیت سے زندگی گذارتے رہے اور ساری زندگی، مصر میں نیابتی حکومت اور آزادی کی تلاش جستجو میں سرگرم رہے۔ وہ سیاستداں، ادیب، ناقد، ناول نگار اور صحافی سب ہی کچھ تھے مگر اس سے بڑھ کر وہ غیور، خوددار اور حریت کے دلدادہ انسان تھے۔ حریت رائے اور حریت قلم ان کی سب سے بڑی دولت تھی جس سے وہ کسی قیمت پر بھی دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔

ادبی اور اجتماعی ارتقار کی کہانی، سیاسی حالات کے نشیب و فراز کے پس منظر میں ہی چھپی ہوتی ہے، لہٰذا کسی ادیب یا فنکار کا مطالعہ، اس وقت کے سیاسی،

سماجی اور تمدنی حالات کے پس منظر میں ہی کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ عمل کا ٹکراؤ جب
ردعمل سے وقوع پذیر ہوتا ہے تو لاتعداد منفی پہلوؤں کے سامنے آنے کے باوجود
پیچھے سے رونما ہو جانے والے مثبت پہلوؤں کی تلاش بھی ایک جگر سوز لیکن دلچسپ
شغلہ ہے۔ اور یہی مثبت پہلو ادب وفن اور فکر و فلسفہ کے ارتقاء کی کہانی
سناتے ہیں۔ مصر میں عمل اور ردعمل کا کچھ ایسا ہی تصادم اس وقت رونما ہوا
جب عثمانی حکومت کے زیر نگیں مدت سے چلے آرہے ملک پر ۱۷۹۸ء میں نیپولین
نے اپنا جھنڈا گاڑ کر باشندگانِ مصر کو بوکھلا دیا۔ اس اچانک تسلط کے ردعمل
نے، مصر پر حکومت کرنے کے، فرانسیسیوں کے خوابوں کو چکنا چور ضرور کر دیا،
لیکن یہ فرانسیسی سیلاب جاتے جاتے اپنے کچھ ایسے اثرات چھوڑ گیا جن سے
مصریوں کو لاشعوری طور پر مستفید ہونا ہی پڑا۔ فرانسیسی حملہ، مصر میں تمدنی اور علمی
ترقی کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ یہ فرانسیسی اپنے ساتھ تہذیب و تمدن اور
علم و ادب کا جو اثاثہ لائے تھے، اس کے اثرات کا نتیجہ ہی تھا کہ مصر میں محمد علی
پاشا کے ہاتھ میں زمام حکومت آتے ہی عام اصلاحات، قوم کی سیاسی سطح
کو بلند کرنے اور ان میں علمی شعور پیدا کرنے کی غرض سے ایسے قوانین کا نفاذ کیا
گیا جن کے نقوش پر ہی مصر میں سیاسی، علمی اور ادبی ارتقاء کی راہیں ہموار
ہوئیں[1]۔ اسی نیپولین کے حملہ کے نتیجہ میں غالباً باشندگانِ مصر کو قومیت کا احساس
ہوا۔ جس نے بعد کے ادوار میں کہیں فوجی انقلاب کا روپ دھارا، تو کہیں
عوامی انقلاب کی تخم ریزی کی، لیکن چونکہ ابھی مصریوں کے سیاسی شعور میں

۱۔ دیکھیئے عمر الدسوقی: فی الأدب الحدیث ج ص ۱۲ تا ۱۴۔
د محمد فہمی لہیطہ: تاریخ مصر الاقتصادی ص ۵۷ تا ۶۸۔

وہ پختگی نہیں آئی تھی جو اقوام کو اپنا راستہ خود متعین کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور خود اپنے تحفظ کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے، لہٰذا کچے ذہن کی ناعاقبت اندیشیوں کا احساس کر کے، انگریزوں نے مصر کو لقمۂ تر سمجھ کر اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور جلد ہی مصر انگریزوں کی استعماریت کے شکنجہ میں کستا چلا گیا۔ لیکن، تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت نے ظلم و عدوان پر کبھی اطمینان کی سانس نہیں لی، بلکہ اسے ہمیشہ ظلم و زیادتی کی کرخت آوازوں کے پس پردہ قومیت کی للکار سنائی دیتی رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصر میں غیر ملکی تسلط پر، وہاں کے باشندوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی چین کی سانس نہیں لی، بلکہ جوں جوں استعماریت کی جکڑ بندیاں سخت ہوتی گئیں، وطنیت کا شعور بڑھتا گیا[1] اسی استعماریت کی ظلم و تعدی کا ثمرہ تھا کہ وہاں جلد ہی قومی لیڈر ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے ظلم کی چکی میں پستے ہوئے عوام کو نجات دلانے اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کی انتھک جدوجہد شروع کر دی[2] حزب الوطنی، حزب الوفد، حزب الأمتہ اور حزب الاحرار الدستوریین، اور کتنی ہی سیاسی و سماجی جماعتوں نے اس استعماری تسلط کو مزید برداشت نہ کرنے کے عزم کا اعلان کر کے، ہنگامے شروع کر دیئے، ملک کے طول و عرض میں مظاہرے ہونے لگے، آگ و خون کی ہولی کھیلی جانے لگی، اور مصری بچہ بچہ مصری تشخص کے تحفظ کا عزم لے کر سینہ سپر ہو گیا۔ آخر کار ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب برپا ہو گیا[3] اور اس طرح مصر

---

[1] ملاحظہ ہو، محمد مصطفیٰ صفوت: مصر المعاصرۃ ص ۷۸۔

[2] عبد اللطیف حمزۃ: الصحافۃ المصریہ فی مائۃ عامہ ص ۸۱۔

[3] نقل: مذکرات ج ۲ ص ۳۴۹ – ۳۸۲

میں ایک طویل جد وجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد آزادی کا پرچم لہرایا۔
سیاسی انقلابات اور تبدیلیاں، علم وادب کی ترقی وتنزلی کی ضامن ہوتی ہیں۔ اور غیر ملکیوں سے سیاسی وثقافتی روابط، علم وادب کا لین دین اور خیالات وافکارات کا تبادلہ، ذہنی وسعت اور ثقافتی ترقی کا وسیلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ غیر ملکی ثقافت اور ان کے اصول وتمدن سے واقفیت نے مصر کو مغربی تہذیب وتمدن کے معائب ومحاسن سے روشناس کرایا، جس نے وہاں کے علمی وادبی افق کو اگر ایک طرف وسعتوں اور پہنائیوں سے آشنا کیا تو دوسری طرف ہم کو، مصری ادب وفن کا اس جدید تہذیب وتمدن سے شناسائی کے نتیجہ میں، ادب وفن میں آہستہ آہستہ در آنے والی کشمکش اور اضطراب کا احساس بھی ہوتا ہے جو مغربی تہذیب کی چکا چوند کرنے والی تیز روشنی کے پس پردہ تہ بہ تہ تاریکیوں کا خاصہ ہے۔ پھر، اگر ایک طرف مصری ادبار اور مفکرین نے عربی زبان وادب کے دامن کو جدید اصلاحات اور سائنسی وثقافتی تعبیرات سے مالا مال کرنے میں اپنی زبان دانی کی قوتیں صرف کی ہیں تو دوسری طرف ہم کو جمال الدین الافغانی[1] اور شیخ محمد عبدہ جیسے مصلحین مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے مذہبی اصلاح[1] دین کو فرسودہ رسوم ورواج اور لایعنی اوہام وخرافات سے پاک کرنے اور نوجوان نسل کو ـــــ جو مغربی تہذیب پر فریفتہ ہو کر دین ومذہب سے بیزار نظر آرہی تھی ـــــ دین کی اصل روح سے آشنا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان مصلحین نے اسلامی ثقافت کی اشاعت اور مسلم معاشرہ میں اسلامی فکر وشعور کو

۱۔ ملاحظہ ہو تشارلز آدمس : الاسلام والتجدید فی مصر ص ۱۷-۱۸
وگب الاتجاہات الحدیثۃ فی الاسلام ص ۶۸ ـــ ۶۹ -

بیدار کرکے ان کی علمی وشعوری سطح کو بلند کرنے کی جدوجہد کو ہی اپنا مطمح نظر بنالیا تھا۔ پھر، ہماری توجہ مصری یونیورسٹی کے قیام[۱] اور اس کے پس پردہ، قوم کی جدید تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے بلند مقصد پر بھی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ قدیم امہات الکتب کی دوبارہ اشاعت، تالیف وترجمہ کے لئے کمیٹیوں کا قیام، کرم خوردہ مخطوطات کے احیاء کی جدوجہد[۲]، جرائد ورسائل کا اجراء اور ان کا، مصر میں ادباء وعلماء کی ایک بڑی تعداد کی ذہنی تربیت کا سنجیدہ عمل، قاسم امین کی تحریک حریتِ نسواں[۳] کا مصری ماحول پر گہرا اثر، اور پھر قوم کا جدید تہذیب وتمدن کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں گم ہوکر، اسلامی وعربی تشخص سے آہستہ آہستہ دست بردار ہو جانے کے خطرناک نتائج کا احساس کرکے چند سر پھرے خدا پرستوں کا سوز عمل اور مصری قوم کو ورطۂ ہلاکت سے باہر نکالنے کی پرعزم کوششیں، اور جدید مصری تاریخ کے سوز وساز کے مطالعہ سے اس قدیم اضطراب وکشمکش کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جو حق وباطل کے درمیان ازل سے ہی نوشتہ ہے۔ مگر باطل کی راہ خوشنما، لذت آشنا اور عیش وطرب کے بے شمار احساسات سے مزین ہے، لیکن اس راہ کی منزل بہرحال ہلاکت، تباہی، ذہنی گھٹن اور ازلی اضطراب پر ختم ہوتی ہے۔ اور حق کی راہ تموز کی دھوپ میں جھلساتی ہوئی، سنگ باریوں کے خطرات سے الجھتی اور خار افشانیوں سے لہو لہان ہوتی ہوئی، آلام ومصائب سے گھری اور

۱۔ عمر الدسوقی : فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۵۲ ۔ ۵۳۔
۲۔ عمر الدسوقی : فی الادب الحدیث ج ۱ ص ۶۱ ۔ ۶۲ ۔
۳۔ دیکھئے : تشارلز آدمس : الاسلام والتجدید فی مصر ص ۲۲۳

سنگلاخ راستوں کے نشیب و فراز سے پُر ہے، لیکن اس راہ کا اختتام جہل شرح روئی، ذہنی سکون اور ابدی طمانیت کی منزل پر ہوتا ہے۔

ہیکل ۲۰ اگست ۱۸۸۸ء کو کفر غنام نامی بستی میں حسین آفندی سالم ہیکل کے گھر پیدا ہوئے[۱]۔ مختلف مدارس میں ابتدائی اور پھر ثانوی تعلیم کی تکمیل کی[۲]۔ ۱۹۰۵ء میں لاکالج میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۰۹ء میں قانون کی ڈگری لینے کے بعد فرانس چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ’دین مصر العام‘ کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی[۳]۔ گویا ڈاکٹر محمد حسین ہیکل پہلے مصری ہیں جنھوں نے ڈاکٹریٹ کی[۴]۔

ہیکل کی ادبی زندگی کا آغاز، لطفی السید کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات سے تاثر کا نتیجہ تھا۔ لطفی السید نے ہی ہیکل کو ادبی اور اجتماعی موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دی اور ہمہ وقت ان کی ہمت افزائی کرتے رہے[۵]۔ اس کے بعد جب ہیکل فرانسیسی ادب و ثقافت خصوصاً Hippolyte Taine کے

۱۔ مقالہ، ڈاکٹر حسین فوزی النجار (الدکتور محمد حسین ہیکل اعداد لطفی السید) ص ۵۔

۲۔ ہیکل: مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ ج ۱ ص ۴۴، دسوقی ضیف: الادب العربی المعاصر فی مصر، ص ۲۷۰۔

۳۔ Antonie Wessils: A modem Arbic Biography of Mohammad P 35

۴۔ حسین فوزی النجار ص ۱۴۔

۵۔ ہیکل: مذاکرات ج ۱ ص ۳۰۔

ادبی و تہذیبی اقدار سے متاثر ہوئے[1]، تو عربی و فرانسیسی ثقافت کے امتزاج سے جو شکل بنتی ہے اُسے وہ ہیکل کی تحریروں کی حلاوت میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ فرانس سے واپس آنے کے بعد ہیکل نے اگرچہ وکالت کا پیشہ شروع کردیا تھا، لیکن مستقبل کا ہیکل ابتدا ہی سے ان کو اپنی جانب کھینچتا رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وکالت کی مشغولیات کے باوجود وہ سیاست، ادب و نقد اور اجتماعی موضوعات پر قلم اٹھاتے رہے حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا کہ ہیکل نے وکالت کا پیشہ ترک کرکے صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز 'السیاسۃ' کی اڈیٹرشپ سے ہوتا ہے۔ جو حزب الاحرار کا روزنامہ اخبار تھا۔[2] پھر چند سال بعد انھوں نے ایک ہفتہ وار ادبی میگزین 'السیاسۃ الاسبوعیۃ' نکالنا شروع کیا[3] جس نے جلد ہی اس وقت کے ادبی و تنقیدی رجحانات اور جدید فکر و شعور کے ترجمان کی حیثیت اختیار کرلی۔ ایک طویل عرصہ تک صحافت سے منسلک رہنے کے بعد جب انھوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا تو کئی بار وزارت تعلیم کا قلمدان ان کے سپرد کیا گیا۔ پھر اس کے بعد رئیس مجلس الشیوخ کے معزز عہدہ پر بھی کئی بار سرفراز ہوئے۔[4] ان کی صحافتی و سیاسی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی بھی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ یہی تو ان کا طرّۂ امتیاز ہے جو ان کو بہت عزیز ہے۔ تقلید اور دوسروں کے نقش قدم پہ چل پڑنا یا مادّی مقصد

۱۔ ہیکل: تراجم مصریہ و غربیہ ص ۲۴۷۔

۲۔ حسین فوزی النجار، حوالہ سابق ص ۸۔

۳۔ Antonie Wessels: opcit P36

۴۔ ہیکل: مذکرات ج ۲ ص ۸۹ و ص ۳۰۲۔

حصول کی خاطر یہاں وہاں جانے والے تو بے تلاش کئے، قدم قدم پھوٹتے
لیکن حریت رائے اور آزادیٔ فکر کو برتنے کے لئے نہ صرف اپنے ہر ذاتی مفاد
کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے، بلکہ قدم قدم پر مخالفتوں اور نکتہ چینیوں کا نشانہ
بھی اس راہ کو اپنانے کا لازمی جزو ہے۔ حریتِ فکر کی راہ بظاہر بڑی پُرخطر اور
دشوار گذار نظر آتی ہے اور اس کے راہی کو اس راہ کے انتخاب کا حساب
کرب و اذیت اور طویل تر تنہائی کے احساسات سے چکانا پڑتا ہے لیکن کاروانِ حیات
میں ہمہ بینوں سے کچھ ستائے ہوئے، تنہائی کے احساس تلے دبے کرب زدہ چند نفوس
اپنا مقام بنانے میں بالآخر کامیابی کی منزل سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور ذاتی اغراض
و مقاصد کے پرستار اور فرسودہ تقلید کے بندے، اپنے ہی جیسے بے شمار انسانوں
کے سیلاب میں بہتے بہتے نہ صرف اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں بلکہ ان کی یادوں کے
نقوش بھی نقش بر آب سے زیادہ دیرپا نہیں ہوتے۔ ہیکل کا شمار بھی ان چند
خوش نصیب نفوس میں کیا جا سکتا ہے، جس نے حریت فکر کا کبھی کوئی سودا
نہیں کیا، اور تقلید کی سہل انگیزی سے منہ موڑ کر، اپنی راہ خود بنانے کی صعوبتیں
جھیلنے ہی میں سکون و طمانیت کے پہلو تلاش کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس
پرعزم کوشش میں انھوں نے لغزشیں بھی کھائی ہیں، اور کبھی غلط راہوں پر بھی چل پڑے
لیکن بالآخر حق کی تلاش کے جذبۂ صادق نے ان کو جس منزل پر پہونچایا وہ تھی 'منزلِ حق'
امن و سکون کی علامت اور صالح فکر و حرارت کی ضامن۔[1]

سیاسی و صحافتی مصروفیات کے باوجود، خوب سے خوب تر کی تلاش ان
کو لکھنے پڑھنے پر آمادہ کرتی رہی اور وہ، کبھی 'زینب' لکھ کر اپنے اندرونی کرب

۱۔ دیکھئے تقدیم فی منزل الوحی۔

اور فرسودہ تقلید کے خلاف اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر اتارتے ہیں[۱]، تو کبھی عظیم مصری شخصیات اور مغربی مفکرین سے اپنے دل کے رشتے جوڑکر مصریوں کو اپنے فکر سے آشنا کرتے ہیں[۲]۔ فرانسیسی اصول تنقید اور حضارت و تمدن کے قوانین کا موازنہ مصری اور عربی ادب و نقد سے کرتے ہیں تو زبردست مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن ہمت نہیں ہارتے بلکہ اپنے مقالات و مضامین میں ادب و نقد کے مسائل چھیڑکر جدید اصولِ نقد اور خالص تحقیقی اسلوب کو اپنانے کی دعوت دیتے ہیں[۳]۔ تاریخ اسلام اور سیرت نبویؐ کے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں[۴] تو اپنے مخصوص تحقیقی، علمی اور ادبی اسلوب میں ایسے نادر نمونے پیش کرتے ہیں کہ خود ہی اپنی تحقیق پر رشک آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'حیاۃ محمد' میں انھوں نے بعض ایسے پہلوؤں پر تاریخی بحث کی ہے جو مستشرقین کا ہدفِ ملامت بنے ہوئے تھے۔ اس تالیف کی ترتیب میں ہیکل کی بعض زبردست لغزشوں سے قطع نظر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جدید دور میں جدید اسلوبِ تحقیق کے پیش نظر لکھی جانے والی سیرت پر یہ پہلی تالیف ہے، پھر، حضرت ابوبکرؓ[۵] اور حضرت عمرؓ[۶] کی شخصیت

۱۔ ملاحظہ ہو ہیکل کی ناول 'زینب'۔
۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "تراجم مصریۃ وغربیۃ"، اور ثورۃ الأدب'
۳۔ دیکھیے ثورۃ الأدب۔
۴۔ حیاۃ محمد۔
۵۔ الصدیق ابوبکر۔
۶۔ الفاروق عمر۔

نجیب کیلانی نے جس تاریخی اسلوب میں پیش کیا ہے اور جدید مصر کی سیاسی تاریخ کی تدوین کی، اس سے ان کی علمی ذمہ داری اور ادبی صلاحیت
احتسابی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی متنوع شخصیت کا بھی احساس
ہوتا ہے۔ (باقی)

"طبقات الصوفیہ"

آصفیہ لائبریری حیدرآباد کا ایک عربی مخطوطہ

جناب عبدالرشید صاحب ، صدر شعبۂ عربی ، پٹنہ یونیورسٹی ، پٹنہ

چند سال پہلے مجھے حیدرآباد جانے کا موقع ملا۔ آصفیہ لائبریری میں ایک مخطوطہ پر میری نگاہ پڑی ، یہ مخطوطہ ناقص الاول ہے ، مجموعی اوراق ۲۲۴ ہیں۔ ۷۸۶ھ میں اس کی کتابت کی گئی ہے۔ صوفیاء اور مشائخ کے تراجم و اقوال پر مشتمل ہے۔ اس ناقص الاول کتاب کی ابتداء مشہور صوفی بشر الحافی کے تذکرہ میں اس عبارت سے ہوتی ہے "فاشتری خبزاً" الخ۔ پوری کتاب حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے۔ مؤلف نے پہلے صوفیاء کا تذکرہ کیا ہے پھر ہر تذکرہ کے ضمن میں اس شیخ سے متعلق تبعین اور مریدین کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب ایک خاتمہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ۳۰ اوراق پر مشتمل ایک ذیل تحریر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نہ مصنف کا نام کہیں مذکور ہے اور نہ کتاب کا۔ مگر یہ کتاب چونکہ صوفیاء اور مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے اس لئے کتاب کا اصل نام چاہے جو بھی ہو "طبقات الصوفیاء" یا طبقات الاولیاء کے نام سے موسوم کرنا قرین قیاس ہے۔

"الفہرست المشروح للکتب الخطیۃ النفیسۃ" کے نام سے [illegible] میں آصفیہ لائبریری کی ایک تفصیلی فہرست ہے۔ اس فہرست کے مرتب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ابو العباس احمد بن محمد السوسی متوفی ۳۹۶ھ کی تالیف ہے، اور ذیل کے مؤلف کا نام غیر معلوم ہے، مگر مؤلف ذیل نے اپنے خطبہ میں تحریر کیا ہے کہ وہ اس حصہ میں اپنے یمنی شیوخ کا تذکرہ کریں گے۔

مرتب فہرست کی اس تحریر سے مخطوطہ کے متعلق تین باتوں کا انکشاف ہوتا ہے:

۱۔ اصل کتاب کے مؤلف چوتھی صدی کے ایک شیخ ابو العباس احمد بن محمد السوسی متوفی ۳۹۶ھ ہیں۔

۲۔ ذیل کے مؤلف کا نام غیر معلوم ہے اور اس کے مولف اور اصل کتاب کے مولف دونوں دو آدمی ہیں۔

۳۔ ذیل میں اس کے مؤلف نے اپنے یمنی شیوخ کے حالات درج کئے ہیں۔

مرتب مذکور نے اپنے پہلے دعوی کی تائید میں کشف الظنون کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ حاجی خلیفہ نے "طبقات الصوفیار" کے ضمن میں لکھا ہے کہ ابو العباس احمد بن محمد سوسی متوفی ۳۹۶ھ کی بھی ایک "طبقات الصوفیار" ہے۔ کشف الظنون دیکھنے پر معلوم ہوا کہ شیخ ابو العباس سوسی نے بھی اس فن میں ایک کتاب تصنیف کی ہے مگر حاجی خلیفہ نے شیخ سوسی کی کتاب کی خصوصیت کے بارے میں ایک بات بھی تحریر نہیں کی ہے جس سے اس بات کا شک بھی ہو سکے کہ زیر بحث مخطوطہ شیخ سوسی کی تالیف ہو سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ مؤلف کے نام کی تحقیق و تفتیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے خطبہ کی تھوڑی سی عبارت آپ کے سامنے آجائے جس سے

رتب فہرست کے وقت دھوکے کے متعلق آپ اپنی رائے قائم کرسکیں:

"وإذا فرغنا من هذه الخاتمة الذي [التي] عقدناها بين
فلنذيل عليها بسادات أدركتهم فبلغناهم باليُمن حشرنا الله
في سلكهم ولا أخرجنا من عقدهم۔"

اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ اصل کتاب اور ذیل کے مؤلف ایک ہیں نہ کہ دو۔

۲۔ مصنف نے ذیل میں اپنے ان مشائخ کا تذکرہ لکھا ہے جن کے زمانہ کو انہوں نے پایا اور تبرک و تیمن کے طور پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، "الیُمن" بضم الیاء اس لئے پڑھنا ضروری ہے کہ ذیل میں شیخ دمیری قاہری اور دوسرے مصری شیوخ کا تذکرہ موجود ہے۔

اصل کتاب اور ذیل دونوں کے کاتب ایک ہیں۔ اب ذیل میں کاتب صاحب کا بھی دیکھتے چلئے:

"وافق الفراغ سنة ۷۸۰ھ، ابقى الله للمسلمين
مؤلفه"

اس کتاب کی کتابت سے ۷۸۰ھ میں فراغت ہوئی۔ اللہ اس کے مؤلف کو مسلمانوں کے لئے باقی رکھے۔

اس عبارت سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ مؤلف (ذیل اور مؤلف کتاب) ۷۸۰ھ میں بقید حیات تھے۔ اس لئے شیخ ابو العباس احمد بن محمد سوسی متوفی سنہ ۳۹۶ھ کے مؤلف کیسے ہوسکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہاں اصل کتاب میں بعض ایسے مشائخ کا تذکرہ ملتا ہے جن کی وفات ساتویں اور آٹھویں صدی میں ہوئی ہے اور کتاب الذیل میں شیخ محمد بن کریم الدمیری کا تذکرہ ملتا ہے جن کی وفات ۷۸۵ھ میں ہوئی ہے اور یہ قاہرہ کے مضافات میں

ا مقیم تھے۔ پھر شیخ دیری کے بعد شیخ شہاب الغزوی کے تذکرہ پر کتاب ختم ہو جاتی ہے جو کہ کتاب کی تالیف کے زمانہ میں بقید حیات تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیخ سنوسی کی تالیف کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ وہ دلائل کسی اور پہنچ سے آپ کے سامنے آجائیں گے۔

اب آیئے اس کتاب کے مؤلف کے بارے میں صحیح اور حتمی فیصلہ کیا جائے جس کی طرف خود اس کتاب کی بعض باتیں رہنمائی کر رہی ہیں۔ "تذکرۃ النوادر" کے مؤلف نے تحریر کیا ہے کہ یہ کتاب شیخ ابو حفص سراج الدین عمر بن علی بن عمر الانصاری الشافعی المصری المعروف بابن الملقن (۷۲۳ — ۸۰۴ھ) کی تالیف ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "معجم المصنفین" کے مصنف کی بھی یہی رائے ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ ٹونکی نے اپنے اس فیصلہ کو کس کتاب میں قلمبند کیا ہے۔ بہرحال ان دونوں اکابر کی رائے سے راقم السطور بھی متفق ہے۔

دلائل پیش کرنے سے پہلے ابن ملقن کے بارے میں چند کلمات کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے ——— ابن ملقن کے والد اندلس کے باشندہ تھے، وہاں سے کوچ کر کے مصر چلے آئے، اور مصر ہی کو اپنا وطن بنالیا۔ یہ جید عالم تھے، مختلف علوم وفنون میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ علم لغت اور علم نحو کے امام مانے جاتے تھے۔ مصر ہی میں ۷۲۳ھ میں ابن ملقن کی پیدائش ہوئی۔ یہ سال بھر کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ وفات کے بعد بہ اخیاقی والدین گئے، اور انہی کی گود میں ابن ملقن کی نشو ونما اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ عیسیٰ مغربی جامع طولون میں درس قرآن دیا کرتے تھے اس لئے یہ ابن الملقن کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بہرحال بعد میں یہ بہت بڑے صاحب فضل و کمال ہو۔ درس و قضاء کے فرائض ایک طویل مدت تک انجام دیتے رہے۔ برقوق کے زمانہ میں بعض ناگفتہ بہ حالات

کی بنا پر عہدۂ قضاء سے سبکدوش ہو گئے اور ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تقریباً تین سو کتابیں تحریر کی ہیں، شاید ہی کوئی فن ایسا ہو جس میں ان کی کوئی تصنیف نہ مل سکے۔ ان کی ایک کتاب "العقد المذہب فی طبقات حملة المذہب" ہے جس کے ایک حصہ کو راقم السطور نے کئی سال پہلے اڈیٹ کیا ہے۔ مقدمہ میں ۷۸ کتابوں کا نام شمار کرایا گیا ہے، جن میں سے بعض کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ بہت سی کتابیں بانکی پور، پٹنہ، آصفیہ لائبریری اور سعیدیہ لائبریری حیدر آباد میں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ تقریباً تیس کتابوں کا نام خود مصنف نے اپنی کتاب "العقد المذہب" میں شمار کرایا ہے۔ ان کتابوں میں "طبقات الصوفیہ" کا نام بھی ملتا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی تالیفات میں طبقات الصوفیہ کا ذکر کیا ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے طبقات الاولیاء لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ نے ایک جگہ طبقات الصوفیہ اور دوسری جگہ طبقات الاولیاء تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی کتاب ہو یا ایک دوسرے کا اختصار یا مطول ہو، جیسا کہ ابن ملقن کی عادت رہی ہے کہ پہلے مطول کتاب تحریر کرتے ہیں پھر اس کا اختصار کرتے ہیں، پھر اس کا خلاصہ تیار کرتے ہیں، اور کبھی پہلے مختصر کتاب تحریر کرتے ہیں پھر مطول تیار کرتے ہیں۔

ابن ملقن کے بہت سے شیوخ ہیں جن سے مختلف علوم و فنون میں تعلیم حاصل کی ہے۔ راقم السطور بہت تفصیل سے العقد المذہب کے مقدمہ میں ان کے شیوخ و تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے۔ شیخ قطب الدین عبد الکریم الحلبی متوفی ۷۳۵ھ ان کے محبوب ترین شیوخ میں سے ایک ہیں، جن کی تاریخ مصر کا حوالہ وہ بکثرت اپنی تالیفات میں دیتے ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اب آئیے مخطوطہ کا جائزہ لیا جائے جس کا اس کے

مؤلف کا صحیح تعین ہو سکے۔

۱۔ اس کتاب میں بار بار یہ عبارت ملتی ہے: "قال شیخنا قطب الدین عبد الکریم الحلبی فی تاریخہ" اور یہ بات مسلّم ہے کہ شیخ قطب الدین متوفی ۷۳۵ھ ابوالعباس سوسی کے شیخ نہیں ہو سکتے اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ شیخ قطب الدین ابن ملقن کے محبوب ترین شیخ ہیں۔ ابن ملقن نے اپنی کتاب "العقد المذہب" میں کثرت سے ان کی تاریخ مصر کا حوالہ ٹھیک انہی الفاظ میں دیا ہے۔

۲۔ بہت سے تراجم میں مصنف کی یہ عبارت ملتی ہے: "ذکرتہ فی طبقات الفقہاء" اور ہمیں معلوم ہے کہ ابن ملقن کی ایک کتاب "طبقات الفقہاء" پر مشتمل ہے جو کہ العقد المذہب کے نام سے موسوم ہے، بلکہ بودلین لائبریری، آکسفورڈ کے مخطوطہ کے ٹائیٹل پیج پر طبقات الفقہاء ہی درج ہے۔

۳۔ شیخ عبدالکریم بن ہوازن قشیری متوفی ۴۶۵ھ کے ترجمہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ میں نے ان کے دونوں بھائیوں کا تذکرہ طبقات الفقہاء میں کیا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے: "ذکرت أخویہ فی طبقات الفقہاء"۔ طبقات الفقہاء دیکھنے پر معلوم ہوا کہ امام قشیری کے دونوں بھائیوں کے علاوہ ان کے چھ لڑکے اور بعض احفاد کے بھی تذکرے مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔

۴۔ کتاب الذیل کے خطبہ کی عبارت سے یہ بات طے پا چکی ہے کہ اصل کتاب ذیل دونوں کے مؤلف ایک ہی شخص ہیں۔ اور ذیل میں شیخ محمد بن کریم دمیری کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ قاہرہ کے مضافات میں اقامت پذیر تھے اور ان کی وفات ۷۸۵ھ میں ہوئی ہے، ان کے بعد شیخ شہاب فرموی کے تذکرہ پر ذیل ختم ہو جاتا ہے جو کہ ذیل کی تالیف کے وقت حیات تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کم از کم ذیل کی تالیف ۷۸۵ھ اور ۷۸۷ھ کے درمیانی عرصہ میں ہوئی۔ ہے اور آٹھویں صدی ✓

نصف آخر ہی ابن ملقن کی کثرت تالیف کا زمانہ ہے ۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن ملقن کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ طبقات الفقہاء کی تالیف کی ابتداء ۷۵۳ھ میں ہوئی اور اس کی تکمیل ۷۶۲ھ میں ہوئی، مگر تکمیل کے بعد بھی اس میں حذف و اضافہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ پھر بعد میں اس کا بھی کتاب الذیل ابن ملقن نے تیار کیا۔ مکتبہ خلیل العد المدراسی حیدرآباد میں اس کا قدیم ترین مخطوطہ محفوظ ہے جس کی کتابت ۷۷۷ھ میں کی گئی ہے۔ اس کا ٹائیٹل پیج مؤلف کے قلم سے تحریر کردہ ہے۔ اس نسخہ میں اصل کتاب کے آخری حصہ میں مولف نے اپنی تالیفات میں شمار کرایا ہے جن میں طبقات الصوفیاء کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس لئے دونوں کتابوں کے درمیان مطابقت کی چند صورتیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ طبقات الفقہاء اور طبقات الصوفیاء دونوں ایک ساتھ تالیف کی گئیں اور طویل عرصہ کے بعد کتاب الذیل تیار کیا گیا۔ یا دونوں یکے بعد دیگرے تالیف کی گئیں مگر ذیل میں حذف و اضافہ ۸۰۰ھ تک جاری رہا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ طبقات الصوفیاء دوسری کتاب ہے اور زیر بحث کتاب طبقات الاولیاء ہے جیسا کہ کشف الظنون سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ملقن کی اس فن میں دو کتابیں ہیں۔ ایک طبقات الصوفیاء اور دوسری طبقات الاولیاء۔ صاحب اعلام خیر الدین زرکلی نے بھی طبقات الاولیاء ہی کا نام ذکر کیا ہے اور ابن ملقن کی عادت بھی یہی ہے کہ ایک فن میں مطول و مختصر کئی کئی باتیں تحریر کرتے ہیں ۔

"اسلام کا نظامِ عدل ... ایک جائزہ"

محمد سعید الرحمان شمس ـ مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر ـ

اسلام کوئی نیا مذہب اور دین نہیں ہے بلکہ اس الہٰی مشن اور پیغام و دعوت کی آخری حتمی اور تکمیلی شکل ہے جسے جملہ انبیائے کرام اپنے اپنے وقت اور دور میں چلاتے اور عروج بخشتے رہے ـ جس کی ابتدا سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی حضرت آدمؑ جہاں پہلے انسان تھے وہاں پہلے رسول بھی تھے' اس کے بعد حضرت عیسٰی مسیحؑ تک مسلسل خدا کے پیغمبر آتے رہے ـ حضرت ابو امامہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ سیدنا حضرت ابوذر غفاریؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مبعوث انبیائے کرامؑ کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار ان میں تین سو پندرہ رسول ہوئے ـ

(بحوالہ مسند احمد و ابن حبان)

خدا کے ان برگزیدہ بندوں اور منتخب نمائندوں نے مختلف قوموں اور آبادیوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا اور خدا سے ڈر کر مستعار زندگی گذارنے کی تلقین کی رسالت و نبوت کی تکمیل پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات سے کی گئی ـ آپؐ جملہ انبیاء و رسل کے خاتم تھے جب کہ دوسرے حضرات صرف نبی اور رسول تھے اور آپؐ پیغمبر ہونے کے ساتھ خاتم النبین بھی

اسی طرح آپ کی ورسالت کے ساتھ دینِ الٰہی کی ہر ہر پہلو اور جہت سے تکمیل ہو گئی۔ قرآن مجید میں ارشاد ربّانی ہے:۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔" (المائدہ ۵)	یعنی آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمت (تم پر) تمام کردی اور اسلام کے دین ہونے کی حیثیت سے تم سے راضی ہو گئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ببانگ دہل یہ بھی اعلان فرمادیا گیا کہ ۔

"ان الدین عند اللہ الاسلام ومن تبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل"	بلاشبہ اسلام ہی حضرت حق جل مجدہ کے نزدیک پسندیدہ (مذہب) اور دین ہے اور جو کوئی اسکے علاوہ دوسرا مذہب تلاش کرے وہ ہرگز قابل قبول نہیں۔

خود ایک حدیث پاک کے اندر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔
"میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا ہوں۔ بلکہ تم کو ایسی چیز کی طرف بلانے آیا ہوں جس کی تعلیم انبیائے سابقین نے دی ہے۔ میں ان تمام رسولوں کی عزت اور ان کا احترام کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مامور تھے، میں ان سب کی توثیق وتصدیق کرتا ہوں"۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث مبارکہ اور قرآنی آیات میں اس حقیقت کی ترجمانی اور وضاحت کی گئی ہے یہاں تک کہ ایمان کی بنیاد جن چھ چیزوں پر ہے ان میں ایک اہم بنیاد تمام انبیائے سابقین پر اجمالی ایمان بھی ہے۔

اسلام نام کا مذہب کوئی ایسا مذہب اور ایسا عقیدہ نہیں ہے جس کی ابتداء اور آغاز کا کوئی احساس یا سوں یا زمانہ شمار کیا جاسکتا ہو۔ بلکہ مذہب اسلام وہ مذہب ہے

جس کی عمر ٹھیک اتنی ہی کہی جاسکتی ہے جتنی ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک بنی آدمؑ اور اولادِ آدم کی بنتی ہے، مذہب اسلام نے جو اپنے متبعین اور پیروں کاروں کو تعلیم دی ہے وہ آفاقی اور عالمگیر ہونے کے ساتھ ساتھ تمام نوعِ انسانی (HUMAN BEING) کی ہدایت اور رہبری کے لیے بھیجے جانیوالے خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ بندوں پر ان کی تعلیم پر ایمان لانے سے شروع ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمام انبیاء و مرسلین کے اسمائے گرامی قرآن مجید میں بالترتیب بیان فرمانے لگتے تو بے شبہ اس پر پوری طرح قادر تھے لیکن یہ چیز لاحاصل تھی۔ اور سوچئے! اس طرح پر قرآن مجید کی ضخامت اور حجم کس قدر بڑھ جاتا ہے لیکن حکیم مطلق نے نہایت ہی مختصر مگر جامع اور مانع طریقۂ بیان اختیار فرمایا۔ کہ پوری انسانی دنیا ایمان و عقیدہ کے اعلان کرتے وقت اس بات کا صدق دل سے اقرار کرے کہ ہم تمام انبیاء علیہ السلام اور ان کی ربانی تعلیمات پر ایمان لاتے ہیں۔

اسلام روئے ارض پر بھی وہ واحد مذہب ہے جو اپنے وسیع تر دامن میں انسانیت کی صلاح و فلاح کے لیے ایک مکمل نظام حیات، نظامِ زندگی اور مقصدِ حیات رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے متنوع اور مختلف گوشوں اور شعبوں میں اسلامی تعلیمات و ہدایات کی تکمیلی حیثیت سے صرف نظر کرتے ہوئے ہمیں درج ذیل مقالہ میں "اسلام کے نظام عدل" پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اسلام نے اس سلسلہ میں کیا کچھ ہدایات دی ہیں اور کون سے اصول وضع کئے ہیں جس سے انسانیت کے درد کا مداوا اور زخم کا مرہم بن سکے۔

اسلامی اور مغربی نظام عدل کا تقابل

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو متضاد قوموں کا حامل بنایا ہے۔ ایک وصف اس

میں ملکوتیت کا پایا جانا ہے جو اسے اچھے اخلاق و کردار کی طرف مائل کرتا ہے اور اس میں نیکی اور پرہیزگاری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ دوسرا وصف بہیمیت ہے جو انسان کو ظلم و جور، لوٹ مار، قتل و غارت، حرص و ہوس اور نفسانی و شیطانی خواہشات کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ چونکہ نفسانی خواہشات میں تلذذ اور رنگینی ہوتی ہے لہٰذا اکثر انسان بغیر سوچے سمجھے اور نتائج و ثمرات سے بے پرواہ ہوکر خواہشات کی وادی میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ انسانی معاشرہ کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنانے اور لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو تحفظ دینے کے لیے دو قسم کے نظام رائج ہیں۔ ایک نظام تو وہ ہے جو انسانی ذہن و فکر کا ساختہ اور پرداختہ ہے جسے ہر ملک کے معاشرے اور موجودہ حالات نے اپنی خواہشات اور جذبات کو مدنظر رکھ کر تیار کیا ہے اور اس کے ذریعے اس ملک کے افراد اپنے معاشرے میں عدل کا نظام قائم رکھتے ہیں۔ دوسرا نظام ہے جسے انسانوں کے خالق و مالک نے اپنے بندوں کی حاجت و ضرورت، اس کی کمزوریوں، خامیوں، خوبیوں اور خرابیوں کو مدِنظر رکھ کر تیار کیا اور اپنے منتخب بندوں اور نمائندوں (انبیاء و رسل) کے ذریعے عالم انسانیت تک پہونچایا ہے۔ یہ نظام سرور کونین حضرت اقدس محمد الرسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ذریعے اور طفیل میں تکمیل پذیر ہوا۔ "اسلامی نظام عدل" اور مغرب کے نظام عدل میں یہی بنیادی فرق ہے کہ یہ انسانوں کا تیار کردہ ہے اس لیے اس میں وہ تمام کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں جو ایک انسان میں عموماً ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً اس نظام میں مملکت کا سربراہ یا اس کے حاشیہ نشین ہر قسم کی مسئولیت اور (IMPEACHMENT) سے مامون ہوتے ہیں۔ مظلوم عوام کا ہاتھ ان کے گریبان تک تو کیا ان کے دامن تک نہیں پہونچ سکتا۔ کیونکہ قانون سازی کرتے وقت وہ اپنے تحفظ کا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی نظام عدل میں مساوات اور برابری ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں بحیثیت بندہ

تمام بندے برابر اور مساوی ہیں۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ اس واقعہ سے لگائیے کہ "ایک مرتبہ رحمۃ اللعالمین جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی چھڑی سے ایک صحابیؓ کو ہلکی سی خراش آجاتی ہے اور وہ اپنی تکلیف کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ذاتِ پاک جس کی خاک پاک مُلک و ملکوت کے لیے سرچشمہ تھی۔ اپنی پشتِ مبارک کھول کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور صحابی کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا بدلہ لو۔"!

کیونکہ مغربی نظامِ عدل انسانوں کا بنایا ہوا ہے اس لیے نہ اس کو استقرار حاصل ہے اور نہ دوام، آج ایک قانون پاس ہوتا ہے اور کل جب دوسری پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے تو وہ قانون اس کے مفادات کے منافی ہوتا ہے تو فوراً اسے (AMEND) کر دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے یوں کہیے کہ مغرب کا نظامِ عدل عوام کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ حکمراں ٹولے کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے اس کے برخلاف اسلام کے عدل پر نہ تو حکومتوں کی تبدیلی کا اثر پڑتا ہے اور نہ زمانہ کے انقلابات و حوادث کا۔ رب العالمین کا واضح ارشاد ہے۔

"لا تبدیل لکلمات اللہ" (یونس) — اللہ تعالیٰ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی معاشرہ قیامت تک کن کن مسائل سے دوچار ہوگا۔ اور ان کا حل کیا ہے؟ اس لیے اس نے نازل کردہ کتاب اور اپنے پاک رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ میں ان تمام مسائل کا حل رکھ دیا ہے۔

ایک نکتہ

اس سلسلہ میں ایک نکتہ اور بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ چونکہ مغرب

کا نظام عدل انسان کا بنایا ہوا ہے اس لئے وہ انسانی خواہشات کے تابع ہے۔
اور اسلامی نظام عدل چونکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اس لیے وہ انسانی خواہشات
پر کنٹرول کرتا ہے۔

اسلامی نظام عدل میں حاکم اور محکوم دونوں کے دل میں یہ بات راسخ کی جاتی
ہے کہ وہ دونوں ایسے سمیع و بصیر اور علیم و منتقم اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہیں جو
عالم الغیب والشہادہ ہے جو بندوں کی نیت و ارادہ سے واقف ہے اور جس کی
آنکھیں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے بندوں کے اعمال سے غافل نہیں۔ یہی جوابدہی
کا یہ احساس اور تصور بندوں کے دل میں خوف و خشیت کو جنم دیتا ہے اور وہ
ایسے اعمال کے ارتکاب سے پرہیز کرتے ہیں جن کے ارتکاب سے اسلامی شریعت
نے منع کیا ہے اس کے باعث جرائم کے ارتکاب کی شرح کم سے کم ہو جاتی ہے۔

تاریخ اسلام کا یہ [illegible] اور سچا واقعہ سننے کے لائق ہے۔
لڑکی کو جب اس کی ماں نے دودھ میں پانی ملانے کے لیے کہا تو لڑکی نے پانی
سے انکار کر دیا جب ماں نے جواب طلبی کی تو اس نے کہا کہ خلیفۃ المسلمین
عمرؓ فاروق نے دودھ میں پانی ملانے سے منع کیا ہے
ماں نے کہا کیا اس وقت عمرؓ دیکھ رہے ہیں؟ کہ تو دودھ میں پانی ملا رہی
لڑکی نے برجستہ جواب دیا۔ ماں یہ سچ ہے کہ عمرؓ نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن
رب تو دیکھ رہا ہے۔ بچی کی بات سن کر ماں لاجواب ہو گئی۔
ماں کو یہ بات معلوم نہیں تھی اس کے مکان کے دروازے سے لگے ہوئے حضرت
عمرؓ ماں بیٹی کے مکالمے کو سن رہے تھے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ سیدنا حضرت
عمرؓ بچی کا جواب اس قدر پسند آیا کہ آپ نے بعد میں اس لڑکی کو اپنی بہو
بنا لیا۔ غور کیا جائے مسئولیت کا یہ خوف اور شدید احساس اس مغربی نظام عدل

میں کہاں سے آسکتا ہے ؟ محافظ پولیس کا ایک سپاہی ہوتا ہے جو اپنی پیٹھ کے پیچھے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جسے رشوت کے ذریعے رام بھی کیا جا سکتا ہے۔ جسے دھوکہ اور فریب بھی دیا جا سکتا ہے۔ اور جسے ضرورت پڑنے پر جرائم پیشہ افراد قتل بھی کر دیتے ہیں۔

ایک اور بنیادی فرق

اسلامی اور مغربی نظام عدل میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اسلامی شریعت نے مسلم معاشرے کی بنیاد اخلاقِ فاضلہ پر رکھی ہے اس لیے اس بات کا مختلف طریقوں سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ ملت میں اخلاقِ فاضلہ پیدا ہوں اور اگر کوئی فعل اخلاقِ فاضلہ کے خلاف دیکھا جاتا ہے تو اس پر سزا دی جاتی ہے۔ لیکن مغربی نظامِ عدل میں اخلاق فاضلہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ البتہ اگر کسی فرد کا کوئی عمل سوسائٹی کے دیگر افراد کے لیے مضر ہو یا اس کے امن عامہ میں خلل پڑنے کا امکان ہو۔ یا حکومت کے انتظامی امور میں دشواری پیدا کرنے والا ہو تو مغربی قانون حرکت میں آجاتا ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر ایک مرد اور عورت باہمی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کریں یا کوئی شخص گھر میں یا بار میں بیٹھ کر شراب پیئے یا کلب میں جا کر جوا کھیلے تو مغرب کا نظام عدل اس سے کوئی تعرض نہیں کریگا۔ اس لیے کہ اس نظام میں فرد کے اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے زنا بالجبر کرے۔ یا شراب پی کر شارع عام پر غل غپاڑہ مچائے۔ جس سے لوگوں کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہو۔ یا نشہ کی حالت میں موٹر چلائے یا جس سے کسی کے کچل جانے کا اندیشہ ہو تو فوراً مغربی قانون حرکت میں آجائے گا۔

اسلامی نظام عدل میں یہ بات نہیں ہے۔ اسلامی شریعت سب سے زیادہ زور لوگوں کے اخلاق سنوارنے اور ایک صالح معاشرہ کی تشکیل [illegible]

سب سے فساد کی جڑ اخلاق کی تباہی ہے۔ اگر لوگوں کے کردار بہتر ہو جائیں تو بغیر کسی تادیبی کارروائی کے جرائم خودبخود کم یا ختم ہو جاتے ہیں۔ مغربی نظام عدل چونکہ تعمیر کردار پر زور نہیں دیتا اس لیے باوجود تمام تر کوششوں اور پروپیگنڈوں کے، جرائم کی شرح میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، مغربی نظام عدل کا ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے۔ عدالتوں کے چکر کا یہ عالم ہے کہ معمولی قسم کے فیصلے میں تین تین اور چار چار سال لگ جاتے ہیں اس کے بعد اپیلوں کا چکر چلتا ہے جس میں اتنی دشواریاں ہیں کہ مظلوم کی داد رسی تو درکنار وہ خود کو عذاب میں گرفتار سمجھنے لگتا ہے۔ دیوانی معاملات کی طوالت کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ ایک ایک مقدمہ کے فیصلہ میں چودہ اور پندرہ سال کی مدت لگ جانا تو معمولی سی بات ہے۔ اور بسا اوقات حصول انصاف کے لیے صبر ایوبؑ اور عمر نوحؑ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کے نظام عدل میں بڑے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمہ کا فیصلہ دو چار دنوں میں ہو جاتا ہے اور "حقیقی عدل" کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ "انصاف کی تاخیر بھی اپنی جگہ پر خود بہت بڑی بے انصافی ہے"۔

اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں دراصل عدل و انصاف ہی ایک ایسا معیار اور ہتھیار ہے جس سے انسانیت کے جائز، جمہوری اور بنیادی حقوق کی حفاظت ممکن ہے۔ چھوٹے بڑے کے مفادات کی نگہداشت اور تحفظ ہوتا ہے اور حق بحق دار رسید والا معاملہ سامنے آتا ہے تو پورا انسانی سماج اور معاشرہ سکھ چین، اطمینان و سکون، لطف و کرم، امن و آشتی، بھائی چارہ، وسیع النظری، مساوات اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن جاتا ہے اور دنیا حقیقی سکون اور اطمینان کی سانس لے سکتی ہے یہ دور بدقسمتی ہے جس سے ہم گذر رہے ہیں ہمیں فعال فکر

عدل کا بحران دوسرا ہے اور جس کے مہلک اثرات سے پوری انسانی آبادی متاثر نظر آتی ہے۔ دوسری اقوام و مذاہب کی بات تو ہم نہیں کرتے، اور نہ فی الحقیقت ہم لوگ ابھی ہم عالمی سطح پر اس پوزیشن میں ہیں۔ البتہ "ملّت اسلامیہ" اور "امت مرحومہ" کے تعلق سے اتنا عرض کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اگر یہ موجودہ خطرناک سماجی ناانصافی اور حق تلفی و استحصال جیسے اجتماعی امراض کے علاج کی متلاشی ہے تو بے شک اسے پوری مضبوطی سے اسلام کے ہی درخشاں نظریہ عدل و انصاف کے پاکیزہ، ستھرے، سچا، پختہ، انمٹ اور راسخ، ذہن و دماغ کو اپیل کرنے والے اصول و مبادیات اپنانے ہوں گے جس کا سلسلہ محض اس دنیا میں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کا ربط اور سلسلہ آخرت کی دائمی زندگی تک متواتر رہتا ہے۔ جی ہاں "عدل و انصاف" کو یقینی بنانا جس کا حکم بارگاہِ ایزدی سے نازل ہوا ہے بڑا ہی نازک اور فرض شناسی چاہتا ہے۔ اسی لیے بتایا گیا ہے کہ "جسے کرسیٔ عدل پہ بٹھا دیا گیا گویا ذمہ داری کی شدت کے پیشِ نظر اسے کند چھری سے ذبح کر دیا گیا" اور جس نے خوف خدا اور محض حضرت حق جل مجدہ سے ڈر کر حق و انصاف کے مطابق پوری دیانت داری کے ساتھ فیصلہ دیا۔ وہ قیامت کے دن نور کے منبر پر بٹھا دیا جائے گا۔ نیز ایک حدیث پاک کے اندر رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میدان محشر میں جب کہ نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور ہر فرد و بشر اپنی جگہ حیران و پریشان ہوگا۔ جن سات قسم کے خوش بختوں اور سعادت مندوں کو "عرش خداوندی" کے زیرِ سایہ جگہ ملے گی۔ ان میں سرفہرست "الامام العادل" ہوگا۔ وہ انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا اپنے ظالمانہ فیصلہ سے اپنے لیے دوزخ خرید لیتا ہے اور منصفانہ فیصلہ سے جنّت کا مستحق اور حقدار بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ظالم و جابر نظام حکومت کے تحت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہؒ نے قصر عدالت کے

کے بجائے پابہ سلاسل ہونا، جیل کی تاریک کوٹھری میں بیٹھنا اور شاہانہ طمطراق اور کروفر کے بجائے اپنی پیٹھ پر مسلسل کوڑے کھانا پسند فرمایا لیکن عہدۂ قضا اور منصب عمل کو قبول فرمانے سے گریز کرتے رہے۔

قرآن مجید کے اندر رب العالمین کا بے غبار ارشاد ہے۔

"ان اللہ یامر بالعدل والاحسان" بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ (النحل)

آیت بالا کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا رقمطراز ہیں۔

قرآن مجید کو "تبیاناً لکل شیئ" فرمایا گیا۔ یہ آیت اس کا ایک نمونہ ہے حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "خدائے تعالیٰ نے ہر ایک خیر و شر کے بیان کو اس آیت میں اکٹھا کر دیا ہے گویا کوئی عقیدہ، خلق، نیت، عمل، معاملہ اچھا یا برا ایسا نہیں جو امراً ونہیاً اس کے تحت میں داخل نہ ہو گیا ہو" بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر قرآن میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو تنہا یہی آیت "تبیاناً لکل شیئ" کا ثبوت دینے کے لیے کافی تھی۔ شاید اسی لیے خلیفہ راشد حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں اس کو درج کر کے امت کے لیے اسوۂ حسنہ قائم کر دیا۔ اس آیت کی جامعیت سمجھانے کے لیے تو ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے تاہم تھوڑا سا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آیت میں تین چیزوں کا امر فرمایا ہے، عدل، احسان، اور ایتاء ذی القربیٰ "عدل" کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال و انصاف کے ترازو میں تلے ہوں۔ افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے

نہ جھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جو بات اپنے لیے پسند کرتا ہو وہ دوسروں کے لیے پسند نہ کرے۔

"احسان" کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل و عفو، اور تلطف و ترحم کی خو اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوع اور تبرع کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا۔ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اُدھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی سے ملے گا۔

"الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"

(صحیح بخاری)

"ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" (القرآن)

یہ دونوں خصلتیں (عدل و احسان یا بالفاظِ دیگر انصاف و مروت) تو اپنے نفس اور ہر ایک خویش و بیگانہ اور دوست و دشمن سے متعلق ہیں، لیکن اقارب کا حق و لجابت سے کچھ زائد ہے" الخ۔ (بحوالہ ترجمہ شیخ الہندؒ)

بہرحال اپنے تو اپنے غیروں اور دشمنوں کے بارے میں حضرت حق جل مجدہٗ، شریعت مصطفیٰؐ اور اسلام کے نظام عدل کو یہ گوارہ نہیں کہ ان کے ساتھ فیصلہ کرتے وقت کہیں ان کی دشمنی اور جذبۂ انتقام آڑے نہ آجائے۔ ارشاد فرمایا گیا:۔

"ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ خبیر بما تعملون"	اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ کے اور اللہ سے ڈرتے

رہو اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔
(ترجمہ شیخ الہند)

(المائدہ)

مذکورہ آیت کی شرح میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم فرماتے
ہیں۔ "عدل" کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے
وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور
برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے
دونوں پلڑوں میں سے کسی پلہ کو جھکا نہ سکے"۔

آگے فرماتے ہیں :-

جو چیزیں شرعاً مہلک یا کسی درجے میں مضر ہیں ان سے بچاؤ کرتے رہنے
سے جو ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اس کا نام
"تقویٰ" ہے۔ تحصیل تقویٰ کے اسباب ... و مجیدہ بہت سے ہیں تمام اعمال
حسنہ اور ... خیر کو اس کے اسباب و ... میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن معلوم
ہوتا ہے کہ "عدل و ..." یعنی دوست و دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا
اور حق کے معاملے میں جذبات محبت و عداوت سے قطعی مغلوب نہ ہونا یہ
خصلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے اس لئے
... " فرمایا (یعنی یہ عدل جس کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک
... ہے) کہ اس کی فرادات کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہو جاتی
ہے ... لکھتے ہیں یعنی ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی یا دشمنی نہ روک
سکے ... اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بننا سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے
حصول کا واحد ذریعہ خدا کا خوف اور اس کی شانِ انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف
ان اللہ ... تعملون کے مضمون کے بار بار مراقبہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

جب کسی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں تو اس کا قلب خشیتِ الٰہی سے لرزنے لگے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں "عدل وانصاف" کا راستہ اختیار کرے گا اور احکام الٰہیہ کے امتثال کے لیے غلامانہ تیار رہے گا۔ پر اس کے نتیجہ پر ثمرہ ملے گا جسے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔"

(بحوالہ ترجمہ شیخ الہندؒ)

پیش کردہ آیاتِ بالا اور مختصر تشریح اور تفسیری نوٹ سے ہر صاحبِ نظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام نے عدل انصاف کی ہر فرد بشر کے ساتھ کس قدر شدت کے ساتھ تاکید کی ہے اور ذمہ دار حضرات کے سامنے واضح اور بے لاگ اصول بیان کر دیئے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی جو عدل وانصاف، اور حریت و مساوات کی جیتی جاگتی تصویر اور شفاف آئینہ ہے۔ آپؐ نے خود اپنا بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ :۔

" امرنی ربی بتسع خشیتہ فی السر والعلانیہ، وکلمۃ العدل فی الغضب والرضی۔ الخ (الحدیث بحوالہ رزینؒ)	میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا ہوں اور غصے میں ہوں یا خوشی میں ہر حال میں انصاف کی بات کہوں۔

معتبر ترین روایات احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مخزومی خاندان کے متمول گھرانے کی ایک عورت نے کسی کے کنگن چرا لیے، پکڑی گئی، مقدمہ دربار رسالتؐ میں پیش ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قوانین کے پیش نظر مجرمہ کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا کچھ لوگوں

کو ڈانٹ کر اللہ عزت بخشی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصفانہ فیصلہ پر تامل ہوا۔ چنانچہ لوگوں نے حضرت اسامہؓ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (زید ابن حارثہ حِب کے منہ بولے بیٹے) کے تعلق سے بیحد چہیتے اور محبوب تھے خدمت اقدس میں سفارشی بنا کر پیش کیا کہ "فاطمہ معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لے معاملہ رفع دفع کر کے صرفِ نظر کر لیا جائے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ صورت حال ملاحظہ فرمائی تو غصہ سے چہرۂ انور سرخ ہو گیا اور ... ارشاد کیا کہ پہلے کے لوگ اسی بنیاد پر ہلاک کر دیئے گئے کہ جب ان میں سے کوئی کمزور (مالی اور سماجی اعتبار سے) اور غریب غلط کام کرتا تو اُسے فوری سزا دی جاتی اور اگر کوئی معزز یا طاقت ور ایسا کرتا تو اسے نظر انداز کر دیتے۔ خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی اور جگر کا ٹکڑا فاطمہ زہراؓ سے بھی یہ حرکت سرزد ہوتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔ اور اسلامی حدؔ جاری کر کے "عدل وانصاف" کو قائم کرتا۔ اس کے بعد پھر دوبارہ کسی صحابیٔ جلیل کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اللہ و رسول کے معاملہ میں دخل اندازی کریں۔ تفصیلات کے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔

اسلام کے نظام عدل کے تعلق سے مستند علماء کی وقیع تصانیف موجود ہیں اور سیر و تواریخ میں سینکڑوں ایسے معاملات اور مثال ملتی ہیں جو موجودہ ظلم و بربریت، ناانصافی، اور حقوق تلفی کی دنیا میں مشعلِ راہ کی حیثیت اور اہم خطوط کا درجہ رکھتی ہے۔ تاہم اپنے موقف کے اثبات اور اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر بطور نمونہ مشتے از خروارے چند ایک معتبر واقعات و حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا سانحہ پیش آنے کے بعد بالاتفاق جمہور اجلۂ صحابہ کرامؓ خلافت و قیادت کی ذمہ داری سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی

اللہ عنہ کو سونپی گئی۔ بیعت عام کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے منبر پر بیٹھ کر جو پہلا خطبہ دیا اور اپنے آئندہ طرز عمل اور پالیسی کی توضیح فرمائی اس میں ایک تاریخی جملہ یہ بھی فرمایا کہ "انشاء اللہ" تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلا دوں۔ انشاء اللہ اور تمہارا اقوی فرد بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق دلا دوں" (بحوالہ طبقات ابن سعد)

خلیفہ ثانی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کی خلافت و امارت کی کی پوری عدل و انصاف، مساوات و برابری، ہمدردی و بہی خواہی، درد مندی اور دل سوزی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

جبلہ بن الایہم کا واقعہ یاد کرنے کے لائق ہے جو امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضؓ کے ہمراہ مناسک حج ادا کر رہا تھا، حالت طواف میں جبلہ کا تہبند جو تمازت اور شوکت کے سبب زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ قبیلہ فزارہ کے ایک شخص کا پیر غلطی سے پڑ گیا۔ جبلہ کو غصہ آگیا اور اس نے زور [illegible] ایک تھپڑ رسید کیا کہ اس شخص کے دانت ٹوٹ گئے۔

مقدمہ خلافت کی عدالت میں پہونچا۔ حضرت عمرؓ نے جبلہ سے فرمایا کہ یا تو تم مدعی کو رضامند کرو ورنہ قصاص لیا جائے گا۔ جبلہ کو یہ خلاف توقع فیصلہ سخت ناگوار گذرا، اس نے کہا کہ ایک معمولی شخص کے عوض مجھ سے قصاص لیا جائے گا میں اپنی جگہ کا بادشاہ اور اہم آدمی ہوں اور وہ عام رعیت کا ایک فرد۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اسلام نے تم کو اور اس رعیت کو اپنے احکام کے معاملے میں مساوی کر دیا ہے۔ اگر کسی کو کسی پر فضیلت ہے تو محض اعمال صالح اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے"

(... الاسلام کی اشاعت صفحہ ۲۱)

رعایت نہیں فرمائی۔ اور دنیا کو بتلا دیا کہ "اسلام کا نظامِ عدل" کیا ہے؟ اور دینے پرانے کے فیصلے سے نازک وقت میں کس طرح عہدہ برآ ہونا ہے اور اس وقت اسلام کا مطالبہ کیا ہے؟

تاریخی حوالے سے یہ بات ثابت ہے کہ خلیفہ اعظمؓ کے صاحبزادے فرزندِ ارجمند نے مصر کے اندر شراب پی لی تھی۔ مصر کے گورنر نے یہ سمجھ کر خلیفۂ وقت کے صاحبزادے سے لغزش ہو گئی ہے تنہائی میں کمرہ کے اندر بلوا کر اسلامی حدود کی روشنی میں ہلکی سزا دے دی اور مطمئن ہو گئے۔

شدہ شدہ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی، فوراً فرمان جاری کیا اور تحریر فرمایا کہ "تم نے محض یہ جان کر کہ خلیفۂ وقت کا بیٹا ہے۔ اسلامی سزا میں مداہنت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مجرم کو یہاں بھیجا جائے تاکہ میں خود اپنی نگرانی میں شرب خمر کی سزا دوں۔ اور تم کو بھی اپنے عہدے سے محض اس بنیاد پر معزول کیا جاتا ہے کہ اسلامی عدل کے مظاہرہ اور حد جاری کرنے میں نرم گوشہ کیوں اختیار کیا؟" صاحبزادہ یوں ہی مصر سے مدینہ آیا فوراً سزا کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سفارش کی کہ صاحبزادہ کی طبیعت کچھ علیل ہے اور پھر ایک حد تک سزا مل بھی چکی ہے۔ بہتر ہوگا چند دن تاخیر کیا جائے۔ فرمایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، زندگی کا کیا بھروسہ۔ ممکن ہے اسی حال میں میری موت آ جائے! اور میں حدود اللہ کو جاری کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں چلا جاؤں!

بالآخر مجرم صاحب زادے فرزندِ ارجمند کو شرعی سزا دی گئی اور بغیر کسی رعایت کے نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبزادے کے مرض میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور پھر جانبر نہ ہو سکے قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

[illegible] متمدن سے متمدن تاریخ کی بھی "عدل و انصاف" کی یہ [illegible]

کرسکتی ہے ؟ داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ العزیز خلافت وسیادت ہے۔ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہو گئی، جو ایک یہودی کے ہاں پکڑی گئی، قاضی وقت حضرت شریحؒ (جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ سے ہی عہدۂ قضا پر فائز چلے آرہے تھے) مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت قاضی نے فریقین کے نام سمن جاری کر دیا۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک طرف ادنیٰ یہودی ہے (جس کا کوئی مذہب نہیں) اور دوسری طرف خلیفۃ الاسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قدسی الاصل اور پاکیزہ شخصیت گرامی ہے مگر چونکہ عدل وانصاف کا معاملہ ہے۔ اس لیے عدالت میں حاضری ناگزیر اور ضروری ہے قاضی عدالت نے کرسی پر بیٹھ کر حضرت علیؓ سے اپنے دعوے پر گواہ طلب فرمایا آپؓ نے اپنے بیٹے حضرت حسنؓ اور غلام ( ) کو شہادت میں پیش کیا۔ قاضیؒ نے گواہوں کی پوزیشن دیکھ کر فرمایا کہ میرے نزدیک باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی معتبر نہیں ہے کوئی دوسرا گواہ پیش کیجئے۔

خلیفہ وقت نے یہ سن کر فرمایا کہ دوسرا گواہ تو اور کوئی نہیں ہے۔ البتہ میرے نزدیک بیٹے کی گواہی باپ کے حق قابل اعتبار ہے!۔

قارئین کرام سوچتے ہوں گے ؟ کہ خلیفہ وقت کے حق قاضی نے یہ سن کر فیصلہ دے دیا ہوگا اگر کیسے سمجھایا جائے کہ یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ کہ قاضی نے دوسرا ہی فیصلہ صادر فرمایا۔ مقدمہ خارج اور فیصلہ یہودی کے حق میں یہودی نے جب "عدل وانصاف" کا یہ اسلامی رنگ دیکھا تو انسانی فطرت صحیحہ کے خلاف اور بات ناممکن ہوتی کہ وہ متاثر نہ ہوتا۔ اس بے مثال واقعہ، اس کی زندگی کی کایا ہی پلٹ دی۔ فوراً اپنے جرم کا اعتراف کر کے اسلام کی غلامی کا طوق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اور گواہی دی کہ بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کی خوشنودی اور رسول برحق ہیں اور دین اسلام کی تعلیمات ہر لحاظ سے تسلی بخش اور فطرتِ انسانی کے ہم آہنگ ہیں۔ دو گروہوں یا دو آدمیوں میں جب کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو اکثر ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر اپنے مفاد پر ہوتی ہے جس جس میں بظاہر فائدہ نظر آئے آدمی اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی یہ ہے کہ "معاملہ" کو حق اور ناحق، انصاف اور بے انصافی اور عدل و ظلم کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ اور جو طریق کار بھی عدل و انصاف کے مطابق ہو اختیار کیا جائے اور جو طریقہ بھی عدل اور حق کے خلاف ہو چھوڑ دیا جائے۔

پوری اسلامی تاریخ الحمدللہ حق و انصاف اور عدل و مساوات کی داستان سے لبریز ہے اور زبانِ حال سے ملک و قوم، اور نوع انسانی کو دعوتِ فکر، دعوتِ عمل اور دعوتِ عدل دے رہی ہے۔

آخر میں ہندوستان کی آزادی کے ممتاز رہنما "گاندھی جی" کا وہ حقیقت افروز تبصرہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو موصوف نے دہلی کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ رام لیلا گراونڈ (RAM LILA GROUND) برسر عام اظہار و اعلان کیا تھا۔ حقیقت ہے "الافضل

بعد میں خود اپنے اخبار "ہریجن" (HARIJAN) بابت ۲۷-۷-۳۷ میں نقل کیا۔ الفاظ ہیں:-

"SIMPLICITY IS NOT THE MONOPOLY OF CONGRES SS IS THE SAME NOT GOING TO MENTION THE NAMES OF RAMA AND KRISHANA, BECAUSE THEY ZERE NOT THE HISTURICAL PERSONALITIES> SAME

(باقی ص ۲۶ پر)

سلسلہ: [illegible]

قرآن کریم میں ترادف

(تیسری قسط)

ڈاکٹر عائشہ عبد الرحمٰن بنت الشاطی ــــ عربی سے ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی

قرآن میں خشوع صرف اللہ کے لیے بیان ہوا ہے، اسے اہلِ ایمان کی صفت یا حال بتایا گیا ہے جو صرف اسی دنیاوی زندگی کے ساتھ خاص ہے۔ ایسا تمام صریح آیات میں ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں:

الاسراء ۱۰۹: إذا يتلى عليهم يخرّون سجدًا ويقولون سبحان ربنا إن كان وعد ربنا لمفعولا، ويخرّون للأذقان يبكون ويزيدهم خشوعا،

المومنون ۲: قد أفلح المؤمنون الذين هم في صلاتهم خاشعون

آل عمران ۱۹۹: خاشعين لله لا يشترون بآيات الله ثمنا قليلا

الانبیاء ۹۰: إنهم كانوا يسارعون في الخيرات، ويدعوننا رغبًا ورهبًا وكانوا لنا خاشعين"

بیانِ قرآنی میں خشوع کی نسبت جہاں مجرمین اور کفار کی طرف کی گئی ہے وہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا صدور ان کی طرف سے آخرت میں ہوگا جس سے ان کو ڈرایا دھمکایا ہے۔ جیسا کہ آیات کے صریح سیاق سے معلوم ہوتا ہے:

الغاشیہ ۲: هل أتاك حديث الغاشية، وجوه يومئذ خاشعة، عاملة ناصبة، تصلى نارا حامية

النازعات ۹: قلوب يومئذ واجفة، أبصارها خاشعة، يقولون أإنا لمردودون في الحافرة، أإذا كنا عظاما نخرة، قالوا تلك إذا كرة خاسرة

المعارج ۴۴: فذرهم يخوضوا ويلعبوا حتى يلاقوا يومهم الذي يوعدون

يوم يخرجون من الأجداث سراعا كأنهم إلى نصب يوفضون، خاشعة أبصار هم ترهقهم ذلة ذلك اليوم الذي كانوا يوعدون

الشوریٰ ۴۲: وترى الظالمين لما رأوا العذاب يقولون هل إلى مرد من سبيل، وتراهم يعرضون عليها خاشعين من الذل

القمر: فتول عنهم يوم يدع الداع إلى شيء نكر، خشعا أبصارهم يخرجون من الأجداث كأنهم جراد منتشر

مجھے نہیں معلوم کہ مفسرین اور اہل بلاغت میں سے کسی کی توجہ اس پہلو کی طرف مبذول ہوئی ہو کہ خشوع کی نسبت دنیا میں اہل ایمان کی طرف ہے اور آخرت میں کافروں، مجرموں اور ظالموں کی طرف۔ میرے خیال میں اس کا بیانی راز یہ ہے کہ کفار کا خشوع اس دن کے آنے کے بعد ہوگا جس سے انھیں ڈرایا جاتا ہے۔ اس دن خوف، ڈر اور ذلت کی وجہ سے ان میں خشوع پیدا ہوگا۔ جبکہ اہل ایمان میں دنیا میں سچے ایمان، تقویٰ اور خشیت الٰہی کی بنا پر خشوع پیدا ہوتا ہے۔

سورۂ حشر کی آیت کے مطابق پہاڑ میں خشوع اس لیے نہیں پیدا ہوا کیونکہ اس پر قرآن نازل نہیں کیا گیا، ورنہ اگر اس پر قرآن نازل کر دیا جاتا تو تم دیکھتے کہ اللہ کی خشیت سے وہ شق ہو جاتا۔ یہ ایک مثال ہے جسے اللہ نے لوگوں کے لیے بیان کیا ہے تاکہ وہ غور کریں۔

جب بے جان و سخت جان پہاڑ اس قرآن کی جلالت کی وجہ سے خشیت الٰہی سے خاشع اور متصدع دکھائی دیتا ہے تو اس انسان کا کیا حال ہونا چاہیے جو حس و ادراک و شعور، قوت تمیز اور سننے اور دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ لیکن انسان پر قرآن نازل ہونے کے باوجود وہ کم ہی اللہ کی خشیت سے خاشع دکھاتی دیتا ہے جبکہ اگر قرآن پہاڑ پر نازل کر دیا جاتا تو وہ بھی حالت خشوع میں ہوتا۔

عقل کے انکار اور دل کی قساوت کی وجہ سے انسان کی نفسانیت کبھی تو
بے حس ہو جاتی ہے اور اس میں تاثیر اور عبرت پذیری کی صلاحیت بالکل مفقود ہو جاتی
ہے حتیٰ کہ اس کا دل پتھر سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ بے حس ہو جاتا ہے:

"وتلك الامثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون" (الحشر-۲۱)

زوج اور امرأة

قرآن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدم و حوا کا قصہ بیان کرتے ہوئے
'زوج' کا لفظ استعمال کرتا ہے [دیکھئے آیات: البقرہ ۳۵، الاعراف ۱۹،
طہٰ ۱۱۷] جبکہ بعض مقامات پر 'امرأة' کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے امرأة العزیز،
امرأة نوح، امرأة لوط، امرأة فرعون۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ میں سے
ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے اس لیے کہ دونوں قرآن میں استعمال ہوئے
ہیں جیسے ہم زوج آدم کی جگہ 'امرأة آدم' اور امرأة العزیز کی جگہ زوجۃ العزیز
کہہ سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کا معجزانہ بیان اس کا انکار کرتا ہے۔

اسی سے ہم پر دلالت کا راز آشکارا ہوتا ہے۔ آدم و حوا جو اس صفحۂ ہستی
پر پہلے دو انسان ہیں۔ ان کے درمیان تعلق کا مناط 'زوجیت' ہے آدم کی بیوی
دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت نہ تھیں۔ بلکہ صرف وہی ان کی بیوی تھیں۔ ان کا
آدم سے تعلق اور وجود کا راز صرف اور صرف زوجیت تھا۔

ہم قرآن میں دونوں الفاظ کے استعمال کے سیاق میں تدبر کرتے ہیں تو
دلالت کا راز آشکارا ہوتا ہے۔ لفظ 'زوج' اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں
مناط 'زوجیت' ہو، حکمت اور مقصد کے اعتبار سے یا قانون اور حکم کے
اعتبار سے۔

زوجیت کی نشانی (سکون، مودت اور رحمت) کے معنی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ومن آیاتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم-۲۱)

"والذین یقولون ربنا ھب لنا من أزواجنا وذریاتنا قرۃ أعین واجعلنا للمتقین اماما" (الفرقان-۷۴)

اسی طرح آخرت میں ملنے والی بیویوں کیلئے "ازواج" کا لفظ آیا ہے، دیکھئے آیات: الواقعہ: ۷، البقرہ: ۲۵، آل عمران: ۱۵، النساء: ۵۷، الزخرف: ۷۰، یٰس: ۵۶

لیکن جب خیانت یا عقیدہ میں اختلاف کی وجہ سے زوجیت کی نشانی سکون، محبت اور رحمت مفقود ہو جائے تو قرآن زوج کے بجائے "امرأۃ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

"امرأۃ العزیز تراود فتاھا عن نفسہ" (یوسف: ۳۰)

"امرأۃ نوح وامرأۃ لوط، کانتا تحت عبدین من عبادنا فخانتاھما فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئا (التحریم)

"امرأۃ لوط" العنکبوت ۳۳، النمل ۵۷، الحجر ۶۰، الذاریات ۸۱، الاعراف ۸۳

"امرأۃ فرعون" التحریم — ۱۱

فرعون کی بیوی کیلئے "امرأۃ" کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ دونوں کے درمیان زوجیت کی نشانی مفقود تھی اس لیے کہ وہ مومن تھی اور فرعون کافر۔

انسان اور دوسری جاندار مخلوقات (حیوانات و نباتات) میں زوجیت کی حکمت توالد و تناسل ہے۔ اسی سیاق میں مندرجہ ذیل آیات میں "زوج"،

زوجین اور ازواج کے الفاظ مذکر و مونث کیلئے استعمال ہوئے ہیں:
النساء - ۱' هود - ۴۰' الشوریٰ ۱۱' یٰس ۳۶' الذاریات ۴۹'
النجم ۴۵' النساء ۸' ساتھ ہی دیکھئے مزید آیات:
المومنون ۲۷' الانعام ۱۴۳' الزمر ۶' الرعد ۳' لقمان ۱۰' الحج ۵' الشعراء ۷' طٰہٰ
۵۳' ق ۷'

جب انسان میں زوجیت کی حکمت بانجھ پن یا بیوگی کی وجہ سے مفقود ہو جائے تو قرآن زوج کے بجائے امرأة کا لفظ استعمال کرتا ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی (حضرت سارہ) اور عمران کی بیوی کے بارے میں امرأة ہی کا لفظ آیا ہے۔ دیکھئے آیات: هود ۷۱' الذاریات ۲۹' آل عمران ۳۵

حضرت زکریا اللہ تعالیٰ سے تضرع کرتے ہیں:

"وکانت امرأتی عاقراً فہب لی من لدنک ولیاً (مریم - ۵)
" قال رب أنی یکون لی غلام وقد بلغنی الکبر وامرأتی عاقر (آل عمران ۴۰)

پھر رب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور زوجیت کی حکمت ثابت ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:

فاستجبنا له ووهبنا له یحیی واصلحنا له زوجه" (الانبیاء - ۹۰)

تشریع کی آیات میں احکام 'زوج' ازواج' سے اس وقت متعلق ہوتے ہیں جب زوجیت حقیقةً یا حکماً قائم ہو جیسے میراث کے احکام میں اور ان عورتوں کی عدت میں جن کے "ازواج" فوت ہو چکے ہیں (البقرہ - ۲۳۴) لیکن جب طلاق یا ایلاء کی وجہ سے زوجیت کا تعلق منقطع ہو جائے تو احکام کا تعلق ازواج کے بجائے نساء سے ہو جاتا ہے جیسے آیات: الطلاق ۱' البقرہ ۲۲۶

سورۂ بقرہ کی آیت ہے:

"فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره" (البقرہ-۲۳۰)

اس کا تقاضا ہے کہ طلاق بائن پانے والی عورت اور مطلق کے درمیان زوجیت کا خاتمہ ہو اور محض نکاح کی ظاہری کارروائی ہو جانے سے طلاق دینے والے شوہر کی طرف اس کی دوبارہ واپسی جائز نہ ہو۔

سورۂ مجادلہ میں ظہار کی آیت ہے:

"قد سمع الله قول التي تجادلك في زوجها وتشتكي إلى الله" (المجادلہ-۱)

اس آیت میں "زوج" کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ زوجیت قائم ہے اور آیت "والذين يظاهرون من نساءهم" میں "نساء" کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے ظہار کے ذریعے زوجیت کو معطل کر دیا ہے۔

کیا دو مختلف صیغوں کے الفاظ کے ایک معنی ہو سکتے ہیں؟

عربی زبان کے محققین نے صرف انھیں الفاظ میں ترادف کا انکار نہیں کیا ہے جن کے حروف اور مادے مختلف ہوں۔ بلکہ ان کے الفاظ کے بھی مترادف ہونے کا انکار کیا ہے جن کے مادے اور حروف یکساں ہوں لیکن ان کے صیغے اور وزن مختلف ہوں۔ اِلّا یہ کہ ان کا استعمال دو لغتوں میں ہو۔ حتیٰ کہ یہ بھی جائز نہیں کہ دو الفاظ میں حرکتوں میں اختلاف ہو اور ان کا معنی ایک ہو۔

ابو ہلال نے اس سلسلہ میں مبالغہ کے صیغوں کی مثال دی ہے کہتے ہیں:

"جب آدمی میں جب کام کرنے کی صلاحیت بالقوی موجود ہو تو "فعول" کہتے ہیں جیسے صبور، شکور۔ اور جب وہ وقت بوقت کام کرے تو "فعّال" کہتے ہیں جیسے علّام، ستّار اور جب ویسا کام کرنا اس کی عادت ہو جائے تو "مفعال" کہتے ہیں جیسے معطان، معطاء۔ جو شخص معانی کے اس اختلاف کو نہیں سمجھتا وہ گمان کرتا ہے کہ تمام صیغوں

ے صیغہ مبالغہ کا فائدہ حاصل ہوتا ہے الا کہ بات صرف اتنی نہیں ہے بلکہ
الا صیغے کے ساتھ ساتھ مذکورہ معانی بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح تمام کلام میں فعلت اور أفعلت کے وزن پر آنے والے الفاظ
معانی میں فرق ہوتا ہے الا یہ کہ دونوں الگ الگ لغت میں ہوں جیسے سقیت
الرجل کے معنی ہیں "تم نے آدمی کو پینے والی کوئی چیز دی یا اس کے حلق میں
ال دی" اور أسقیت الرجل کا مطلب یہ ہے کہ "تم نے اس کیلئے پانی کا ایک
حصہ خاص کر دیا" اسی طرح 'شرقت الشمس' کا مطلب ہے کہ سورج طلوع
ہو (غربت کی ضد) اور 'أشرقت الشمس' کا یہ مطلب ہے کہ سورج روشنی
والا ہو گیا۔ رہا بعض اہل لغت کا یہ قول کہ الشَّعَر اور الشَّعْر اور النَّهَر اور النَّهْر
ایک معنی میں ہے تو در حقیقت یہ دو لغتیں ہیں۔ جب حرکتوں کے اختلاف سے
معانی کا اختلاف لازم آتا ہے۔ تو خود معانی کے اختلاف سے ایسا ہونا زیادہ
قرین صواب ہے" [۱]

عربی زبان کی عظیم کتاب — قرآن کریم — ہم پر یہ دقیق نکتہ واضح کرتی ہے کہ
الفاظ ایک مادہ سے ہوں لیکن ان کی حرکتوں یا صیغوں میں اختلاف ہو۔ ان
کی دلالتوں میں فرق ہو جاتا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں ذیل کی سطور میں بیان کی
جا رہی ہیں۔

اشتات اور شتی:

دونوں کا مادہ ایک ہے۔ الشت اور الشتات لغت میں تفرق و

---

[۱] - ابو ہلال العسکری: الفروق اللغویہ ص ۱۲-۱۳

اختلاف کے معنی تے ہیں۔ یہ مادہ قرآن میں پانچ جگہ آیا ہے۔ تین جگہ شتی کے صیغے میں ذیل کی آیات میں:

طٰہ ۵۳: وأنزل من السماء ماءً فأخرجنا به أزواجاً من نباتٍ شتّٰی

اللیل ۴: إن سعیکم لشتّٰی

الحشر ۱۴: تحسبهم جمیعاً وقلوبهم شتّٰی

ان آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی اختلاف کے ہیں جو ائتلاف (اتحاد) کی ضد ہے۔ جبکہ مندرجہ ذیل دو آیتوں میں اُشتات کے صیغے میں آیا ہے جس کا معنی سیاق کی رو سے تفریق و انتشار (الگ الگ ہونا) ہے۔ جو تجمّع کی ضد ہے۔

الزلزلة ۶: یومئذ یصدر الناس أشتاتاً لیروا أعمالهم

النور ۶۱: لیس علیکم جناح أن تأکلوا جمیعاً أو أشتاتاً

الإنس اور الإنسان:

دونوں کا مادہ ایک ہے جو توحش کی ضد ہے۔ لیکن دونوں میں ترادف نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک میں ایک خاص ملحوظ ہے۔ جو اسے دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔

لفظ 'إنس' قرآن میں ہمیشہ 'جن' کے ساتھ تقابل کے طور پر آیا ہے۔ کسی بھی جگہ اس کی خلاف ورزی نہیں ہوئی ہے۔ تمام آیات میں 'جن' کے قسیم کی حیثیت سے اس کا استعمال ہوا ہے۔ ان مقامات کی تعداد ۱۸ ہے اس میں 'انسیت' کا پہلو ہے جو 'توحش' کی ضد ہے۔ 'جن' کے مقابل میں اسے بیان کرنے سے یہی مفہوم بصراحت معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ 'جن'

ہے خفاء' پر دلالت ہوتی ہے جو توحش کے مظاہر میں سے ہے ... ہماری جنس ان جنسوں سے ممتاز ہے جو مخفی' مجہول اور نامانوس ہیں ... ہماری زندگی کے قوانین کے تابع نہیں ہیں۔

۲۔ لفظ 'انسان' تو معجزانہ بیان کی آیات کا استقراء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی 'انسانیت' کا مناط محض 'انس' ہونا نہیں ہے بلکہ اس میں انسانیت در اصل مکلف ہونے کی اہلیت' یا بار امانت کا تحمل اور خیر و شر کی آزمائش کی منزل تک ارتقاء ہے۔[15]

قرآن کریم میں لفظ 'انسان' ۶۵ مقامات پر آیا ہے۔ جب ہم ان تمام آیات کے سیاق میں غور کرتے ہیں تو ہمیں 'انسانیۃ' کی متمائز دلالت کا اشارہ ملتا ہے

وہ اپنی عام جنس میں 'انسی' ہے۔

"خلق الانسان من صلصال کالفخار' وخلق الجان من مارج من نار (الرحمن ۔۱۴)

" ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون والجان خلقناہ من قبل من نار السموم (الحجر ۔۲۴)

لیکن اپنی 'انسیۃ' کے ساتھ انسان مندرجہ ذیل خصوصیات کا بھی حامل ہے :

قرأت وعلم : سورۃ العلق ۱۔۵

بیان : الرحمن ۔۳

مکلف ہونا : الدھر، النجم ۳۹، القیامہ ۱۴، الاسراء: ۱۷

مجادلہ و خصومت : کہف ۵۴

---

۱۵ اس استقراء کی تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب التفسیر البیانی للقرآن الکریم کا دوسرا حصہ

جیت: لقمان ۱۴، العنکبوت ۱۸

مشقت کو برداشت کرنا: البلد۔ ۴

اس بار امانت کو اٹھانے والا جسے اٹھانے سے آسمان، زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا اور اس کے اٹھانے سے خوف محسوس کیا: الاحزاب ۷۲

آزمائش اور گمراہی سے دوچار ہونے والا: الفرقان ۴۴، ق ۱۶، الحشر ۱۶، الدھر ۲، ۴، الفجر ۱۵

غرور استکبار کرنے والا اور اپنے خالق سے بے نیاز سمجھ کر گمراہ ہو جانے والا: العلق ۶

اسی طرح بکثرت مقامات پر قرآن انسان کو اس کا ضعف اور ناتوانی یاد دلاتا ہے تاکہ اس کا غرور ٹوٹے اور وہ اپنی حد سے تجاوز کر کے سرکشی نہ کرے کیونکہ اس بات کا گمان تھا کہ سرکشی اسے خالق کے انکار تک پہنچا دے یا اسے کھلا ہوا جھگڑالو بنا دے:

النحل ۴، مریم ۶۷، الانفطار ۶، حم السجدہ ۴۹، الزخرف ۱۵، عبس ۱۷، العادیات ۶ ؁

النعمۃ اور النعیم:

دونوں الفاظ ایک مادہ سے ہیں اور دونوں اپنے مشترک مادے کی عام دلالت میں مشترک ہیں لغت کی کتابوں میں دونوں صیغوں میں کوئی فرق نہیں ملتا

؁ تفصیل اور وضاحت کیلئے دیکھئے میری کتاب "مقال فی الانسان: دراسة قرآنية" طبع المعارف ۱۹۶۹ء۔

اہل تفسیر نعیم کی تفسیر ان تمام معانی سے کرتے ہیں جو اس مادہ کی لغوی دلالت میں پائے جاتے ہیں۔ ۱؎

پورے قرآن میں جب ہم دونوں صیغوں کا استقراء کرتے ہیں تو دونوں کے معنی میں واضح فرق دیکھتے ہیں۔ نعمۃ کا لفظ قرآن میں مختلف اقسام کی دنیوی نعمتوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔ تمام مواقع استعمال میں (خواہ اس کا استعمال مفرد ہوا ہو یا جمع) ایسا ملتا ہے کہیں اس کے برخلاف نہیں ہے۔ ان کی تعداد ۵۵ ہے۔

لیکن نعیم کا صیغہ قرآن میں اسلامی دلالت کے ساتھ آیا ہے۔ اس کا استعمال صرف آخرت کی نعمتوں کے ساتھ خاص ہے۔ ایسا تمام آیتوں میں ہے جن کی تعداد ۱۶ ہے۔

پندرہ آیتوں میں صریح لفظ کے ساتھ وارد ہے جنت کی نعمتوں کے علاوہ کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی

الواقعہ ۸۹ : فأما إن كان من المقربين، فروح وريحان وجنة نعيم

المعارج ۳۸ : أيطمع كل امرئ منهم أن يدخل جنة نعيم

المطففين ۲۲ : إن الابرار لفي نعيم، على الأرائك ينظرون تعرف في وجوههم نضرة النعيم

الشعراء ۸۵ : واجعلني من ورثة جنة النعيم

الدهر ۲۰ : وجزاهم بما صبروا جنة وحريرا ... وإذا رأيت ثم رأيت نعيما وملكا كبيرا

۱؎ دیکھئے تفسیر طبری اور تفسیر کبیر الرازی سورۃ ۱۰۲ التکاثر

المائدة ٦٥ : ولأدخلناهم جنات النعيم

یونس ٩ : تجری من تحتھم الانھار فی جنات النعیم

القلم ٣٤ : إن للمتقین عند ربھم جنات النعیم

لقمان ٨ : إن الذین آمنوا وعملوا الصالحات لھم جنات النعیم

الطور ١٧ : إن المتقین فی جنات النعیم

الحج ٥٦ : الملک یومئذ للہ، فالذین آمنوا وعملوا الصالحات فی جنات النعیم

[ساتھ ہی دیکھئے آیات : الصافات ٤٣، الواقعہ ١٢]

التوبہ ٢١ : وجنات لھم فیھا نعیم مقیم

صرف سورۂ تکاثر کی آیت میں ان لوگوں کو خطاب کر کے جنھیں ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا کمانے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ کہا گیا ہے :

"ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم" (٨)

تمام آیات میں قرآن کے 'نعیم' کے صیغے کو آخرت کی نعمتوں کے ساتھ خاص ...نے کے بعد ہم اس آیت کی وہ تفسیر نہیں کر سکتے جو ہمیں تفسیر کی کتابوں میں ملتی ... وہ یہاں 'نعیم' سے مراد دنیا کی نعمتیں نہیں لے سکتے۔ اس لیے کہ دنیا کی نعمتوں ...ن قرآن میں نعمۃ، نعماء اور نعم وغیرہ کے صیغے آئے ہیں۔ اس آیت میں ... زیہ ہے کہ جن لوگوں کو دنیاوی اسباب کی زیادتی نے آخرت کیلئے زاد ... سے غافل رکھا ان لوگوں سے اس دن جب وہ جہنم دیکھ لیں گے (اور یقیناً اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے) یہ سوال کیا جائے گا کہ حقیقی نعمت (نعیم) کیا ... اور اس وقت انھیں اس 'نعیم' کی حقیقت کے بارے میں علم الیقین حاصل ... گا جسے انھوں نے ضائع کر دیا اور دنیا کی فانی کی نعمتوں پر ٹوٹے پڑے

سمجھا اور اس کے چند مخصوص اسباب کی کثرت نے انھیں اس سے غافل رکھا۔

× × ×

یہاں میں ان شواہد کے پیش کرنے پر اکتفا کرتی ہوں جو ان محققین اہل لغت کے مسلک کی تائید کرتی ہیں جو دو الفاظ کے مترادف ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ الا یہ کہ دو لغتوں میں آئیں۔

"لیکن یہ کہ ایک ہی لغت میں یہ محال ہے کہ دو الفاظ مختلف ہوں اور ان کا معنی ایک ہو جیسا کہ بہت سے نحویین اور لغویین کو گمان ہوا انھوں نے اہل عرب کو ان کی حقیقت پر اور عادت کے مطابق جیسا کہ وہ معروف تھے بولتے ہوئے سُنا، بولنے والوں کے نفوس میں ان کے مختلف معانی کا استحضار تھا لیکن سننے والے ان علتوں اور فروق کو نہ سمجھ سکے اور انھوں نے ان کے مترادف ہونے کا گمان کر لیا اور اہلِ عرب کے بارے میں ایسی بات کہہ دی جو صحیح نہ تھی"[12]

× × ×

مجھے اعتراف ہے کہ میں قرآن کے بعض الفاظ (جو بظاہر مترادف معلوم ہوتے ہیں) کی دلالتوں میں فرق جاننے سے قاصر رہی ہوں۔ میں اپنی عاجزی اور جہالت کا پورا اعتراف کرتی ہوں اور ابن الاعرابی کے یہ الفاظ مستعار لیتی ہوں۔

"دو الفاظ جنھیں اہلِ عرب نے ایک معنی میں استعمال کیا ہے۔ انمیں سے ہر ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے میں نہیں۔ بسا اوقات ہمیں وہ معلوم ہو گیا ہے تو ہم نے بتلا دیا ہے اور کبھی ہم نہیں جان سکے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اہلِ عرب کو بھی وہ معلوم نہ تھے"[13]

---

[11] دیکھیے التفسیر البیانی کے پہلے حصے میں سورۂ التکاثر۔ طبع المعارف

[12] ابو ہلال العسکری: الفروق اللغویہ صد ۱۲

[13] ایضاً صد ۶۵

نذرانۂ عقیدت

بحضور مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ بانی ندوۃ المصنفین دہلی

از کمال جعفری، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

اے مفکر، اے مدبر اے امیر کارواں
تو نہیں لیکن زمانے میں ہے تیری داستاں

اے امام قوم اے فخر وطن اے روزگار
تجھ کو قدرت نے عطا کی تھی نگاہِ معتبر

ملک و ملت کے لئے تھی وقف تیری زندگی
قابلِ صد رشک تیری ذات کی تھی سادگی

گفتگو میں تیری پوشیدہ تھی شانِ دلبری
ایسا لگتا تھا کہ تجھ پر ختم تھی دانشوری

تجھ کو بخشا تھا خدا نے کیا غضب کا حافظہ
آیتِ قرآن سے کرتا تھا حل ہر مسئلہ

مفتیٔ دیں میں کہوں یا مفتیٔ اعظم کہوں
یا کہ تجھ کو رازہائے قوم کا محرم کہوں

تیری ہر تقریر ہوتی تھی ہمیشہ دل پذیر
جس کی اب دنیا میں مل سکتی ہے مشکل سے نظیر

حوصلہ تیرا ہمالہ عزم تھا تیرا فکا
تیرے دل میں ہندو مسلم کا اتحادِ مقصد

پاکباز و پاک سیرت نیک خو انسان تھا
فخرِ ہندو فخرِ مسلم فخرِ ہندوستان تھا

تو کہ علم و فضل کا تھا ایک بحرِ بیکرا
ناز کرتی تھی خطابت پر تری اردو ز

فضلؒ جیسے صاحبِ علم و عمل دادا ملے
تربیت پائی چچا شبیرؒ کے سائے تلے

شفقتِ پدرِ عزیزؒ مردِ حق حاصل رہ
درسِ انور شاہؒ سے عرفان کی دولت

دیوبند سے کرکے جب تعلیم تو فارغ ہوا
درسِ دیں مدرسوں میں جابجا دیتا رہا

شہر کلکتہ ہو یا ڈابھیل و بیضاوی
تو جہاں ٹھہرا نہ پیدا ہو سکا کوئی حریف

جس جگہ پہنچا اسے جنت بداماں کر دیا
قوم مسلم کے لئے راحت کا ساماں کر دیا

کرکے قائم انجمن ندوۃ المصنفین کی
عمر بھر دہلی میں کی خدمت خدا کے دین

[illegible] ابن جوزیؒ کی کتب کے ترجمے
انہماک و شوق سے تو نے بہت اچھے کیے

حق پرست و حق شناس و حق نگر پاکیزہ ذات
خوبیاں کیا ہوں بیاں تجھ میں ہزاروں تھیں صفات

ماہنامہ جاری کردہ جو ترا "ترجمان" ہے
تشنگانِ علم پیاس کا بڑا احسان ہے

اس رسالے کو سعید احمدؒ نے بخشا وہ وقار
ہو گیا دنیائے علم و فن میں یہ اک شاہکار

درحقیقت تھے رفیقِ کار تیرے جاں نثار
کر کے باہم مشورے کرتے تھے کارِ بے شمار

اللہ اللہ کس قدر بیدار تھا تیرا شعور
دم بخود افکار رہتے تھے سدا تیرے حضور

تیرے جیسا اب مسلمانوں میں ہے خادم کہاں
اب کہاں ڈھونڈوں تجھے آنکھوں سے آنسو ہیں رواں

بارگاہِ حق میں ہو جائے دعا میری قبول
تیرے مرقد پر قیامت تک ہو رحمت کا نزول

حشر تک باقی رہے گا مفتیٔ دیں تیرا نام
روح کو تیری کمالِ بے ہنر کا صد سلام

تبصرہ

تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء

مصنف: مولانا شہاب الدین ندوی
ناشر: فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ
قیمت: نامعلوم
صفحات: ۲۷۷

سائنسداں جب کافی مشاہدی حقائق جمع کر لیتا ہے تو وہ ان کو ترتیب دے کے ایک نظری قانون اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے اگر اس کے ایک مخصوص ترتیب بندی میں چند حقائق موافق ہوتے ہیں اور زیادہ حقائق خلاف تو اس ترتیب بندی کو مفروضہ کہا جاتا ہے لیکن جس ترتیب بندی میں زیادہ حقائق موافق اور چند حقائق مخالف ہوتے ہیں تو اس کو نظریہ سے یاد کیا جاتا ہے مگر جس ترتیب بندی میں تمام حقائق موافق ہوتے ہیں تو اس کو ثابت شدہ حقیقت مان لیا جاتا ہے۔
(خان - مذہب اور سائنس، ۱۹۸۱)

ارتقاء برسوں سے ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور آج شاہدی حقیقت اس کے خلاف نہیں ملی ہے (خان، سائنس اور اجتہاد، ۱۹۷۶) اگرچہ چند غیر یا تیم سائنسداں ارتقاء کے خلاف لکھتے آئے ہیں بغیر کسی شاہدی حقیقت کے۔ اسی بنا پر ذہین اور صاحب مطالعہ مسلم مفکروں نے ارتقاء کی مخالفت نہیں کی ہے۔ خود مولانا آزاد، سید سلیمان ندوی اور شیخ عبدہ وغیرہم ان مسلم مفکروں میں شامل ہیں۔

مسلمان اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ الہامی کتابیں

بہرحال دینی یا اسلامی قوانین بھی خدا کے تخلیق کردہ ہیں لہٰذا ان دونوں میں تضاد غیر ممکن ہے مگر فطری قوانین مشاہدہ حقائق پر مبنی ہیں لہٰذا ان کو [illegible] ہے لہٰذا الہامی کتابوں میں بیان کردہ واقعات یا قوانین اور مشاہدہ [illegible] یا فطری قوانین میں اگر تضاد نظر آتے ہیں تو یہ محض الہامی کتابوں کی تفسیر کی بنا پر ہو سکتے ہیں. لہٰذا ارتقاء کے معاملے میں علم [illegible] میں اگر اختلاف ہے تو یہ محض تفسیر کی وجہ سے ہے.

مذہبی حلقوں کی یہ عام روش ہے کہ وہ الہامی کتابوں کی قدیم تفسیر کو ہی تسلیم کرتے ہیں اور اس کے خلاف تفسیر کرنے والوں کو اہل الرائے قرار دیتے ہیں. علاوہ ازیں یہ حضرات سائنس کی ہر چیز کو خواہ وہ مشاہدی حقیقت ہی کیوں نہ ہو مشتبہ گردانتے ہیں. انہیں پس منظر میں ارتقاء کو مفروضہ یا افسانے سے یاد کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء ایک ثابت شدہ حقیقت ہے لیکن یہ تصور کہ ارتقاء کی تمام کڑیاں خود بہ خود وجود میں آتی ہیں اور ان میں خدا کا کوئی منصوبہ کارگر نہیں ہے غیر سائنٹفک ہے مگر ملحدوں نے اس تصور کو سائنسی عقیدت کی حیثیت دے دی ہے جس کی مخالفت محض مذہبی حضرات ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ غیر جانبدار اور سچے سائنسدانوں کا بھی یہی موقف ہے (خان، دور جدید اور مذہب، ۱۹۸۵)

مولانا شہاب الدین ندوی صاحب مسلسل یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ علماء حضرات میں مشاہدی حقائق، مفروضہ، نظریہ اور ثابت شدہ حقیقت کے فرق کو واضح کریں۔ (میں نے بھی مندرجہ بالا تینوں کتابوں میں یہی واضح کرنے کی کوشش کی ہے) تاکہ علماء حضرات جدید تعلیم یافتہ حضرات کی نظر میں مشکوک نہ بنیں بلکہ عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور ان کے اسلامی خیالات

کو جو قبولیت ان حضرات میں مقبولیت حاصل ہو سکے اسے حقیقی کی صداقت
سے ہے معلوم ہو سکیں لہٰذا پوری کتاب میں مولانا کی یہ کوشش
رہی ہے کہ یہ ثابت کریں کہ دنیا کا پہلا نظام خدا کے منشور کے مطابق
چل رہا ہے کہ ملحدوں کی یہ کوشش کہ دنیا کا پہلا نظام بغیر خدا کے چل رہا ہے
سازش کا نتیجہ ہے مگر غلطی سے اعتقاد کے خلاف ثبوت فراہم کرنے میں
لگ گئے جو کتاب کا بڑا کمزور پہلو ہو کر رہ گیا ہے

(احسان اللہ)

بقیہ : اسلام کا نظام عدل

COMPLELLED TO MEN ONE THE NAMES OF ABUBAKR AND UMMAR.

THOUGHTHEY WERE MASTER OF A VERET EMRIRE YET THEY BINED. THE LIFE OF PURES.

("HARIJAN" Dated 27/7/37)

"یعنی سادگی کانگریس کی اجارہ داری نہیں۔ میں رام اور کرشن کا حوالہ بھی اس سلسلہ میں پیش نہ کر سکوں گا کیونکہ ان کی شخصیتیں ماقبل از تاریخ کی ہیں۔ البتہ میں اس ضمن میں ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام لینے پر مجبور ہوں کہ باوجود ایک وسیع مملکت کے حاکم ہونے کے ان نے انتہائی سادگی اور فقرانہ زندگی بسر کی"

جی ہاں کمال یہی ہے کہ غیر اور پرائے بھی اعتراف کمال اور اقرار حق پر مجبور ہو جائیں

(بشکریہ نصرۃ الاسلام نمبر بابت ماہ نومبر)